رضیہ
IDRIS

نجانے کون مجھے دعاؤں میں یاد رکھتا ہے
میں ڈوبنا چاہتا ہوں تو سمندر اچھال دیتا ہے

دو سٹاپ ابھی باقی تھے۔

بس بھری ہوئی تھی۔ سیٹوں پر تو جو لوگ بیٹھے تھے بیٹھے ہی تھے۔ درمیانی جگہ پر دو قطاریں کھڑے ہونے والوں کی بن گئی تھیں۔ عورتیں مرد ٹھنسے کھڑے تھے۔ دو تین بچے ان کھڑے ہونے والوں کی ٹانگوں میں چھٹے بس کو ذرا سا جھٹکا لگنے سے پسنے لگتے تھے۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہے تھے۔ عورتیں چھت سے لگے راڈ کو ایک ہاتھ سے پکڑے دوسرے سے بچوں کو اپنے ساتھ چمٹانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دو ایک عورتوں نے تو مردوں سے جھڑپ بھی لے لی تھی۔

"ذرا پرے ہٹ کر کھڑے نہیں ہو سکتے"

"بی بی جگہ ہے۔ کہاں جاؤں"

"ہاتھ ادھر رکھو"

"کوئی بات نہیں سب اپنی مائیں بہنیں ہیں۔ تکلیف تو ہو رہی ہے لیکن کیا کیا جائے"

مُنے تھے خواب کسی اجنبی سحر کے لئے
کھلی جو آنکھ تو ہم تھے اُداس گھر کے لئے
کسی نے چپکے سے آ کر کہا ابھی ٹھہرو
اگرچہ قافلے تیار تھے سفر کے لئے

"اے بھائی تمہیں سگریٹ بھی ابھی ہی پینا ہے۔"

"لو بہن جی نہیں پیتے — منہ دوسری طرف کر لیتے ہیں۔"

"سیدھی طرح بات کرو — اتنا بننے کی ضرورت نہیں۔"

عورت غصے میں آ گئی تھی۔ قطار میں کھڑے بزرگوں اور نوجوانوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ کوئی کنڈکٹر سے اُلجھ پڑا۔ کوئی سیٹوں پر بیٹھے مردوں کو سرزنش کرنے لگا۔

"اتنی تو شرافت کسی میں ہے ہی نہیں۔ بیبیاں پھنسی پھنسائی کھڑی ہیں یہ ہیں ہماری نئی نسل جوان لڑکے سیٹوں پر بیٹھے ہیں۔ یہ نہیں کرتے کہ کم از کم بچوں والی بیبیوں ہی کو جگہ دے کر خود کھڑے ہو جائیں۔"

ایک سفید ریش بزرگ نے عورتوں پر ترس کھا کر سیٹوں پر بیٹھے جوانوں کو احساس دلانے کی کوشش کی۔ دو ایک شریف لڑکے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"بیٹھ جائیے آپا جی —!"

"اماں اس جگہ بیٹھ جائیں۔"

"بی بی اِدھر آ جائیں۔"

عورتیں بنا شکریہ ادا کیے سیٹوں پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئیں۔ کچھ نوجوان بزرگ کی بات پر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بلکہ ان جگہ دینے والے نوجوانوں کو تمسخر سے تکنے لگے۔ ایک نوجوان تو خاصہ لمبا تڑنگا تھا سر چھت سے ٹکراتا تھا۔ مجبوراً گردن جھکا کر کھڑا ہونا پڑا۔

سیٹ پر بیٹھے اک کاریگر قسم کے بیہودہ سے لڑکے نے آوازہ کسا۔

"بھگتو اب —!"

ساتھ بیٹھے دونوں جوان ہنس دیئے۔ درمیانی جگہ پر بوریوں کی طرح ٹھنسے لدے آدمی ان کو لعن طعن کرنے لگے۔

وہ —!

ڈرائیور کی پیچھے والی تین آدمیوں کی سیٹ میں سے ایک پر کھڑکی سے لگی بیٹھی تھی بے حد گھبرا رہی تھی پریشان ہو ہو کر ان لوگوں کو تک رہی تھی جو ٹرک کے مال کی طرح لدے ہوئے تھے۔ دو سٹاپ ابھی اور تھے۔ پھر اس نے اترنا تھا لیکن جس طرح بس میں سواریاں لادی اور ٹھنسائی جا رہی تھیں اسے باہر جانے کا راستہ دکھائی نہ دے رہا تھا اس کے ساتھ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک دیہاتی معمر عورت بیٹھی تھی اس کے چہرے اور گردن کے مساموں میں میل پھنسی تھی بالوں سے کھٹی لسی کی بساند آ رہی تھی کپڑے اتنے گندے تھے کہ کراہت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سلور کا ایک پرانا سا ڈبہ گود میں رکھا ہوا تھا جس میں تیل یا گھی قسم کی کوئی چیز تھی اس کے برابر ایک برقعہ پوش خاتون تھی جس نے جاپانی کپڑے کا نیا سوٹ پہنا ہوا تھا ہاتھوں میں انگوٹھیاں تھیں کلائیوں میں چوڑیاں، سنہری رنگ کا پرس اس نے گود میں رکھا ہوا تھا — لال ریشمی جرابیں اور سنہری سینڈل پاؤں میں تھی۔

درمیان میں کھڑے ہونے والے مرد دھکا لگنے پر جھکے جا رہے تھے۔ کئی بار یہ برقعہ پوش عورت انہیں سیدھی طرح کھڑے ہونے کا کہہ چکی تھی۔ لڑکی بری طرح گھبرا رہی تھی۔

"توبہ۔ سواریاں لادے جا رہے ہیں" اس نے اپنے آپ سے کہا۔

"بس جو ہوئی" اماں نے اس کی بات کا مسکرا کر جواب دیا۔ اس کے پیلے پیلے دانت اور سانس کے بھبکے سے اسے بے طرح کوفت ہوئی اپنا منہ پھیر کر لاشعوری طور پر اس نے دوپٹہ ناک کے آگے رکھ لیا۔

معمر عورت نے اسے دیکھا تو ناک منہ چڑھاتے ہوئے بولی۔

"بدبو تو نہیں آ رہی۔ دوپٹہ کیوں ناک کے آگے رکھ لیا ہے"

وہ بیزاری سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ دوپٹہ ناک سے ہٹا لیا۔

بس کسی سٹاپ پر رکی تو سواریوں کا ایک ریلا سا آ گیا۔

"اے بھائی کیا کرتے ہو" لڑکی نے سیٹ پر بیٹھے ڈرائیور کو متوجہ کیا۔

"بی بی بسوں میں ایسا ہی ہوتا ہے"

"جانور لاد رہے ہو"

ڈرائیور مسکرایا۔ اور دائیں ہاتھ لگے شیشے میں سے اس کا عکس دیکھنے کی کوشش کی۔

لڑکی جھلا گئی۔

اماں بولی۔ "یہ ان کا روز کا کام ہے ہر ایک نے جانا بھی تو ہوتا ہے کھڑے انتظار کرتے رہیں تو صبح کے نکلے شام کو پہنچیں جہاں جانا ہوتا ہے"

"ہونہہ" اس نے بیزاری سے آواز نکالی اور ایک بار پھر ان لوگوں پر نگاہ ڈالی جو درمیانی جگہ میں لدے پھنسے کھڑے تھے۔ باہر نکلنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔

"یہ لوگ اسی طرح چڑھتے رہے تو میں باہر کیسے نکلوں گی۔؟" وہ اپنے آپ سے بولی۔

"بس رکے گی تو جگہ بن جائے گی" معمر عورت بڑے اطمینان سے بیٹھی تھی لڑکی کو دیکھا اور پھر بولی۔

"گھبرا کیوں رہی ہو"

"اماں آپ تو چپ کریں" اس نے جھلا کر کہا۔

"ہائے ہائے" اماں نے گال پر انگلی رکھ کر اسے دیکھا جھک جھک کر گرتے پڑتے مسافر دونوں کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اماں کی بات پر وہ مسکرانے لگے۔

اماں باتونی سی عورت تھی۔ سفر میں باتیں کرنے کی عادی تھی اس کا خیال تھا باتوں میں سفر کٹ جائے تو وقت کا احساس ہوتا ہے نہ تکلیف کا۔ پہلے وہ برابر والی برقعہ پوش سے باتیں کر رہی تھی۔ پھر کھڑے مردوں اور جوانوں سے باتیں کیں۔ اب اس کا رخ اس کی طرف تھا۔

وہ پہلے ہی اس سے بیزار تھی۔ دل میں کراہت محسوس کر رہی تھی اس پر اس کا خواہ مخواہ دخل در معقولات ہونا پسند نہیں تھا ہر بات کا بگڑ کر غصے سے جواب دے رہی تھی۔ برقعہ پوش عورت نے دو ایک بار سر آگے کر کے اس کی طرف دیکھا تھا۔ "کہاں سے آ رہی ہو" اماں نے پھر پوچھا۔

اک خشمگیں نگاہ اس پر ڈال کر اس نے پھر رخ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ اور باہر دوڑتی بھاگتی چیزوں کو دیکھنے لگی۔

اماں نے گردن موڑ کر سامنے غور سے دیکھا وہ جوان اور خوبصورت لڑکی تھی صاف ستھرا لباس تھا، بال بنے ہوئے تھے۔ بیگ کا فیتہ بازو پر چڑھا رکھا تھا گود میں دو ایک کتابیں تھیں جن پر سیاہ چشمہ رکھا ہوا تھا۔

اماں چند منٹ تکتی رہی۔ وضع قطع سے وہ کچھ امیر امیر سی لگ رہی تھی۔ بس میں بیٹھی بیزار بھی ہو رہی تھی۔ اس کے وجود سے ہلکے ہلکے خوشبو کے بھبکے بھی اٹھ رہے تھے۔

اماں نے پوچھا۔ "لگتا ہے بس میں پہلی بار آئی ہو"؟

اس نے جواب نہیں دیا صرف اماں کو تکا اور ڈرائیور کی سیٹ کی پشت پر نظریں جما دیں۔

اماں کے سوال پر اسے ہنسی بھی آئی۔ لیکن یہ میلی کچیلی عورت اس کے اعصاب پر مسلط تھی۔ بات کرنا نہیں چاہتی تھی اس سے۔ اسے ایسے لوگ بالکل اچھے نہیں لگتے تھے۔ غریب جاہل اور اپنے آپ سے بے خبر۔ بسوں میں جانوروں کی طرح لد کر سفر کرنے والے۔ اسے تو اچھے لگتے تھے۔ امیر کبیر صاف ستھرے لباسوں والے سمارٹ سمارٹ لوگ جو چمکیلی کاروں میں سفر کرتے۔ ہوائی جہازوں میں اڑتے پھرتے۔

دولت اس کی کمزوری تھی۔

بس میں بیٹھی وہ پریشان بھی تو اسی لئے تھی۔ جھلائی ہوئی بھی تو تبھی تھی۔ کیا اچھا ہوتا۔ جو اس کے پاس بھی گاڑی ہوتی۔ کتنے آرام سے وہ ہوسٹل سے نکلتی۔ گاڑی میں بیٹھتی اور منٹوں میں گھر پہنچ جاتی۔

لیکن اپنی سوچ کو وہ خود ہی کاٹ رہی تھی۔ گاڑی ہوتی تو پھر نرسنگ کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔ نرسوں کے ہوسٹل میں رہنے کا سوال ہی پیدا ہوتا۔

بس پھر رکی۔

اک دھکا لگا۔ لوگوں کی قطار آگے کو جھول گئی۔ کچھ لوگ اترے زیادہ اور چڑھ آئے۔

اب وہ پریشان ہو گئی۔

اگلے سٹاپ پر اسے اترنا تھا۔

کنڈکٹر درمیانی لائن میں کھڑے لوگوں کو ٹکٹ دیتے آیا تو اس نے بیزاری سے اسے بلایا۔

"اے بھائی ۔۔!"

"ہاں بی بی ۔۔! وہ ٹکٹ بک سے پرچی پھاڑ کر مسافر سے پیسے وصول کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے اگلے سٹاپ پہ اترنا ہے"۔

"اتر جانا ۔۔!"

"جگہ نظر آ رہی ہے۔ کیسے اتروں گی"۔

"بس رکے گی تو جگہ بن جائے"۔ کنڈکٹر نے بڑے سہل انداز میں کہا۔

اور پنسل کان پر رکھ کر کرتے کا دامن اٹھا کر نیچے پہنی صدری کی جیب سے پیسے نکال کر مسافر کو دینے لگا۔ اسے سخت غصہ آیا۔

کچھ لوگ اس کے غصّے پر مسکرانے لگے ایک باباجی بولے۔
"گھبراؤ نہیں بیٹی ۔ تمہیں آرام سے اتار دیں گے۔"
"گھبرا تو جب سے بس میں بیٹھی ہے رہی ہے" معمر عورت نے کہا۔
اس نے پھر اماں پر غصیلی نگاہ ڈالی۔
اماں اس کی امارت سے کچھ کچھ مرعوب ہو رہی تھی بولی۔
"بھئی بچّی گھبرانے میں حق بجانب ہے۔ لگتا ہے گاڑیوں میں آنے جانے کی عادی ہے۔"
اس نے اماں کی طرف دیکھا۔ اماں کی بات پر بہت سی نظریں اس پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ اس نے تفاخر سے بالوں کو جھٹکا سب پر اک نگاہ ڈالی اور باہر کی دوڑتی بھاگتی چیزوں کو دیکھنے لگی۔ اب اماں سے اسے کراہت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اماں کی بات نے اس کا قد کا مُٹھ جو بڑھا دیا تھا۔
وہ کچھ بولی نہیں۔
اماں اب برقعہ پوش عورت سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے کان ادھر ہی لگے تھے اماں کہہ رہی تھی۔
"شکل وصورت اور سج دھج سے ہی گاڑیوں موٹروں میں سفر کرنے والی لگ رہی ہے۔"
اس نے پتہ نہیں کیا جواب دیا۔
اماں گہری سانس لے کر اس کی بات کے جواب میں کہنے لگی۔
"یہ تو اپنا اپنا اخلاف ہے نا بی۔ ہر امیر لوگ اپنے سے کمتر لوگوں سے ایسے

ہی پیش آتے ہیں ہم جیسے غریبوں کو تو منہ بھی نہیں لگاتے۔ اللہ جانے اتنی دیر سے کیسے میرے ساتھ بیٹھی ہے وہ۔"
وہ ۔!
دل ہی دل میں مسکرا اٹھی۔
اماں نے اسے امیر کبیر موٹر گاڑیوں والی سمجھا تھا۔ موٹر گاڑیاں نہ سہی، امیر کبیر بھی نہ سہی۔ امیروں والی چھاپ تو تھی اس کے چہرے پر۔ مرعوب تو کر سکتی تھی اپنے سے کمتر لوگوں کو۔
اگلے سٹاپ پر وہ اتری۔ دوپٹہ سر پر اوڑھا بیگ گلے میں لٹکایا۔ کالا چشمہ آنکھوں پر دھرا۔ دو تین جوانوں نے بازو پھیلا کر قطار میں کھڑے لوگوں کو دوسری طرف دھکیلا اور اس کے لیے جگہ بنائی۔ خدائی خدمت گار بن تو گئے تھے لیکن اپنا مطلب بھی تھا لڑکی کے جسم کو چھو کر محسوس کرنے کی گرسنہ خواہش بھی تھی، پوری کر لی۔
اس کے باہر نکلتے ہی ایک نے دوسرے کے کان میں باآواز سرگوشی کی۔ "خوشبودار لڑکی تھی۔"
پیچھے کھڑے مرد نے ہنس کر کہا۔ "بدمزاجی کی بدبو بھی شامل تھی۔"
مرد ہنسنے لگے۔
اور ایسی لڑکیوں پر بے لاگ تبصرے کرنے لگے۔

صحن کے ایک کونے میں بچھی چارپائی پر بیٹھی رشیدہ سبزی بنا رہی تھی۔ ململ کا سا دوپٹہ پائے پر پڑا زمین تک لٹک رہا تھا پھولدار قمیض کے بازو اڑسے پالک بنا رہی تھی۔ ایک ٹوکری میں پالک تھی۔ لگن میں صاف کر کے کتر رہی تھی۔ ڈنٹھل فرش پر نیچے پھینکتی جا رہی تھی۔

صبیحہ صحن کا فرش دھو رہی تھی۔ بانسی تیلیوں کا جھاڑو ہاتھ میں تھا نیلے رنگ کی ربڑ کی پائپ کا ایک سرا نلکے سے بندھا تھا دوسرا اس کے ہاتھ میں تھا جہاں رشیدہ پالک کے ڈنٹھل پھینک رہی تھی وہ جگہ اس نے ابھی ابھی دھوئی تھی۔ شلوار کے پائنچے اڑسے ننگے پاؤں صبیحہ فرش دھوتے ہوئے کوئی فلمی گیت بھی گنگنا رہی تھی۔ سامنے ہی کچن میں ربیعہ بیٹھی تھی گیس کے چولہے پر اس نے ہنڈیا چڑھا رکھی تھی۔ آٹا گوندھ کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔

اس نے اماں کو ساگ کا کوڑا فرش پر پھینکتے دیکھا تو ہنس کر صبیحہ کو آواز دی۔

"اے صبو۔۔۔!"

"کیا ہے"؟

"اِدھر دیکھو"

"کدھر۔۔۔!"

"اماں کی طرف"

رشیدہ نے ربیعہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "فساد کی جڑ ہے تو"

"ہائے اماں" صبیحہ ششدر جھاڑو مارتے ہوئے رک گئی۔

"اس کوڑے کو چارپائی کے اوپر نہیں رکھ سکتیں۔ میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا"

"چل اٹھا لیں گے۔ کیا ہو گیا" رشیدہ نے اس سے کہا۔

"تو کام کر اپنا۔ جلدی کر پانی جانے والا ہے۔ ابھی ڈیوڑھی بھی دھونا ہے"

"میں دھو دھو کر مروں۔ تم گند ڈالے جاؤ۔ یہ کیا بات ہوئی اماں۔ دیکھ رہی ہو کتنی محنت سے صاف کر رہی ہوں فرش"

ربیعہ نے ہانڈی میں ڈوئی چلاتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "چل کیا ہوا۔ تو بھی تو چھٹی کے دن قابو آتی ہے۔ وہ بھی موڈ بنے جناب کا تو دھو دھلا دیا گھر"

"تو کیا کالج جاتے یا آتے ہی جھاڑو اور پائپ پکڑ لیا کروں" وہ سیدھی کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

رشیدہ نے ساگ بنا لیا تھا۔ ہاتھ صافی سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

"لے ربیعہ دھو لے پانی بند ہونے والا ہے، ذرا کھلے پانی میں دھونا۔

ساگ میں بڑی کرک ہے۔ بالٹی میں پانی بھر لے۔ نتھار نتھار کر دھونا۔ ساری ریت مٹی بھری ہے۔"

ربیعہ ہانڈی ہی میں ڈوئی چھوڑ کر اٹھ آئی۔ ساگ کی ٹوکری ماں سے لیتے ہوئے کہا۔

"اماں یہ میتھی کیوں بچالی ہے۔ دھنیہ بھی نہیں کترا۔"

"ڈال دیا ہے سب کچھ۔ تو جلدی سے دھولے۔ ابا کو روٹی بھیجنی ہے دکان پر۔ ساڑھے بارہ بجے آجائے گا شرفو۔!"

"مجھے پتہ ہے روز میں ہی بھیجتی ہوں۔ صبیحہ تو نہیں ہیں۔ جو ہفتے میں صرف ایک دن گھر میں کام کے لئے نظر آؤں۔"

"اماں تو چاہتی ہے آپ ہفتے میں ایک دن بھی گھر میں نظر نہ آئیں آپا۔" صبیحہ نے نل سے پانی کا فوارہ چھوڑتے ہوئے ہنس کر کہا۔

اماں نے اک گہری سانس چھوڑی۔

"اللہ جانے کب وقت آئے گا۔"

"آجائے گا اماں۔" صبیحہ بولی۔ "اپنی آپا اتنی پیاری ایسی سگھڑ ہے۔"

"جی جواب مل گیا۔" ربیعہ نے ہنس کر کہا۔

"لیکن یہ ہنسی اماں کا جی جلا گئی۔ اماں کے کچھ کہنے سے پہلے ہی صبیحہ بولی۔" اچھا ہی ہوا۔ وہ لوگ ہمارے قابل تھے ہی نہیں۔"

"ہاں۔! ربیعہ نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا۔

"خوب سے خوب تر کی تلاش جاری ہے۔"

"بالکل۔ اور انشاءاللہ تلاش ناکام بھی نہیں ہوگی۔"

اماں کو لڑکیوں کا اس موضوع پر اس طرح تبصرہ کرنا پسند نہ آیا۔ دوپٹہ جھاڑتے ہوئے چارپائی سے اتریں صبیحہ سے بولی۔

"باتیں ہی کئے جائے گی۔ جلدی کر تجھے کہا نہیں پانی بند ہونے کو ہے۔"

"اچھا اماں اچھا۔ غصے نہیں ہوتے۔" صبیحہ نے پیار سے منہ بنا کر ماں سے کہا، تو رشیدہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

ربیعہ ساگ کی ٹوکری اٹھائے باورچی خانے میں چلی گئی۔ کونے میں لگے نلکے تلے ٹوکری رکھ کر ہانڈی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ابا آج بڑا عمدہ گائے کا گوشت لائے تھے۔ ساگ بھی لے کر دے گئے تھے۔ ساگ بڑے بیٹے طاہر کو بہت مرغوب تھا۔ رفیق صاحب کو بڑا بیٹا کچھ زیادہ ہی عزیز تھا دو بیٹیوں اور تین بیٹوں پر ہمیشہ اسے ترجیح دیا کرتے تھے۔

رشیدہ کبھی کبھی ٹوکتی۔

"اتنا سر پر نہ چڑھاؤ جی اسے۔ ذرا رعب و دبدبہ بھی رکھا کریں اس پر آپ کی شہ ہوتی ہے۔ میری تو سنتا ہی نہیں۔"

رفیق مسکرا دیتے کہتے۔

"خدا کا شکر ادا کیا کرو بھاگوان۔ اتنا اچھا بیٹا خدا نے دیا ہے۔"

"سارے ہی اچھے ہیں۔" وہ کہتی۔

"لیکن طاہر زیادہ ہی اچھا ہے۔" وہ مسکرا کر کہتے۔ رشیدہ بی بی جی میں خوش ہوتی لیکن بظاہر منہ بنا لیتی۔ "آپ کی وجہ ہی سے پڑھنے لکھنے میں

دلچسپی نہیں لیتا۔"

"نہ لے ۔!

"کیا کرے گا۔؟

"دکان ہے اپنی ۔ بٹھالوں گا دکان پر۔ میرا کام بھی تو سنبھالنا ہے کسی نے۔"

"کام بڑا لاکھوں کا ہے جو سنبھالے گا وہ۔ میں کہتی ہوں یہ بات اس کے دماغ میں نہ ڈالیں۔ ایم اے کر لینے دیں۔"

"ایم اے کر کے کیا کر لے گا۔ کلرک ہی بھرتی ہوگا۔ اس سے زیادہ تو دکان پر کما لے گا۔"

"اچھا اچھا آپ رہنے دیں ۔ میں نے نہیں بنانا اسے دکاندار۔"

"دکاندار کی بیوی ہو ماں۔"

"بھئی نہ کریں یہ باتیں۔ پڑھنے دیں اسے پہلے۔"

"میں کونسا منع کرتا ہوں ۔ وہ تو تمہاری بات کا جواب دیا ہے کہ نہ پڑھ سکا تو اپنی دکان تو ہے ہی۔ کپڑے کی دکان ہے وہ محنت کرے تو کپڑے کی فیکٹری لگا سکتا ہے۔"

اکثر میاں بیوی میں ایسی باتیں ہوا کرتیں۔ طاہر کا مستقبل زیر بحث ہوتا۔ ماں کسی طور حامی نہ تھی کہ اس کا بیٹا معمولی سا دکاندار بنے۔ پڑھ لکھ کر بڑا افسر بنے ہر ماں کی طرح رشیدہ کی بھی خواہش تھی۔ رفیق زمانے اور تجربے کی بھٹی سے گزرے تھے اس لئے سچی اور کھری بات کرتے تھے۔ اپنی طرف سے محنت کرتے تھے۔ جو نصیب میں تھا ملتا تھا۔

لیکن

رشیدہ جانتی تھی تھوڑے سے سرمائے سے کاروبار بھی ٹکا چال ہی چلتا ہے بمشکل ہی گزر بسر ہوتی ہے اپنے طبقے کے سینکڑوں لوگوں سے اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔ پھر بھی شمار خوشحال لوگوں میں تو نہیں ہوتا تھا بیٹوں کو تعلیم دلانا بیٹیوں کی شادیاں کرنا گھر کے چھوٹے بڑے اخراجات سے نپٹنا مشکل ہی نظر آتا تھا۔

خدا کا شکر ادا کرتی تھی کہ گھر اپنا تھا شہر کے اندرون گلیوں میں تھا یہ گھر بھی اچھا تھا چھ مرلے زمین پر دو منزلہ عمارت شاید تیس چالیس سال پہلے بنی تھی ۔ دو کمرے اوپر کی منزل پر تھے۔ تین نچلی میں۔ باورچی خانہ غسل خانہ نچلی منزل ہی میں صحن میں ایک طرف بنے ہوئے تھے۔ بجلی پانی اور گیس آجانے سے بڑی سہولت تھی۔ دو گلیاں پڑتی تھیں میں بازار آ جاتا تھا۔

زندگی کی ہر ضرورت کا سامان اس بازار سے مل جاتا تھا۔ سبزی گوشت کریانہ سبھی کچھ تھا۔ ہارڈویر کی دکانیں بھی تھیں۔ کپڑے جوتوں کی بھی۔ ڈاکٹر بھی تھے۔ کیمسٹ بھی ۔ نانبائی حلوائی سبھی کی دکانیں تھیں۔ بیکری بھی کھل گئی تھی۔ بھرا پرا بازار تھا کسی چیز کی ضرورت ہوئی جھٹ سے آ گئی۔ اس محلے میں رہتے ہوئے یہ تو آرام تھا۔ گو بچے خاص کر طاہر ناک منہ چڑھاتا تھا۔

گلیوں کی رہائش پسند نہیں تھی۔ شہر کے اضافی علاقوں میں دھڑا دھڑ

کوٹھیاں بن رہی تھیں۔ لوگ شفٹ کرتے جا رہے تھے وہ بھی چاہتا تھا ایسے علاقے میں جا بسے۔

جب بھی میں ماں سے کہتا وہ فٹ سے جواب دیتی۔

"پڑھ لکھ بڑا افسر بن۔ پھر ایسی ہی کوٹھیوں میں رہنا ہم تو یہاں ہی رہیں گے۔ جو آرام یہاں ہے وہ دور ویرانوں میں رہنے سے کہاں۔"

صبیحہ بھی جب سے کالج گئی تھی۔ اس کو بھی ان گلیوں میں رہنے سے کوفت ہونے لگی تھی وہ بھی طاہر کی ہم خیال تھی۔

ربیعہ نے کبھی ان کی باتوں میں دلچسپی نہ لی تھی اسے پتہ تھا کہ زود بدیر بابل گھر چھوڑ ہی جانا ہے، گلیوں میں رہیں یا کشادہ بستیوں میں کیا فرق پڑتا ہے۔ میٹرک کے بعد وہ گھر بیٹھی تھی۔ اماں کا سارا کام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ شادی کے انتظار میں برس بیتتے جا رہے تھے۔ ایک جگہ منگنی چھوٹ گئی تھی نوشتہ تقدیر سمجھ کر صبر کر لیا تھا۔

ربیعہ نے ہانڈی میں ڈوئی چلائی۔ ساگ دھویا اور پھر گھی کے ڈبے کا ڈھکنا کھولا۔

"اماں۔"

"کیا ہے"

"گھی تھوڑا ہے۔"

"پہلے نہیں بتایا۔ آبا لے کر دے جاتے۔"

"ساگ اس گھی میں ٹھیک نہیں بنے گا۔ منگوا دے بازار سے۔"

"کون لائے گا۔؟"

"طاہر اوپر ہے۔"

"گھر پہ ہی ہے۔"

"ہاں اور کہاں جانا ہے اس نے۔ رسالے لئے پڑا ہے اوپر۔!"

صبیحہ جھاڑو اور پاپ لئے سیدھی ہوتے ہوئے شوخ نظروں سے اماں کو دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

"آج شگو گھر آئی ہوئی ہے ہوسٹل سے بھائی آج نیچے اترے گا تھوڑے ہی۔ رسالے تو بہانہ ہیں۔"

ربیعہ اس کی بات پر زیر لب مسکرا دی۔ اماں کے ماتھے پر دو ایک شکنیں آ گئیں۔ بڑبڑائیں۔

"کس برتے پہ، شگو میں دلچسپی لیتا ہے۔"

"کیوں اماں" ربیعہ نے جلدی سے کہا۔ "کیا کمی ہے طاہر میں۔"

"بیکار بیٹھا روٹیاں توڑتا ہے۔ اور۔!"

"مل جائے گی نوکری۔ کئی جگہ تو درخواستیں دے رکھی ہیں۔ پرائیوٹ فرم میں تو کام کر ہی رہا ہے۔"

"کیا ملتا ہے؟ جیب خرچ بھی پورا نہیں ہوتا اس کا۔"

"کوشش میں تو لگا ہے۔ مل ہی جائے گی نوکری بھی۔" ربیعہ کے ساتھ صبیحہ بھی بھائی کی طرفداری کرنے لگی۔ پھر مسکرا کر بولی۔

"بھابی ہم نے شگو ہی کو بنانا ہے اماں۔ نہ رنگ ورنگ ہم نے نہیں

کرمے دینی۔ لاڈلی بھابی بنا کر گھر میں رکھیں گے۔"

"لو بھلا مجھے کوئی اعتراض ہے۔ شگو میرے مرحوم بھائی کی بیٹی ہے مجھے اس سے زیادہ کون عزیز ہوگا۔ لیکن جب تک اپنا بیٹا پاؤں پر کھڑا نہ ہو جائے۔ منہ سے کیسے نکالوں کوئی بات۔"

صبیحہ ہنس کر بولی۔

"آپ نکالیں نہ نکالیں۔ ان دونوں میں دوستی خوب ہے۔"

ربیعہ بولی۔ "اب کی ہے۔ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کے اچھے دوست ہیں۔"

رشیدہ نے یونہی سر ہلایا۔ پھر صبیحہ سے کہا۔

"جاؤ طاہر کو بلا لاؤ۔ گھی لے آئے۔"

"آپ آواز دیں نا۔ اوپر ہی ہے۔"

رشیدہ نے جنگلے کی طرف منہ کر کے آواز دی۔

"طاہر۔ او طاہر۔!"

طاہر درمیانی دروازے میں کھڑا برابر والے گھر کی چھت پر کھڑی شگو سے باتیں کر رہا تھا۔ ماں کی آواز سنی تو جھٹ سے پلٹا اور لکڑی کے جنگلے سے آدھا دھڑ لٹکاتے ہوئے بولا۔

"کیا ہے اماں۔"؟

"نیچے آ۔!"

"کیوں۔؟"

"گھی لادے بازار سے۔"

"اوہ خدایا۔ اب میں برتن پکڑ کر گھی لینے جاؤں گا بازار سے۔"

"کیا ہو گیا۔ شان کم ہو جائے گی کیا۔"؟

وہ بڑبڑاتا ہوا پھر درمیانی دروازے کی طرف گیا۔ شگو سے معذرت کی اور سیڑھیوں سے دھڑ دھڑاتا نیچے آگیا۔

صبیحہ اور ربیعہ دونوں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرا دیں۔

اماں اندر گئی اور پیسے نکال لائی۔

طاہر بادل نخواستہ گھی لینے بازار چلا گیا۔ یہ کام اسے اپنی آن شان کے خلاف لگتا تھا۔ لیکن اماں کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ ایک ہی سانس میں بے نقط بھی سنا ڈالتی تھیں۔

خوبصورت سمارٹ ایم اے پاس لڑکا تھا۔ ذہن کی اڑان بہت اونچی تھی اوپر ہی اوپر اڑنا چاہتا تھا لیکن اماں ہمیشہ ہی اسے پاؤں زمین پر ٹکانے پر مجبور کر دیتی تھی۔

" اے امّاں " وہ چارپائی پر امّاں کے زانو پر سر رکھے بیٹی تھی ۔ امّاں کے بالوں میں تیل ڈال رہی تھی ۔

" ہاں " اماں ہولے ہولے مالش کرتے ہوئے بولی ۔

" تم نے میرا نام شگفتہ کیوں رکھا تھا " شگو نے لطف آمیز غنودگی محسوس کرتے ہوئے کہا ۔

" کیوں بُرا نام ہے کیا " اماں نے اس کے چہرے سے بال ہٹا کر جھکتے ہوئے پیار سے شکوہ کیا ۔

" بُرا نہیں تو اچھا بھی نہیں ۔ اتنا پرانا نام ہے ۔ ذرا بھی اچھا نہیں لگتا مجھے "

" تجھے اچھا کیا لگتا ہے ۔ نہ تو تجھے یہ گھر اچھا لگتا ہے ۔ نہ ۔ گھر ۔ والے ۔ ! "

" آں ہاں ہاں ۔ دیکھو اماں زیادہ نہ کرو ۔ مجھے یہ گھر واقعی اچھا نہیں لگتا ۔ گھر نہیں کہنا چاہیے ۔ مکان ۔ ہاں مکان ۔ بالکل اچھا نہیں لگتا ۔ دیکھو نا کتنا پرانا ہے ۔ ایک تو پرانا اور چھوٹا اس پر برسوں مرمت نہیں ہوتی دیواریں

ہیں تو بے رنگ چھتیں ہیں تو دھواں کھائی ۔ فرش ہیں تو زخمی "

اماں کو اس کی بات پر ہنسی آگئی ۔ زخمی فرش شاید انہوں نے پہلی بار سنا تھا ۔ شگو بھی مسکرانے لگی ۔ بولی ۔

" غلط تو نہیں کہہ رہی ۔ خود دیکھو نا ۔ پھر یہ مکان واقع کہاں ہے گلیاں در گلیاں ہیں ۔ گندی گندی گلیاں ۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں ۔ نالیاں کوڑے اور پانی سے بھری رہتی ہیں ۔ ہر وقت سڑاند سی اُٹھتی رہتی ہے ۔ یہ کوئی جگہ ہے رہنے کی ۔ اور پھر سامان دیکھو ذرا ۔ پتہ نہیں دادا ابّا کے وقت ۔ ! "

" اے ہے ۔ میرے جہیز کا ہے سارا سامان ۔ دادا بانٹ گئے تھے سب کچھ اپنی زندگی میں ۔ یہ برآمدے میں جو ڈولی پڑی ہے نا ۔ صرف یہ ایک شے ہمارے حصے آئی تھی ۔ بیٹیوں کے گھر بھر گئے تھے یہ دونوں پلنگ یہ سنگار میز ۔ یہ کرسیاں سب میرے جہیز کی ہیں "

" کم از کم پچیس سال پرانی ۔ ! " شگو نے قہقہہ لگایا ۔

" پرانی تو ہونا ہی تھیں ۔ پچیس برس سے استعمال ہو رہی ہیں "

" ابّا نے کوئی شے نہیں بنائی تھی ۔ کچھ نہیں چھوڑا تھا "

اماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری ۔ پھر اسے دیکھ کر بولی ۔

" تجھ جیسی بلا جو چھوڑ گیا تھا "

شگو نے لاڈ سے منہ بنایا ۔ " تو میں بلا ہوں "

" اور نہیں تو کیا "

"آپا بلا نہیں تھی۔"

"وہ بیچاری کیا بلا ہوتی۔ سیدھی سادھی۔"

"اتنا سیدھا سادا بھی نہیں ہونا چاہیئے اماں۔ اسی لیئے تو آپا کا یہ حال ہے سسرال میں۔"

"کرے بھی کیا بیچاری۔"

"شادی ہی نہ کرتی ایسی جگہ۔"

اماں نے شگو کی طرف گھور کر دیکھا۔ شگو ہنس پڑی بولی۔

"سیدھی سادی تھی نا اسی لیئے بڑی سادگی سے فریب کھائے جا رہی ہے۔"

"اور کیا کرے۔"

"چھوڑ دے سب کو۔"

"بس کر۔ اپنی سوجھ بوجھ اپنے پاس ہی رکھ کر۔ چار بچے ہیں اس کے۔ بچے زنجیر ہوتے ہیں۔ زنجیر۔!"

"ہوں۔!"

"اور چھوڑ کے آئے کس برتے پر۔ کونسا باپ کمائی کرنے کو بیٹھا ہے یا کوئی بھائی ہی ہے۔ جو سہارا دے سکتا ہے۔ بیوہ ماں پر بوجھ بنے کیسے وہ تو مہینے دو مہینے کے بعد بھی آئے تو ایک دن سے زیادہ نہیں ٹکتی۔"

"دیکھو اماں۔ یہ کوئی جواز نہیں۔ نہ ہی اس بات پر کڑھنے کی ضرورت ہے۔ کہ باپ نہیں بھائی نہیں۔"

"تو کون ہے جو۔"

"میں۔ صرف تین ہفتے رہ گئے ہیں امتحان میں۔ پاس ہوتے ہی نوکری مل جائے گی۔"

"نوکری نہ ہوئی خزانہ ہو گیا۔ جو خود بھی لوٹے گی اور دوسروں کو بھی لٹائے گی۔ ہوں۔ نرس کو تنخواہ ہی کتنی ملتی ہے اور۔!"

"آہا۔!" شگو نے سر ادھر ادھر ہلایا پھر بولی۔

"ڈاکٹر بننا تھا نرس بن جاؤں گی۔"

"چلو یہ بھی غنیمت ہے۔"

"سخت غصہ آتا ہے مجھے۔ لیکن۔ میں بھی۔!"

"کیا"؟

"بڑے اونچے اونچے ہیں پلان میرے۔"

"بس کرو شگو۔ کبھی تو کام کی بات کیا کرو۔ اپنے آپ میں رہا کرو۔ جو لوگ اپنا آپ بھول جاتے ہیں نا وہ خطا کھاتے ہیں۔!"

"خطا نہیں کھاتے اماں۔ اپنے آپ کو بھول کر اپنے آپ کو نیا انداز بخشتے ہیں۔ سرتاپا بدل دیتے ہیں اپنے آپ کو۔ وہ کیا تھے۔ کوئی شناخت نہیں کر پاتا۔"

پھر وہ ہنس کر بولی۔

"جیسے میں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کہ میں غریب لڑکی ہوں۔ یا میرا گھر یہ ڈربہ نما پرانا اور بوسیدہ مکان ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے اماں۔ میں ہوسٹل

سے آ رہی تھی نا۔"

"ہاں"

"بس میں جتنی سواریاں تھیں، سب سمجھ رہی تھیں کہ میں شاید پہلی بار بس میں سفر کر رہی ہوں۔ موٹروں کاروں والے سمجھ رہے تھے مجھے۔"

اماں نے ایک گہرا سانس لے کر شگو کو دیکھا اور بولی۔

"اللہ کرے تجھے ایسا ہی گھر ملے جہاں راج کرے راج"

شگو ہنس کر بولی۔ "ملے گا کہاں سے اماں — میں خود بناؤں گی سب کچھ —!"

اماں نے بیزاری سے اسے دیکھا اور بولی۔

"چل اب اٹھ میری انگلیاں تھک گئی ہیں"

"نہیں اماں — اور ملو — اتنا مزہ آ رہا ہے۔ تمہارے پیارے پیارے ہاتھ میں دبا دوں گی"

"شگو مجھے اور بھی کام کرنا ہیں ابھی"

"مثلاً"

"تیرے کپڑے دھونا ہیں — ڈھیر بنا کر اٹھا لاتی ہے — یہ نہیں کرتی وہیں دھو لیا کرے۔ سرف کا ڈبہ تو تمہارے پاس ہوتا ہی ہے"

"دیکھو اماں" وہ اٹھ کر بال سمیٹتے ہوئے بولی۔ "دو جوڑے تو کل ہیں میں خود دھو لونگی نا — یہاں دھولوں تو کوئی بات نہیں — لیکن ہوسٹل میں دھونے کو کبھی نہ کہنا"

"کیوں"

"وہ — اماں — میں نے سب سے کہہ رکھا ہے نا — کہ گھر پہ دو نوکرانیاں ہیں —!"

"اچھا — تو — مجھے تو —!"

اس نے ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا پھر بیٹھے بیٹھے ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر جھومتے ہوئے بولی۔

"بھرم بنا رکھا ہے اماں — کہ ہمارے ہاں کام کے لیے دو دو نوکر ہیں"

"پتہ نہیں تیرا یہ پاگل پن کب ختم ہوگا۔ شگو بیٹی حقیقت سے آنکھیں چرانے والے کبھی چین و سکون سے زندگی نہیں گزار سکتے — تو جو ہے وہی اپنے آپ کو سمجھا کر"

"میں جو ہونا چاہتی ہوں — وہ کیوں نہ سمجھوں — بتا اماں اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اگر میں اپنی روم میٹس یا کورس میٹس پر یہ تاثر ڈالتی ہوں کہ میں اچھے خاصے اونچے گھرانے کی لڑکی ہوں تو اس میں تمہارا کیا بگڑتا ہے۔ کونسا وہ لڑکیاں تحقیق کرنے آ جاتی ہیں۔ خدا نے شکل اچھی دی ہے کپڑے اچھے پہنتی ہوں۔ رکھ رکھاؤ اچھا ہے۔ تو بتاؤ تمہیں کیا تکلیف ہوتی ہے"

"مجھے تو جو ہوتی ہے سو ہوتی ہے شگو — کل کو تجھے ان باتوں سے ضرور تکلیف ہوگی۔ خیالی دنیا میں رہنا چھوڑ دے"

"میں خیالی دنیا میں بالکل نہیں رہتی اماں" وہ چارپائی سے اٹھتے ہوئے بڑے تیکھے اور تلخ لہجے میں بولی۔

اماں چپ چاپ اس کا منہ تکنے لگی۔

شگو بڑبڑائی۔ "ہفتے میں ایک دن گھر گزرتا ہے وہ بھی تلخ ترش باتیں سنتے ہوئے۔ تمہاری کشش ہی کھینچ لاتی ہے اماں ورنہ۔ میں تو چھٹی بھی ہوسٹل ہی میں گزار لیا کروں۔"

"شگو" اماں روہانسی ہو کر بولی۔

"بیٹی تقدیر نے تمہیں ایک غریب گھر میں پیدا کیا ہے۔ تیرے خیالات اتنے اونچے ہیں۔ کہ مجھے بعض اوقات خوف آنے لگتا ہے۔ اتنی اونچی اڑان۔ نہ۔ !"

"اماں" وہ بالوں کے سرے ہتھیلیوں سے ملتے ہوئے بولی۔

"مجھے تم لوگوں پر کبھی غصہ آتا ہے اور کبھی رحم۔ اونچی اڑانوں کے خیال ہی سے تم لوگ خوفزدہ ہو جاتے ہو۔ اسی لئے تو ان بند تاریک اور ٹوٹے پھوٹے صدیوں پرانے ڈربوں میں زندگی مر مر کر گزار جاتے ہو۔ آپا پر بھی مجھے اسی لئے غصہ آتا ہے۔ سوچ ہی اتنی محدود ہے تم لوگوں کی۔ تقدیر کے آگے ہتھیار ڈالنے میں بہت تیز ہو۔ اماں تقدیر انسان خود بناتا ہے"

اماں نے کوئی جواب نہ دیا۔

وہ خود ہی بولی۔ "میں اپنی تقدیر خود ہی بناؤں گی اماں۔ مجھ میں حوصلہ ہے عزم ہے۔ میں تم لوگوں کی طرح ہتھیار پھینک کر سرنگوں کرنے والی نہیں سن لو اماں۔ میں آپا نہیں بنوں گی۔ کبھی نہیں بنوں گی۔"

اماں چارپائی سے اٹھی۔ تیل والی کٹوری ہاتھ میں پکڑے پکڑے بولی۔

"پچھلے ہفتے کے کپڑے دھوئے رکھے ہیں۔ استری کر لے۔ بعد پھر نہانا سر دھونا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ تیل پڑا رہنے دے بالوں میں۔"

"کہاں ہیں کپڑے۔"

"اندر پڑے ہیں چارپائی پر۔"

"شام کو کر لوں گی۔"

"ابھی کر لے فارغ ہی ہے۔"

"نہیں اماں۔ موڈ نہیں ہے اس وقت۔"

اماں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ پھر دعائیہ انداز میں بولی۔

"اللہ کرے تجھے دو دو نوکر ملیں۔ کبھی کام نہ کرنا پڑے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"فکر نہ کر اماں۔ ایسا ہی ہوگا۔ اگلے گھر جاؤں گی ہی تب۔ جب ان سب چیزوں کی ضمانت ہوگی۔ سمجھیں۔"

وہ پھر ہنس پڑی۔

اماں منہ ہی منہ میں کچھ کہتی ہوئی کٹوری رکھنے سامنے ہی غسل خانے کی طرف بڑھی۔ جو غسل خانہ کم اور ڈربہ زیادہ لگتا تھا۔ دروازہ ٹوٹا ہوا تھا فرش کئی جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ نل تلے برسوں پرانی زنگ آلود بالٹی پڑی رہتی تھی جگہ جگہ سے قلعی جھڑی دیوار پر دو کھونٹیاں لگی تھیں۔ کونے میں ایک طاقچہ تھا جس میں صابن کنگھی تیل کی کٹوری اور دنداسے کی ڈبی پڑی رہتی تھی۔ شگو جب آتی اپنا برش ٹوتھ پیسٹ اور امپیریل لیدر ساتھ لے آتی۔ اس پرانے گرد آلود طاقچے

میں یہ چیزیں رکھتے ہوئے وہ بڑی ناگواری محسوس کرتی ۔

ناگواری تو وہ اس گھر میں داخل ہوتے ہی بے طرح محسوس کرتی گھٹن کا احساس ہوتا نرسز ہوسٹل میں رہتے ہوئے اس کا دماغ کچھ اور خراب ہو گیا تھا اس ہوسٹل کی عمارت نئی بنی تھی۔ گو تین تین لڑکیوں کے لئے ایک کمرہ تھا۔ لیکن تھا روشن ہوادار چپس کے فرشوں والا۔ باتھ روم بھی نئے تھے ۔ فلش سسٹم تھا۔ واش بیسن آئینے کموڈ سب کچھ جدید طرز کا تھا پھر کتنا بڑا لان تھا عمارت کے سامنے۔ طویل برآمدے تھے ۔ ڈائیننگ ہال تھا کرسیوں اور میزوں پر کھانا کھایا جاتا تھا۔ مشترکہ لاؤنج بھی تھا جس میں سب سے بڑی بات کہ ٹی وی بھی مہیا کیا گیا تھا۔ ٹی وی اس کی معلومات کا بہترین ذریعہ تھا۔

اس ہوسٹل میں رہتے رہتے وہ اس سیلن زدہ گلیوں کے گھٹے گھٹے ماحول میں واقع گھر سے دور ہو گئی تھی۔ واقعی ماں کی کشش نہ ہوتی تو اس گھر میں کیا ہی کیا تھا ؟

کھانا کھانے کے بعد کچھ لڑکیاں لان میں چلی گئیں تھیں۔ کچھ اپنے کمروں میں۔ شگو اپنی سہیلیوں کے ٹولے میں لاؤنج میں بیٹھی ڈرامہ دیکھ رہی تھی ڈرامہ کچھ بور قسم کا تھا۔

ریما بولی۔ " کیا دیکھ رہی ہو شگو۔ اتنا بور ڈرامہ ہے۔"

" دیکھو بھئی " شگو بولی " پہلی بات ۔ !"

" کیا " عصمہ نے پوچھا۔

صبو بھی ادھر متوجہ ہو گئی۔ کامنا نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ شگو کی شخصیت کچھ ایسی مرعوب کن تھی۔ کہ بات کرتی تو سب اسے سننا جیسے فرض سمجھنے لگتیں۔

اس مرعوبیت کی وجہ سے وہ قصے قصیدے ہی تھے نا۔ جو شگو اپنے اپنے خاندان اور گھر والوں کے متعلق انہیں سنایا کرتی تھی۔ اک مفروضہ سی دنیا کے حصار میں اس نے اپنے آپ کو گھیر رکھا تھا۔ مفروضہ۔ جس کا حقیقت

کی دنیا سے ذرہ بھر بھی ناطہ نہ تھا۔

"ہاں کیا کہنے والی تھیں شگو" راحت بھی ڈرامے سے منہ موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"اب بتا بھی چکو۔!" عصمہ نے کہا۔ "خواہ مخواہ تجسس بڑھانے کی تمہیں عادت پڑ گئی ہے"

"بھئی ہم سب میں وہ معتبر بھی تو ہے"

"اے نہیں" شگو کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "معتبری کیسی جیسی تم ویسی ہیں"

"تمہاری یہی بات تو ہمارے دل میں تمہارے لئے احترام اور محبت پیدا کرتی ہے"

"سچی تم اتنی انکساری سے کام نہ لو— تو میں تمہارے قریب بھی نہ پھٹکوں"

"ٹھیک بات کہی ہے زہرہ نے"

"بات ڈرامے کی ہو رہی تھی— تھی نا؟" شگو بولی۔

"ہاں"

"ریما نے شاید کچھ کہا تھا"

"ہاں میں نے کہا تھا کہ بور ڈرامہ ہے"

"میرا نام کیا بلایا تھا۔؟"

"شگو— اور کیا کہنی شگو ہی کہا تھا"

"تو سن لو تم سب —!"

"کیا —!"

"آج سے ہمیں کوئی شگو نہیں کہے گا"

"کیوں"؟

"اور کیا کہیں گے"

"مس صاحبہ کہا کریں"

دو تین سہیلیاں بول اٹھیں۔

"با دولت" شگو نے بڑے ٹھاٹھ سے صوفے پر پھیلتے ہوئے کہا۔ "آج سے شگو کی جگہ شیگی کہلانا پسند فرمائیں گے"

"شیگی —!" کئی آوازیں ابھریں۔

"جی جناب" وہ اٹھلائی۔

"نام کس خوشی میں بدلا جا رہا ہے" زہرہ نے پوچھا۔

"بدلا نہیں— اس کا ذرا سا حلیہ تبدیل کیا ہے"

"شگو برا تو نہیں تھا"

"شیگی زیادہ ماڈرن لگتا ہے" وہ خود ہی ہنس پڑی۔

"واقعی —!" کچھ لڑکیوں نے اس کی تائید کی— لیکن ریما اور عصمہ نے اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔

"بھئی میں اپنی ممی سے جب بھی گھر جاتی تھی— خوب لڑتی تھی" شگو نے ہنس کر کہا۔

"کیوں —؟" لڑکیاں ڈرامہ بھول بھال کر اس کی باتوں میں مزے لینے لگیں۔

"بس مجھے شگو کہلانا پسند نہیں تھا۔"

"تمہارا پورا نام تو شگفتہ مجید ہے نا۔"

"اوہ۔ ہے تو شگفتہ اسی لئے تو ممی سے جھگڑتی ہوں۔ کتنا بور سا نام رکھ دیا تھا میرا۔"

"بور کیوں ہے جی اور پھر تمہارا پیار کا نام تو شگو ہے۔ کتنا اچھا لگتا ہے۔"

"مجھے پسند نہیں ہے ناں۔ ممی سے اس دفعہ تنگ آ کر کہہ دیا۔ جو کہلوانا پسند کرتی ہو بتا دو۔"

"مجھے شیگی اچھا لگا۔ ممی بولیں ٹھیک ہے۔ سب شیگی ہی کہا کریں گے۔"

"ایکدم غیر ملکی سا لگتا ہے۔" ریما نے منہ بنایا۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔" وہ بولی۔

"ویسے ایک بات پوچھوں شگو۔" عصمہ نے پوچھا۔

"شگو نہیں۔ شیگی۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"اچھا شیگی صاحبہ۔" عصمہ نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"تمہارے نام بدلنے کی سمجھ نہیں آئی۔ پھر غیر ملکی نام تمہیں زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ یہ بات تو احساس کمتری کی نشانی ہے۔ حالانکہ تم میں یہ بات نہیں۔ اچھے بھلے خاندان کی ہو۔ خوش شکل ہو۔ گھر بار اچھا ہے۔ تمہیں تو۔"

شگو ہنس پڑی۔

"بھئی اس میں کیا ہے۔ شگو شیگی ایک ہی نام کے مخفف ہیں مجھے شیگی اچھا لگتا ہے کہلانا۔ تمہیں کیا۔"

"ویسے ہی بات کر رہی تھی۔"

"بات کرنے کی ضرورت۔" راحت بولی۔

"ہمیں کیا اسے شیگی اچھا لگتا ہے۔ تو ہم شیگی کہہ دیا کریں گے۔ اس میں کوئی پیسے ویسے کا خرچہ تھوڑا ہے جو سوچ سوچ کر خرچ کریں گے۔"

سب راحت کی بات پر ہنس پڑیں۔

پھر پیسے کی باتیں ہونے لگیں۔ ریما اور عصمہ اچھے خاندان کی لڑکیاں تھیں۔ ریما کے دو بھائی خاصے کماؤ تھے۔ لیکن باپ کے مرنے کے بعد ماں اور بہن کی طرف سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ اسی لئے ریما نے بی اے ایم اے کرنے کی بجائے نرسنگ میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ اپنا اور اپنی ماں کا بار اٹھانے کے قابل ہونا چاہتی تھی۔ یہ باتیں اس نے کبھی کسی سے نہ چھپائی تھیں۔

عصمہ کے حالات ایسے تو نہ تھے۔ کھاتے پیتے گھرانے کی تھی ڈاکٹر بننے کا شوق تھا لیکن میٹرک میں نمبر اتنے آئے تھے کہ ایف اے میں میڈیکل کے مضامین لینا ممکن نہ تھا۔ اپنی اس حسرت کو پورا کرنے کے لئے اس نے امی ابو سے لڑ جھگڑ کر نرسنگ میں داخلہ لے لیا تھا نرسنگ کر کے ڈاکٹر بننے کی امید تھی، اس لئے اس نے یہ راہ اپنا لی تھی۔

باقی سب لڑکیاں غریب گھرانوں ہی کی تھیں۔ کسی کا باپ ڈرائیور تھا کسی کا سکول ماسٹر۔ کوئی آٹھ دس افراد کی فیملی کا فرد تھی۔ کوئی معمولی دکاندار کی بیٹی تھی۔ شگو بھی انہی کی طرح تھی۔ بلکہ ان سے کم تھی۔ ان کے گھروں میں تو باپ

—— بھائی تھے۔ شگو کی تو اکیلی ماں تھی جو جانے کیسے اپنا اور اس کا بار گھسیٹے جارہی تھی لیکن شگو نے اپنے اردگرد ایسی مضبوط خیالاتی دیواریں اٹھا رکھی تھیں کہ سب اسے امیر نہ سہی اونچے متوسط گھرانے کی لڑکی ضرور سمجھتی تھیں۔ اس کی باتوں اس کے لباس اور رکھ رکھاؤ سے بھی تو یہی تاثر ملتا تھا باتیں وہ ذہن سے گھڑلیتی تھی۔ لباس بہت حد تک لنڈے کو ذہانت سے دی گئی نئی صورت کا ہوتا۔

اماں تو مدتوں سے سلائی کڑھائی کا کام کر رہی تھیں ڈیزائن وہ خود کرتی تھی۔ رسالے دیکھ دیکھ کر پڑھ پڑھ کر اسے یہ شعور آگیا تھا۔ رکھ رکھاؤ وہ اپنی کاوش سے کرتی تھی۔ بال باقاعدگی سے کٹواتی۔ ناخنوں کو لمبے کرنا اور صاف ستھرا رکھنا اس کا مشغلہ تھا۔ پرفیوم اور ٹیلکم پاؤڈر بھی جیسے بن پڑتا وہ ضرور خریدتی۔ یہ چیزیں ان غریب گھرانوں کی لڑکیوں کے پہنچ سے بہت دور تھیں۔

آرٹیفشل جیولری بھی اس کے پاس کافی تھی۔ شام کے وقت وہ کپڑوں کے ہمرنگ یہ جیولری ضرور پہنا کرتی تھی۔

روزانہ شام نہا دھو کر وہ کپڑے ضرور بدلتی۔ انہی باتوں سے دوسری لڑکیاں مرعوب تھیں۔

ریما اور عصمہ کبھی کبھی اس کی باتوں سے الجھ جاتیں اور اکثر کوئی نہ کوئی سوال ایسا داغ دیتیں۔ جس سے اس کا بھرم کھل جانے کو ہوتا۔ لیکن وہ بھی اک کایاں تھی بڑی ہوشیار۔ بڑی حاضر دماغ۔ ان سوالوں کو بڑی خوبصورتی

سے گول کر جاتی اور کبھی بڑے گھماؤ دے کر جواب دیتی۔ اس طرح کہ انہیں کچھ کہنے نہ بنتی۔

پچھلے دن ہی کی بات ہے ریما عصمہ سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے تو یہ فراڈ لگتی ہے۔ بنتی ہے بڑے ماڈرن گھرانے کی اور رہتی ہے شہر کے اندر۔ گلیوں میں۔"

عصمہ نے ہنس کر کہا۔

"کیوں گلیوں میں ماڈرن لوگ نہیں رہتے۔ بھئی جن کے آبائی گھر ہیں وہ تو اپنے گھروں کو کسی طور چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے۔ اب ہمارے امی ابو کو دیکھو۔ زمین بھی لے رکھی ہے ایک کنال، ہمت کریں تو گھر بھی بن سکتا ہے۔ لیکن امی تو کسی طور راضی نہیں ہوتیں اپنا محلہ چھوڑنے کو۔ ہو سکتا ہے اس کے ساتھ بھی یہی بات ہو۔"

"ہاں بتاتی تو ہے کینٹ میں زمین خریدی ہوئی ہے، امی محلہ چھوڑنے پر رضامند نہیں۔"

"یہ بات تو ٹھیک کہتی ہے وہ۔ پرانے لوگوں کی پرانی باتیں ہیں اور بھائی وائی تو کوئی ہے نہیں اس کا۔ اکیلی ماں کیسے وہاں جا کر رہ سکتی ہے۔ محلے میں بڑا تحفظ محسوس کرتے ہیں ایسے لوگ۔"

"اس کی باتیں کبھی دھیان سے سننا۔ تو بہت کچھ جھلکتا نظر آتا ہے۔"

"ہاں میں نے بھی محسوس کیا ہے۔ اڑان اونچی ہے اس کی۔"

"ماں کو کبھی ممی کہتی ہے اور کبھی امی۔ گھر میں لگتا ہے اماں ہی کہتی ہوگی۔"

عصمہ نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"کسی دن پکڑیں گے اسے۔"

"ہاں"

اسی دن جب شگو اپنے خاندانی قصّے سنا سنا کر لڑکیوں کو مرعوب کر رہی تھی تو ریما نے ایک دم کہا۔

"بھئی تم اپنی ماں کو ممی کہتی ہو یا امّی۔"

"کیوں" وہ ایک دم بولی۔

"باتوں میں نہیں یاد نہیں رہتا۔ کبھی ممی کہتی ہو کبھی امّی۔"

"یاد کیوں نہیں رہتا بھئی" وہ حسب عادت قہقہہ لگا کر بولی۔

"میں ممی بھی کہتی ہوں اور امی بھی۔ ماما بھی آپو بھی۔ بس پیار سے جو جی میں آئے کہہ لیتی ہوں۔ میری امی تو خوش ہوتی ہے ایسی باتوں سے۔ ویسے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔"

سوال کرنے والوں کو لاجواب کر دینا اسے آتا تھا حاضر دماغی کی دولت خدا نے اسے فراوانی سے بخشی تھی۔ اسی دولت کی بدولت وہ اپنا بھرم ان لڑکیوں میں قائم رکھتی تھی۔

سہیلیوں سے اس نے شیگی کہلانے کا عہد لے لیا۔ یہی بات اس نے گھر پر بھی لاگو کرنا چاہی۔

"اماں مجھے شگو نہیں شیگی کہا کرو۔"

"چل ہٹ۔ تیرے دماغ میں نئے نئے فتور ہی آتے ہیں۔" اماں نے

جواب دے دیا۔

بڑی آپا سے کہا۔ "آپا میں اب شیگی کے نام پر پکاری جاتی ہوں شگو بدل کر میں نے شیگی اپنا نام رکھ لیا ہے۔"

"تیرا نام تو شگفتہ بانو ہے پیاری۔ شگو پیار کا نام ہے۔ یہ نام بدلو گی تو پیار کے جذبے مجروح ہوں گے۔ میں تو ہمیشہ شگو ہی کہوں گی۔"

پھوپھی زاد صبیحہ اور ربیعہ نے بھی یہی کہا۔

"شگو پیارا لگتا ہے۔"

اس نے دلیل دی۔

"لیکن یہ ماڈرن نہیں لگتا۔ شیگی میں جدیدیت ہے۔"

صبیحہ تو نہ مانی لیکن نئے پن کو اپنانے والی ربیعہ نے اس کو داد دی۔

"واقعی شیگی یوں لگتا ہے کسی امریکن لڑکی کا نام ہو۔ ٹھیک ہے شگو آئندہ سے تم شیگی۔"

صبیحہ نے منہ بنایا "ہرگز نہیں۔ کبھی نہ بدلنا نام۔ اس نام کے ساتھ ہماری جذباتی وابستہ ہے۔"

طاہر سے بھی اس نے کہا۔ "اے طاہر"

"کیا ہے شگو۔؟"

"اوں ہوں۔ شگو نہیں شیگی۔"

"کیا مطلب۔؟"

"میں نے اپنا نام بدل لیا ہے۔ شگو سے شیگی بن گئی ہوں۔"

طاہر نے حیرانگی سے اسے دیکھا وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرا دی۔ طاہر نے پوچھا "یہ کیا سوجھی تمہیں۔؟"

"بس یہ نام ماڈرن لگتا ہے۔ ماڈرن امیرانہ۔ فیشن ایبل سا۔!" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"شیگی۔!"

طاہر نے اس نام میں رومانیت اور موسیقی محسوس کرنے کی کوشش پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"شگو زیادہ پیارا زیادہ خوبصورت ہے"

"لیکن فرسودہ اور بیہودہ۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "ماڈرن نہیں"

"ہاں۔ ہاں تم ٹھیک کہتی ہو" طاہر نے جلدی سے کہا۔

وہ تو شگو کی ہر بات پر پسندیدگی کی مہر لگانے کا عادی تھا۔

"شیگی کہا کرو گے نا مجھے" شگو نے اس کی کمزوری جانتے ہوئے رعب سے کہا۔

"بالکل لیکن زبان پر چڑھتے چڑھتے چڑھے گا نا۔ بھول چوک معاف۔

"معاف۔!"

دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

یوں

شگو

کسی کے کھاتے میں شگو رہی اور کسی میں شیگی بن گئی۔

اٹھارہ انیس برس پہلے جب شگو نے جنم لیا تو مجید کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ بڑی بیٹی شائستہ کے بعد تین بچے ضائع ہو گئے تھے۔ اب شائستہ آٹھ برس کی تھی۔ تہمینہ اُمید سے ہوئی تھی۔ تو مجید اس کی اماں اور اس کی بہنوں رشیدہ اور حمیدہ نے کئی منتیں مانی تھیں۔

"خدا میرے بیٹے کو کوئی جیتا جاگتا جی دے دے" مجید کی ماں جھولی پھیلا پھیلا کر دعائیں کرتی تھی۔

"میں پیر بابا کی زیارت پر گھی کے چراغ جلاؤں گی" رشیدہ نے جیتے جاگتے بچے کے لئے منت مانی تھی۔

"بیٹا ہو یا بیٹی۔ تندرست اور عمر والا ہو۔ میں شاہ رحمان کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھاؤں گی"

حمیدہ نے عہد کیا تھا۔

مجید بھی اپنے طور پر دعائیں کرتا تھا۔ جہاں جہاں کوئی حاضری دینے

کا کہتا چلا جاتا تین مردہ بچوں کی پیدائش نے اسے ہولا دیا تھا۔ بچے کے ساتھ
ساتھ وہ تہمینہ کی صحت اور زندگی کے لئے بھی برابر دعائیں مانگتا تھا تہمینہ اس کی
بڑی پیاری خدمت گزار اور جانثار قسم کی بیوی تھی۔

اس دفعہ تو وہ بہت ڈر رہی تھی۔

"خدا مالک ہے تہمینہ — ہماری دعائیں وہ ضرور سنے گا۔ مجھے اس کے
گھر سے خیر پانے کی پوری امید ہے — تم سارے ڈر خوف دل سے نکال

"پتہ نہیں کیا ہوگا" ؟

تہمینہ اس کی تسلیوں کے باوجود خوفزدہ تھی۔

"ہسپتال میں بڑی ڈاکٹر کو دکھایا ہے — اس کی دواؤں اور ہماری دعا
سے سب ٹھیک ہوگا"

"اگر مجھے کچھ ہو گیا تو — تو شائستہ —" وہ رو دی۔

"ایسی بری بری باتیں منہ سے نہیں نکالو — تم ہمت نہ ہارو — ہم سے
جو کچھ ہو سکتا ہے کر رہے ہیں — دوائی باقاعدگی سے کھلا رہے ہیں دعائیں
مانگتے ہیں — منتیں مانی ہیں — اماں روز پانی دم کر کے تمہیں پلاتی ہے یہ سب
کچھ ہوتے ہوئے تمہیں کیسے کچھ ہو سکتا ہے تہمینہ — اللہ میاں اس دفعہ
تمہیں اپنی رحمت سے نوازے گا۔ پیارا پیارا۔ گم جی۔ گگ جی گول مٹول سا
بچہ دے گا تمہیں"

تہمینہ اپنے اندر حوصلہ پاتی۔

"ہم جی بھر کر خوشیاں منائیں گے تہمینہ — میں نے ابھی سے بچے

جمع کرنے شروع کر دیئے ہیں تمہاری ایک نہیں سنونگا۔ لڈو بانٹوں گا عقیقہ
کروں گا۔ دیکھ لینا پورا محلہ منہ دیکھے گا۔ ایسی یادگار خوشی مناؤنگا۔ ویسے
ایک بات بتا دوں ؟"

"کیا"

"یہ آنے والا ہے خوش بخت"

"کیسے معلوم ہوا تمہیں"

"اپنی دکان خوب چل رہی ہے"

"دکان کے چلنے سے اس کا کیا تعلق"

"ہے"

"کیسے — ؟"

"جب سے تم نے یہ خوشخبری سنائی ہے بکری میں اضافہ ہو رہا ہے تمہیں
خرچہ دے دلا کر بھی بیس پچیس روز بچا لیتا ہوں"

"سچ — !"

"ہاں — تمہیں بتانا تو نہیں تھا۔ لیکن شکل ایسی مسکینوں کی سی بنا لیتی
ہو — ترس آ جاتا ہے۔ سب کچھ بتا دیتا ہوں"

"اچھی بات ہے نا — !"

دونوں مسکرائے۔

مجید اسے حوصلہ دلانے کے لئے ایسی ہی باتیں کرتا۔ وہ سچ مچ ہی
دل سے سارے وہم اور وسوسے نکال دیتی۔ ایک گل گوتھنے سے بچے کا تصور

اسے سرشار کر دیتا۔

جس دن تہمینہ کو دردِ زہ شروع ہوئی مجید دکان بند کر کے گھر آگیا۔ بہت بے چین اور بڑا بیقرار تھا وہ۔ اپنے علاقے کی ہیلتھ وزیٹر کو بھی بلا لایا تھا تہمینہ اس کے پاس بھی معائنے کے لئے آتی جاتی رہتی تھی۔ کیس اس نے خود کرنا تھا۔

پورے چوبیس گھنٹے تکلیف میں گزار کر تہمینہ نے بچی کو جنم دیا جب ہیلتھ وزیٹر نے اسے جیتی جاگتی بچی کی خبر سنائی تو فرطِ مسرت سے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

رشیدہ نے دوڑ کر مجید کو بیٹھک میں جا کر بتایا۔

"بھائی مبارک ہو۔ بیٹی پیدا ہوئی ہے۔"

"ٹھیک ٹھاک"

"ہاں بالکل۔ اتنی موٹی تازی۔ بڑی پیاری۔"

"تہمینہ ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں"

"خدایا تیرا شگر ہے۔"

مجید نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے مجید کی اماں بھی جیتے جاگتے بچے کی خوشخبری اسے سنانے آئی خوش تو وہ بھی بہت ہوئی تھی۔ لیکن بیٹے کی آس لگائے بیٹھی تھی۔ بیٹی کا سن کر کچھ بجھ سی گئی تھی۔ مجید کے سر پر مشفقانہ انداز میں ہاتھ پھیرتے ہوئے

بولی۔

"اللہ میاں بیٹا دے دیتا تو خوشی اور بھی بڑھ جاتی۔ خیر۔!"

"اماں" مجید جذباتی لہجے میں بولا۔

"مجھے یہ بیٹی دس بیٹوں سے زیادہ پیاری ہے۔ خدا کا شکر ہے اس نے جیتا جاگتا کھلونا ہمیں دے دیا۔ شکر کرو اماں۔ شکر کرو۔ تین مردہ بچوں کے بعد یہ بچی پیدا ہوئی ہے۔"

"ہاں ہے تو خوشی کی بات۔ چلو اللہ بیٹا بھی دے گا" اماں اپنی پژمردگی دباتے ہوئے بولی۔ "ہاں سفر۔"

"جی اماں۔"

"تہمینہ کو نہ جتلانا۔"

"کیا۔؟"

"کہ بیٹا کیوں نہیں ہوا۔"

"اوہ اماں۔ آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ مجھے تو یہ بیٹی کہا ہے نا... بیٹوں سے بھی عزیز ہے۔ چھوڑیں یہ باتیں۔"

ہیلتھ وزیٹر اور دائی زچہ بچہ کو سنبھالنے کے بعد فارغ ہو کر کمرے سے باہر نکلیں۔ مجید بے تابی سے ان کی طرف بڑھا۔

"ماں بیٹی ٹھیک ہیں نا۔"

"بالکل۔!"

ہیلتھ وزیٹر نے اسے مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

مجید نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ دائی لالچی نظروں سے نوٹ دیکھنے لگی۔

"اس کی کیا ضرورت ہے" ہیلتھ وزیٹر نے نوٹ پکڑتے ہوئے کہا۔

"یہ کیس ہمارا تھا ہم نے کرنا ہی تھا"

"مٹھائی کے لئے جی" مجید بولا۔ پھر دوسرا نوٹ نکال کر دائی کو دیا۔ دائی نوٹ پکڑتے ہوئے بولی۔

"یہ صرف آج کی خوشخبری سنانے کا ہے۔ بی بی نہائیں گی تو میں اور لوں گی"

"ضرور۔ ضرور۔" مجید نے کہا۔ اور پھر کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں انہیں دیکھ سکتا ہوں"

"ضرور بخوشی" وہ بولی۔

مجید جلدی سے بھڑا ہوا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

تہمینہ بستر میں پڑی تھی۔ سر پر دوپٹہ باندھا ہوا تھا۔ رنگت بے حد پیلی پڑ گئی تھی۔ اس کے قریب ہی دوسری چارپائی پر چادر میں لپٹی پیاری سی بچی پڑی تھی۔ رشیدہ اور حمیدہ دونوں اس چارپائی پر بیٹھی بچی کے نقش ونگار کو جانچ پرکھ رہی تھیں۔

"آؤ بھائی آؤ۔ لو دیکھو اپنی ننھی سی بچی۔" حمیدہ نے بچی کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

مجید نے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا۔ پھر تہمینہ کی طرف آ گیا۔

"پہلے میں اپنی زوجہ کو تو دیکھ لوں۔ کیسی ہو تہمینہ۔ مبارک ہو۔ خدا نے چاند سی بچی دی ہے"

حمیدہ نے بچی مجید کے سامنے کر دی۔

"لو دیکھ لو نا۔"

مجید نے دیکھا۔ پیار امنڈ آیا۔ جی چاہا بچی کو بازوؤں میں بھینچ کر پیار کرے لیکن بڑی بہنوں کے سامنے ایسا نہ کر سکا۔ بچی کے گال کو انگلی سے چھو کر بولا۔

"بہت خوبصورت ہے۔ بالکل میری طرح ہے"

دونوں بہنیں ہنس پڑیں۔ حمیدہ بولی۔

"نین نقش ماں کے ہیں۔ سپید رنگت دادی پہ گئی ہے"

رشیدہ نے کہا۔ "رنگت کا ابھی کیا پتہ چلے گا۔ ویسے ہو گی گوری چٹی"

"کالا کون ہے اس خاندان میں"

حمیدہ نے اتراتے ہوئے کہا۔

"شائستہ سے زیادہ خوبصورت ہے۔" رشیدہ نے پیار سے اس کا گال چھوا۔

دونوں باتیں کرنے لگیں۔ مجید تہمینہ سے حال احوال پوچھنے لگا۔

"تم نے دیکھی ہے" اس نے ہولے سے تہمینہ سے پوچھا۔

"دیکھ لوں گی" وہ جواباً بولی۔ پھر آہستہ سے کہا۔

"اماں کو بیٹے کی تمنا تھی"

"ہمارے لئے یہ بیٹیوں سے بڑھ کر ہے۔ دیکھنا میں کتنی خوشیاں مناؤں گا۔ محلے میں لڈو بانٹوں گا۔ اور۔"

"ارے ارے" حمید نے فوراً ہی اس کی بات اچک لی۔

"کیا ارجیوں چھچھوروں والی باتیں کر رہے ہو۔ کبھی بیٹیوں کے بھی لڈو بانٹے ہیں کسی نے۔"

"کسی نے نہیں بانٹے نا۔ میں تو بانٹوں گا۔"

لڈو بانٹنے کی بات اماں تک پہنچی تو انہوں نے ناک پر انگلی رکھ کر آنکھیں پھیلائے ہوئے کہا۔

"ارے مجیدے۔ پاگل تو نہیں ہو گیا۔ مانا کہ تجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ لیکن لڈو کیسے۔ لڈو بیٹوں کے بانٹے جاتے ہیں۔ انتظار کر خدا نے اگلی دفعہ بیٹا دیا تو خوشی پوری کر لینا۔"

ماں اور بہنوں نے ہاہاکار مچادی۔ خوب سرزنش کی۔

اماں نے ٹوکا۔

"بیٹی پیدا ہوئی ہے ہوش مت سے خرچ کر۔ تو نے تو اس موٹی ڈاکٹرنی اور دائی کو بھی سو سو روپیہ لیے پکڑا دیا۔ جیسے انہوں نے بیٹا تیری گود میں لا ڈالا ہے۔ پیسے سنبھال کے رکھ۔ اب ایک نہیں دو بیٹیاں ہو گئیں ہیں تیری۔ بیٹی تو گھر میں آئی نہیں کہ ذمہ داریاں شروع ہو گئیں۔ کام آئیں گے انہی کے لئے سنبھال کر خرچ کر۔"

مجید بے چارہ چپ ہو گیا۔

لیکن

بیٹی اسے واقعی بیٹوں سے بڑھ کر پیاری تھی۔ وہ اسے بہت پیار کرتا تھا۔

"یہ بڑی خوش قسمت ہے تہمینہ۔ جس دن سے پیدا ہوئی ہے۔ پیسہ پانی کی طرح آنے لگا ہے۔"

"خدا کا شکر ہے۔"

"دیکھ لینا اسی سال میں یہ دکان خرید لوں گا۔"

"اللہ کرے۔"

شگو اس دن پورے ایک سال کی ہوئی تھی جب مجید نے دکان خرید لی۔

مجید کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ کاروبار میں برکت اسی ننھی سی بچی کی وجہ سے ہے۔ اسی لئے وہ اسے بہت پیار کرتا۔ دکان سے آتے ہی گود میں اٹھا لیتا۔ بازار لے جاتا۔ کھلونے اور مٹھائیاں لے کر دیتا۔

کبھی کبھی تہمینہ کہتی۔

"شائستہ کی طرف بھی دھیان دیا کرو۔ وہ بھی ابھی بچی ہے۔ تم تو شگو ہی کو سر چڑھائے جا رہے ہو۔ لاڈ و پیار جائز حد تک ہونا چاہیئے۔ بڑی ضد کرنے لگی ہے اب۔"

"اوہ بھلی لوک۔ یہ بچی میری قسمت کا ستارہ ہے چمکتا دمکتا۔ ویسے شائستہ کو بھی میں پیار کرتا ہوں۔ تھوڑے لاڈ پیار دیکھے ہیں اس کے جب اکیلی تھی اب شگو کو اس کا حصہ ملنا چاہیئے نا۔"

وہ دوسرے سال میں تھی کہ مجید نے تہمینہ کے لئے دس تولے کے کڑے

بنوائے۔ پھر اگلے سال پانچ پانچ تولے کے دو سیٹ بھی بنوا دیئے گھر میں پیسے کی وجہ سے جیسے بہار اتر آئی ہو۔ خوشیوں کا دور دورہ تھا۔ اب تو تہمینہ کو بھی یقین ہونے لگا تھا کہ شگو ہی نصیبے والی تھی۔ ماں باپ کی طرف سے لاڈ پیار میں اور اضافہ ہو گیا۔ چھوٹی سی بچی کو بھی اپنی اہمیت کا احساس ہو گیا تھا اس لیے جا بے جا ضدیں کرتی رہتی تھی۔ جو بات منہ سے نکالتی وہ پوری کرا کے ہی رہتی۔

لیکن

گھر میں چار سو ہنستی مچلتی خوشیاں دائمی نہ تھیں۔

آنگن میں اتری بہاریں عارضی تھیں۔

اس دن خلاف معمول مجید دوپہر ہی کو دکان بند کر کے گھر چلا آیا۔

اماں صحن میں پلنگڑی پر پڑی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی بولیں۔

"کیسے گھر آگیا مجید ے"

"اماں طبیعت کچھ خراب ہے"۔ وہ ہاتھ میں پکڑا مٹھائی کا لفافہ شگو کو دیتے ہوئے بولا۔

"کیا ہوا ابو۔؟" شائستہ نے پوچھا۔

تہمینہ باورچی خانے میں دوپہر کے لیے کھانا بنا رہی تھی۔ آواز سن کر صحن میں آ گئی۔

"خیر تو ہے۔؟" اس نے مجید سے پوچھا۔

مجید بارہ تیرہ سالہ شائستہ کو بستر ٹھیک کرنے کا کہتے ہوئے شگو کو بازوؤں میں بھر رہا تھا۔ تہمینہ اس کے قریب آکر بولی۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ اس لاڈ و پیار کے لئے اب تم دکان چھوڑ کر گھر آنے لگے ہو؟"

اماں اس کی جگہ بولیں۔

"طبیعت خراب ہے اس کی۔ اسی لئے گھر آگیا ہے۔"

تہمینہ نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے برآمدے میں پڑی چارپائی کی طرف بڑھا جس پر شائستہ نے کھیس بچھا کر تکیہ رکھ دیا تھا

"بخار ہو گیا ہے۔ سر درد ہے۔ پیٹ میں تکلیف ہے۔" تہمینہ پٹی پر بیٹھتے ہوئے بے تابی سے بولی۔

"پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہے۔ جی بھی متلا رہا تھا۔ اسی لئے گھر چلا آیا۔ تم جنگلی پودینے اور سونف کا قہوہ بنا دو ذرا۔"

"ابھی بنا دیتی ہوں۔"

وہ باورچی خانے میں گئی۔ شائستہ اپنی کتاب لے کر دادی اماں کے پاس جا بیٹھی۔

"ابا سر میں درد ہے۔" شگو اپنے منے منے ہاتھوں سے ابا کا سر دبانے لگی۔ مجید نے اس کے منے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر چوم لیا پھر اسے

اپنے سینے پر لٹاتے ہوئے بولا۔

"میری منی۔ میری رانی۔ میری شہزادی۔"

"ابا بڑی آپا کہتی ہے میں شہزادی نہیں ہوں۔"

"کیوں نہیں ہو۔ اتنی خوبصورت اتنی پیاری۔ شہزادی نہیں ہو تو کیا ہو۔"

"وہ کہتی ہے شہزادیاں محلوں میں رہتی ہیں۔ یہ گھر محل تو نہیں ہے نا ابا؟"

"میں تیرے لئے محل بنواؤں گا شہزادی۔ زمین خریدنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مل گئی تو سال دو سال میں یہ شاندار کوٹھی بن جائے گی۔"

"کوٹھی بنواتے رہنا۔ اٹھو پہلے قہوہ پی لو۔ اس لڑکی کا دماغ تم خراب کر کے ہی چھوڑو گے۔"

"بھلی لوگ کیوں خفا ہوتی ہو۔"

وہ چارپائی میں اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

شگو ابا کی شہہ پا کر بولی۔ "ابا اماں بھی کہتی ہے۔ میں شہزادی نہیں ہوں۔ ہوں نا۔"

"بالکل ہو۔ تمہاری اماں تم سے جلتی ہے۔"

"لیکن ابا میرا محل۔؟"

"بنوا دوں گا۔"

"پھر اس میں پریوں کا شہزادہ بھی آئے گا نا۔"

تہمینہ نے گھور کر مجید کو دیکھا۔ بچی کی بات سن کر بولی۔ "لو بنا لو اسے شہزادی شہزادہ بھی مانگے گی۔"

"اے ہٹو۔ بچی ہے۔ تم تو خواہ مخواہ اس کے پیچھے پڑ گئی ہو۔"

مجید مسکراتے ہوئے قہوے کے گھونٹ حلق میں اتارنے لگا لیکن دو چار گھونٹ لئے تھے کہ ابکائی آئی۔ وہ شگو کو چارپائی سے نیچے اتارنے اٹھا اور سامنے والے غسل خانے میں گھس گیا۔

تہمینہ اس کے پیچھے دوڑی۔ اماں نے بھی دھڑ اونچا کرتے ہوئے اسے دیکھا۔ "دیکھو تو شائستہ تمہارے ابو کو قے ہو رہی ہے۔"

"ہاں دادی اماں۔"

دادی اماں اٹھ بیٹھی۔ فکرمندی سے بیٹے کو دیکھا۔ جلدی سے بولی۔

"گھر آ گئے تھے کسی ڈاکٹر سے دوائی لے آتے۔"

"قہوہ دیا ہے اماں۔ الٹ دیا ہے سارا۔" تہمینہ بولی۔

مجید کو کافی بڑی قے آئی۔ صبح کا کھایا پیا نکل گیا۔ ہانپتا ہوا اٹھا ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے۔ بہت بے حال ہو گیا تھا۔ تہمینہ نے تولیہ دیا۔ وہ منہ پونچھتے ہوئے باہر نکل آیا۔

پھر شام تک اسے دوبارہ قے آئی۔ پیٹ میں بھی گڑبڑ ہوئی۔

اماں اور تہمینہ نے زور دیا کہ ڈاکٹر سے دوائی لے آئے لیکن اس میں تو اٹھنے کی سکت ہی نہ تھی۔ نڈھال اور بے حال ہو رہا تھا۔

"شائستہ" تہمینہ نے گھبرا کر بیٹی کو پکارا۔

"جی اماں۔"

"جاؤ رشیدہ کو بلا لاؤ۔ کسی کو دکان پر بھیج کر بھائی صاحب کو بلا دیں تمہارے ابا کی طبیعت زیادہ ہی خراب ہو رہی ہے۔"

رشیدہ ساتھ والے مکان ہی میں تو رہتی تھی۔ چھت پر دیواریں آنے

جانے کے لئے بیچ در کا دروازہ بنا ہوا تھا۔ شائستہ دوڑ کر اوپر گئی اور رشیدہ کو بلا لائی۔

بھائی کی حالت دیکھ کر وہ گھبرا اٹھی۔ جلدی سے اپنے نو دس سالہ بیٹے طاہر کو دکان پر ابو کو بلانے کے لئے بھیجا۔ ملیحہ اور ربیعہ بھی بھاگی آئیں۔

دکان سے رفیق دوڑا آیا۔ مجید کو دیکھا اور الٹے پاؤں ڈاکٹر لینے چلا گیا۔

شام ڈھلے ڈاکٹر آیا۔ مجید کو دیکھا دوائیاں لکھیں انجکشن دیا اور کھانے پینے کے متعلق ہدایات دے کر فیس لی اور چلتا بنا۔ جاتے جاتے کہہ گیا کہ طبیعت نہ سنبھلے تو فوراً اسے اطلاع دی جائے۔

ان دنوں شہر میں ہیضے کی وبا پھوٹ رہی تھی۔ اکا دکا کیس ہو رہے تھے۔ مجید بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ تہمینہ کے تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ رہے تھے رشیدہ اور رفیق ہی اسے سنبھال رہے تھے۔

"بھائی حوصلہ رکھو۔ دوائی سے افاقہ ہوگا۔ ٹھیک ہو جائیں گے بھائی۔"

رفیق اور رشیدہ خود بھی متفکر تھے۔ لیکن تہمینہ کو بھی حوصلہ دے رہے تھے۔

رات اتر رہی تھی۔ بڑی تاریک بڑی منحوس۔ رفیق دوبارہ ڈاکٹر کو بلا لایا۔ دوائیں بدلی گئیں پھر بھی افاقہ نہ ہوا۔ مریض کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ رفیق بھاگم بھاگ دوسرا ڈاکٹر لے آیا۔ پھر ہسپتال سے سول سرجن کو لے آیا۔

لیکن

ساری دوڑ دھوپ اور کوششیں نوشتۂ تقدیر کو بدل نہ سکیں۔ انسان مستقبل کے لئے بہت کچھ سوچتا ہے۔ بڑے پلان بناتا ہے۔ بڑے منصوبے ترتیب دیتا ہے

لیکن مستقبل میں جھانک کر دیکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ وارد ہونے والے لمحے کی خبر نہیں ہوتی کہ یہ لمحہ اس کے پلانوں اور منصوبوں کے ہم آہنگ ہو کر گزرے گا بھی کہ نہیں۔

مجید کے ذہن میں بھی کئی پلان تھے۔ کئی منصوبے تھے۔

لیکن

فرشتۂ اجل نے اسے اچک لیا۔

پو پھٹ رہی تھی۔ دنیا اندھیرے کے چنگل سے نکل کر آفتاب کی منو باریوں سے منور ہونے کے لیے بڑھ رہی تھی کہ مجید نے دم توڑ دیا۔

ایک ہنستا بستا گھر پل بھر میں اندھیرے کی نحوستوں میں ڈوب گیا مقدر سیاہ ہو گئے اور مستقبل کی اندھی اندھیری راہوں میں تہمینہ دو بچوں کے ساتھ بھٹکنے کے لیے اکیلی رہ گئی۔

اک قہر مچ گیا۔ گلی محلے والے دوڑے آئے۔ عزیز و اقارب بھاگم بھاگ پہنچے لیکن سوائے انسان کی بے بسی پر آنسو بہانے کے کچھ نہ کر سکے۔

تہمینہ تو پاگلوں کی مانند ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی زور زور سے چیخنے لگتی۔ کبھی خاموش ہو کر چپ سادھ لینے والے مجید کو ٹکر ٹکر تکتی۔ صدمہ اتنا غیر متوقع اور یقینی تھا کہ حواس سے ہم آہنگ ہو ہی نہ رہا تھا۔

بوڑھی ماں بھی غم سے جیسے سکتے کی کیفیت سے دوچار تھی۔ کچھ کہہ رہی تھی نہ پوچھ رہی تھی دم بخود سی اک کونے میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ رشیدہ حمیدہ کی آہ وفغاں سے در و دیوار ہل رہے تھے۔ شہر کے پرے حصے میں بسنے والے دونوں بڑے بھائی بھی آ گئے تھے۔

غمزدوں کو تسلیاں دیتے ہوئے خود بھی بے تحاشہ روئے جا رہے تھے۔ گھر لوگوں سے بھر گیا تھا۔ گلی میں دری بچھا دی گئی تھی۔

شام جنازہ اٹھنا تھا۔ روانگی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ رفیق اور بڑے بھائی ہی سب کچھ کرتے پھر رہے تھے۔ زندہ انسان برسوں اپنوں میں رہتا ہے لیکن جب حیات سے ناطہ ٹوٹ جائے تو اپنوں ہی کو جلدی پڑی ہوتی ہے۔ کفن سیا جا رہا ہوتا۔ نہانے دھلانے کی تیاریاں ہو رہی ہوتیں۔ میت کو جلد از جلد قبر میں اتار کر مٹی سے ڈھانپ دینے کے لیے بیقراری ہوتی ہے سانس کی ڈوری ہی میں تو رشتوں ناطوں کی کڑیاں پروئی ہوتی ہیں۔

انسان بھی عجب سخت جان ہے بڑے سے بڑا صدمہ بھی سہہ جانے کی صلاحیت رکھتا ہے کرب کے ان لمحوں کی اذیت بھی سہہ کر زندہ رہتا ہے جن کا تصور کرتے ہوئے بھی موت کی خنکی اپنے اندر اترتی محسوس کرتا ہے لیکن حقیقت میں جب ان سانحوں سے دوچار ہو کر زندہ رہتے ہوئے جھیل لیتا ہے سب اذیت سارے درد۔

جنازہ اٹھا تو اک کہرام سا مچ گیا اپنے کیا بیگانے بھی دھاڑیں مار مار کر روئے۔ شائستہ تو کچھ سمجھدار تھی۔

ابو سے لپٹ لپٹ کر روئے گئی۔ لیکن شگو کو کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ وہ گھبرائی گھبرائی سارے گھر میں پھر رہی تھی۔ کبھی ابا کی چارپائی کے پاس آ کر حیرانگی سے اسے تکنے لگی۔ پھر ارد گرد کھڑے بیٹھے گریہ وزاری کرنے والوں سے حیرانگی سے پوچھتی۔

”ابا کو کیا ہوا ہے“

"ابا اُٹھتے کیوں نہیں۔"

"ابا بیمار ہیں۔"

دو چار دفعہ تو وہ ابا سے بے اختیار ہو کر لپٹ گئی۔ چلا چلا کر پکارا رو رو کر اٹھنے کو کہا۔

لیکن

شہزادی کہنے والا ابا تو ہمیشہ کے لیے منہ موڑ گیا تھا شہزادی کو محل میں پہنچانے کا وعدہ ادھورا ہی چھوڑ گیا تھا۔ شہزادی کے ذہن میں چھوٹے چھوٹے حسین حسین خواب اگا کر خود شاید اسی لیے منہ موڑ گیا تھا کہ جانتا تھا یہ سب جھوٹے خواب ہیں ان کی تعبیر وہ کبھی نہیں دے سکتا۔ بیٹی سے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اسی لیے چپکے سے چل دیا۔

لوگ اس معصوم بچی کو دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے۔ اس کی باتیں کلیجہ چیر رہی تھیں۔

معصومیت بظاہر بڑی بے ضرر چیز ہے۔

لیکن

یہ کتنی ضرر رساں تھی۔

سب شاید اسی لیے شگو کو دیکھ دیکھ رو رہے تھے۔

رات وہ گھر جس میں خوشیوں کے جگنو جگمگاتے اور نیلی پیلی روشنیاں پھیلاتے تھے اجڑا دیار تھا۔ گلی محلے کے لوگ چلے گئے تھے عزیز و اقارب یہیں تھے۔ پچھلی رات بھی جن عزیزوں نے جاگ کر دوڑ دھوپ کرتے۔ صدموں کی یلغار سہتے گزاری تھی۔

اب جہاں جگہ ملی وہیں پڑ گئے تھے کچھ لوگ رشیدہ کے گھر جا کر سوئے تھے۔ نیند ایک فطری عمل ہے۔ جسمانی اور ذہنی تھکاوٹ کے لیے نیند ضروری ہے۔

یہ آپ ہی آپ آنکھوں میں اترنے لگتی ہے انسان کے تھکے ہارے ذہن اور جسم کو بڑی شفقت سے آسودگی بخشتی ہے۔

لیکن۔

کچھ آنکھیں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ جو اس کی شفقت اور رحم کی فراوانی کے باوجود آسودہ نہیں ہوتیں۔ کھلی رہتی ہیں۔ سکون نہیں پاتیں۔ ان آنکھوں کی ویرانی اور اجاڑ نیند کو بھی بے کل کر دیتا ہے۔ اور وہ ان سے دور بھاگتی ہے۔

سب تکان سے چور ہو کر کہیں نہ کہیں جگہ بنا کر پڑ گئے تھے۔ صرف ایک تہمینہ تھی جو چوپٹ آنکھوں سے در و دیوار دیکھ رہی تھی کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ رہی تھی۔ ایک دم ہی بے سہارا اور بے آسرا ہو گئی تھی۔ سر سے سائبان اٹھ گیا تھا۔ تحفظ کی دیواریں گر گئی تھیں۔ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ کیا کرے گی کس طرح جیئے گی دو بچیوں کو کیسے پالے گی۔ یہ سب سوال ذہن میں دھواں دھواں تھے۔

کوئی راہ سجھائی نہ دے رہی تھی دکھ کا وار اتنا کاری تھا کہ بے اختیاری سے کلیجہ پکڑ پکڑ رہ جاتی تھی۔ لگتا تھا شدت غم سے آنکھوں کے سوتے بھی خشک ہو گئے ہیں۔

"میں نے کہا "

"کیا — ؟"

"دکان دیکھی جاکر "

"ہاں —"

"اندازاً کتنے کا مال ہوگا "

"مال کا بھی اندازہ ہوجائے گا ۔ ابھی لینے دینے والوں سے تونپٹ لیں ۔ لوگ بھی غضب کرتے ہیں ۔ خداخوفی تو رہی نہیں ۔ جس نے پانچ دس بھی لینے ہیں ، مانگنے کو چلا آرہا ہے دینے والوں کا پتہ ہی نہیں ۔ گاما شروع سے مجید کے پاس ملازم تھا اس کو لوگوں کے نام یاد ہیں جنہوں نے مجید کا قرض دینا تھا لیکن دو چار کے سوا کوئی مانتا ہی نہیں "

"کیا ہوگا "

اللہ کرے گا کوئی سبیل بن ہی جائے گی تم تہمینہ بہن کو تسلی تشفی دیا کرو

وہ بیچاری تو لگتا ہے جیتے جی مر گئی ہے "

"شگو بڑا تنگ کرتی ہے نا — زبان تالو سے لگاتی ہی نہیں ۔ ضد میں پڑ جائے تو کسی کی سنتی نہیں ۔ کل سارا دن روتی رہی کہ ابا کے پاس جانا ہے ۔ حمیدہ آپا اپنے ساتھ لے گئی ۔ نجیب بھائی اٹھا کر بازار لے گئے ۔ کھلونے دلائے ، مٹھائی لے کر دی ۔ لیکن اسے صبر آتا ہی نہیں "

"بہت زیادہ مانوس تھی باپ سے "

"ہتھیلی کا چھالا بنایا ہوا تھا "

"بچی ہے اسے کیا پتا کہ اب ابا کی صورت ساری عمر نظر نہ آئے گی "

"سمجھائے کوئی کیسے "

"وقت کے ساتھ ساتھ سمجھ جائے گی بیچاری "

"بھابی بیچاری بھی کیا کرے — خود ہی صدمے سے نڈھال ہے ، کل تو بہت مارا شگو کو "

"تت تت — بھئی تم لوگ سنبھال لیا کرو اسے — بہلا پھسلا لیا کرو ۔ بچی پر اس طرح تو بہت برا اثر پڑے گا — اسے تو بہت زیادہ پیار کی ضرورت ہے "

"کسی سے سنبھلے بھی "

صبیحہ ربیعہ کے پاس بھی نہیں رہتی — ؟ طاہر سے کھیلا کرے ۔ اپنے ہاں لے آیا کرو اسے "

گھڑی دو گھڑی ٹکتی ہے پھر کسی حیلے بہانے رونے لگتی ہے "

"اللہ رحم فرمائے۔"

"ان کو صبر دے۔"

"آمین۔!"

"میں سوچ رہی ہوں اماں کچھ دنوں کے لئے نجیب بھائی کے ہاں چلی جائیں ان کو بھی تو دیکھا نہیں جاتا۔ بڑھاپے میں بیٹے کی جوانمرگی نے کچل دیا ہے انہیں۔!"

"ہاں کچھ دنوں کے لئے چلی جائیں وہاں۔ اس ماحول سے دور رہیں گی تو صدمے سے نپٹنے کے قابل ہو سکیں گی۔"

"ہائے ہماری بخت ماں!"

رشیدہ نے دوپٹے کی کنی سے اپنی بھیگی آنکھوں کے گوشے پونچھے۔ وہ رفیق سے باتیں کر رہی تھی۔ ماں بھاوج اور بھتیجیوں سے دلی ہمدردی تھی ان کے دکھ کا اسے شاید اس لئے بھی زیادہ احساس تھا کہ برابر میں رہتی تھی۔ ورنہ بڑی بہن حمیدہ بھی تھی۔

اور نجیب اور لطیف دونوں بھائی بھی تھے۔ دکھ ان سب کو بھی بہت ہوا تھا لیکن اپنے اپنے گھروں کو سدھارے تھے جس دن یہاں آتے بھابی اور بچیوں کو دیکھ کر آزردہ ہو جاتے۔

چلے جاتے تو شاید یاد بھی نہ رہتا کہ اتنا بڑا سانحہ اک پورے خاندان کو کچل چکا ہے۔

رفیق دل کا اچھا آدمی تھا وہی اب مجید کے چھوڑے ہوئے اثاثے اور

دکان کی خبر گیری کر رہا تھا۔

لوگوں کے قرضے چکا رہا تھا۔ اور جہاں جہاں سے وصولی ہو رہی تھی وہ لا رہا تھا۔

تہمینہ اور بچیوں کے مستقبل کا مسئلہ جیسے اس کا اپنا مسئلہ تھا۔ وہ کوشش میں تھا کہ ان کے مستقبل کے لئے کوئی مستقل ذریعہ آمدنی بنا سکے۔ اتنا ہو جائے کہ وہ روکھی سوکھی بھی کھا کر گزارہ کریں۔ کسی کے سامنے انہیں دست سوال تو دراز نہ کرنا پڑے۔

وہ اکثر تہمینہ کو سمجھاتا۔

"بھابی اب آپ ہی کو ہمت سے کام لینا ہوگا۔ مجید کی امانت یہ دو بچیاں ہیں۔ انہیں اب پال پوس کر ان کی شادیاں کرنا آپ کے ذمہ ہے غم کا کوہ گراں آپ پر ٹوٹا ہے۔

آپ ریزہ ریزہ ہو گئی ہیں لیکن بھابی ان ریزوں کو مزید بکھرنے نہ دیں۔ سمیٹ کر اپنا آپ جوڑیں۔ بچیوں کا سہارا بنیں۔ انہیں اچھی زیست دیں۔ تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔

آپ کا اپنا آپ آپ کے لئے مٹ گیا ہے۔ لیکن ان بچیوں کے لئے آپ ہیں۔"

تہمینہ چوپٹ آنکھوں سے تکتی رہی اور کبھی بلک بلک کر اس طرح روتی کہ رفیق جیسے باہمت مرد کا دل بھی لہو کے آنسو روتا۔

وقت گزرتا گیا۔

وقت کا گزرنا اور گزرتے چلے جانا ہی سب سے بڑی نعمت ہے یہ ٹھہر جائے یا رک جائے تو قیامتیں بپا ہی رہیں۔

اور جس پر بپا ہوں۔ وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی زندہ نہ رہے ان کی حشر سامانیوں ہی سے نپٹتا رہے۔

لیکن

ایسا نہیں ہوتا۔ بڑے سے بڑا غم بھی طوفانی بہاؤ کے ساتھ آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ تباہی کے آثار چھوڑ جاتا ہے لیکن پھر بھی گزر تو جاتا ہے۔ اس کی شدت اتنی زیادہ نہیں رہتی۔ اس کی تباہ کاری رک جاتی ہے۔

دو تین ماہ تو تہمینہ کو جیسے سدھ بدھ ہی نہ رہی تھی۔ رشیدہ ساتھ نہ رہ رہی ہوتی تو جانے اس کا اور اس کی بچیوں کا کیا حال ہوتا۔ اسے تو اپنے کھانے پینے کا ہوش نہ تھا نہ اوڑھنے پہننے کا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی رنگت میلی ہو گئی تھی۔

اور آنکھوں کی ساری خوبصورتی آنسوؤں کی تلخی اور شدت میں ڈوب گئی تھی۔ دو تین ماہ تو اسے یہ بھی نہ پتہ چلا کہ گھر کا خرچہ کہاں سے آرہا ہے کون کر رہا ہے۔

ہانڈی روٹی کیسے پکتی ہے۔ اور آئے گئے کا خرچہ کہاں سے پورا ہو رہا ہے۔

لیکن

پھر وہی قدرت کے کام۔ غم کا طوفانی بہاؤ تباہی کے آثار چھوڑ کر چلا جاتا ہے ہمت بھی بندھ جاتی ہے۔ حوصلہ بھی آجاتا ہے اور زندگی کے ساتھ ٹوٹے ہوئے بندھن بھی جڑنے لگتے ہیں سارے دکھ دل کے گھاؤ بن کر جیتے ہیں۔

تہمینہ نے بھی اپنے آپ کو یکجا کیا۔ سنبھالا۔ رفیق اور رشیدہ نے سہارا دیا اور وہ اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے کے قابل ہو گئی۔

"بھابی"

"جی"

"دکان کرائے پہ دے دی ہے ۔ یہ لیں سال کا ایڈوانس ہے۔"

تہمینہ کی آنکھیں بھر آئیں دوپٹے کے آنچل سے آنکھیں پونچھتے ہوئے اس نے ایڈوانس کی رقم پکڑ لی۔

رفیق اور رشیدہ دونوں ہی رقم لے کر آئے تھے دکان کا سارا حساب کتاب رفیق نے ہی بند کیا تھا۔ سارا سامان بیچا تھا۔ لین دین کا چکر ختم کیا تھا۔ یوں زیادہ تو نہیں۔ البتہ معقول رقم لاکر تہمینہ کو دی تھی۔ آج دکان کرائے پہ اٹھا کر ایڈوانس کی رقم بھی لاکر دی تھی۔

وہ ہاتھ میں پکڑی رقم کو گیلی گیلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"گن لو بھابی"

رشیدہ نے کہا۔

تہمینہ نے بوجھل نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولی۔

"رفیق بھائی نے گن کر ہی لی ہوگی ۔۔۔ میں تو ان کا احسان اتارنے"

"بھابی شرمندہ نہ کریں"

رفیق جلدی سے بولا۔

"انسان ہی انسان کے کام آتا ہے ۔ آپ مجھے اپنا بھائی سمجھیں ۔ کوئی ضرورت ہو کوئی الجھن ہو کوئی تکلیف ہو۔ بلا جھجک کہہ دیا کریں۔ میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں"

"شکریہ بھائی صاحب ۔۔۔ اور ہے بھی کون ۔ آپ نے سہارا دیا ہے تو یہ سہارا قائم رکھے گا"

"سہارا تو وہ ہوتا ہے تہمینہ بھابی" رفیق نے انگلی آسمان کی طرف کی۔

"انسان تو وسیلہ بنتا ہے"

تینوں تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے۔ تہمینہ کو ان کی ہمدردانہ باتوں سے بڑی تسلی ملتی تھی۔

"اماں کہاں ہیں"

رشیدہ نے صحن میں پڑی اماں کی خالی چارپائی دیکھتے ہوئے کہا۔

"نجیب بھائی لے گئے ہیں دو دن کے لئے"

"اچھا ہی کیا اماں بیچاری تو صدمے سے بہت ہی نڈھال ہوگئی ہیں"

"مجید جیسا بیٹا بچھڑ گیا ہے"

رفیق نے گہری سانس لی۔

"ماں کی بڑی خدمت کرتا تھا وہ"

"ہاں ۔ کہتا تھا ۔ اماں کی دعاؤں سے مالا مال ہوں"

رشیدہ نے آہ بھری۔

"میرے خیال میں اماں کو نجیب ہی مستقلاً اپنے پاس رکھ لیں" رفیق نے کہا تو تہمینہ جھٹ سے بولی۔

"نہیں رفیق بھائی ۔ اماں میرے پاس ہی رہیں گی ۔ مجھے ان کا سہارا چاہیے۔ گھر میں بزرگ کا ہونا ضروری ہے ۔ ورنہ دو بچیوں کے ساتھ اکیلے رہنا بہت مشکل ہے"

رشیدہ بولی " اماں کونسا وہاں رہنا پسند کرتی ہے ۔ پتہ نہیں دو دن کے لئے بھی کیسے چلی گئیں۔ نجیب بھائی تو خیر شاید اماں کا بار اٹھانا پسند کر لیں۔ بڑی بھابی توبہ ۔ وہ کب چاہیں گی"

"میں نے کہا نا اماں میرے پاس ہی رہیں گی ۔ میں اکیلی نہیں رہ سکتی رشیدہ"

"میں نے تو صرف خرچے کی وجہ سے کہا تھا بھائی"

رفیق نے کہا۔

"اب آمدنی"

"جہاں تین ماں بیٹی رہ سکتی ہیں وہاں اماں کی گزر کا بندوبست بھی ہو جائے گا رفیق بھائی ۔ مجھے ان کا کوئی بار نہیں لگتا ۔ بار تو شگو کا ہے ۔ وہ ابھی تک

نہیں سمجھ پائی اسی طرح چیزوں کی فرمائش کرتی ہے۔ نہ ملے تو رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیتی ہے۔ مار سے پیار سے سمجھتی نہیں۔

"مجید نے ہتھیلی کا چھالا بنا کر پالا تھا اسے"

"بے جا لاڈ پیار نے بگاڑ کے رکھ دیا ہے اسے"

تہمینہ دکھ سے بولی۔

"بچی ہے ۔ ابھی کیا سمجھ پائے گی ۔ بڑی ہوگی تو خود بخود احساس ہو جائے گا"

رشیدہ نے کہا۔

"رشیدہ تم نہیں جانتیں ۔ بہت پریشان کر دیتی ہے ۔ چھوٹی موٹی چیز سے تو بہلتی ہی نہیں ۔ یہی عادتیں رہیں تو کہاں سے پورا کروں گی"

"اللہ مالک ہے ۔ کیا خبر اس کا نصیب کتنا اونچا ہے"

"اونچا ہوتا تو باپ ہی بچھڑتا"

"دکھی نہ ہو ۔ حوصلے اور صبر سے کام لو ۔ انسان کے بس میں کچھ نہیں ہوتا کچھ نہیں کر سکتا عاجز ہے بندہ"

رفیق اور رشیدہ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے۔

تہمینہ نے ان کی دی ہوئی رقم لا کر صندوق میں رکھ دی ۔ جہاں پہلے بھی پیسے رکھے ہوئے تھے۔

وہ سوچوں میں گم وہیں بکس کھولے بیٹھی رہی ۔ دکان کا کرایہ اتنا زیادہ نہیں تھا جس سے چار آدمیوں کا خرچہ چل سکے۔ روکھی سوکھی کھانے کے لئے

بھی اس سے دگنی رقم کی ضرورت تھی۔ نقد رقم جو پاس تھی ۔۔ وہ ہر ماہ خرچ کر کے حساب پورا کیا جا سکتا تھا ۔ لیکن کتنی مدت ؟

ابھی تو لمبی مسافتیں طے کرنا تھیں ۔ بچوں کو پالنا تھا تعلیم دینی تھی ان کی شادیاں کرنا تھیں ۔

یہ سب کچھ کیسے ہوگا ؟ کیونکر ہوگا ۔۔ ؟

سوچ سوچ کر تہمینہ کا دماغ ماؤف ہونے لگا ۔

رونا دھونا تو مقدر بن ہی چکا تھا ۔ لیکن اب اس کو ہمت کرنا تھی خرچہ چلانے کے لئے کوئی بندوبست کرنا تھا ۔"

اگلے ماہ رفیق دکان کا کرایہ لے کر آیا ۔ ایڈوانس کی کچھ کٹوتی سے یہ رقم اور بھی کم ہو گئی تھی ۔

" شکریہ بھائی صاحب "

تہمینہ نے پیسے لیتے ہوئے کہا ۔ " بیٹھئے "

رفیق پرانی سی کرسی ایک طرف گھسیٹ کر بیٹھ گیا ۔

" کوئی ضرورت ۔ میرا مطلب ہے کسی چیز کی ضرورت ہو تو ۔۔ !"

تہمینہ چارپائی کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے شائستہ سے بولی ۔

" پھوپھا کے لئے چائے بنا لاؤ "

" بنا لیتی ہے چائے ہماری بیٹی "

" سارے کام کرتی ہے بے چاری ۔۔ وہ دوسری جو ہے مادر پدر آزاد سوائے کھیلنے اور قیمتی قیمتی چیزوں کی فرمائش کرنے کے اور کوئی کام نہیں ہے

" ہے کہاں شگو "

" آپ کی طرف گئی ہے ۔ ربیعہ سے بڑی دوستی ہے اس کی "

" وہ بھی اسی کی طرح ہے ۔ چھوٹی موٹی چیز اسے بھی پسند نہیں آتی "

" خدا آپ کو زندگی دے ۔ آپ اس کی فرمائشیں پوری کر سکتے ہیں میرے لئے شگو مسئلہ بنتی جا رہی ہے ۔ کل ہی کہیں سامنے والے کے بیٹے کے پاس ہوائی جہاز دیکھ آئی تھی ۔ بس آتے ہی جہاز کی فرمائش کر دی ۔ بہت بہلایا پھسلایا نہیں مانی ۔ تھپڑ بھی کھا کے ۔

" نہ مارا کریں اسے ۔ زیادہ ضدی ہو جائے گی "

" ہو چکی ہے بھائی صاحب "

" شام تک روتی رہی ۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ۔ چیخ چیخ کر ۔ ہار کے جہاز منگوا کر دینا ہی پڑا "

اماں صحن میں چارپائی پر پڑی ان کی باتیں سن رہی تھی وہیں سے بولیں ۔

" یہی تو غلط بات ہے ۔ پوری کر دیتی ہو نا اس کی فرمائش اسی لئے ضدیں کرتی ہے ۔ اسے پتہ ہے رو دھو کر لڑ جھگڑ کر اپنی بات منوا لوں گی "

" اماں آپ بھی تو دیکھتی ہیں کہ وہ کیا کرتی ہے "

" کرنے دیا کر ۔ مر نہیں جائے گی رونے سے سختی برتا کر بہو ۔ کہاں سے لائے گی پیسے "

رفیق مسکرا کر اماں سے بولا ۔

" اماں آپ دعا کیا کریں ۔ خدا سب بنا دے گا "

"میری دعاؤں میں اثر ہوتا تو میرا شیر مرتا ہی کیوں" اماں چندھیائی آ
کے گوشے دوپٹے سے پونچھتے ہوئے بولی۔

"مرنے والا اس بچّی کا دماغ ساتویں آسمان تک پہنچا گیا ہے"

"اب آہستہ آہستہ ہی نیچے اترے گا نا اماں"

رفیق نے ہنس کر کہا۔

شائستہ چائے کی پیالی لے آئی۔ بڑی چپ چاپ سی بچّی تھی۔ باپ
مرنے سے کچھ زیادہ ہی سہم گئی تھی۔ اتنی سمجھدار تو ابھی نہیں تھی۔ پھر
ماں کے دکھ اور اس پر پڑنے والے بوجھ کو سمجھتی تھی۔ کبھی ماں کو تنگ نہ
کیا تھا۔

کبھی کسی چیز کے لئے ضد نہ کی تھی جو ملا وہ لے لیا نہ کھانے پینے میں
فرمائش نہ اوڑھنے پہننے میں۔

رفیق نے چائے کا گھونٹ لیا۔

"واہ۔ واہ۔ بہت عمدہ چائے بنائی ہے ہماری بیٹی نے"

شائستہ نے فخر سا محسوس کیا۔ رفیق نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ
نکالے اور اس کی مٹھی میں دے کر بولا۔

"تمہارا انعام"

"نہیں بھائی صاحب"

تہمینہ نے اس سے پیسے لے کر واپس کرنا چاہے۔

"بھابی یہ ہمارا اور ہماری بیٹی کا معاملہ ہے۔ اتنی عمدہ چائے پلا

یہ اس کا انعام ہے دے دیں اسے"

تہمینہ نے پیسے شائستہ کو دے دیئے۔

رفیق نے چائے پی کر خالی پیالی شائستہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شاباش۔ کسی دن کھانا بھی کھائیں گے تمہارے ہاتھ کا۔۔۔
بنا سکتی ہو"؟

"ہاں"

رفیق شائستہ سے اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھنے لگا۔

وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ شگو باہر سے آگئی۔ وہ سامنے والوں کے
بچوں کے ساتھ کھیلنے گئی تھی۔

شائستہ نے مٹھی میں پکڑے پیسے شگو کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمیں انعام ملا ہے"

"کس نے دیا"

"پھوپھا نے"

شگو ایک دم رفیق کی طرف بڑھی۔ اس کے کندھے سے لگتے
ہوئے بولی۔

"آپا کو کیوں پیسے دیئے ہیں"

"اس نے ہمیں مزے دار سی چائے پلائی"

"مجھے بھی دیں"

"شگو" تہمینہ نے ڈانٹا۔

لیکن وہ بگڑ گئی۔

"آپا کو کیوں دیئے ہیں۔"

"مجھ سے لے لو۔" شائستہ نے پیسے اس کی طرف بڑھا دیئے۔ شگو نے اس کی ہتھیلی پر سے پیسے جھپٹ لئے اور باہر بھاگ گئی۔

"شگو۔ شگو۔!"

شائستہ اس کے پیچھے لپکی۔

تہمینہ نے بھی آوازیں دیں۔ پھر شائستہ سے بولی۔

"تو نے کیوں دے دیئے اسے پیسے۔ جا کر اس سے لے آ۔ ا
کا کیا ہے ابھی ٹافیاں ٹکیاں لے آئے گی۔"

رفیق کو بھی شگو کی حرکت سے کچھ تشویش سی ہوئی اور وہ تہ
سے بولا۔

"اسے سکول داخل کروا دیں بھابی۔"

"سوچ رہی ہوں۔"

"سکول جانا شروع کر دے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔"

"خرچے کا ہی سوچ کر ابھی داخل نہیں کروایا۔ گورنمنٹ سکول دور ہے اور محلے میں جو سکول ہے اس کی فیس۔"

"اوہ ہاں۔" رفیق بولا۔

"میں جس کام کے لئے آیا تھا وہ تو بھول ہی گیا۔"

"جی کہیے۔"

"بھابی میں نے اپنے ایک دوست سے بات کی تھی۔"

"کیا۔؟"

"وہی آپ سے کہا تھا نا کہ کہیں آپ کا پیسہ لگوا دوں گا۔ اس طرح تو سارا پیسہ خرچ ہو جائے گا۔

کسی کے کاروبار میں لگوا دیں۔ تو سرمایہ بھی محفوظ ہو گا اور ماہ بہ ماہ آمدنی بھی ہو گی۔"

"تو پھر۔"

"میرا دوست ہے ایک بہت ایماندار ہے اسے چاہیئے پیسہ۔ میں نے سب طے کر لیا ہے۔ آپ کے پاس دکان کے مال اور کرائے کے ایڈوانس کا پیسہ ہے نا۔"

"تین سو ہی خرچ ہوا ہے اس میں سے۔ دو سو روپیہ نصیر بھائی کا دیا تھا، سو گھر میں خرچ ہو گیا ہے۔"

"چلیں باقی لگا دیں کاروبار میں۔ ہر ماہ اک معقول رقم مل جایا کرے گی۔!"

"خدا آپ کو زندگی دے۔"

تہمینہ نے دعا کی۔

"کل دکان پر جاتے ہوئے میں پیسے لے جاؤں گا۔ پکا کاغذ لکھوالیں گے ویسے بہت نیک اور ایماندار آدمی ہے۔"

"آپ جو کریں گے مناسب ہی ہو گا۔ بہت بہت شکریہ رفیق بھائی۔"

"نہیں — !" رفیق نے انگلی نہ کے انداز میں ہلائی۔
"شکریہ ادا کر کے شرمندہ نہ کیا کریں بھابی — بھابی کہا ہے تو بھائی بن کر دکھاؤں گا۔"

تہمینہ نے احسان مندی سے سر جھکا لیا — رفیق اٹھ کر چلا گیا۔

شائستہ شگو کو پکڑ لائی تھی — وہ چیخے چلائے جا رہی تھی۔ پیسے کسی طور بھی واپس کرنے پر آمادہ نہ تھی — گلا پھاڑ پھاڑ رو رہی تھی۔

تہمینہ مشین پر جھکی تھی مشین کی گھرر گھرر فضا کے سکوت کو توڑ رہی تھی۔ شائستہ ماں کے قریب ہی بیٹھی سلے ہوئے کپڑوں پر استری پھیر کر بٹن ٹانک رہی تھی — شگو قریب ہی دری پر اپنے کھلونوں کے درمیان بے سدھ سو رہی تھی۔

رفیق نے اک معقول ذریعہ آمدنی تہمینہ کے لئے بنا دیا تھا لیکن یہ رقم اتنی نہیں تھی کہ اس گھر کی گاڑی کو سہولت سے کھینچ سکتی جب سے شگو کو سکول داخل کرایا تھا خرچہ بڑھ گیا تھا۔

شائستہ والے سکول میں تو اس نے جانے سے انکار کر دیا تھا پٹائی بھی ہوئی تھی — لیکن وہاں وہ نہیں گئی تھی۔

"گندہ ہے یہ سکول — میں نہیں پڑھوں گی — گندے گندے بچے یہاں پڑھتے ہیں۔"

اس نے ماں کی ہر کوشش کو یہ کہہ کر بیکار کر دیا تھا۔

"میں جانی والے سکول جاؤں گی" اس نے سامنے والے کے بچّے کے
سکول میں جانے کے لئے ضد کی۔

یہ سکول قریب ہی تھا۔ یہاں صاف ستھرے یونیفارموں والے بچّے
پڑھتے تھے شگو اکثر ان بچّوں کو دیکھا کرتی تھی۔

یہ انگلش میڈیم سکول تھا۔ فیس بھی کافی تھی فیس کے علاوہ اور بھی
بہت سے خرچے تھے۔

رشیدہ نے ربیعہ اور طاہر کو ساتھ والے محلے کے سکول میں داخل کروا
تھا۔ یہ سکول بھی پڑھائی کے لحاظ سے اچھا تھا۔ تہمینہ شگو کو اس سکول
میں لے کر گئی تھی۔

لیکن

اس نے رو رو کر بُرا حال کر لیا ماں کا پلو پکڑتے چلاتے ہوئے کہے گئی۔

"میں جانی والے سکول میں پڑھوں گی"

"یہ سکول بھی دیکھو تو کتنا اچھا ہے"

تہمینہ نے کہا۔

"نہیں — نہیں — !"

"ربیعہ اور طاہر بھی تو ادھر ہی پڑھتے ہیں — ان کے ساتھ آجایا کرو
گی۔ تمہارا خیال بھی رکھیں گے۔ پھر ربیعہ سے تمہاری دوستی بھی تو ہے دونوں
بہنیں اکٹھی رہا کرنا"

لیکن شگو نے تو ایک ہی ضد پکڑ رکھی تھی۔ اسے نہ تو یہ تھا کہ اس

سکول کی پڑھائی اچھی ہے نہ ہی یہ کہ جس سکول میں داخل ہونے کی ضد کر
رہی ہے اس کے اخراجات زیادہ ہیں اس نے تو حسب عادت جو بات کہہ دی
تھی۔ کہہ دی تھی۔ پیار سے مار پھٹکار سے اس نے ماننا تھوڑا ہی تھا۔
تہمینہ نے اس کے رونے دھونے کو نظرانداز کر کے اسے اسی سکول میں
داخل کروا دیا۔

"یہ تو رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے خاصی بڑی بچی ہے ہمارے پاس تو چار سال
سے کم عمر کے بچے بھی آرہے ہیں"

ہیڈ مسٹرس نے تہمینہ سے کہا۔

"ٹھیک ہو جائے گی دو چار دن میں خود اس کے ساتھ آؤں گی۔ عادت ہو
جائے گی اسے سکول کی"

تہمینہ نے کہا۔

پھر

وہ روز اس کے ساتھ سکول آنے لگی — زبردستی کلاس میں بٹھاتی —
پچکارتی — دوسرے بچوں کی تعریف کرتی۔

لیکن

شگو یا تو کلاس میں بیٹھی روتی رہتی — یا اٹھ اٹھ کر باہر بھاگتی۔

کئی دن یہی ہوا —

لیکن روز روز تہمینہ بھی سکول نہ آسکتی تھی — ایک دن اس نے اسے تیار
کیا بستہ کندھے پر ڈالا اور ربیعہ اور طاہر کے ساتھ کرتے ہوئے بولی۔

"بچو بہن کا خیال رکھنا۔"

طاہر چوتھی جماعت میں تھا۔ بڑے اعتماد سے بولا۔

"میں خیال رکھوں گا امی — آپ فکر نہ کریں۔"

اس نے شگو کا ہاتھ پکڑ لیا۔

شگو اس کے ساتھ ساتھ چل دی۔ تہمینہ نے خدا کا شکر ادا کیا وہ دروازے میں کھڑی بچوں کو جاتے دیکھتی رہی۔

بچے گلی کا موڑ مڑ گئے تو وہ واپس پلٹی۔ شائستہ بھی تیار ہو کر سکول جا رہی تھی۔

"شکر ہے طاہر کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گئی ہے۔" تہمینہ نے ہنس کر شائستہ سے کہا۔

"بڑا تنگ کرتی ہے امی۔"

"ضدی کر دیا تھا اسے تمہارے باپ نے — میں لاکھ منع کرتی وہ سنتے ہی نہیں تھے۔"

"ابو بیچارے کو کیا پتہ تھا۔"

"مصیبت تو پڑ گئی ہے نا۔"

"ہاں۔"

"اچھا اللہ مالک ہے ہمارا بھی۔"

شائستہ سکول چلی گئی — جانے سے پہلے وہ ناشتے کے برتن دھو جایا کرتی تھی۔ تہمینہ بستر ٹھیک کرنے لگی۔ صفائی کے بعد آج کپڑے بھی دھونا

تھے اس نے اپنے اور شائستہ کے بستروں سے چادریں اتاریں۔ تکیے کے غلاف بدلے۔ پھر برابر والے کوٹھڑی نما کمرے میں آ کر اماں کو دیکھا۔

مجید کے مرنے کے بعد اماں اکثر چارپائی پر پڑی رہتی تھی لگتا تھا ہمت اور سکت رہی نہیں۔ بہت لاغر ہو گئی تھی۔

تہمینہ نے اماں کو پکارا۔

"کیا ہے۔"

"ناشتہ کر لیا۔"

"ہاں۔"

"اماں ذرا اٹھیں — بستر کی چادر بدل دوں۔"

"رہنے دے بہو — صاف ہے۔"

"نہیں اماں بہت میلی ہو رہی ہے اور یہ تکیہ بھی میلا چکٹ ہے — آج کپڑے دھوؤں گی۔"

"میں نے کہا نا رہنے دے — کہاں صابن کا اتنا خرچہ کرے گی۔ گزارہ ہو رہا ہے ابھی صاف ستھری ہے۔"

تہمینہ نے اک گہری سانس لے کر کہا۔

"اماں آپ کی چادر نہ دھونے سے کیا فرق پڑے گا — گزارہ ہو ہی رہا ہے۔"

"جیسے ہو رہا ہے میں جانتی ہوں — اور اب تو شگو بھی سکول جانے لگی ہے اس کا خرچہ بھی۔"

"ہاں اماں — شکر ہے وہ بلا آج طاہر کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گئی

اس سکول کا خرچہ بہت زیادہ نہیں ہے جس سکول میں وہ جانے کی ضد کرتی تھی نا۔ توبہ — ہم لوگ وہاں کیسے داخل کروا سکتے ہیں بچوں کو۔"

تہمینہ نے اماں کا بستر بدلہ کپڑے جتنے زیادہ میلے ہوتے اسے اتنی ہی زیادہ محنت کرنا پڑتی تھی۔

کپڑے رگڑ رگڑ کر اس کے ہاتھ زخمی ہو جاتے تھے۔ خاص کر اماں کے تکیئے کے غلاف — تیل اور میل جم گئے ہوتے تھے۔

وہ میلے کپڑے اٹھا کر صحن میں نل کے قریب رکھ کر جھاڑو اٹھا کر چلی گئی۔ دونوں کمرے اور سامنے کا دالان نما برآمدہ صاف کیا۔ باورچی خانے کی صفائی کی۔ اور صحن میں جھاڑو لگانے لگی۔

وہ صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی کہ باہر کا دروازہ کھٹاک سے کھلا۔ اور طاہر ہراساں سا دوڑتا ہوا اندر آیا۔

"کیا — کیا ہوا طاہر —؟"

ہاتھ روک کر اس نے طاہر سے پوچھا۔

"مامی — مامی — وہ شگو"

وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

"کیا ہوا شگو کو؟" جھاڑو پھینک کر اس نے طاہر کے قریب آتے ہوئے بے اختیارانہ پوچھا۔

"وہ اس کے سکول میں چلی گئی ہے"

"کس سکول میں"

"بٹر فلائی"

"ہیں —"

"ہاں مامی — میرا ہاتھ چھڑا کر وہ اندر بھاگ گئی کہتی ہے اس سکول میں پڑھوں گی۔ ہمارے سکول میں نہیں جائے گی"

"ہائے اللہ —"

تہمینہ نے سینے پر ہاتھ مارا — پھر بولی۔

"سکول کے اندر ہی گئی ہے نا"

"ہاں"

"کہیں ادھر سے — چپڑاسی تھا گیٹ پر"

"ہاں"

"اللہ میرے کیا کروں — وہاں سے نکل کر کہیں چلی گئی تو"

وہ جلدی سے اندر لپکی۔ اماں سے کچھ کہا۔ اور چادر لے کر طاہر سے بولی۔

"چلو میرے ساتھ"

دونوں بھاگم بھاگ سکول پہنچے۔

شگو گیٹ پر ہی مل گئی۔ چپڑاسی اسے پکڑ کر گیٹ سے باہر کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تمہارا داخلہ نہیں ہوا۔ باہر جاؤ۔ مس مارے گی۔ نویں جماعت میں جا گھسی ہو تم۔ کہاں سے آئی ہو۔ جاؤ"

تہمینہ نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "میری بچی"

"بی بی ۔ یہ اس سکول میں داخل تو نہیں ہوئی ۔ یونیفارم بھی نہیں پہنا ہوا دوڑی دوڑی اندر آئی اور اس سامنے والے کمرے میں جا گھسی ۔ کلاس ہو رہی تھی ۔ بمشکل مس نے اسے باہر نکالا ۔

کچھ بتا بھی تو نہیں رہی ۔ یہی کہہ رہی تھی ۔ یہ میرا سکول ہے ۔ میں اِدھر پڑھوں گی "

" ہاں چاچا " تہمینہ نے چپڑاسی سے کہا ۔

" یہ اس سکول میں داخل نہیں ہے "

وہ شگو کو لے کر پلٹی ۔

طاہر بولا ۔ " آپ آج بھی ساتھ چلیں مامی "

" نہیں بیٹے ۔ تم جاؤ سکول ۔ تمہیں دیر ہو رہی ہے "

" اور شگو "

" شگو کو میں گھر لے جاؤں گی "

" غیر حاضری لگے گی مامی ۔ مس مارے گی اسے "

" یہ اب اس سکول نہیں جائے گی "

" کیوں ۔ پڑھے گی نہیں "

" پڑھے گی ۔ اس سکول میں "

وہ شگو کو لے کر گھر آ گئی ۔ شگو بستہ پھینک کر اپنے مٹی پلاسٹک اور لکڑی کے کھلونوں سے کھیلنے لگی ۔ ابو کے یادگار تھے کھلونے ۔ اس کی ننھی منی یادیں بھی اس سے وابستہ نہیں ۔

اگلے ہفتے ساس کے منع کرنے کے باوجود تہمینہ نے شگو کو بٹر فلائی سکول میں داخل کروا دیا ۔

" اتنا خرچہ کہاں سے پورا کرے گی بہو " ساس نے کہا ۔

تو

وہ اطمینان سے بولی ۔ " اماں میں محنت کروں گی ۔ سلائی کڑھائی کا کام کر سکتی ہوں نا "

" بچی کی ضد پوری کر دیتی ہو ۔ یہی خرابی ہے ۔ روتی مرتی ۔ نہ پڑھتی ۔ اس سکول میں رہنے دیتیں "

" مشکل تھا اماں ۔ کوئی بات نہیں ۔ دو چار کلاسیں ادھر پڑھ لے ۔ تب تک سمجھ دار ہو جائے گی ۔ پھر شائستہ کے سکول میں لے جاؤں گی اسے "

اماں چپ ہو گئی ۔ شگو جس مزاج کی بچی تھی وہ بھی آگاہ تھی ۔ اتنی کم عمری ہی میں بات منوا لینے کے فن سے آشنا ہو گئی تھی ۔

یہ بات کی تربیت کا اثر تھا ۔ یا ویسے ہی مزاج اس طرح کا تھا کہ چھوٹی موٹی چیز اس کی نگاہ ہی میں نہ آتی تھی ۔ اچھے کھلونے اسے درکار تھے اچھے کپڑوں کی شیدائی تھی ۔

جوتے موزوں کے بغیر نہ پہنتی تھی ۔ بالوں میں رنگا رنگ ربن اور کلرڈ موتیوں والے ہیئر بینڈ چاہئیں تھے اسے ۔

تہمینہ مجبور ہو کر اس کی فرمائش پوری کرتی رہتی لیکن سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی ۔ کہ آخر ایسے کب تک چلے گا ۔

اس سلائی کڑھائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ شائستہ پڑھائی میں ا
تنی تیز نہ تھی۔ بس واجبی سے نمبر لے کر پاس ہو جاتی تھی۔ لیکن گھریلو کاموں
بیحد شوقین تھی۔ جب سے اماں نے سلائی کڑھائی کا کام شروع کیا تھا ا
نے دوسرے سارے کام اپنے ذمہ لے لئے تھے۔ پہلے صرف برتن
کر سکول جاتی تھی۔

اب صفائی بھی کر کے جاتی۔ کمرے ٹھیک ٹھاک کر کے جاتی اور واپس آ
کر ماں کے ساتھ سلائی کے کاموں میں بھی مدد دیتی۔

سلے ہوئے کپڑوں کو استری کرنا ان میں بٹن ٹانکنا اور ایڑی کرنے کا کا
بھی وہ کرتی تھی۔

اب تو وہ بضد تھی کہ اماں اسے بھی سینا سکھائیں۔ شلواروں کے پائنچے
بنانا سیکھ رہی تھی۔

یوں مزدوری سے اک معقول رقم ہر ماہ تہمینہ کما لیتی تھی۔ یہ دوسری بات
تھی کہ مشین پر جھکتے جھکتے اس کی کمر میں مستقل درد ٹھہر گیا تھا اور آنکھوں پر چشمے
کی ضرورت آن پڑی تھی۔

آج بھی شائستہ نے سارے کپڑے استری کئے بٹن ٹانکے اور تہہ
جماتے ہوئے بولی۔

"اماں یہ کپڑے دے آؤں"

"ہاں دے آؤ شاہدہ آپی کو۔ اور ہاں کہنا باقی کپڑے کل تک سل جا
گے"

"اچھا اماں"

"اور سنو"

"ہوں"

"کہنا کل والے کپڑوں کے پیسے بھی آج ہی دے دیں۔ پیشگی"

"پیشگی"

"ہاں بیٹی۔ یہ پیسے لائے گی تو کام چلے گا نا۔ شگو نے کل سکول کے
فنکشن میں نیا فراک اور شوز پہننے ہیں"

"وہ تو آج ہی لانے ہوں گے"

"شاہدہ آپی نے پیشگی پیسے دے دیئے تو آسانی ہو جائے گی"

تہمینہ نے اک گہری سانس لی۔

"بڑی کوشش کی ان کے سارے کپڑے آج ہی سل جائیں۔ تمہاری تائی
اماں کو دیکھنے نہ جاتی تو سل جاتے۔ پر وہاں جانا بھی ضروری تھا کئی دنوں سے
ان کی طبیعت خراب ہے"

"دادی وہیں رہ گئیں"

"ہاں۔ نجیب بھائی نے روک لیا تھا"

دونوں ماں بیٹی نجیب اور اس کے اہل خانہ کے رویوں سے متعلق باتیں
کرنے لگیں۔ انہی کے حوالے سے رشیدہ اور رفیق کا ذکر بھی آ گیا۔

"سب اچھے ہیں اماں" شائستہ نے کہا۔ "لیکن رشیدہ اور رفیق جتنے
اچھے ہیں اتنا کوئی نہیں"

"ہاں بیٹی خدا کے بعد انہی کے آسرے پر جی رہے ہیں ہم لوگ، بہت خیا
رکھتے ہیں ہمارے۔ اچھا تو جا یہ کپڑے لے جا۔ پیسے لے آئے گی تو بازا
گی، فراک سینا بھی ہے۔"

"اچھا اماں جاتی ہوں۔"

شائستہ نے دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا اور کپڑے رومال میں احتیاط
لپیٹ لئے۔ وہ شاہدہ آپی کے ہاں جانے کو تیار تھی۔

شگو رشیدہ کے پہلو میں تخت پر بیٹھی تھی قریب ہی ربیعہ اپنا سکول کا کام جلدی جلدی ختم کر رہی تھی۔ طاہر نے ہوم ورک ختم کر لیا تھا اب اپنا بستہ سمیٹ کر کرکٹ کا بیٹ پکڑے کھڑا تھا۔ وہ ان دنوں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

"اماں اب میں جاؤں؟" اس نے بیٹ گھماتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

"جلدی آجانا" اماں نے کہا۔

"پھپھو یہ ہر وقت کرکٹ ہی کھیلتا رہتا ہے" شگو نے طاہر کو دیکھ کر شوخی سے کہا۔

"جی نہیں" پھپھو کی بجائے طاہر بولا۔

"ہم اپنا سکول کا کام ختم کر کے ہی کھیلتے ہیں۔ تمہاری طرح تھوڑے ہی ہیں۔"

" کیوں — میں ہوم ورک نہیں کرتی کیا " ؟

" میں جانتا ہوں جتنا کرتی ہو۔ کبھی آپا کے سامنے رکھ دیتی ہو — کبھی ما[موں] کے سامنے "

" آہاہا — کتنے بے وقوف ہو تم — میرا سارا ہوم ورک انگریزی میں ہوتا ہے۔ آپا کو تو تھوڑی بہت آتی ہے — اماں کو تو اے بی سی بھی نہیں آتی میرا ہوم ورک وہ کیسے کریں گی "

" یہ بات تو ہے طاہر بھائی " ربیعہ نے کہا۔ " شگو انگلش میڈیم سکول کی پانچویں جماعت میں پڑھتی ہے — سمجھے "

" پڑھتی انگلش میڈیم سکول میں ہے لیکن نالائق ہے " طاہر نے شگو سے کہا۔

" مشکل سے پاس ہوتی ہے تم سے بھی کم نمبر لیتی ہے "

" نہیں کیا — پاس تو ہو جاتی ہوں نا " شگو بولی۔

" پاس تو کسی بھی سکول میں ہو جائیں — ہو جاتیں — اتنی زیادہ فیس دے کر بھی صرف پاس ہی ہونا ہے۔ تو فائدہ کیا — تمہیں تو دن رات ایک کر کے امتحان فسٹ کلاس کرنا چاہیئے "

" تمہاری طرح رٹو طوطا نہیں ہوں — ہمارے سکول میں صرف پڑھائی ہی زور نہیں دیا جاتا۔ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے "

" جی ہاں آئے دن فنکشن ہوتے ہیں — جن کے لئے تم ماموں بیچارے کو خوب تنگ کرتی ہو "

" تمہیں تو نہیں کرتی نا "

" طاہر تم کیوں الجھنے لگے شگو سے " پھپھو نے کہا تو ربیعہ نے مسکرا کر کہا۔ " امی آپ درمیان میں نہ آئیں۔ دونوں لڑتے بھی ہیں اور دوستی بھی بہت ہے۔ یہ طاہر بھائی جو ہے نا — سب کے سامنے شیر ہوتے ہیں۔ شگو بھپر جائے نا تو دودھ کے ابال کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ ابھی شگو بُرا مان جائے منہ پھلائے تو پھر دیکھیں کیسے کیسے اس کے سامنے جھکتے ہیں۔ معافیاں مانگنے لگتے ہیں امی — یوں ہاتھ جوڑ جوڑ کر "

ربیعہ نے ہاتھ جوڑ کر طاہر کی نقل اتاری تو شگو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

" بڑا رعب ہے میرا ان پر پھپھو "

شگو اٹھلاتے ہوئے بولی۔

طاہر شرمندہ سا ہو کر بیٹ گھماتے ہوئے باہر نکل گیا۔

شگو کچھ دیر وہیں بیٹھی ربیعہ اور پھپھو سے باتیں کرتی رہی۔ پھر ایک دم ہی جیسے کچھ یاد آ گیا اٹھ کھڑی ہوئی۔

" کیوں " پھپھو نے دیکھا۔

" ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں "

" ایک کام یاد آ گیا پھپھو "

" کیا " ربیعہ نے پوچھا۔

" کل میری سہیلی کی برتھ ڈے ہے "

" تم جا رہی ہو "

"ہاں وہ تو میری بڑی پکی سہیلی ہے"

"کیا نام ہے اس کا۔ گکو۔؟"

"ہاں اصلی نام تو ثمینہ ہے۔ پیار سے سب اسے گکو کہتے ہیں۔ بڑی پیاری سہیلی میری۔ بہت امیر ہے وہ"

شگو نے مرعوب سی آواز میں گکو کے امیر ہونے کی صفت بیان کی تو پھ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔

"تیری سہیلی ہے تو ظاہر ہے امیر ہی ہوگی۔ تو غریبوں کو لفٹ کہاں دیتی ہے"

"حالانکہ خود غریب ہے" ربیعہ نے بے ساختہ کہا۔ تو شگو کا چہرہ ا پھیکا پڑ گیا۔

پھپھو نے ربیعہ کو گھور کر دیکھا۔ وہ خفت سے سر جھکا کر کام کرنے لگی۔

شگو اپنے گھر آ گئی۔ شائستہ باورچی خانے میں تھی۔ دادی صحن میں چارپائی پر پڑ سی پڑی سو رہی تھی۔

اس کا بستر میلا نہیں تو اجلا بھی نہیں تھا۔ پرانی سی گھسی ہوئی دری پر میلی کچیلی چادر پڑی تھی۔ تکیہ کا رنگین غلاف بار دھوئے جانے سے اپنی اصلی رنگ کھو چکا تھا۔ دس گیارہ سالہ شگو کو دادی کا بستر دیکھ کر کچھ کراہت سی محسو ہوئی۔

وہ سیدھی باورچی خانے میں گئی۔ "آپا"

"کیا ہے" شائستہ سلور کی دیگچی سے پیالے میں دادی کے لئے چائے

انڈیل رہی تھی۔

"یہ چائے"

"دادی کے لئے بنائی ہے"

"دادی کا بستر کتنا خراب ہے"

"کیوں کیا خراب ہے۔ ابھی تو کل ہی چادر اور تکیے کا غلاف بدلا ہے۔ میں نے خود دھلی ہوئی چادر اور غلاف ڈالے۔ اب یہ چادر اور غلاف اتنے بوسیدہ ہو گئے ہیں کہ دھلے ان دھلے ایک سے لگتے ہیں"

"نئی چادر اور غلاف ڈال دو نا"

"کہاں سے لائیں"

"بہت مہنگی آتی ہے کیا"

"مہنگی سستی کی بات نہیں۔ پیسے بچیں اماں کے پاس تو لائیں نا۔ بیچاری جانے کن مشکلوں سے دادی کی دوا کا خرچہ پورا کرتی ہیں۔ پھر ایک ہی خرچہ تو نہیں اور بھی بہت سے ہیں۔ تجھے کیا پتہ"

"اماں گئی کہاں ہے"

"بازار۔ تمہارے لئے تمہاری سہیلی کا پریذنٹ لانے" شائستہ نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔

شگو چپ ہو گئی۔ وہ ابھی اتنی سمجھدار تو نہیں تھی کہ گھریلو مالی حالات پوری طرح سمجھ سکتی۔ لیکن اتنی ناسمجھ بھی نہ رہی تھی کہ ماں کی مسلسل محنت کے باوجود گھر میں خوشحالی کے فقدان کو محسوس نہ کر سکتی۔

دادی کو چائے پلا کر سرہانے رکھے ململ کے دوپٹے سے شائستہ نے اس کا منہ صاف کیا۔

"دادی اب کیسی طبیعت ہے"

اس نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"کھانسی اٹھتی ہے تو سینے میں درد ہوتا ہے" دادی نے گہری سانس

شگو بھی دادی کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

"تو کہاں تھی شگو" دادی نے پوچھا۔

"دادی۔ تم کتنی کمزور ہو گئی ہو۔ اٹھ کر چل پھر بھی نہیں سکتیں"

شگو نے دادی کا کمزور ہاتھ ہاتھوں میں تھام لیا۔

"دن پورے کر رہی ہوں بیٹی"

دادی نحیف آواز میں بولی۔

"ایسا نہ کہو دادی"

شائستہ نے جلدی سے کہا۔

"آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ ڈاکٹر نے آج دوائی بدلی ہے اماں بازار گئی ہیں لیتی آئیں گی"

دادی نے اک آہ بھری۔ پھر چندھیائی آنکھوں کے گیلے گوشے کانپتے ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

"بیچاری بہو۔ ایک جان پر کتنے بار ہیں۔ میں نے تو کئی دفعہ کہا مجھے نجیب یا لطیف کے ہاں چھوڑ آئے۔ میں ان کی ماں ہوں۔ ان پر بھی کچھ فرض

بنتا ہے۔ ان کی"

"دادی آپ ایسی باتیں کیوں سوچتی ہیں۔ جب تک ہم ہیں آپ کو ایسی باتیں نہیں سوچنا چاہیں۔ آپ کا سایہ خدا ہمارے سروں پر رکھے"

"خرچ کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے"

"یہ پریشانی ذہن سے نکال دیں۔ برا بھلا وقت گزر ہی رہا تھا اور اب تو میں نے بھی اماں کے ساتھ سلائی کا کام شروع کر دیا ہے۔ دسویں کے امتحان سے فارغ جو ہوں۔ اب ڈبل کام ہو جائے گا دادی۔ ڈبل"

"خدا تمہیں زندگی دے بیٹی۔ اونچے نصیبوں والی ہو۔"

"اونچے نصیبوں والی ایک جو ہے دادی"

شائستہ نے مسکرا کر شگو کو دیکھتے ہوئے دادی کو خوش کرنے کے لئے کہا۔

"وہ تو سدا سے ہے۔ خدا تمہیں بھی کرے"

دادی نے دعا دی۔

"شگو" تھوڑی دیر بعد شائستہ نے اسے پکارا۔

"کیا ہے آپا"

"اپنے کپڑے دیکھے"

"ہاں دیکھ لئے"

"پسند آئے"

"اچھے ہیں۔!"

"اماں نے بڑی محنت سے سیئے ہیں۔ ترپائی میں نے کی ہے۔ بہت خوبصورت ہیں، پہنوگی تو شہزادی لگوگی۔ تمہاری سہیلی کی برتھ ڈے میں آنے والی لڑکیوں میں میرے خیال میں سب سے اچھے کپڑے تمہارے ہوں گے۔"

شگو کا موڈ کچھ اچھا نہیں تھا۔ ہوں ہاں کرکے چپ ہو رہی۔

اماں سے ضد کرکے اس نے یہ جوڑا سلوایا تھا۔ سلنے پر خوش بھی ہوئی تھی لیکن اک غیر محسوس سی اداسی بھی اس کے اندر اتر رہی تھی وہ چپ چاپ اندر چلی گئی۔

ان دنوں وہ تضادات کا مجموعہ بنی ہوئی تھی۔ بہت حساس بھی ہوئی تھی۔ اس کی سہیلیاں امیر گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ گاڑیوں میں ٹھاٹھ سے سکول آتی تھیں کنٹین میں پانچ دس روپے روز خرچ کرنا ان کا معمول تھا۔ اپنے گھروں کی باتیں سناتی تھیں۔

کسی کا باپ بہت بڑی فیکٹری کا مالک تھا کسی کا بہت بڑا افسر۔ روپے پیسے کی کسی کے ہاں کمی نہ تھی۔ سب بڑی بڑی جہازی سائز کوٹھیوں میں رہتی تھیں۔

کسی کی ماں سلائی کڑھائی نہیں کرتی تھی ـــ کسی کو فنکشن میں پہننے کے لئے نئے کپڑے بنوانے کے لئے ضد نہیں کرنا پڑتی تھی۔ کسی کو بڑھلائی سکول میں پڑھنے پر یہ نہیں سننا پڑتا تھا کہ مہنگا سکول ہے۔ فیس زیادہ ہے اور خرچ جان لیوہ ہے۔"

اماں بازار سے آگئی۔ وہ کچھ سودا سلف بھی لائی تھی۔ ٹوکری اس نے

شائستہ کے حوالے کرتے ہوئے سفید چادر اتاری۔ گرمی کچھ زیادہ تو نہیں تھی پھر بھی کافی دور تک پیدل چلنے سے اسے پسینہ آرہا تھا رنگت تو پہلے ہی میلی ہو چکی تھی گرمی سے چہرہ سیاہ مائل ہو گیا تھا۔

اس کے ایک ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا۔ دوسرے میں دادی کی دوائی۔

دوائی بھی اس نے شائستہ کو پکڑا دی۔

"اماں کمرے میں آجاؤ ـ تھوڑی دیر پنکھے تلے بیٹھو۔ تمہیں پسینہ آرہا ہے۔ شگو بھی اندر ہے۔"

شائستہ نے دوائی لی اور اماں کی چادر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"دادی ٹھیک ہیں نا؟"

اماں نے سوئی ہوئی ساس پر نگاہ ڈالی۔

"ہاں آپ اندر آجائیں نا ـ" شائستہ نے ماں سے کہا۔

اماں اندر آگئی۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا پیکٹ شگو کو دکھاتے ہوئے بولی۔

"تیرے لئے پورا بازار گھومنا پڑا۔"

"کیا لائی ہو اماں" شگو چارپائی پر بیٹھے بیٹھے بولی۔ پیکٹ ماں سے لے کر دیکھنے لگی۔

"تیری سہیلی کے لئے تحفہ۔"

اماں عین پنکھے کے نیچے چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"پانی لاؤں اماں؟" شائستہ نے پوچھا۔

"پلادے" ماں نے کہا شائستہ پانی لینے چلی گئی۔

"یہ کیا لائی ہو"؟ شگو نے پوچھا۔

"کھول کر دیکھ"

"کوئی اچھی سی چیز لائی ہو نا اماں"

"اس سے اچھی چیز اور کوئی چیز نہیں تھی"

"سچی"

"ہاں"

شگو نے پیکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھولدار کاغذ میں خوبصورتی سے پیک کی ہوئی دو کتابیں تھیں۔

اگلے دن وہ برتھ ڈے پارٹی میں شرکت کے لئے تیار ہو کر رفیق پھوپھا کے ساتھ لکو کے ہاں گئی۔ رفیق پھوپھا اپنی سائیکل پر بٹھا کر اسے چھوڑنے آئے تھے۔

بہت بڑی کوٹھی کے آہنی گیٹ پر انہوں نے اسے اتارا۔ اندر ڈرائیوے پر تو گاڑیاں ہی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ گیٹ کے باہر بھی کچھ گاڑیاں پارک کی گئی تھیں۔

"دو گھنٹے کے بعد لینے آجاؤں گا۔ تم یہیں گیٹ پر آجانا" رفیق نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"اچھا پھوپھا جی" وہ جلدی سے بولی۔

ابھی گاڑیاں آرہی تھیں اس کی ایک اور کلاس فیلو بھی بڑی سی گاڑی

سے باہر نکلی۔

شگو کچھ گھبرا سی گئی۔ رفیق کو بھی گاڑیوں کے درمیان سائیکل لئے کھڑا ہونا کچھ اچھا نہیں لگا وہ اسے پورے چھ بجے گیٹ پر آنے کا کہہ کر واپس ہو لیا۔

وہ کلاس فیلو اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔

"ہیلو شگو ابھی آئیں"

"ہاں"

"بڑے اچھے کپڑے پہنے ہیں۔ پریزنٹ کیا لائی ہو"؟

شگو کپڑوں کی تعریف سن کر خوش ہو گئی چہک کر بولی۔

"یہ کتابیں دوں گی پریزنٹ"

"میں تو یہ گڑیا لائی ہوں۔ پپا ہانگ کانگ سے لائے تھے" اس کی سہیلی نے کہا۔

دونوں اندر آگئیں جہاں بہت سے مہمان بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔ لکو کا گھر بہت بڑا اور سجا ہوا تھا۔ شگو تو ششدر سی رہ گئی تھی۔ ڈرائنگ روم اتنا بڑا تھا کہ اس کا اپنا پورا گھر اس میں سما سکتا تھا پھر ڈرائنگ روم کی آرائش کیا کہنے۔

شگو نے تو کبھی خواب میں بھی ایسا گھر نہیں دیکھا تھا۔ کتنے نرم نرم موٹے موٹے قالین بچھے ہوئے تھے۔ نرم و گداز صوفے۔ ریشمی لہراتے پردے۔ لکڑی کا چمکتا دمکتا فرنیچر آرائشی چیزیں۔ دیواروں پر لگی خوبصورت فریموں والی سینریاں

کونوں میں رکھے نفیس بڑے بڑے دانز۔ پتھر کے تراشے ہوئے مجسّ
کانسی کی مورتیاں کیا خوبصورت اور نفیس چیزیں تھیں۔ شگو کو ان کی قیمت کا
احساس تو نہیں تھا لیکن ان کی سجاوٹ سے وہ مرعوب و متاثر تھی۔

گگو اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ پنک رنگ کے کمرے میں کچھ
مسہری پر پنک پھولدار بیڈ کور پڑا تھا۔ ایک طرف دو کرسیاں تھیں جنکے
نرم فوم کے گدیلے بھی پنک رنگ کے تھے۔ کارپٹ بھی گہرا پنک تھا فرش
کو دیوار سے دیوار تک ڈھانپے ہوئے تھا۔

ایک طرف میز رکھا تھا جس پر گگو کی کتابیں سجی تھیں۔ سامنے کرسی
پڑی تھی۔ ٹیبل لیمپ کا شیڈ اور کرسی کی گدیاں بھی چھوٹے چھوٹے پھول
والی ہلکے گلابی رنگ کی تھیں۔ پردے بھی اسی طرح کے ملتے جلتے شیڈ کے
تھے۔ گگو نے اسے ممی ڈیڈی کا کمرہ بھی دکھایا۔ یہ ہلکے نیلے رنگ کا تھا
رنگ کی مناسبت سے کمرے کی ہر چیز تھی۔ دونوں بھائیوں کے کمرے بھی
ہلکے اور گہرے نیلے رنگوں کے تھے۔

وہ اسے اپنی بڑی بہن کے کمرے میں لے گئی یہ سفید اور ہلکے سبز
رنگ کے شیڈوں پر مشتمل تھا۔ ہر چیز نفیس اور خوبصورت تھی۔

گگو اسے اپنی دادی کے کمرے میں لے گئی۔ سفید پردوں اور سفید
کارپٹ والا یہ کمرہ اس کی دادی کے سفید بالوں سے بہت میچ کر رہا
ہر چیز صاف ستھری اور اجلی اجلی تھی۔ دادی اماں کی طبیعت کچھ خراب تھی
اس لئے وہ اپنے نرم و گداز بیڈ میں پڑی تھیں۔ سائیڈ ٹیبل پر ان کی دوائیاں

بڑی ترتیب سے رکھی تھیں۔

گگو نے شگو کو اپنی ساری کوٹھی گھما کر دکھائی۔

شگو بڑی مرعوب بڑی متاثر تھی اتنا شاندار گھر اس نے پہلے کہاں
دیکھا تھا۔

گھوم پھر کر وہ ڈرائینگ روم میں آ گئیں جہاں گگو کی اور بھی کلاس فیلوز
اور سہیلیاں بیٹھی تھیں اس نے سب کا تعارف اپنے ممی ڈیڈی سے کروایا
دونوں نے ان بچیوں کو بہت پیار کیا۔ انہیں خوش کرنے کے لئے ڈیڈی نے
دو ایک لطیفے بھی سنائے۔

پھر

سالگرہ کی رسم ہوئی۔ کیک کٹا۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو کورس کی صورت
گایا گیا۔ اس کے بعد پر تکلف چائے پی گئی۔ ہر چیز اتنی خوشگوار اور مسحور کن
تھی کہ شگو کا جی چاہ رہا تھا کہ اسی ماحول میں جیتی رہے۔ کتنا اچھا لگ رہا
تھا یہ سب کچھ۔

شگو گکو کا گھر کیا دیکھ آئی تھی۔ اپنے گھر والوں کا سر کھالیا تھا۔

" اماں گکو کا گھر بہت بڑا ہے "

" یہ بڑے بڑے کمرے ۔ اتنی اچھی اچھی چیزیں "

" اور اماں باغیچے بھی تھے اس گھر میں۔ اتنے پیارے پیارے پھول تھ[ے] بیلیں تھیں۔ درخت تھے۔ گھاس اتنی سبز سبز۔ ہمارے سکول کے چمن [میں] بھی ایسی نہیں "

" آپا اس کی بہن کا کمرہ اتنا اچھا تھا ۔ اتنا اچھا تھا کہ کیا بتاؤں "

" گکو کا کمرہ گلابی رنگ کا تھا ہر چیز گلابی ۔ نرم نرم بستر ۔ کتنا شاندار تھا [اس] کا کمرہ "

" اور آپا بیٹھک پتہ ہے کتنی بڑی ہے ۔ اتنی بڑی ۔ ہمارے پورے گھر سے بھی بڑی۔ سارے گھر میں موٹے موٹے قالین پڑے تھے اور آپا [اتنے] بڑے بڑے کالے اور سفید مجسمے ۔ بڑے بڑے گلدان ۔ میرے کندھوں

کے برابر تھے ۔ ہاں "

" اماں دیواروں پر بھی قالین لگے ہوئے تھے "

" اور بڑی بڑی تصویریں بھی دیواروں پر لگی تھیں ۔ بیٹھک میں "

" ہائے اتنا پیارا گھر ہے گکو کا ۔ جی چاہتا ہے میں بھی وہیں رہا کروں "

" اماں سارے کمروں میں اے سی لگے ہوئے تھے "

" آپا گکو کی ممی اور ڈیڈی بھی بہت اچھے ہیں۔ بہت پیار کیا ہمیں ۔ اس کے ڈیڈی نے ہمیں لطیفے بھی سنائے ۔ سناؤں آپ کو "

" اور پتا ہے آپا کیک کتنا بڑا تھا ۔ اتنا ۔ آپ نے کبھی دیکھا بھی نہیں ہوگا۔ بہت بڑی میز تھی۔ ساری کھانے کی چیزوں سے بھری تھی۔ بہت سارے لوگ تھے ۔ سارے بہت اچھے تھے ۔ اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے سب نے "

اماں اور آپا اس کی باتیں پہلے تو شوق سے سنتی رہیں۔ لیکن جب شگو وہی باتیں بار دہرانے لگی تو اکتا کر اماں نے کہا۔

" چل اب بس بھی کر سن لی ہیں تمہاری باتیں "

" یہ تو پاگل ہی ہو رہی ہے اماں " شائستہ نے تمسخرانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

" گکو کا گھر کیا دیکھ آئی ہے ۔ ہوش ہی جیسے کھو بیٹھی ہے "

شگو چہک کر بولی۔

" تم نے دیکھا ہے کبھی ایسا گھر "

"مجھے دیکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ دیکھ کر تمہاری طرح حواس کھونا نہیں
چاہتی۔"

شگو کے ذہن پر اس خوبصورت گھر کے نقوش جم گئے تھے۔ بہت
اچھا لگا تھا اسے گکو کا گھر۔ اس کے معصوم ذہن کے کسی گوشے میں ایسے ہی
گھر کی تمنا موجود تھی۔

"کاش میرا گھر بھی گکو جیسا ہوتا۔"

وہ آنکھیں بند کر کے سوچ رہی تھی۔

"شگو۔"

شائستہ نے اس کا کندھا ہلایا۔

"کیا ہے۔؟"

شگو نے آنکھیں کھول دیں۔

"اٹھو کپڑے بدلو۔"

"آپا"

"ہاں"

"گکو کے گھر۔۔!"

"اوہ خدایا۔ بس بھی کر اب۔" شائستہ نے آہستہ سے اس کے
پیار بھری چپت لگائی۔

"بس تھوڑا کرے گی۔" اماں نے ہنس کر کہا۔

"اس کا حال دیکھ نہیں رہیں۔ بھئی یہ تو ایک گھر دیکھ کر آئی ہے اس

جو دو چار اور دیکھ لئے تو بس گئی کام کاج سے۔"

شائستہ بھی ہنس پڑی۔

لیکن

شگو بڑی سنجیدگی سے اماں کو دیکھ کر بولی۔

"اماں ہمارا گھر گکو جیسا کیوں نہیں"

اماں نے ایک گہری سانس لی پھر شائستہ کی طرف دیکھ کر آنکھوں سے اشارہ
کیا۔ "میں جانتی تھی یہ ایسے سوال کرے گی۔"

"تم جواب دو نا اماں۔"

اماں کیا جواب دیتی۔ کچھ سوال ایسے ہوتے ہیں۔ جن کے جواب کئی اور
سوالوں کو جنم دے دیتے ہیں۔ اس لئے اماں کچھ نہیں بولی۔

"ہیں آپا۔ ہمارا گھر اتنا خراب سا کیوں ہے۔ گکو ایسا کیوں نہیں۔"

شائستہ نے پیار سے کہا۔

"کیا فضول سوال کر رہی ہے۔ ظاہر ہے وہ امیر لوگ ہیں۔ ان کے پاس
دولت ہے جو جی چاہے لے سکتے ہیں بنوا سکتے ہیں۔"

"ہمارے پاس دولت نہیں ہے۔؟"

شگو نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"لو سن لو۔"

اماں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ شائستہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔

"کیوں نہیں ہے ہمارے پاس دولت۔ بہت ہے بے شمار ہے۔ اماں

نے چھپا کر رکھی ہے بڑی پیٹی میں ۔ ہوا نہیں لگاتیں اسے ۔"

"سچ آپا"

شگو بے اختیارانہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔

"بیٹھ جاؤ شگو ۔ اِدھر میرے پاس آکر بیٹھ ۔ مذاق کر رہی ہے شا تجھ سے ۔ ارے پگلی ہمارے پاس دولت ہوتی تو ہمارا گھر گکو جیسا نہ ہوتا"

اماں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ۔

"تو ہمارے پاس کیوں نہیں ہے"

شگو نے اماں کے پاس بیٹھتے ہوئے سوال کر دیا ۔

"بس ہم غریب ہیں ۔" شائستہ بولی ۔

"طاہر لوگ بھی غریب ہیں"

اس نے ایکا ایکی سوال کیا ۔

"یہ سارا محلہ ہی اپنے ایسے لوگوں کا ہے ۔ امیر کبیر لوگ ایسی گلیوں میں تھوڑا ہی رہتے ہیں ۔"

شائستہ نے کہا ۔

"اماں تو کہا کرتی ہے سامنے والے ملک صاحب امیر ہیں ۔ شاہد امیر ہیں ۔"

شگو نے محلے کے دو تین کھاتے پیتے لوگوں کے نام گنوا دیئے ۔

"ہاں بھئی ۔ وہ بھی امیر ہیں ۔ لیکن تمہاری گکو جتنے نہیں ۔ گکو کے گھر کا جو نقشہ تم کھینچ رہی ہو ۔ وہ تو بے حد امیر لوگ لگتے ہیں ۔"

شگو کی سمجھ میں نہیں آیا ۔ امیر اور بے حد امیر کا فرق اس کا مرعوب و متاثر ذہن ٹھیک سے سمجھ نہ سکا ۔

"اماں ۔ !"

وہ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد بولی ۔

"ہوں"

"ہمارے پاس دولت نہیں آسکتی ۔"

"نہیں ۔ !"

"کیوں ۔ !"

"دولت کمانے والا تیرا باپ تھا ۔ جواب نہیں ہے ۔"

"جن کے باپ نہیں ہوتے ان کے پاس دولت بھی نہیں ہوتی ۔"

"ہاں"

"پھر طاہر لوگوں کے پاس دولت کیوں نہیں ہے ۔ طاہر کے ابو تو زندہ ہیں ۔ رفیق پھوپھا دولت نہیں لاسکتے ۔"

"لاتے رہتے ہیں ۔"

"سچی ۔ !"

"ہاں ۔ !"

"طاہر کا گھر بھی گکو جیسا بن جائے گا ۔"

"کیا خبر وہ وقت بھی آجائے ۔"

شگو خوش ہو گئی ۔ پھر جلدی سے بولی ۔

"پھوپھا کا گھر گگو جیسا بن گیا نا — تو اماں — پھر —"

"پھر کیا"

"پھر ہم لوگ بھی ان کے گھر رہا کریں گے"

"خواہ مخواہ"

شائستہ نے چھیڑا۔ "دوسروں کے گھر خواہ مخواہ رہنے لگیں گے"

"تم بے شک نہ رہنا میں تو رہوں گی"

شگو کی بات پر اماں مسکرا دی۔

شائستہ نے بھی مسکرا کر ماں کو دیکھا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسری کو بڑا پرامید اور لطیف سا اشارہ کیا۔

شائستہ ہنس کر بولی۔

"ہو سکتا ہے تو وہیں رہنے لگے"

اماں نے کہا۔ "کاش ایسا ہو"

شگو ان کی باتوں سے کچھ نہ سمجھ پائی۔ اس کے ذہن میں تو گگو کے خوبصورت گھر اور خوبصورت چیزوں نے ہلچل مچا رکھی تھی۔

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد وہ پھر چشم تصور سے گگو کا گھر دیکھتے ہوئے بولی۔

"آپا — !"

"ہاں — !"

"گگو کی دادی ماں بھی ہے"

"اچھا — !"

"وہ بھی بیمار ہے"

"چلو دونوں سہیلیوں میں ایک قدر مشترک تو ہوئی"

اماں نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن اماں"

"ہوں — !"

"اس کی دادی میری دادی کی طرح تو نہیں"

"پھر کیسی ہے"؟

"گوری گوری — سارے بال بھی سفید ہیں — اس کا کمرہ بھی سفید ہے یہ بڑا سا پلنگ جس پر وہ لیٹی تھی۔ ہماری دادی تو ہر وقت ٹوٹی ہوئی چارپائی پر میلے سے بستر پر پڑی رہتی ہے نا"

"ہوں — !"

"کیوں اماں — ہماری دادی کا کمرہ — ویسا کیوں نہیں"

"اب بس بھی کر دماغ چاٹ لیا ہے"

اماں نے جھنجلا کر کہا۔

شائستہ نے بھی ڈانٹ پلائی۔

شگو ٹکر ٹکر ان کا منہ تکنے لگی۔

لیکن اس کے تصور میں گگو کا گھر بسا رہا۔ ڈانٹ ڈپٹ کھانے کے بعد وہ اماں اور آپا سے تو پھر اس گھر کے بارے میں کوئی بات نہ کر سکی۔

لیکن باتیں کرنا ضرور تھیں۔ اسے کچھ اندرونی طور پر فخر کا احساس ہو رہا تھا۔ خوبصورت گھر کو دیکھنا ہی اس کے لئے بہت بڑی بات تھی شاید۔

شام کے دھندلکے پھیل رہے تھے۔ موسم کچھ بدل رہا تھا گرمی کی آمد آمد تھی، شائستہ نے صحن دھو کر ٹھنڈا کیا۔ دادی اماں کو دوائی پلائی تھی اور اب دوسری چارپائی گھسیٹ کر صحن میں لا رہی تھی۔

"اس طرف سے پکڑنا شگو"

اس نے شگو سے کہا۔

جو کپڑے بدل کر کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔

شگو نے آگے بڑھ کر چارپائی کا سرا پکڑا دونوں بہنیں چارپائی اٹھا کر صحن میں لے آئیں۔

شگو دادی ماں کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں گگو کی دادی کا کمرہ گھوم رہا تھا۔

"کتنا پرسکون اور خوبصورت تھا کمرہ۔ اس کا بیڈ کتنا نرم تھا۔ نرم نرم تکیوں میں دھنسی ہوئی تھی۔ بے داغ سفید چادر سے جسم ڈھانپا ہوا تھا

وہ بار بار اپنی دادی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں بے ربط سے سوال اٹھ رہے تھے۔ وہ بھی دادی تھی۔

یہ

بھی

دادی ہے۔

لیکن وہ اور یہ۔

"آپا۔!" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔!"

شائستہ چارپائی پر پرانی لکیر دار بچھاتے ہوئے بولی۔

"آپا دادی کو سفید چادر دو نا۔ یہ رنگدار چادر کتنی میلی لگتی ہے اور تکیے کے غلاف بھی سفید نہیں ہیں کیا۔"

"ٹھیک ٹھاک ہیں بیٹی۔"

دادی نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"کل ہی تو بدلے تھے تیری ماں نے۔"

شائستہ ہنس کر بولی۔

"دادی۔ یہ شگو ہے نا۔ اپنی امیر کبیر سہیلی کے ہاں آج ہو کے آئی ہے۔ اس سہیلی کی دادی کو دیکھ کر آئی ہے۔ جس کا پورا کمرہ ہی سفید ہے۔ پردے قالین بستر لباس۔ سب دودھیا رنگ کے۔ اسے تمہارا بستر عجیب لگ رہا ہے نا۔"

شگو نے منہ بنایا۔ وہ کچھ کہنے کو تھی کہ اوپر جنگلے سے آدھا دھڑ لٹکاتے ہوئے ربیعہ نے آواز دی۔

"شگو۔ آگئی ہے پارٹی سے ہو کر۔!" اس نے کہا

"ہاں۔!"

شگو نے اوپر تکتے ہوئے جواب دیا۔

"آنا اوپر ---!" ربیعہ کے پیچھے کھڑے طاہر نے بلایا۔

"آتی ہوں" وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔

شگو اٹھی تو شائستہ نے ہنس کر ربیعہ اور طاہر سے کہا۔

"تیار ہو جاؤ اب تم لوگوں کا مغز چاٹے گی یہ --- بس یہ آج اپنی سہیلی کے گھر کا پورا نقشہ تمہاری آنکھوں کے سامنے لے آئے گی"

شگو بنا کچھ کہے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

پھوپھی کو سلام کر کے وہ ان کے قریب ہی تخت پر بیٹھ گئی۔ طاہر اور ربیعہ شگو کے ساتھ ہی اوپر سے نیچے اترے تھے۔ ابھی ملگجا سا اجالا تھا۔ لیکن ربیعہ نے صحن کی بتی جلا دی۔ رفیق ابھی دکان سے نہیں لوٹا تھا۔

"پھوپھا وقت پر ہی لینے پہنچ گئے تھے نا شگو" رشیدہ نے پوچھا۔

"جی ---!"

"کیسی رہی تیری سہیلی کی سالگرہ"

"بہت شاندار پھپھو میں نے پہلی بار ایسی سالگرہ دیکھی ہے"

"امیر لوگ ہوں گے --- یہ چونچلے انہی کو بھاتے ہیں"

"امیر نہیں --- بیحد امیر پھپھو"

دس گیارہ سالہ شگو نے شائستہ کی بات دہرائی۔

"اچھا" ربیعہ نے آنکھیں پھیلائیں۔

"تب تو پورا جشن ہوگا"

"ہاں ۔ بالکل" شگو بولی۔
پھر چشمِ تصور میں ابھر آنے والے گگو کے بے انتہا خوبصورت گھر کی
تعریفیں بڑے فخریہ انداز میں کرنے لگی۔
"تم نے ایسا گھر دیکھا ہے کبھی"
اس نے ربیعہ سے پوچھا۔
"ہاں اس سے بھی شاندار"
"جھوٹی"
"واہ جھوٹی کیوں ۔ اچھا بتا گگو کے چمن میں فوارہ ہے؟"
"نہیں۔ فوارہ تو نہیں دیکھا"
"میں نے فوارے والا گھر دیکھا ہوا ہے۔ ہیں نا امی ۔ ہم لوگ گئے
تھے نا۔ آپ کے ساتھ۔ آمین انکل کے گھر۔ کتنا خوبصورت گھر ہے
کا۔ سامان بھی بہت اچھا ہے"
"ان کے گھر میں قالین بچھے ہوئے ہیں" شگو نے پوچھا۔
"ایک قالین ۔ ان کی تو سیڑھیوں پر بھی قالین بچھے ہیں۔ ہیں نا امی"
اس نے ماں سے تائید چاہی۔
رشیدہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"بھئی وہ کروڑ پتی لوگ ہیں"
"کون ہیں وہ"
شگو جلدی سے بولی۔

"ہیں ہمارے دور پار کے رشتہ دار" رشیدہ بولی۔
شگو بولی۔ "ان کی سیڑھیوں پر بھی قالین بچھے ہیں پھپھو"
"ہاں بیٹی ۔ ہر چھ ماہ بعد تو وہ یورپ امریکہ جاتے ہیں۔ وہاں سے چیزیں
لے آتے ہیں ۔ روپے پیسے کی کمی جو نہیں۔ صرف قالین ہی نہیں ان کے
ہاں تو ایسی ایسی چیزیں ہیں کہ بس"
شگو پھپھو کے قریب کھسکتے ہوئے بولی۔
"پھپھو۔ مجھے کبھی ان کے گھر لے چلیں گی"
"کبھی موقعہ بنا تو" رشیدہ نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا ۔ پھر جلدی
سے بولی۔
"اگلے ماہ ان کی بیٹی کی شادی ہے اگر ہمیں بلایا نا ۔ تو میں تمہیں ضرور
لے چلوں گی"
"آہا" شگو نے خوشی سے تالی بجائی۔
طاہر جو چپ چاپ کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ شگو کے اس طرح
خوش ہونے پر بولا۔
"اس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے؟"
"کیوں نہیں ۔ ان کا گھر گگو سے بھی خوبصورت ہے ۔ میں تو ضرور
جاؤں گی"
"گھر دیکھنے سے کیا فائدہ ۔ مزا تو تب ہے اپنا گھر ایسا ہو"
"تم نے ان کا گھر دیکھا ہے"

"نہیں"

"دیکھنے کو دل نہیں چاہا"

"وہی تو کہہ رہا ہوں۔ فائدہ کیا مزہ تو جب ہے اپنا گھر ایسا ہو"

"اپنا ایسا نہیں ہو سکتا نا" شگو بڑے جہاندیدہ انداز میں بولی، "اس کے لئے دولت چاہیئے، دولت — اور دولت ابا لاتے ہیں میرے تو ابا ہیں ہی نہیں"

طاہر نے قہقہہ لگایا۔ رشیدہ حیران سی شگو کو تکنے لگی — ربیعہ مسکرانے لگی۔

"سب ابا نہیں لاتے دولت" وہ بولا۔

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ — !"

"آپا نے اماں نے — !"

شگو نے اپنی خوبصورت آنکھیں طاہر کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا تھا — ؟" رشیدہ بولی۔

"یہی کہ ابا ہوں تو دولت آ سکتی ہے"

وہ معصومیت سے بولی۔

"ہمارے تو ابا ہیں — لیکن پھر دولت کیوں نہیں آتی"

طاہر نے تکرار کی۔

"آتی ہے — !" بڑے اعتماد سے شگو نے کہا۔ "تمہارے ابا کما کما کر لاتے رہتے ہیں دولت۔ اماں کہتی ہے تمہارا گھر بھی تمکو کی طرح بن سکتا ہے

تمہارے ابا جو ہیں"

"پاگل ہو تم — !" طاہر نے ہنس کر کہا۔ چودہ پندرہ سالہ لڑکا شگو کی منطق قبول نہ کر سکا۔

شگو ایک دم جیسے برس پڑی۔ "تو کیا میری اماں جھوٹ کہتی ہے"

"صبر بیٹی صبر —" رشیدہ نے اس کی پیٹھ پہ ہاتھ پھیرا پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

"اللہ کرے تمہاری اماں کی بات سچ ہو۔ تمہارے پھوپھا اتنی دولت کمائیں کہ ہمارا گھر بھی تمہاری سہیلی جیسا بن جائے"

"سہیلی جیسا کیوں" ربیعہ جھٹ سے بولی۔

"انکل امین جیسا کیوں نہیں امی — اس کی سہیلی کے چمن میں تو فوارے بھی نہیں، نہ سیڑھیوں پر قالین ہیں"

رشیدہ ہنس پڑی۔

شگو جھٹ سے بولی۔ "ہاں پھپھو انکل امین جیسا ہی بنوانا"

"بنوانا — ہاہا —" طاہر نے پھر قہقہہ لگایا۔

"شیخ چلی والی باتیں ہیں"

"نہیں" شگو پورے تیقن سے نگاہیں گھماتے ہوئے بولی۔

"پھوپھا دولت کما کما کر لا سکتے ہیں"

"اچھا بھئی اچھا" طاہر نے ہتھیار ڈال دیئے۔

"جو تم کہو ٹھیک ہے — بس — !"

شگوفتہ فخر سے سر اٹھا کر ہنسی۔ پھپھو سے بولی۔ "پھپھو"

"ہاں"

"آپ کا انکل ایبن جیسا گھر بن جائے گا۔ نا۔ تو۔ تو"

"تو کیا" پھپھو دل لگی کرنے لگی۔

"تو میں بھی آپ کے گھر رہا کروں گی" اس نے سر ہلا دیا۔

"کیوں نہیں کیوں نہیں" رشیدہ نے نور مسرت سے اسے باہوں میں بھر لیا۔

"واہ۔ تم کیوں رہو گی اس گھر میں" طاہر نے چھیڑا۔

"بس میری مرضی۔ رہوں گی۔ رہوں گی" شگو چڑچڑی سی ہو کر بولی

ربیعہ ہنسنے لگی

"ہاں بھئی۔ یہ وہاں رہے گی" رشیدہ نے بیٹے کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔

"نہیں رہے گی" وہ بھی تاؤ میں آگیا۔

"رہوں گی" شگو لڑنے پہ اتر آئی۔

"میری جان تسلی رکھو" رشیدہ نے اسے گلے سے لگا لیا۔

"گھر ویسا بنے یا ایسا ہی رہے تمہیں اپنے پاس رکھنے کی میری دلی تمنا

شگو کچھ نہ سمجھی۔ پھپھو کے بازوؤں سے نکلتے ہوئے بولی۔

"نہیں پھپھو۔ گھر ایسا ہی رہے۔ تو پھر میں یہاں نہیں رہوں گی۔ ام

کے ساتھ۔ میں نے تو اماں اور آپا سے بھی کہہ دیا ہے"

"کیا کہہ دیا ہے"

رشیدہ بڑے پیار شوق اور تجسس سے پوچھنے لگی۔

شگو نے برملا کہا۔ اماں کہتی تھی آپ کا گھر گگو جیسا بن سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ جب بنے گا ہم سب وہاں رہیں گے۔ پھپھو آپا نے پتہ ہے کیا کہا۔

"کیا۔؟"

"کہنے لگی ہم نہیں رہیں گے وہاں"

"اچھا۔!"

"پر میں نے کہا تم بے شک نہ رہو میں رہوں گی۔ ٹھیک ہے نا پھپھو"

طاہر نے ماں سے چھپ کر اسے ستانے کو ٹھینگا دکھایا۔ شگو چیخ اٹھی۔

"دیکھو پھپھو طاہر کو۔ میں نہیں بولتی اس سے"

"نہ نہ۔ نہ" طاہر جلدی سے بولا۔ "معافی۔ معافی"

"کس بات کی معافی" رشیدہ بچوں کی باتوں سے محظوظ ہو رہی تھی۔

طاہر بھائی نے شگو کو ٹھینگا دیا تھا۔ ربیعہ بولی۔

"شگو ناراض ہوگئی ہے"

"ہٹ بے وقوف" رشیدہ نے پیار سے اسے ڈانٹا۔

"یوں نہ چڑایا کر میری بیٹی کو"

"آپ کی بھی لاڈلی بن گئی" طاہر بولا۔

"وہ تو سدا سے ہے" وہ بولی۔

پھر شگو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"تیرا منہ خدا کرے ۔ تیرے پھوپھا خوب دولت کمائیں، پھر انکل
جیسا گھر بنے اور تو اس گھر میں راج کرے"

شگو نے خوش ہو کر طاہر کا منہ چڑایا۔

رشیدہ کسی کام سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ تینوں بچے وہیں بیٹھے باتیں
کرنے لگے۔ پھر پھر کر موضوع پھر وہی گکو کا گھر تھا ۔ شگو تعریفیں کئے جا رہی تھی
اب طاہر بھی اس کی باتیں توجہ اور شوق سے سن رہا تھا اور تجسس سے
سوال بھی کر رہا تھا۔

"طاہر" شگو آنکھوں میں تصور لئے بولی۔

"ہوں"

"تمہارا گھر بھی ایسا ہی بن گیا تو کتنا مزہ آئے گا"

"ہاں ۔ پھر تم ہمارے گھر ہی رہو گی نا"

"بالکل رہوں گی"

"پکا پکا وعدہ"

"پکا پکا"

طاہر نے وعدہ لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ شگو نے اس کے ہاتھ پر
ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا۔ ربیعہ ہنس کر بولی۔ "گھر بنا نہیں اور وعدے ہو رہے
ہیں، واہ وا ۔"

"تمہیں اس سے کیا" طاہر نے کہا۔

"تم نہیں چاہتی ہو گی نا ۔ کہ میں تمہارے ساتھ رہوں" شگو روٹھنے لگی

تو ربیعہ اس کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول گئی۔

"تم تو میری پکی پکی سہیلی ہو۔ تمہارے رہنے سے تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔"

"ہاں شگو" طاہر بولا۔ "تم تو ہمیں بہت اچھی لگتی ہو۔ تمہیں بھلا کون نہیں
چاہے گا۔ اس گھر میں رکھنا"

"میں تمہیں اچھی لگتی ہوں" شگو نے پوچھا۔

"ہاں بہت اچھی لگتی ہو" طاہر نے ایمانداری اور معصومیت سے جواب دیا۔

"تو پھر چڑاتے کیوں ہو مجھے"

"مزہ آتا ہے"

"میں بھی چڑاؤں گی پھر"

"نہ بھئی نہ ۔ اس طرح لڑائی ہو جائے گی"

"ہو جائے"

"کہا نا ۔ نہ ۔ تم مجھ میں لڑائی ہونا تو مجھے اچھا نہیں لگتا"

شگو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"طاہر بھائی اصل میں تم سے ڈرتے ہیں تم سے" ربیعہ ہنسی۔

"واہ" طاہر سینہ تان کر بولا۔ "اس بالشت بھر کی لڑکی سے میں کیوں
ڈرنے لگا۔"

"پھر اس کی باتیں کیوں مانتے ہو۔ جو کہتی ہے وہی کرتے ہو" ربیعہ بولی۔

"وہ تو اس لئے کہ یہ ہمیں اچھی لگتی ہے" طاہر سینہ پھلا کر بولا۔

شگو خوش ہو گئی۔

تینوں دیر تک اسی قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں کرتے رہے۔ جن کا بظا
کوئی مطلب و مقصد نہیں تھا۔ لیکن جو معصوم لگاؤ اور پیار کے جذبوں کا بے
دھڑک اظہار تھا۔

بچپن معصوم ہوتا ہے، ہیرا پھیری سے شناسا ہوتا نہیں — نہ ہ
پیار و محبت کے پاکیزہ جذبوں پر تصنع کا لیبل لگانا جانتا ہے۔ اسے بناو
نہیں آتی نہ ہی پردہ پوشی سے کام لیتا ہے۔ جو کچھ کہنا ہوتا ہے۔ برملا کہتا ہ
خلوص نیت اور صدق دل سے کہتا ہے۔

اس وقت من میں میل نہیں ہوتا۔ معصومیت کا تقدس اور اجالا
میں پھیلا ہوتا ہے۔ اس لئے جذبوں کی سچی اور صحیح ترجمانی اپنے آپ ہ
جاتی ہے۔

"سن شگو"

"کیا ہے"

"امی بتا رہی تھیں کہ تم ماڈرن سکول چھوڑ رہی ہو"

"ہاں"

"واقعی"

"کہا ہے نا — ہاں"

"پر کیوں"

"میری مرضی —"

"یہ کیا بات ہوئی — چھٹی جماعت تک ہی پڑھنا تھا یہاں"

"ہاں — ہاں — ہاں —"

"بھئی غصے میں کیوں آتی ہو — میں تو سیدھی بات پوچھ رہا ہوں انگلش میڈیم میں پڑھتے پڑھتے ایک دم ہی اردو میڈیم میں آگئیں۔ شائستہ آپا والے

سکول میں داخلہ لے رہی ہو ___"

"ہاں لے رہی ہوں ___ اسی سکول میں ___ جہاں سے آپا نے میٹرک
پاس کیا ___"

"یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ آخر کیوں ___؟"

"اور میں بھی یہی کہہ رہی ہوں کہ میری مرضی ___"

"مجھے پتا ہے"

"کیا ___؟"

"کہ کیوں سکول چھوڑ رہی ہو"

"کیوں چھوڑ رہی ہوں بھلا ___؟"

"شائستہ آپا کی شادی کی باتیں ہو رہی ہیں نا ___"

"تو پھر ___"

"مامی کہہ رہی تھیں شگو کے سکول کا خرچہ بہت زیادہ ہے۔ شائستہ
لئے کوئی چیز ہی نہیں بنا سکتیں۔ نہیں مامی نے اس سکول سے ا
ہوگا۔ بچت کے لئے"

"طاہر ___"

"لڑتی کیوں ہو ___؟"

"تم خود لڑنے والی باتیں کرتے ہو"

"میں نے تو صرف یہی کہا ہے نا کہ مامی نے اٹھا لیا ہوگا اس سکو
"جبکہ یہ بات نہیں ہے۔ اماں تو اب بھی کہتی ہیں کہ میٹرک نہ سہی

یہاں ہی پڑھ لو"

"پھر ___"

"بس نہیں جاؤں گی اب اس سکول"

"کسی نے کچھ کہا"

"نہیں ___"

"اب بتا بھی دو نا ___؟"

طاہر بڑے پیار سے اصرار کرنے لگا تو شگو بھی کچھ نرم پڑ گئی دونوں چھت پر تھے۔ طاہر جب سے دسویں جماعت میں آیا تھا چھت والے کمرے میں آگیا تھا۔

صبیحہ نے ہی یہ کمرہ اس کے لئے ٹھیک ٹھاک کر دیا تھا۔ بیکار کی چیزوں سے بھرا رہتا تھا یہ کمرہ ___ اس نے فالتو چیزیں باہر نکال پھینکیں، کچھ نچلے کمروں میں لے گئی۔ الگ کمرہ دینے کا مقصد تھا کہ میٹرک کی تیاری سکون سے کر سکے۔

نیچے ویسے بھی تین کمرے ہی سونے کے تھے۔ اب تک وہ دونوں بھائیوں کے کمرے میں ہی سوتا تھا۔ اماں ابا کا بیٹھک سے ملحقہ کمرہ تھا اور کوٹھڑی کے ساتھ والے چھوٹے کمرے میں ربیعہ اور صبیحہ سوتی تھیں ___ بمشکل دو چار پائیاں یہاں ڈالی جا سکتی تھیں۔

امی نے نئی پیٹی خرید کر اسی کمرے میں رکھی تھی، کوٹھڑی میں بھی کافی کاٹھ کباڑ تھا۔ گندم اور چاول کی بوریاں بھی یہیں رکھی رہتی تھیں۔ ابا سال بھر کا

راشن اکٹھا ہی لے لیا کرتے تھے۔

چھوٹے دونوں بھائی بہت شوخ اور جھگڑالو سے تھے۔ لڑائی جھگڑ
تو خوب گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے۔ دونوں کی آپس میں بنتی بھی بہت تھی او
بھی بہت ہوتی تھی۔

صغیر چوتھی کلاس میں تھا، اور بشیر نے اسی سال داخلہ لیا تھا۔ سا
لڑائی جھگڑوں سے طاہر تنگ آجاتا۔ رات جب وہ اپنے بستر میں بیٹھا پڑھ
میں مشغول ہوتا تو ایکا ایکی دونوں بھائی گتھم گتھا ہو جاتے۔ ایک دو
کو مارتے پیٹتے اور پھر ہمیشہ بشیر ہی گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگتا۔
میں طاہر کو بڑی کوفت ہوتی۔ پڑھائی سے دھیان ہٹ جاتا کبھی ان کو
سے سمجھاتا کبھی دو ایک تھپڑ جڑ دیتا۔

لیکن

وہ ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا تھا کہ دونوں بچے اس کی اتھارٹی مان لیتے
مانتے تو امی ابا کی بھی نہیں تھے۔ صرف صبیحہ سے ڈرتے تھے وہ ان
پیار بھی بہت کرتی تھی۔ لیکن مارتی بھی بہت تھی۔ ساری کسر نکال دیتی تھ
بڑی بہن کا رعب سب پر تھا۔

"آپا یہ مجھے بہت ڈسٹرب کرتے ہیں۔ اس سال میں نے میٹرک
کا امتحان دینا ہے۔ ابھی سے تیاری کرونگا تو نمبر آئیں گے۔ کالجوں میں د
لینا کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔ فرسٹ کلاس فرسٹ ہو تو کسی ا
کالج میں داخلہ ملے گا۔"

"میں کچھ بندوبست کرتی ہوں۔"

"ان دونوں کو کہیں اور جگہ دے دیں۔ بیٹھک میں سو جایا کریں۔"

"تمہارا مطلب ہے بیٹھک کو کباڑ خانہ بنا دیں دونوں۔ وہی ایک کمرہ تو ہے
جو صاف ستھرا رہتا ہے۔ چیزیں ٹھکانے پر رکھی رہتی ہیں — یہ وہاں سوئے
تو —!"

"آپا بیٹھک میں کونسا قیمتی سامان پڑا ہے۔ صدیوں پرانا صوفہ اور کرسیاں
ہی تو رکھی ہیں۔ قالین بھی گھس گھس کر دری —"

"اچھا آگئی ہوش تجھے بھی باتیں بنانے لگے ہو — یہ شگو کا اثر ہے۔"

"نہیں آپا —"

"تو بھی اس کے رنگ میں رنگا جا رہا ہے، اس کا دماغ تو ساتویں آسمان
تک پہنچا ہوا ہے۔ تو زمین پہ ہی رہ۔"

"آپا آپ تو —"

"چل چپ رہ — اپنے آپ میں رہا کر — میں دیکھ رہی ہوں تجھے۔ اپنی
حیثیت نہیں بھولنا چاہیئے طاہر — انکل امین کے گھر تم کیا جانے لگے ہو
تمہیں اپنا گھر —"

"بس آپا بس — معاف کر دیں — بات تو صرف اس کمرے
کی ہو رہی تھی۔"

"ہاں —"

صبیحہ نے کچھ سوچا پھر بولی۔

"اوپر والا کمرہ ٹھیک کر دوں تمہارے لئے ــــــ"

"کونسا ــــــ وہ جس میں پرانا سامان پڑا ہے"

"ہاں وہی ــــــ سامان وہاں سے ہٹا لوں گی۔ اچھا خاصہ کمرہ ہے۔ بجلی بھی ہے اس میں۔ بلب لگا دوں گی۔ صاف ستھرا ہو جائے تو ٹھیک ٹھاک ہے"

"ہاں ــــــ ہے تو ٹھیک ٹھاک۔ صرف پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہے۔ قلعی وہاں برسوں سے نہیں ہوئی"

"پھر ویسے ہی انداز میں باتیں کرنے لگا۔

"چھوٹی آپا ــــــ میرے سب دوستوں کے الگ الگ کمرے ہیں، روشن، کھلے کھلے، ہوادار ــــــ سجے سجائے۔ میں اسی لئے تو اپنے کسی دوست کو گھر نہیں لاتا"

صبیحہ نے کچھ سوچا، پھر بولی۔

"میں تمہارے لئے اوپر والا کمرہ ٹھیک کر دوں گی۔ پلستر بھی ٹھیک ہو جائے گا اور قلعی بھی ہو جائے گی۔ ایک پلنگ اور دو کرسیاں بھی ڈلوا دوں گی"

"میٹرک تو اوپر ہے ہی۔ تو فکر نہ کر ــــــ سجا دوں گی تیرا کمرہ بھی، پھر بے دھڑک بلا لیا کرنا اپنے دوستوں کو"

"میری اچھی آپا"

صبیحہ نے اوپر والا کمرہ خالی کروا لیا۔ پھر ابا سے کہہ کر مرمت بھی کروائی اور قلعی بھی پھروالی۔

امی کئی دنوں سے تھوڑا سا فرنیچر بنوانے کا کہہ رہی تھی۔ صبیحہ نے امی سے کہہ کر اس کمرے کے لئے پلنگ بنوایا۔ دو کرسیاں اور میز بھی پلنگ کے ساتھ ہی بنوا لئے۔

دیواروں پر دو تین تصویریں لگائیں، نئی دری بھی بچھوا دی۔ یوں یہ کمرہ طاہر کے لئے مختص کر دیا۔

طاہر بہت خوش تھا الگ تھلگ کمرہ تھا ــــــ پڑھائی بھی پوری دلچسپی سے کر سکتا تھا۔ اور کبھی کبھار دوستوں کو بھی بلا لیتا تھا۔

ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ فرصت کے لمحات میں شگو سے لڈو کھیل لیتا تھا گپ شپ لگا لیتا تھا۔ مامی کے ہاں چلا جاتا تھا۔ نانی سے باتیں کر لیتا تھا اور شائستہ آپا سے جنگلے پر ہی جھک کر ہنسی مذاق کر لیتا تھا۔

آج بھی شگو اوپر آئی تھی۔ اپنے چھت پر ہی تھی آپا نے دھلے ہوئے کپڑے تار پر ڈالنے کے لئے دیئے تھے۔ چھٹی تھی ــــــ طاہر بھی چھت پر تھا، اس نے شگو کو دیکھا تو دونوں گھروں کی چھت والی دیوار کے درمیانی دروازے میں آ کر اسے بلایا تھا۔

شگو لڈو کھیلنے کی دیوانی تھی۔ طاہر کے ساتھ کھیلنے میں تو بہت مزہ آتا تھا۔ اپنی گوٹیں وہ کئی کئی خانے سرکا دیا کرتی تھی۔ ہر بازی میں اسے اس طرح مات دے دیتی تھی۔

اب طاہر کو ابا نے کیرم بورڈ بھی دلا دیا تھا۔ شگو طاہر سے کیرم کھیلنا بھی

سیکھ رہی تھی۔

ان کھیلوں میں کبھی آپا بھی شریک ہو جاتی تھی۔

لیکن

جب سے اس کے رشتے کی بات چلی تھی وہ کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گئی تھی۔ ویسے بھی میٹرک کرنے کے بعد وہ گھر بیٹھی تھی۔ سارا کام کاج کرتی تھی۔ اماں کے ساتھ سوئی سلائی کا کام بھی کرواتی تھی — اور اب تو جہیز کے لئے چھوٹی موٹی چیزیں بنا رہی تھی — کیرم اور لڈو کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔

یہی حال صبیحہ کا تھا۔ ہاں ربیعہ فارغ ہی ہوتی تھی۔ وہ اس کھیل میں ان کے ساتھ اکثر شریک ہوتی۔

آپا یا صبیحہ ہوتیں تو وہ پارٹنر کی حیثیت سے کھیلتی وہ نہ ہوتیں تو شگو اور طاہر کے کھیل کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھتی رہتی کئی بار وہ شگو کی بے ایمانی پکڑ لیتی۔

شور مچا دیتی۔ طاہر کو اکساتی۔ طاہر غصے میں آتا تو شگو جھٹ سے دانہ اور گوٹیں گڈمڈ کر کے کھڑی ہوتی اور طاہر کے ساتھ کبھی نہ کھیلنے کا اعلان کر دیتی۔

طاہر فوراً ہی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا۔ الٹا ربیعہ پر غصہ جھاڑنے لگتا اور شگو کی منت سماجت کرنے لگتا۔

یہ معمول ہی بن چکا تھا۔

طاہر کبھی کبھی اپنے اس رویے پر اندر ہی اندر جھنجھلا بھی جاتا۔ سوچتا بھی۔ کہ وہ شگو کے زیر اثر کیوں ہے۔ اس کے غصے سے مرعوب کیوں ہو جاتا ہے اس سے لڑائی کرتے ہوئے ڈرتا کیوں ہے۔

ان سوالوں کے مبہم مبہم جواب تو اس کے من میں ابھرنے لگے تھے لیکن ان کو تسلیم کرنے سے وہ ابھی جھجکتا تھا۔ ڈرتا تھا — خفت محسوس کرتا تھا۔

لیکن

یہ بے داغ سچائی تھی کہ شگو اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ اور اس اچھی لگنے میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

آج بھی دونوں چھت پر کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ درمیانی میز پر کیرم بورڈ پڑا تھا۔

گیلے کپڑے تار پر ڈالنے کے بعد شگو نیچے جانے کی بجائے ادھر ہی آگئی تھی۔ دونوں کیرم کھیلنے لگے تھے۔

اور گوٹ کو سٹرائیکر سے نشانہ بناتے ہوئے ہی طاہر نے شگو سے سکول چھوڑنے کی وجہ پوچھی تھی۔

شگو نے کیرم کی ساری گوٹیں گڈمڈ کر دی تھیں — آج کھیل کا موڈ نہیں تھا۔ ہاں تو بتانا شگو۔

"بات یہ ہے طاہر — کہ میں اب اس سکول میں جانا ہی نہیں چاہتی۔"

"پٹائی کر دی کسی نے۔"

شگو نے اس کی طرف دیکھا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی،

"میری بہت کچی ہوئی ہے۔"

"کیا ——؟"

طاہر کچی ہونے کا مطلب سمجھتا تھا، جہاں کہیں شرمندہ ہوئے، زبان پر آگیا۔ لیکن وہ سمجھا کچھ نہیں۔

"کیسے ہوئی کچی ——؟"

"بس ہوگئی ——!"

"اوہو بتاؤ بھی —— بات مختصر کیا کرو۔"

"طاہر ——"

"ہاں ——"

"پچھلے ہفتے میں شاہدہ آپی کے ہاں سے آرہی تھی تو گلی میں مجھے اپنی فیلو نیرا مل گئی۔"

"ہوں ——"

"نیرا ہمارے گھر بھی آگئی ——!"

"تو ——!"

"ہمارا گھر تو پتہ ہے نا جیسا ہے۔ وہ گھور گھور کر چاروں طرف دیکھ رہی۔ آپا نے بیٹھنے کو کہا۔ لیکن وہ کھڑی رہی۔ بیٹھی نہیں۔"

"پھر ——"

اگلے دن اس نے میری ساری سہیلیوں کو بتادیا کہ میں بہت غریب

میرا گھر بہت خراب ہے۔"

"ہوں ——"

"ساری لڑکیاں حیران ہو ہو کر مجھے تکنے لگیں۔ کسی کو یقین نہیں آرہا تھا نا —— نیرا کہہ رہی تھی، خود جاکر دیکھ لو چھوٹا سا پرانا پرانا سا گندی گندی دیواروں والا گھر ہے اس کا۔"

"تو —— تو ——"

"اس نے یہ بھی کہا کہ میں نے اس کی دادی کو نوکرانی سمجھا۔ اتنے گندے مندے بستر میں پڑی تھی —— نوکر بھی نہیں ہے اس کے گھر۔"

طاہر پریشان ہوکر بولا۔

"تم نیرا کو گھر لائی کیوں تھیں ——؟"

"وہ خود ہی آگئی تھی میرے ساتھ ——"

"تم نے سہیلیوں کو بتایا ہوگا۔ کہ تم بڑے عالیشان ——"

روہانسی ہوکر شگو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"جھوٹ کبھی نہیں بولنا چاہیئے ——"

شگو ایک دم چمک اٹھی اور بولی۔

"تو کیا سہیلیوں کو بتا دیتی کہ غریب ہوں میں —— میرا گھر پرانا ہے اور ——"

"اچھا بھئی —— ٹھیک کیا تم نے —— اب سکول بھی چھوڑ رہی ہو تو ٹھیک ہی ہے۔ چلو چھوڑو آؤ کھیلیں ——"

شگو اٹھ کھڑی ہوئی ۔۔ وہ کچھ پژمردہ افسردہ نظر آ رہی تھی ۔
طاہر کے روکنے کے باوجود وہ اپنے چھت پر آ گئی۔ آپا دھلے ہوئے
کپڑے اوپر لے آئی تھی۔ وہ کپڑے تار پر ڈالنے میں آپا کی مدد کرنے لگی

دادی اماں ایک رات چپکے سے ہی اللہ کو پیاری ہو گئی ۔

اس رات گرمی جس تھا۔ شائستہ نے سر شام چھت پر چارپائیاں ڈال
دی تھیں ۔

"آج دادی کو بھی اوپر لے چلتے ہیں۔ نیچے بہت گرمی ہے اماں"
اس نے کہا۔

"نہیں ۔۔" دادی بے حد نڈھال تھی ۔

"مجھے یہیں پڑا رہنے دو۔ کون لے کر جائے گا مجھے اوپر"

"نہیں ۔۔ یہیں ٹھیک ہوں۔ تم لوگ اوپر سو جانا ۔۔"

"اماں سے اوپر نہیں جایا جاتا شائستہ ۔۔ میں ان کے ساتھ یہیں صحن
میں پڑی رہوں گی۔ تم دونوں بہنیں اوپر سو جاؤ۔"
شائستہ نے جلدی سے کہا۔

"اماں میں دادی کے پاس نیچے سو جاؤں گی۔ آپ کے شگو کے ساتھ

اوپر چلی جائیں ۔ آج بہت گرمی ہے "

"یہ ٹیبل فین جو ہے " اماں نے دادی کے سرہانے رکھی چھوٹی سی
پر رکھے پنکھے کی طرف اشارہ کیا۔

"رشیدہ نے اچھا ہی کیا جو بھجوا دیا ۔ رات چلا لیں گے "

رات تہمینہ نے کچھ دیر مشین پر کام کیا جب تک وہ قمیص سیتی رہی
اس کے پاس ہی بیٹھی رہی۔

ان دنوں کپڑے والی زبیدہ اپنے بیٹے کے رشتے کے لئے آر
رشتہ ابھی طے نہیں ہوا تھا بات ہی چل رہی تھی لیکن اماں کو فکر دامن گیر
تھی۔ سلائی کا کام زیادہ کر دیا تھا۔

جہیز کی صورت دو چار ہی چیزیں بن پائی تھی خرچے ہی پورے
نہ ہوتے مہنگائی دن بدن بڑھ رہی تھی اب تو شگو کے سکول کا خرچہ بھی
پھر بھی اخراجات سے آمدنی نپٹ نہ پاتی تھی۔

رات کافی ڈھل آئی تھی۔

"تم جاؤ شائستہ سو جاؤ بیٹی "

اماں نے قمیص سی لی تھی۔

"لاؤ اماں تر پائی بھی کر دوں "

"کل کر لینا ۔ اب جا کر سو جاؤ ۔ شگو اوپر ہی ہے نا "

"ہاں وہ تو اوپر جاتے ہی پڑ کر سو گئی تھی "

"دادی کو پنکھا لگا دیا ہے ؟"

"ہاں اماں کو دوائی بھی پلا دی تھی۔ سرہانے پانی بھی رکھ دیا ہے "

"جیتی رہو بیٹی "

دونوں ماں بیٹی اٹھیں ۔ پنکھا اور بتی بند کر کے صحن میں آگئیں۔

"اور اکیلے ڈرتی تو نہیں ہو "

اماں نے شائستہ سے مسکرا کر پوچھا۔

"لو ڈر کس کا ۔ ساتھ ہی تو چھت پر پھپھو لوگ سوتے ہیں سب "

"اچھا جاؤ اب ۔ صبح بھی جلدی اٹھ جاتی ہو "

"اماں میں تو اب بھی کہتی ہوں آپ اوپر جا کر آرام کریں اور سو جائیں۔ میں
دادی کے پاس ہی سو جاتی ہوں۔ دادی ایک دو بار رات میں ضرور پانی
مانگتی ہیں آپ بے آرام ہوں گی "

"نہیں بیٹی بے آرامی کیسی ۔ وہ بیچاری تو کسی کو تکلیف دیتی ہی نہیں ۔
اس کی خدمت تو ہمارا فرض ہے "

شائستہ پانی کا گلاس لے کر اوپر چلی گئی۔

تہمینہ نے چارپائی کونے سے گھسیٹ کر اماں کے برابر کر لی۔ پنکھے کی
ہوا یہاں بھی آ رہی تھی۔

سحری کے وقت تہمینہ کو پیاس محسوس ہوئی آنکھ کھل گئی۔ اٹھ کر گھڑے
سے پانی پیا۔ پھر آ کر چارپائی پر لیٹ گئی۔

اماں کے سرہانے پانی کا گلاس بھرا پڑا تھا ۔ گرمی کے پیش نظر
اس نے اماں کو آواز دی۔

"امی پانی پیو گی ؟"

اماں نے جواب نہیں دیا ۔

اس نے اماں کا کندھا ہولے سے دبا کر پوچھا ۔

"اماں آج پیاس نہیں لگی ۔ تھوڑا پانی پی لو ۔ بہت گرمی ہے ۔"

لیکن

اماں پھر بھی نہ ہلی ۔

تہمینہ چپ ہو رہی آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کر
کروٹ بدل لی ۔

لیکن

نیند نہیں آئی ۔

تھوڑی دیر وہ چارپائی پر کروٹیں بدلتی رہی جانے کیوں بے چین
رہی تھی فضا بھی کچھ ٹھنڈی ہو چکی تھی پنکھے کی ہوا خاصی خوشگوار لگ ر
وہ تھوڑی دیر اور آرام کرنا چاہتی تھی ۔

کوشش کے باوجود آنکھوں میں نیند نہیں اتری ۔ کروٹیں بدلنے
سے پڑے رہنے سے بدن کچھ دکھنے لگا ۔

وہ اٹھ بیٹھی سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا لیکن ابھی صحن میں اجالا
طرح نہیں پھیلا تھا ۔ نماز کا وقت تھا اس نے تنگ جنگلے سے نظر آ
والے آسمان پر نظر ڈالی اور پھر اٹھ کر سامنے ہی غسل خانے میں چلی
وضو کیا اور کمرے میں آ کر نماز پڑھی ۔

اب کچھ سپیدی سحر صحن میں بھی پھیل رہی تھی ۔ شاید باہر ہوا چل رہی تھی ۔ کبھی کبھی کوئی جھونکا صحن میں بھی اتر آتا تو گھر گھر چلتے پنکھے کی آواز میں تبدیلی آ جاتی ۔

ایک دم ہی اسے خیال آیا ۔ اماں کو پنکھے کی ہوا ٹھنڈی نہ لگ رہی ہو ۔ یا تو پنکھا بند کر دینا چاہیئے یا انہیں چادر اوڑھا دینی چاہیئے ۔

وہ اسی خیال سے اماں کی چارپائی کی طرف بڑھی ۔

لیکن

ٹھٹک گئی ۔

چونک کر انہیں دیکھا ۔

ان کا منہ آدھ کھلا تھا ۔ آنکھیں چوپٹ تھیں اور وہ بستر پر چت پڑی تھیں دونوں بازو سیدھے تھے اور بدن کے ساتھ لگے ہوئے تھے ۔

اس نے جلدی سے اماں کا کندھا ہلایا ۔

"اماں ---- اماں ----"

لیکن

اماں وہاں ہوتی تو جواب دیتی ۔ وہ تو زندگی کے راستے کی ساری کی ساری تکلیفیں اور ساری کلفتیں طے کر کے آخری منزل پر پہنچ چکی تھیں ۔

"اماں ---- اماں ---- اماں ----" تہمینہ نے بے یقینی سے انہیں ہلاتے ہوئے بلند آواز میں پکارا ۔

لیکن کوئی جواب نہ ملا ۔ اماں کے نہ ہونے کی تصدیق ہوتے ہی اس نے

سینے پر دو ہتڑ مارا — اور زور زور سے شائستہ کو آوازیں دینے لگی،

شائستہ تو گہری نیند میں تھی۔ جاگی نہیں۔ ہاں رشیدہ نماز پڑھ کر ہوئی تھی اپنے بستر کی دری تہہ کر کے نیچے جانے والی تھی کہ اس کی آو پر جلدی سے دری ویسے ہی پھینک کر ان کی چھت پر آگئی۔

"کیا ہوا بھابی ——؟"

اس نے جنگلے پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

"اماں مر گئی رشیدہ اماں مر گئی" وہ سر پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز میں رو ہوئے بولی۔

"ہائے ہائے ——" رشیدہ کے تو جیسے اوسان خطا ہو گئے وہ بے اختیارانہ سیڑھیوں کی طرف لپکی۔ پاؤں الٹا پڑا لیکن تکلیف کا احسا کئے بغیر رگڑ رگڑ کرتی سیڑھیاں اتر گئی۔

"اماں ——"

اس نے چیخ کر کہا اور پھر اماں کی چارپائی کی طرف بڑھی ماں سے لپٹ گ اس کے سینے پر سر پٹخ دیا۔

دونوں اونچی آواز میں رونے لگیں۔

آوازیں سن کر طاہر رفیق بیبیہ اور ربیعہ بھاگے آئے۔ شائستہ اور ن بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

اماں واقعی مر گئی تھی۔ کئی سال بستر پہ پڑی پڑی ڈھانچہ بن گئی تھی، سے زیادہ احساس اسے تہمینہ کے سر پڑے بوجھ کا تھا — آج چک

راہئ ملک عدم ہو گئی۔ شاید اسی طرح اس نے بہو کے سر کا تھوڑا سا بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔

رونے دھونے کی آوازیں سن کر اہل محلہ بھی دوڑے آئے۔ کچھ ہی دیر میں سارا صحن لوگوں سے بھر گیا۔

دن نکل آیا تھا — عورتیں اور لڑکیاں تو اماں کی چارپائی کے اردگرد بیٹھی رو رہی تھیں۔ رفیق نے ہی سب رشتہ داروں کو اطلاع دی، کسی کے ہاں ہمسائے کے لڑکے کو بھیجا۔

کسی کے ہاں محلے کے بزرگ کو، پھر نانی کو بلوایا اور پوری برادری میں اماں کے مرنے کی خبر بھجوائی۔ جنازے کا وقت محلے کے بزرگوں کے ساتھ بیٹھک میں بیٹھ کر طے کیا۔

کفن دفن کا انتظام بھی کرنا تھا۔ زبیدہ لطیف اور نجیب کے ہاں وہ خود سائیکل پہ جا کر اطلاع دے آیا۔

ماں مر گئی تھی —— سب ہی دوڑے آئے۔ جیتے جی تو اتنی مستعدی خبر نہ لیتے تھے مرنے پہ جلدی آ گئے۔ ماں سے لپٹ لپٹ کر روئے۔

رونے دھونے کا سلسلہ سارا دن چلتا رہا — جب بھی کوئی آتا اماں کے چہرے پر سے چادر ہٹا کر آنسو بہاتا تو سب رونے لگتے شائستہ کو تو اماں سے بہت پیار تھا۔

بڑی خدمت کی تھی اس کی۔ وہ تو رو رو کر بے حال ہو رہی تھی۔ رشیدہ اور حمیدہ بھی رقتوں سے بین کر کر کے رو رہی تھیں ان کے بین دل چیر دیتے

تھے. ماں کی مرگ کے حوالے سے آج برسوں پہلے بچھڑ جانے والے بھائی
بھی یاد کیا جارہا تھا تہمینہ کی آنکھوں سے آنسو نہ رک رہے تھے مجید ٹوٹ گرا
آرہا تھا۔

رشتے برادری کے لوگ بھی آنے لگے گلی میں میلی میلی دریاں مردوں کے
بچھادی گئیں. اندر عورتوں نے مل جل کر سامان سمیٹ کر کمرے میں ایک
لگا دیا. یہاں بھی دریاں بچھادیں. عورتیں آکر بیٹھنے لگیں۔

مرحومہ کی باتیں ہورہی تھیں. بڑی بوڑھیاں اس کی جوانی کو یاد کررہی
کئی قصے سنارہی تھیں۔

باتیں بتارہی تھیں ـ دادی نے جوانی اچھی ہی گزاری تھی. اس کی ملنسا
خوش اخلاقی اور دوسروں کے کام آنے کی باتیں ہورہی تھیں جو شگو
اور انہی کی ہم عمر دوسری رشتہ دار لڑکیاں بڑے شوق سے سن رہی
گرمی کے پیش نظر جنازہ جلدی اٹھانے کی ضرورت تھی. گیارہ بجے کا وقت
نماز جنازہ کے لئے دیا گیا تھا۔

مردہ نہلانے والی آگئی تھیں کفن کا لٹھا اور دوسری چیزیں بھی منگا لی گ
نہیں. پانی کے گھڑوں میں پانی گرم کیا جارہا تھا مٹی کے کوزے بھی بھر کر
دیے گئے تھے. اور مسجد سے نہلانے کا تختہ اور قبرستان لے جانے
ڈولی بھی آگئی تھی۔

"انسان کا آخر انجام یہی ہے :
"برس ہا برس جیئے. آخر مرنا ہی ہے"

عورتیں ان چیزوں کو دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتے ہوئے بڑی سوگواری سے
باتیں کررہی تھیں کفن سیا جارہا تھا موت عبرت تھی سب وقتی طور پر اس
عبرت سے جیسے کوئی اچھا سبق لے رہے تھے۔

گھر میں بہت لوگ تھے. صحن برآمدہ دونوں کمرے عورتوں اور بچوں سے
بھرے تھے چھت پر رفیق نے شامیانہ لگوادیا تھا. اس لئے عورتیں اوپر
آگئیں تھیں. نیچے تو گرمی اور گھٹن تھی۔

پنکھے ناکافی تھے. پسینے کی بدبو ابھی سے پھیلنا شروع ہوگئی تھی ـ
لوگ بھی تو جیسے بیٹھے تھے اسی طرح اٹھ کر چلے آئے تھے اکثر عورتوں کے
لباس میلے کچیلے تھے. بچوں کے منہ ہاتھ بھی نہیں دھوئے تھے کوئی رو
رہا تھا۔

کسی نے پیشی کردی تھی. کسی کو چھی چھی آئی تھی. عجب تلاطم بپا کر رکھا
تھا ان بچوں نے. شگو تو گرمی حبس اور پسینے پیشاب کی بدبو سے بھاگ
کر اوپر چلی آئی تھی. اور جنگلے پر جھکی نیچے صحن کے درمیان پڑی دادی کی چارپائی
اور آنے جانے والے لوگوں کو تک رہی تھی. جو دادی کا چہرہ دیکھتے
آنسو بہاتے۔

پھر

ایکدم سب کی رونے کی رفتار بڑھ جاتی. چند لمحے کھڑے ہونے کے
بعد آنے والے ادھر ادھر دیکھ کر اپنے لئے جگہ تلاش کرتے پھر میلی
کچیلی دری پر جاکر بیٹھ جاتے۔

شگو کو یہ ہنگامہ اچھا نہیں لگ رہا تھا گندگی سے اسے نفرت تھی، اس کا
جی چاہ رہا تھا کہیں سے ڈھیر ساری سفید چادریں جمع کر لائے اور ان دیواروں
کو ان سے ڈھانپ دے، صاف ستھری چادروں پر لوگ بھی صاف ستھرے
لباس پہن کر بیٹھے ہوں تو کتنے اچھا لگیں۔

اسے محلے کے سرے والی حویلی میں ہونے والی مرگ یاد آ گئی۔ ابھی پچھلے
مہینے کی ہی تو بات تھی کوئی مرد فوت ہوا تھا وہ بھی وہاں جا گھسی تھی حویلی کا
لمبا چوڑا صحن سفید چادروں سے ڈھانپا گیا تھا۔ حالانکہ دریاں بھی نئی تھیں
پھر بھی سفید چادریں ڈالی گئی تھیں۔ تقدس اور پاکیزگی کا احساس ہوتا تھا
لوگ بھی صاف ستھرے لباسوں میں آئے تھے — کتنا اچھا انتظام تھا وہاں
لیکن

شگو کر کیا سکتی تھی۔ سوچ ہی سوچ تھی۔ غریبوں کے ہاں تو شادیوں
پر ایسے اہتمام نہیں کئے جاتے۔ مرگوں پر کون کرے۔

اماں کو نہلا دھلا کر سفید کفن میں لپیٹ دیا گیا۔ عطر و لوبان کی خوشبو ہر
طرف پھیل گئی۔

پھول اور پتیاں بھی سفید کفن پر ڈالی گئیں۔ شگو نے دادی کو دیکھا اندر
ہی اندر خوش ہوئی۔ کم از کم آج تو اماں کو سفید بے داغ چادریں میسر آ گئی
تھیں۔ جنازہ وقت مقررہ پر اٹھ گیا۔ بچھڑنے والے بلک بلک کر روئے جانے
والا چپ سادھ کر چلا گیا۔

دوپہر برابر والوں نے دیگ پکائی تھی۔ کھانا ان کی طرف سے دیا گیا تھا

دفنانے کے بعد لوگ واپس آئے تو کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ حمیدہ نے دیگ
باورچی خانے میں ہی منگوا لی تھی۔ اماں کا غم بھول کر اب وہ مہمانوں میں کھانا تقسیم
کر رہی تھیں۔

تہمینہ رشیدہ دونوں بھابیاں مہمانوں کو بٹھا کر ان کے سامنے چنوں والے
چاول رکھ رہی تھیں، ہنس ہنس کر سب سے باتیں کر رہی تھیں۔ صبیحہ اور شائستہ
پانی کے جگ لئے گھوم پھر رہی تھیں۔ کھانا کھایا جا رہا تھا۔ ہنسی مذاق ہو رہا
تھا قہقہے اٹھ رہے تھے۔ مہمانوں کے ساتھ اہل خانہ بھی شریک تھے۔

شگو سوچ میں پڑی تھی — یہ سب کیا تھا اور اب کیا ہو رہا ہے۔
زمانے کے سرد و گرم دھوپ چھاؤں اور نشیب و فراز سے اُسے
آگہی کب تھی۔

رسم قل دلا کر صبح دس بجے سب فارغ ہو گئے۔

رشتے دار چلے گئے، برادری کے لوگ بھی اظہار افسوس کر کے چلے گئے، دریاں سمیٹ دی گئیں۔

گھر میں صرف قریبی رشتہ دار رہ گئے تھے۔ لطیف نجیب حمیدہ اور ان کے اہل خانہ ہی تھے۔ سب بیٹھک میں بیٹھے اماں ہی کی باتیں کر رہے تھے۔ شگو آج بھی دادی اماں کے جوانی اور ادھیڑ عمری کے قصے سن سن کر خوش ہو رہی تھی۔ وہ طاہر کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ گاہے گاہے اس کو بھی متوجہ کر لیتی۔ وہ بڑے ماموں کے بیٹے صادق سے اپنی پڑھائی کی باتیں کر رہا تھا۔

پرانے قصے دہرانے میں کچھ وقفہ آیا تو نجیب کی بیوی بولی۔

"اب گھر کی بھی خبر لیں۔ چلنا نہیں ہے کیا۔؟"

"بھئی چلتے ہیں۔ قل تک تو ٹھہرنا ہی تھا نا۔؟" نجیب بولا۔

تہمینہ نے جلدی سے کہا۔ "بھائی آپ کا اپنا گھر ہے۔ صرف قل تک

کیوں ٹھہرنا تھا۔ جتنے دن جی چاہیے یہاں رہیں۔"

لطیف نے کہا۔ "ٹھیک ہے بھائی۔ لیکن اپنے گھروں کو بھی جانا ہے نا۔"

لطیف کی بھاری بھرکم ادھیڑ عمر بیوی نے تہمینہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بھئی صرف تمہاری ساس ہی فوت نہیں ہوئی۔ ہماری بھی ہوئی ہے۔ تعزیت کے لئے لوگ ہمارے گھر میں بھی آئیں گے۔ آج ہمیں چلے جانا ہے۔"

"واقعی ——"

نجیب کی دبلی پتلی کوتاہ قد بیوی نے کہا۔

"ملنے جلنے والے ہمسائے وغیرہ تو افسوس کے لئے آئیں گے ہی۔"

"بس چلتے ہیں پہلے حساب تو کر لیں۔" نجیب نے لطیف کی طرف آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرتے ہوئے دیکھا۔

"کیوں بھئی ——؟"

"ہاں واقعی ——" تہمینہ نے جلدی سے کہا۔ "اماں کے مرنے کے دن سے رفیق بھائی ہی خرچ کر رہے ہیں۔ پتا نہیں کتنا خرچہ کیا ہے۔"

"بتا دیں نا ——؟"

حمیدہ نے سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"سب بہن بھائی ہیں ہم۔ اماں سب کی تھی، خرچہ بھی سب کا۔۔۔۔۔؟"

"اوہو ——" رفیق نے مسکرا کر بات کاٹی۔ "حمیدہ بہن — اماں میری

بھی ماں ہی تھی ۔ خرچہ آپ سب کریں یا میں ۔ کیا فرق پڑتا ہے "

" نہیں بھائی ——— "

تہمینہ نے جلدی سے کہا " آپ کی اتنی ہی مہربانی تھوڑی ہے ۔ سارے کام اس خوش اسلوبی سے نپٹا دیئے ۔ خرچہ تو مشترکہ ہوگا آپ بتا دیں ——— "

نجیب نے لطیف کی طرف پھر دیکھا ۔

لطیف بولا " ہاں بھئی ہر چیز مشترک ہے تو خرچہ بھی مشترکہ ہونا چا[illegible]

تہمینہ کچھ نہیں سمجھی ۔ کوئی خاص بات رشیدہ رفیق اور حمیدہ کے پلے بھی [illegible] پڑی ۔ ہاں نجیب اور لطیف کی بیویاں ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہو[illegible] کسی کے کچھ پوچھنے سے پہلے نجیب نے کمرے میں ایک نگاہ ڈالی ۔ پھر بولا ۔

" سب بچے اٹھ جائیں یہاں سے ۔ ہمیں کچھ ضروری باتیں کرنا ہے جاؤ ——— بھاگو اٹھو ——— "

سب بچے اٹھ کر جانے لگے ۔ طاہر، صادق اور ناصر بیٹھک [illegible] نکل گئے، شائستہ صبیحہ اٹھیں تو تہمینہ نے کہا ۔

" بیٹو ——— چل کر گھر ٹھیک کر لو ۔ کمرے دالان اور صحن [illegible] بچوں نے میٹھے چنے بہت گرائے ہیں مکھی ہی مکھی ہو جائے گی اور ہاں [illegible] کمرے کا سامان بھی ٹھیک سے لگا دو "

" چلو باجی میں بھی آپ کا ہاتھ بٹاتی ہوں " نجیب کی سولہ سترہ سالہ [illegible]

نے کہا ۔

" میں بھی ——— " لطیف کی بڑی بیٹی نے کہا ۔

" میں بھی ——— " دوسری بیٹی بھی اٹھ کھڑی ہوئی ۔

سب لڑکیاں گھر صاف کرنے کے لیے اٹھ گئیں ۔

نجیب نے دری پر رکھا گاؤ تکیہ اپنی پشت کے پیچھے کر لیا ۔ اور ایک طرف رکھے حقے کی نے منہ میں لے کر حقہ گڑگڑایا ۔

" چل رہا ہے ——— ؟ "

تہمینہ نے میزبانی کے احساس سے پوچھا ۔

" ہاں ابھی دم ہے ——— " وہ بولا ۔

" نجیب بھائی " رفیق نے ہنس کر کہا " آپ نے تو بیٹھک ایسے خالی کروائی جیسے کوئی خفیہ میٹنگ کرنا ہے "

" بچوں کے سامنے اچھا نہیں لگتا ایسے معاملے "

" کیسے معاملے بھائی جان ——— "

رشیدہ نے جلدی سے کہا ۔

" بھئی اماں تو اب رہی نہیں ، جب تک زندہ تھیں ہم نے کوئی بات نہیں کی ، سب کا مشترکہ ہی گھر تھا ۔ لیکن اب ماں رہی ہے نا باپ "

نجیب متانت سے بولا ۔

" میں سمجھی نہیں آپ ——— " تہمینہ نے حیران نظروں سے ان کے منہ تکتے ہوئے کہا ۔

رفیق نے بھی ان کی طرف دیکھا۔

نجیب بولا۔ " بھئی ہم سے کسی دوسری زبان میں تو بات نہیں کی

مر گئے۔ ہم سے بات نہیں ہلائی کہ اماں تھیں۔ اس گھر ہی میں رہتی

اب تو وہ بھی گئیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ آج جب ہم سب اکٹھے ہیں، ا

میں ہی فیصلہ کر لیں۔ اماں کی وراثت کا۔"

"وراثت ——"

تہمینہ کے منہ سے نکلا۔ رفیق نے بھی عجیب نظروں سے نجیب کو دیکھا

لطیف بولا " اماں کے مرنے سے اب تک جو خرچہ ہوا ہے

بانٹ لیں گے۔ اماں نے جو مکان چھوڑا ہے اس کی بات بھی ہو

اس کی بات سے اک بوجھل سی خاموشی بیٹھک کی فضا پر مسلط ہو

تہمینہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

ایک گھر ہی تھا جس میں وہ بیوگی کی چادر اوڑھے اپنی دو بچیوں

ساتھ سر چھپائے گزر بسر کر رہی تھی —— اس گھر —— ؟ اس

ماؤف سا ہو گیا۔

رفیق تو کچھ نہ بولا۔ رشیدہ جلدی سے بولی۔

" مکان —— ؟ مکان کا کیا کرنا ہے۔ آپ جانتے ہیں اس

بیوہ بھابی اور یتیم بھتیجیاں سر چھپائے بیٹھی ہیں۔"

لطیف اور نجیب کی بیویاں ہوشیار تھیں۔ مکان کی تقسیم کا شو

سے ہی چھوڑا تھا۔ لیکن اب چپ تھیں۔ ساری بات شوہروں کی زبا

چاہتی تھیں نجیب کی بیوی تو اٹھ کر ہی چلی گئی۔

رشیدہ کی بات پر نجیب نے حقہ گڑگڑایا۔ پھر بولا۔

"اس مکان پر ہم سب کا حق ہے یہ جائیداد ہمارے باپ کی تھی۔"

لطیف نے کرخت سے لہجے میں کہا۔

"یہ ہماری شرافت ہے کہ اماں کے ہوتے ہوئے ہم نے حصے بخرے کا سوال نہیں کیا۔"

تہمینہ تو دم بخود بیٹھی تھی —— رفیق بھی کچھ نہیں بولا۔ وہ اپنی نوٹ بک نکال کر اس پر حساب لکھنے لگا۔

چاروں بہن بھائیوں میں خوب بحث تکرار ہونے لگی۔ رشیدہ تو یہ حصہ لینے کے بالکل حق میں نہ تھی۔ حمیدہ بین بین تھی۔ لیکن نجیب و لطیف حصہ لینے پر بضد تھے۔

تہمینہ ٹکر ٹکر ان کے منہ تک رہی تھی وہ تو اب تک اماں کو رو رہی تھی کہ وہ اس کے لئے اخلاقی سہارا تھی اسے کیا پتہ تھا۔ یہ سہارا چھٹتے ہی مکان کی چھت کا سہارا بھی جاتا رہے گا۔

"صرف یہ مکان ہی مکان ہے۔ سامان تو ابا اپنی زندگی ہی میں ہم دونوں بہنوں کو دے گئے تھے۔" رشیدہ نے کہا۔

"ہم بھی مکان ہی کی بات کر رہے ہیں۔" نجیب بولا۔

"کیا اسے بیچیں گے —— ؟" رشیدہ بولی۔

"یہ تو حالات پر منحصر ہے۔ قیمت ڈلوائی جائے گی۔ پھر ہم میں سے ہی

کوئی خریدنا چاہے تو ٹھیک ہے۔ گھر کی بات گھر ہی میں رہ جائے گی سب
حصّہ بھی مل جائے گا۔"

رفیق پہلی بار بولا۔

"قیمت کیا لگے گی اس کی۔ اتنا خستہ شکستہ تو ہو رہا ہے۔"

"شہر میں جایداد کی قیمت کا آپ کو بھی پتا ہے۔" لطیف بولا۔

نجیب نے کہا۔

"یہ سوال نہیں ـــ سوال تو حصہ لینے کا ہے چاہے کتنی بھی تو
پڑے ـــ"

رفیق خاموش ہو گیا تو حمیدہ بولی۔

"حصّہ لینا سب کا قانونی اور شرعی حق ہے۔ چاہے جتنا بھی ہو"

"میں تو نہیں لوں گی ـــ" رشیدہ بولی۔ "بیوہ بھاوج اور یتیم
بھتیجیوں کے سر سے سائبان چھیننے والی بات ہے۔"

حمیدہ اس کی بات سن کر آنکھیں گھماتے ہوئے بولی۔

"جذباتی ہونے والی بات نہیں۔ خدا رسول کا حکم بجا لانا چاہیے۔ کہتے
وراثت کے فیصلے نہ کیے جائیں تو مرنے والوں پر بار رہتا ہے۔ پھر ضرور
مند کون نہیں۔ ہم میں سے لاکھوں والا کوئی بھی نہیں۔ اللہ جانے کیسے گزرا
رہی ہے چند ہزار بھی ہزار ضرورتوں کے منہ بند کر سکتے ہیں۔

رشیدہ کو غصّہ تو آیا لیکن ضبط کرتے ہوئے تہمینہ کی طرف دیکھ کر بولا

"اے بھابی تم بھی تو کچھ بولو۔"

"میں کیا بولوں ـــ میرا منہ تو اللہ میاں نے اسی روز سے بند کر دیا تھا جس
دن میرا سہاگ اجڑا تھا۔"

وہ دکھی لہجے میں بولی۔

"آپ لوگوں نے جو فیصلہ کرنا ہے ـــ جو بھی کریں گے اسے تقدیر سمجھ کر
جھولی میں ڈال لوں گی۔"

رشیدہ اور رفیق کا دل پسیجا لیکن دوسرے بھائی اور بہن چپ ہو رہے۔
چند لمحے بڑی بوجھل اور دل گرفتہ سی فضا رہی۔ پھر نجیب بولا۔

"میں نے تو سب کے بھلے کی بات کی ہے۔ آج ہم بہن بھائی زندہ ہیں اکٹھے
ہیں، یہ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ کل کلاں ہم میں سے ایک بھی لڑھک گیا تو بات
اولادوں تک چلی جائے گی۔ اتنے کی جایداد نہ ہوگی جتنا مقدموں پر خرچ
ہو جائے گا۔"

"بہتر یہی ہے نجیب بھائی کہ فیصلہ کر دیا جائے ـــ جتنا بھی حصّہ بنے
ٹھیک ہے۔ باقی رہی بیوہ بھاوج اور یتیم بھتیجیوں کی بات۔ تو ہم لوگ بھی
ان ہی جیسے ہیں۔ میری تینوں بیٹیاں جوان ہیں۔ میں اکیلا کمانے والا ہوں۔
بیٹے دونوں چھوٹے ہیں۔"

"اور میرا کیا حال ہے ـــ" حمیدہ نے کہا "بتاتی نہیں نا کسی کو۔ خاوند
نے کب سے کام چھوڑ رکھا ہے۔ اندر ہی اندر ہم ماں بیٹے محنت مزدوری کر
رہے ہیں۔ بیٹے سکول بھی پڑھتے ہیں اور میرے ساتھ مزدوری بھی کرتے
ہیں بھرم بنایا ہوا ہے ہم نے سفید پوشی کا۔"

نجیب جو سب میں خوشحال تھا بولا ۔

" بھئی اسی لئے تو یہ سوال اٹھایا ہے ۔ ہر کوئی ضرورت مند ہے ، ہر
ایک کا قانونی اور شرعی حق ہے ، جو لوگ جذباتی ہو رہے ہیں پیسہ سامنے
وہ بھی حصہ لینے کو تیار ہو جائیں گے ۔"

رشیدہ نے اک کڑوی کسیلی تھوک نگلتے ہوئے بھائی پر تند سی نگاہ
کتنا کٹھور اور سخت دل ہو رہا تھا وہ ۔

گھنٹہ بھر تلخ و تند باتیں ہوتی رہیں ۔ ایک دوسرے پر احسانات گنوا
گئے ۔ اپنی اپنی حالت زار بیان کی گئی ۔ لڑائی بھی ہوئی اور مصالحت بھی ۔ بالآخر
نجیب نے کہا ۔

" مکان کی قیمت ڈلوائی جائے ۔ ہم بھائی کے لئے زیادہ سے زیادہ گنجا
نکالیں گے ۔ انہیں برابر کا حصہ دیں گے ۔"

سب چپ رہے ۔

نجیب پھر بولا ۔ " ویسے انکا حصہ اتنا بنتا نہیں ہے مجید فوت ہو
ہے اور اس کی اولاد نرینہ بھی نہیں ہے ۔ اس کا حصہ بھی بہن بھائیوں کے
کھاتے میں جاتا ہے ۔ وہ ہم نہیں لیں گے ۔"

" دکان بھی تو ہے ۔" لطیف نے فیصلہ سن کر کہا ۔

" مگر ___ مگر وہ تو شگو کے ابو نے خریدی تھی ۔"

تہمینہ جلدی سے بولی ۔

" ہاں ___ وہ مجید کی ذاتی تھی ۔" رفیق بولا ۔

" بھائی میرے ___ " نجیب نے رفیق کے کندھے پر ہاتھ مارا ۔
" کیا تم نہیں جانتے کہ مرنے والے کا کوئی بیٹا نہیں صرف بیٹیاں ہیں ۔
اس طرح اس کی ذاتی جائیداد میں بھی بہن بھائیوں کا حصہ بنتا ہے میں نے سب
کچھ بتا کر کہا ہے ۔"

" تو کیا دکان ___ ؟ دکان میں ___ " تہمینہ کا دل اچھل کر جیسے حلق
میں آن پھنسا ۔

ان دنوں وہ دکان بیچنے کا ارادہ کر رہی تھی ۔ اس نے رفیق سے بھی کہہ دیا
شائستہ کے لئے رشتہ آ رہا تھا اس کی شادی کے لئے روپے کی ضرورت
تھی ۔ رشیدہ اور رفیق سے اس نے مشورہ کیا تھا دونوں نے کہا تھا دکان بیچ
کر کچھ شادی پر لگا دے کچھ کسی کاروبار میں ۔"

لیکن

اب دکان میں بھی حصہ کی باتیں ہو رہی تھیں ۔ مکان بھی تقسیم ہو رہا تھا وہ
بے طرح گھبرا رہی تھی ۔

بڑی لے دے ہوئی بحث و تکرار بھی ہوئی ۔

بالآخر طے پایا ___ کہ دکان بیچ دی جائے مکان کی قیمت ڈلوا کر اسے
تہمینہ خرید لے ۔

اس کے پاس مجید کا بنوا کر دیا ہوا زیور بھی تھا ۔ دکان سے بچنے
والے پیسے اور زیور سے شادی کا مسئلہ حل کر لیا جائے ۔ سب نے
اس پر صاد کیا ۔

رشیدہ اور رفیق نے اپنا حصّہ تہمینہ کے حق میں چھوڑ دیا۔ تہمینہ تشکّر کے
آنسو آنکھوں میں بھر لائی۔
رفیق نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ میں تمہارا
بھائی تمہارے ساتھ ہوں"
تہمینہ رونے لگی۔

بعض لوگوں کو اللہ میاں شاید پیدا ہی اس لئے کرتا ہے کہ عمر بھر آزمائشوں ہی سے دوچار رہیں یا وہ ایسے افراد کو منتخب کر لیتا ہے جیسے آزمائشوں میں مبتلا کر کے وہ ان کے صبر و ضبط کا امتحان لیتا ہے۔

تہمینہ بھی شاید انہی لوگوں میں سے تھی۔ چند کلیاں نشاط کی چننا اور کانٹوں سے انگلیوں کا لہولہان ہو جانا اس کا مقدر تھا خوشیاں ہمیشہ ہی اس کے لئے اپنے جلو میں غموں کی بھرمار لے کر آئیں۔

لیکن اللہ کی بندی تقدیر پر شاکر تھی۔ کبھی کسی سے گلہ کیا نہ شکوہ جو سر پڑی سہہ لی۔

اب وراثت کے مسئلے نے بھی اسے بری طرح متاثر کیا تھا اس نے جو پلان بنا رکھے تھے وہ ایکا ایکی پلٹ ہو گئے۔

اس نے تو سوچا تھا دکان بک جائے گی تو شائستہ کی شادی کرنے کے بعد بھی اتنی رقم بچ جائے گی جسے پہلے والی رقم میں ملا کر کاروبار میں لگا

دے گی اس طرح اک معقول ذریعہ آمدنی ہو جائے گا۔

زیور اس کے پاس تھا۔ دس تولے کے دو کڑے اور زیور کے دو سیٹ مجید نے بنوا کر دیئے تھے دو چار تولے شادی کا زیور بھی تھا وہ مطمئن تھی کہ ایک سیٹ اور ایک کڑا شائستہ کی شادی میں کام آئے گا بقیہ شگو کے لئے پڑا رہے گا۔

لیکن

اس نے جو سوچا تھا وہ نہیں ہوا تھا شائستہ کی شادی ابھی طے بھی نہ ہو پائی تھی کہ اماں مر گئی اور جائیداد تقسیم ہو گئی۔

دکان سے جتنا پیسہ ملا۔ وہ حصے بخرے ہی چکانے کے کام آیا مکان اس کے حصے دے کر اپنے نام کروالیا۔ یہ بات باعث تسلی تو تھی کہ کم از کم پر چھت تو اپنی ہو گئی ہے۔

لیکن

شائستہ کی شادی ؟

زبیدہ شائستہ کے لئے اصرار کر رہی تھی۔ ہر چوتھے پانچویں دن وہ اپنی جھولی پھیلائے اس کے ہاں آجاتی۔

تہمینہ سوچ میں پڑجاتی۔

تہمینہ ہاں کرتی تھی نہ نا۔ زبیدہ نے رفیق اور رشیدہ کو بیچ میں ڈالنے کا سوچا۔ اس لئے اس دفعہ وہ تہمینہ کے ہاں آنے کی بجائے ان کے ہاں گئی اپنا مدعا بیان کیا۔

رشیدہ ساری بات سن کر بولی۔

"ہاں بھابی نے مجھ سے ذکر کیا تھا لیکن اماں فوت ہو گئی بات آگے نہ بڑھ سکی" "اب تو چالیسواں بھی ہو چکا ہے۔ دنیا کے کام رکتے تھوڑا ہی ہیں۔ مجھے تسلی تو دے دیں۔"

"شادی چار چھ ماہ بعد بھی کی جا سکتی ہے۔"

رفیق اس کے بیٹے وسیم کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"تعلیم کتنی ہے ——— ؟"

"الیف اے کے بعد نوکری کر لی تھی۔ واپڈا میں کلرک ہے۔ آپ تو جانتے ہیں بھائی۔ وسیم میرا اکلوتا بیٹا ——— شرافت کا آپ پتہ کر سکتے ہیں۔ میرا بیٹا سگریٹ تک نہیں پیتا۔ ہمارے خاندان کو آپ لوگ جانتے ہی ہیں ——— کوئی گرے پڑے نہیں ہیں ہم لوگ۔"

"تو جانتے کیوں نہیں ———" رشیدہ بولی۔ "ہماری پھوپھی کا سسرال ہے۔ سب کو جانتے ہیں۔"

"اللہ کا فضل ہے۔ گھر اپنا ہے دونوں بیٹیاں بیاہ چکی ہوں۔ وسیم کے ابا بھی ابھی کام کرتے ہیں۔ دولت مند تو نہیں۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ شائستہ بیٹی خوش رہے گی۔"

"یتیم بچی ہے ——— اس کے سر پر جو شفقت کا ہاتھ رکھے گا۔ اللہ اس سے خوش ہو گا۔ ویسے لڑکی لاکھوں میں ایک ہے بھتیجی کے ناطے تعریف نہیں کر رہی۔ خدا لگتی کہتی ہوں ——— بڑی سیانی۔ کم گو اور خدمت گزار لڑکی ہے۔"

"اس لئے تو میں جوتیاں گھسا رہی ہوں ——"

بھابی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ابھی تو نہیں —— اسی لئے تو آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ کی وسا
سے یہ رشتہ ہو جائے گا تو آپ کی احسان مند رہوں گی۔"

"اچھا ——"

رفیق نے سر اثبات میں ہلایا۔

"بھابی سے بات کریں گے ——؟"

"بات نہیں کرنی —— رشتہ طے کر دینا ہے ——"

زبیدہ نے کہا۔ "میں یہ رشتہ ضرور لوں گی بھائی —— بہت رشتے
لیکن یہ بچی من کو بھا گئی۔"

"قسمت کی بات ہے زبیدہ بہن —— رشتوں کے بندھن تو اللہ میاں
باندھے ہوتے ہیں۔"

"وسیلہ بھی کوئی بنتا ہے نا ——"

"چلو ہم ہی وسیلہ بن جاتے ہیں ——"

رفیق نے ہنس کر کہا۔

"خدا آپ کا منہ مبارک کرے بھائی ——"

زبیدہ انہیں تاکید کر آئی —— دو چار دن بعد پھر آنے کا کہہ گئی۔

رفیق نے اپنے طور پر وسیم کا پتا کروایا۔ وہ شکل و صورت کا اچھا تھا شرافت بھی مسلم تھی —— واپڈا کا کلرک تھا —— دفتری زندگی بھی بے داغ تھی۔

رشیدہ گھر بار بھی دیکھ آئی۔ سفید پوش لوگ تھے۔ سات مرلے کا مکان تھا جو دو کمروں دالان اور ایک بیٹھک پر مشتمل تھا بیٹھک خاصی بڑی تھی جس میں پرانا فرنیچر پڑا تھا —— مجموعی طور پر شائستہ کے لئے خاصی خوبیوں والا رشتہ تھا —— !

اسی لئے رشیدہ اور رفیق ساری تحقیق کرنے کے بعد تہمینہ کے پاس آئے —— زبیدہ کی خواہش کا اظہار کیا —— اور جو کچھ تحقیق کر چکے تھے اسے بتائی —— !

وہ خاموشی سے سنے گی۔

"کچھ تو کہو نا بھابی ——" رشیدہ نے کہا۔

"کیا کہوں رشیدہ —— رشتہ اچھا ہے لیکن ——"

"لیکن کیا ——؟"

شادی کی حامی کیونکر بھر لوں —— میرے پلے کیا ہے —— ؟ شادی کے لئے پیسے کی ضرورت ——"

"بس اس لئے جواب نہیں دے رہیں زبیدہ کو ——"

رفیق نے کہا

"ہاں بھائی —— آپ جانتے ہی ہیں —— دکان بیچنے کے بعد کیا بچا ہے میں تو سوچا تھا کہ دکان بیچ کر شادی کر دوں گی —— اب ——"

"کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جائے گا —— آج پیسہ نہیں تو کل کہاں سے آئے گا بھابی" رشیدہ بولی۔ "اور یہ فرض تو ادا کرنا ہی ہے۔"

تینوں باتیں کرتے رہے ——— !

تہمینہ کے پاس جو کچھ تھا اس نے رفیق اور رشیدہ کو بتایا۔ دنیا میں یہ مخلص اور غمگسار ہستیاں تھیں جو اس کا بھلا ہی چاہتی تھیں۔ زیور کافی تھا اسے کام چلایا جا سکتا تھا۔

پھر زبیدہ کو بھی پہلے سے واضح کیا جا سکتا تھا کہ اگر جہیز کا لالچ ہے تو کوئی اور گھر دیکھ لے۔

" ہاں اگر وہ اس چھوٹے موٹے جہیز کے ساتھ شائستہ کو قبول کر سکے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں "

تہمینہ نے بالآخر کہہ دیا۔

" وہ دو ایک دن میں آئے گی۔ ساری باتیں کھل کر ہو جائیں گی ——— تم فکر نہ کرو بھابی ——— "

رشیدہ نے کہا۔ " ہم طے کریں گے "

انہوں نے واقعی طے کر لیا۔ زبیدہ تو ایک جوڑے میں شائستہ کو لانے کے لئے تیار ہو گئی۔

" بھلا میں جانتی نہیں کہ بچی یتیم ہے ——— کوئی بھائی نہیں۔ ماں ہی ماں کام جو محنت کر کے وقت کو دھکا دے رہی ہے۔ آپ تہمینہ بہن سے کہہ دیں وہ بیٹی ہمیں دے رہی ہے۔ یہ متاع کیا کم ہے۔ ہمیں کچھ نہیں چاہیئے۔ شائستہ کے نصیب میں روپیہ پیسہ ہو گا تو خدا اس کے شوہر کو دے دے گا۔ میں جس طرح تہمینہ چاہے گی کرنے کو تیار ہوں ——— ایک پیالی چائے پر نکاح پڑھوا لیں گے

آپ اس کی فکر نہ کریں ——— میں اپنی بہو کے سارے ارمان خود پورے کروں گی ———۔"

زبیدہ جذباتی سی ہو رہی تھی۔

رشیدہ نے ہنس کر کہا

" اب بھابی اتنی بھی گئی گزری نہیں ——— تھوڑا بہت جہیز تو دے گی ہی۔ پہلی شادی ہے۔ شادی دھوم دھڑکے سے نہ سہی پھر بھی بارات تو آئے گی ——— شہنائیاں بجیں گی۔ کھانا دیا جائے گا رخصتی شان سے ہو گی۔"

" یہ آپ لوگوں کی اپنی خوشی ہے۔ ہماری طرف سے کوئی پابندی نہیں ——— مجھے تو یہ رشتہ مل جائے تو آپ کا بہت بڑا احسان ہو گا۔ اور انشاءاللہ میں احسان فراموش کبھی نہیں ہوں گی۔"

رشتہ طے پا گیا۔

شائستہ کے لئے انگوٹھی اور سنہری جوڑا آیا ——— دو ڈبے مٹھائی اور پھل کی ٹوکری بھی آئی۔ زبیدہ تین چار عورتوں کے ساتھ آکر نشانی کر گئی۔

تہمینہ نے بھی لڑکے کو انگوٹھی اور رومال دیا ——— زبیدہ اور اس کے شوہر کو کپڑے دیئے ——— منگنی کی رسم انتہائی سادہ طریق سے ہو گئی۔ شادی کی تاریخ بھی طے پا گئی۔

شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ شائستہ بھی بہت مصروف ہو گئی۔ اماں نے زیور بیچا ——— رشیدہ اور رفیق نے کچھ قرض دیا ——— یوں معمولی درجے کا جہیز تیار ہونے لگا۔

شگو شائستہ کی شادی ہونے پر خوش تھی۔ شادی کا اس کے ذہن میں بڑا شاندار تصور تھا۔ وہ رشیدہ کے ساتھ انکل امین کی بیٹی کی شادی کی تقریب دیکھ چکی تھی۔ شادی سے پہلے رسم حنا بھی گئی تھی۔ کتنی شاندار تھی یہ تقریب۔ اسی کا پرتو اس کے ذہن میں تھا۔

مہندی کا شگن ہر شادی پر خوش کن تصور ہوتا ہے۔ شادی معمولی ہو یا شاندار یہ رسم ضرور ہوتی ہے۔

دلہن کے ہاتھوں پر وفا کے نقوش سجائے جاتے ہیں ڈھولک پر سہاگ گیت گائے جاتے ہیں، پھولوں کی خوشبو مہکتی ہے — جی بھر کر خوشی منائی جاتی ہے۔

شائستہ کی بھی رسم حنا ہوئی — لڑکے کی دونوں بہنیں اپنی دو تین رشتہ داروں کے ساتھ مہندی کے دو تھال لے کر آئیں — ڈھولک پیٹی۔ گانے گائے اور خوشی کا اظہار کیا۔

شگو حیران حیران سب کچھ تکتی رہی۔ اسے یقین کب آ رہا تھا کہ یہ رسم حنا ہے اسے تو انکل امین کی بیٹی کی رسم حنا یاد آ رہی تھی۔

ساری کوٹھی روشنیوں کے غبار میں ڈوبی تھی۔ کوٹھی کے ماتھے پر لائٹوں کے جھومر سجے تھے۔ لان کے ایک ایک درخت پودے اور بیل میں رنگ برنگی قمقمے جگمگا رہے تھے۔

دودھیا ٹیوب لائٹس سارے لان کو بقعہ نور بنا کے تھیں بینڈ بڑے خوبصورت انداز میں بج رہے تھے، فضا میں خوشبوئیں رچی بسی تھیں کوٹھی کے اندر بھی روشنی ہی روشنی تھی۔ مہک ہی مہک تھی۔

انکل امین کی بیٹی ہلکے زرد رنگ کے جوڑے میں ملبوس تھی۔ پھولوں کے گہنے پہنے بالکل پھولوں کی شہزادی لگ رہی تھی۔ شرما شرما کر مسکراتی اور مسکرا مسکرا کر شرماتی وہ شگو کو بے حد اچھی لگی تھی۔

پھر

جب سسرالی عورتیں اور مرد مہندی کے تھالوں میں موم بتیاں جلائے ناچتے گاتے آئے تھے۔ تو کیا رنگ جم گیا تھا۔ ہر طرف روپہلی سنہری کپڑوں اور زیوروں کی کھنک چھنک تھی۔ پھولوں کی پتیاں ٹوکروں کے حساب سے لائی گئی تھیں ان مسرور و شاداں لوگوں پر ان پتیوں کی بارش برسائی گئی تھی، پھر ایک خوبصورت سٹیج پر دلہن کو لایا گیا۔ اس کے ہاتھوں پر مہندی رچائی گئی تھی کتنا مسرور ہنگامہ تھا کتنی پر مسرت گھڑیاں تھیں۔

شگو کے ذہن میں ایک ایک لمحہ محفوظ ہو گیا تھا۔

لیکن

اپنے ہاں — شائستہ کی رسم حنا — ؟

نہ روشنیاں ہوئیں نہ مہک برسی — نہ ہی اس نے ہلکا زرد جوڑا پہنا اور نہ ہی پھولوں کا زیور پہن کر پھولوں کی شہزادی نظر آئی۔ مہندی کے تھال کتنے بھدے تھے۔ اور لانے والیاں بے ہنگم سی اچھل کود اور بے ربط سے گانے گا رہی تھیں۔

کسی نے جھلمل کرتے کپڑے نہیں پہنے تھے لڑکے کی دونوں بہنوں نے بھی

ساٹن کے سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھے دوپٹوں پر معمولی ساگوٹا تھا۔ دوایک [illegible]
نے تو میلے سے کپڑے پہن رکھے تھے۔

شادی کا دن بھی انکل امین کی بیٹی کی شادی سے کوئی میل نہ کھاتا تھا۔ وہ جب
دلہن بن کر سٹیج پر بیٹھی تھی تو لگتا تھا زرنگار گٹھڑی ہے۔ سر سے پاؤں تک زیور
لدی تھی۔ شگو کو تو لگا تھا اس نے لباس بھی سونے کا پہن رکھا ہے وہ آنکھیں
پھیلا پھیلا کر تکتی اور اس کا عکس ذہن کی دیواروں پر کندہ کرتی رہی تھی۔ شائستہ کو [illegible]
بنے دیکھا تو یقین نہ آیا۔

گلابی رنگ کا ریشمی جوڑا — دوپٹے پر گوٹے کے ٹکلے معمولی سا زیور۔ [illegible]
من ہی من میں اس کا موازنہ انکل امین کی بیٹی سے کر رہی تھی۔ اس کا ذہن شائستہ
کو دلہن تسلیم ہی نہیں کر رہا تھا۔

اندر اور باہر کے تضادات شگو کو بے کل کر رہے تھے۔

اندر اور باہر کے تضادات ہی میں وقت گزرتا گیا اور شگو جوان ہو گئی سات سال میں شائستہ کے چار بچے ہو گئے۔ نازک مالی حالت اتنے بار کی متحمل کیسے ہوتی۔ حال برا ہی تھا۔

بچوں کو اچھا کھانے کو نہیں مل سکتا تھا اچھا پہننے کو کہاں سے ملتا۔ وہ بھی ماں کی طرح صابر و شاکر تھی اپنے حالات سے سمجھوتہ کئے تھی اچھے دن دیکھے ہی کب تھے۔ جو برے دنوں کی مار سے بے حال ہو جاتی۔ شوہر ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔ یہ پیار ہی زندگانی تھی۔ وہ غریب ضرور تھی لیکن پیار کی متاع سے مالا مال تھی۔

شگو کی طبیعت اس کے بالکل برعکس تھی اسے شائستہ سے انہی باتوں پر چڑ لگتی تھی اس کے صدق و صبر پر اسے غصہ آتا تھا۔ اکثر اس سے الجھ پڑتی لیکن بہن تھی پیار بھی تھا اس سے اس لئے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ نرس بننے کے بعد جوں ہی جاب ملے گی وہ آپا کے بچوں کے لئے ہر ماہ اچھے اچھے کپڑے ضرور خریدا

کرے گی۔

اور ——

اپنے لئے تو اس نے جو کچھ سوچا تھا وہ اس کے گھریلو حالات سے مطا
تو کیا ایسی سوچ کا بھی متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن بچپن ہی سے اس نے من کے
اندر اک دنیا سجائی تھی خواب اگائے تھے۔ یہ خواب وقت کے ساتھ ساتھ جنگل
کی طرح پھیل چکے تھے وہ اسے حقیقت کی طرح زندہ لگتے تھے۔ اس نے تضادات
کی چکی میں پس کر یہ جان لیا تھا کہ دولت میں بڑی قوت ہے ان خوابوں کو رنگ
دولت ہی دے سکتی ہے۔

وہ نرسنگ کا کورس کر رہی تھی۔ آخری سال میں تھی کچھ ماہ بعد امتحان تھے
امتحان قریب آ رہے تھے اسے یوں لگ رہا تھا منزل قریب آ رہی ہے
نرس کا پیشہ گو اس کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تھا وہ بننا تو ڈاکٹر چاہتی
تھی۔ لیکن میٹرک میں نمبر ہی اتنے آئے تھے کہ وہ پری میڈیکل نہ لے سکتی
تھی۔ جانے کس نے مشورہ دیا تھا اور وہ مان لینے کا اہل کون سا لمحہ تھا کہ شگو
نرسنگ میں داخلہ لینے پر آمادہ ہو گئی تھی۔

نرسنگ کا پیشہ اختیار کر کے وہ اپنی منزل نہیں پا سکتی تھی لیکن اس منزل
کا حصول اس کے اندر کی کاوش تھی۔

جو ——

بدستور جاندار ہوتی جا رہی تھی۔ اور جسے حاصل کرنا شگو کا مشن تھا۔
نگو اور انکل امین کے خوبصورت گھروں کے نقش اس کے ذہن پر نقش تھا

انکل امین کی بیٹی کی شادی کا عکس نقش تھا۔ اس نے اپنے مستقبل کو اس تصور
سے کبھی جدا نہ کیا تھا۔

"لو اماں میں آگئی ——"

امتحان سے فارغ ہو کر شگو اپنا بوریہ بستر سمیٹ کر گھر آگئی۔
اماں نے ہنس کر اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ خیر کرے ——"

شگو نے اپنا بستر اندر پیٹی پر رکھ دیا۔ سوٹ کیس بھی اماں کے صندوق پر
رکھ آئی۔ بیگ میں چھوٹی چھوٹی چیزیں تھیں۔ انہیں جگہ جگہ رکھنے لگی۔

"پرچے اچھے ہو گئے —— پاس تو ہو جاؤ گی نا" اماں نے چارپائی پر بیٹھتے
ہوئے شگو سے پوچھا۔

"ضرور ہو جاؤں گی اماں —— فکر نہ کر اب سختی کے دن کٹ گئے"
وہ بڑے تیقن سے مسکرائی۔

"ڈاکٹر سعدیہ نے تو ابھی سے مجھے اپنے کلینک آنے کی دعوت دی ہے
ان کا خیال ہے باقاعدہ جاب کرنے سے پہلے میں ان کے ساتھ رہوں تجربہ
حاصل کرنے کے لئے ——"

"ڈاکٹر سعدیہ کون ہے ——؟"

"بہت اچھی ڈاکٹر ہیں۔ اکثر وہاں آیا کرتی تھیں۔ اماں اپنی واقفیت بڑے
بڑے ڈاکٹروں سے ہو گئی ہے"

"اچھا ——؟"

"ہوں ——"

"خدا کرے تو پاس ہو جائے۔ محنت ٹھکانے لگے ——"

"ایسی ٹھکانے لگے گی کہ سب دیکھیں گے ——"

وہ ایسی ہی باتیں کرنے کی عادی تھی اور اماں کو اس کی ایسی باتیں کی عادت ہو گئی تھی۔ ویسے اماں خوش تھی کہ شگو گھر آگئی ہے اکیلے رہتے وہ تنگ آچکی تھی۔

"تیرے آنے سے کتنی رونق لگ رہی ہے شگو ——"

"اوں ہوں ——"

"کیا ہے ——"

"شگو نہیں شیگی ——"

"ارے چل ہٹ —— میں تو شگو ہی کہوں گی۔"

"کہو گی تو میں بولوں گی نہیں ——"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی —— اماں بھی مسکرانے لگی۔

"آپا آئی تھی ——"

"پچھلے ہفتے آئی تھی ——"

"ٹھیک ہے ——"

"ہے تو ٹھیک ہی ——"

اماں نے ہنس کر کہا۔

"اس کا کیا مطلب ہوا اماں ——"

اماں مسکرا مسکرا کر اسے دیکھنے لگی پھر بولی۔

"آئی تھی بڑی پریشان تھی ——"

"اس کی پریشانی مسکرانے لائق تھی ——"

اماں نے آنکھیں بھینچتے ہوئے سر ہلایا پھر مسکرا کر بولی۔

"خیر سے پھر امید سے ہے ——"

"ہا ——"

شگو نے پوری آنکھیں پھیلانے اور منہ کھولتے ہوئے سینے پر ہاتھ باندھ لئے ——

"کیا کرے بیچاری —— وہ تو نہیں چاہتی تھی۔ چار ہی بہت تھے پر۔۔۔"

"اُف اماں ——"

شگو جیسے بلبلا اٹھی۔

"اس کے لئے تو ایک بھی بہت تھا۔ اب پانچواں کتنی بے وقوف ہے وہ کیا حالت ہے اس کی —— ننگ دھڑنگ بچوں میں اور اضافہ کئے جائے گی ——"

"چل تجھے کیا ——"

اماں نے مسکرا کر کہا

"اچھا ہے تب تک تجھے کسی ہسپتال میں نوکری مل جائے۔ بہن کا کیس اس دفعہ ہسپتال ہی میں کر لینا —— پھر —— پھر ساتھ ہی —— بچے بند کرنے کا آپریشن بھی کروا دینا ——"

شگو کو تو اس بات کا سخت دھچکہ لگا تھا اماں کی مسکراہٹ اسے زہر لگ
تھی اس کے نزدیک تو رونے کا مقام تھا۔

اماں پھر بولی۔

"جو آئے گا اپنا نصیب لے کر آئے گا ——"

"نصیب تو پہلے چاروں کے نظر آ رہے ہیں —— پانچواں ——"

"اچھا چھوڑ ان باتوں —— جا نہا لے جا کر —— پھپھو سے بھی
ربیعہ صبیحہ پوچھ رہی تھیں تمہارا ——"

"کپڑے نکال رہی ہوں —— نہاتی ہوں —— اماں تم نے تو یہ نئی خ
میرے اوسان ہی خطا کر دیئے۔ آپا کا کیا بنے گا —— کتنا برا حال ہے اس
پہلے ہی —— بچوں کو پالے گی کیسے۔ پڑھائے گی کہاں سے۔ کیا
جاہل ان پڑھ رکھ کر مزدور بنائے گی۔"

اماں نے شگو کا دھیان بٹانے کے لئے کہا۔ "رفیق پھوپھا بھی
انتظار کر رہے تھے ——"

شگو مسکراتے ہوئے بولی

"طاہر نہیں کر رہا تھا میرا انتظار ——"

اماں نے پیار سے اسے گھورا۔

"اب تم لوگ بچے نہیں رہے جوان ہو گئے ہو۔ طاہر کا نام اتنی بے
سے نہ لیا کر ——"

"کیوں —— کیوں نہ لیا کروں۔ ہم دونوں بچپن کے دوست ہیں بے

ساتھی ہیں ——"

"اوں ہوں ——" اماں نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

"ہمارے طبقے کی لڑکیاں دوست نہیں بنائیں ——"

شگو بھی مسکرائی پھر بولی۔

"میں آپ کے طبقے کی لڑکی نہیں ہوں۔ سمجھی اماں ——"

اماں نے سر ہلایا۔

شگو سنجیدہ ہو کر بولی۔

"اماں —— مجھے یہ بندشیں پسند نہیں ہیں —— میں پھپھو کے گھر جیسے ہمیشہ سے جاتی آتی ہوں اب بھی ویسے ہی جایا آیا کروں گی —— طاہر کے ساتھ میرے جیسے مراسم ہمیشہ سے ہیں۔ ویسے ہی رہیں گے۔"

اماں کچھ نہیں بولی۔

شگو بیگ سے کپڑے نکال کر چارپائی پر رکھتے ہوئے بولی۔

"میں اس سے گپ شپ لگاتی ہوں۔ لڈو اور کیرم کھیلتی ہوں۔ تاش کی بازی بھی جم جاتی ہے۔ دنیا کے مسئلے مسائل پر بحث مباحثہ بھی ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اب بھی ہوگا اماں۔ بلکہ اب تو مزہ آئے گا۔ پہلے تو ہفتے دو ہفتے بعد گھر آتی تھی تو تھوڑی سی فرصت ملتی تھی اب تو فارغ ہی فارغ ہوں۔"

اماں جانتی تھی کہ اس لڑکی کو روکنا بھڑکانے کے مترادف ہے۔ اماں کی اپنی سوچ تھی۔ طاہر اب ماشاءاللہ اک خوبرو نوجوان بن چکا تھا۔ ایم اے کرنے کے بعد عارضی نوکری کر رہا تھا۔ کسی اچھی ملازمت کی تلاش تھی۔ بہت سعادت مند

اور شریف لڑکا تھا گھریلو مالی حالات بھی اچھے تھے باپ کا کاروبار ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔

گو رشیدہ اور رفیق نے ہر آن ہر پل اماں کا ساتھ دیا تھا پھر بھی اسے پکا یقین نہیں تھا کہ یہ لوگ طاہر کے لئے شگو کا ہاتھ طلب کریں گے۔ اسی لئے اس نے شگو کو خبردار کرنے کے لئے بڑی ملائمت سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

لیکن

شگو

وہ تو اماں کی بھی اماں تھی۔ بحث و تکرار میں اماں کو جیتنے کہاں دیتی تھی اماں ہی چپ ہو گئی تھی۔ ورنہ شگو نہانا دھونا بھی بھول جاتی اور اماں سے بحث کر کے اپنی دلیل منوا کے رہتی چاہے گھنٹوں لگ جاتے۔

اماں اٹھ کر شگو کی بے ترتیبی سے رکھی ہوئی چیزیں ترتیب سے رکھنے لگی شگو اپنے کپڑے لے کر نہانے چلی گئی۔

فراغت کا احساس جانفزا ہوتا ہے۔ شگو کے سر سے امتحانوں کا بوجھ اتر گیا تھا۔ جب تک جاب نہ ملتی وہ فارغ تھی۔ وقت گزاری کے بڑے پلان اس کے ذہن میں آ رہے تھے اس پلان میں طاہر کو اس نے اک لازمی جزو کی طرح آپ ہی آپ شامل کر لیا تھا۔

نہا دھو کر وہ صحن میں آئی کندھوں پر تولیہ پھیلائے — اور بالوں کو جھٹک جھٹک کر سکھانے لگی۔

شائستہ نے صحن کی دیوار پر دو فٹ کا آئینہ لگایا ہوا تھا۔ آئینہ کی چمک دمک

غائب ہو چکی تھی اس کی قلعی کو کئی جگہ زنگ لگ چکا تھا۔ شگو کو اس آئینے سے بڑی خار آتی تھی۔ وہ جس دن بھی گھر آتی تھی اماں سے کہتی تھی، "یہ اتار دو اماں، کس لئے لگا رکھا ہے کسی کام کا تو ہے نہیں۔"

اماں کہتی "تیرا کیا لیتا ہے میری شائستہ نے لگایا ہوا ہے — اندر باہر آتے جاتے منہ دیکھ ہی لیتا ہے آدمی ——"

اماں کی دلیل اسے کبھی نہ بھائی تھی۔

لیکن ——

آج وہ غسل خانے سے صحن میں آئی تھی۔ بال سکھا رہی تھی تو آئینے پر نگاہ ڈالی، اور اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ یہ آئینہ غنیمت لگا ورنہ کوئی بڑا آئینہ گھر میں تھا ہی نہیں۔

وہ برش بالوں میں پھیرتے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑی اپنا جائزہ لیتی رہی ——

وہ یقیناً خوبصورت تھی۔ بڑی بڑی گہری گہری آنکھیں — بھرے بھرے گلابی ہونٹ۔ ناک قدرے موٹی تھی لیکن چہرے پر خوب سجی تھی۔ وہ اپنے بالوں کو برش کرتے اپنے چہرے کو بڑے ناقدانہ انداز میں تک رہی تھی جانے کیوں اسے اپنا حسن جاندار نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اتنی حسین لگ نہیں رہی تھی جتنی وہ تھی۔ جتنا اسے لگنا چاہیئے تھا۔

تو کیا اس کے چہرے پر اس کے طبقے کی چھاپ لگی تھی۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ انسان اپنے چہرے سے پہچانا جاتا ہے وہ جس طبقے سے تعلق رکھتا ہو

اس کی چھاپ اس کے چہرے پر لگی ہوتی ہے۔ خوشحالی اور آسودگی بذات خود حسن ہے۔ یہ میسر ہو تو ان کا ہر تو چہروں پر پڑتا تھا۔ اسی طرح بے سکونی ناآسودگی بھی چہروں سے نظر آجاتی ہے۔

یقیناً یہ بات صحیح تھی جبھی تو اسے اپنے چہرے پر خوبصورتی کے باوجود بشاشت اور تازگی کا پرتو نظر نہیں آ رہا تھا۔ حسن بجھا بجھا۔ جاذبیت دھیمی دھیمی کشش مری مری۔

وہ گھبرا کر آئینے میں غور سے اپنا آپ دیکھنے لگی۔

بڑی دیر دیکھتی رہی۔

بڑی دیر تجزیہ کرتی رہی۔

نقوش کو مختلف زاویوں سے جانچتی رہی۔

اسے خاصی ڈپریشن ہوئی۔

بہت سی امیر لڑکیوں کے چہرے نظروں میں گھوم گئے خوبصورت نہ ہونے کے باوجود شاداب رسیلے خوشگوار۔ زندگی کی مسکراہٹوں سے جگمگاتے۔ اس نے اک گہری سانس لی۔

اور بالوں میں بے توجہی سے برش پھیرنے لگی۔

وہ بال بنا کر آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اندر آ کر دوپٹہ کندھوں پر پھیلا تولیہ صحن میں رسی پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"اماں ــــــ میں اوپر جا رہی ہوں۔ پھپھو کے ہاں ــــــ"

"اچھا ــــــ اماں نے جواب دیا۔

شگو سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

سیڑھیاں بھی شکستہ سی ہو رہی تھیں کئی جگہ سے اینٹیں بیٹھ گئی تھیں کئی جگہ سے ابھر آئی تھیں۔ یوں خاصی ناہموار ہو چکی تھیں۔ شگو انہیں پھلانگتے ہوئے اوپر آ گئی۔

پتہ نہیں کہاں سے انکل امین کے گھر کی کارپٹ پڑی سیڑھیاں اس کے ذہن میں آ گئیں۔ چوبی جنگلے والی چوڑی چوڑی سیڑھیاں جن پر ارغوانی کارپٹ پڑے تھے ایک طرف کی دیوار پر بڑے بڑے فریموں والی تصویریں تھیں اور دوسری طرف تازہ پودوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔

"اوشگو ——"

"اوں ہوں ——"

"کیوں ——"

"پھر شگو کہا ——"

"اوہ سوری —— ہاں تو آگئیں تم ——"

"بالکل آگئی —— یہ نفیس نفیس تمہارے سامنے کھڑی ہوں ——"

شگو درمیانی دیوار کے دروازے سے نکل کر چھت پر آگئی تھی طاہر ہی تھا وہ کرسی پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ قریب ہی میز پر دو اور ضخیم کتابیں پڑی تھیں۔

ہلکے براؤن شلوار قمیص میں تھا۔ قمیص کے بٹن کھلے تھے اور اس کی چوڑی کے بال باہر جھانک رہے تھے سر کے بال بڑے سلیقے سے سنوارے ہوئے تھے۔ شگو نے اس پر اک نگاہ ڈالی تھی۔ یہ نگاہ وہیں اٹک گئی تھی۔ آج پہلی

جیسے اسے تک رہی تھی۔ کتنا ہینڈسم اور کتنا سمارٹ ہوگیا تھا وہ — اسے ایک دم ہی وہ بہت اچھا لگا۔

اتنا بہت کہ اس بہت کو من میں سمیٹنا مشکل ہوگیا وہ اپنے اس انوکھے سے احساس سے کچھ ہڑبڑا سی گئی۔ اس سے نکلنے کے لیئے ہی اس نے پاؤں زمین پر زور سے مارا تھا۔

اور طاہر اسے اپنے سامنے پاکر خوشی اور حیرانگی سے صرف یہی کہہ پایا تھا۔

"اوشگو ——"

"بیٹھو ——"

طاہر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

شگو کرسی کھینچ کر اس کی کرسی کے سامنے کرتے ہوئے بیٹھ گئی۔

"کیا پڑھ رہے ہو ——"

شگو نے میز پر پڑی کتاب اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

طاہر کی بھرپور شخصیت اس پر چھائی جا رہی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ نہ پا رہی تھی پتہ نہیں کیوں۔

شاید یہ اماں کی بات کا لاشعوری ردِعمل تھا اس کا اندر کا من جان گیا تھا کہ اماں نے طاہر سے بے تکلف ہونے سے کیوں منع کیا تھا۔ اماں کا جملہ اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔

طاہر نے کرسی کے ہتھے پر الٹی رکھی کتاب اٹھا کر میز پر رکھتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھا اور شوخی سے بولا۔

"بے کار وقت نہیں گزرتا تھا ــــــ لائبریری سے یہ کتابیں لے آ

لیکن اب ــــــ"

"اب کیا ــــــ ؟"

"اب کتابیں واپس کر آؤں گا ــــــ"

"کیوں ــــــ"

"بس ــــــ"

"یہ کیا بات ہوئی ــــــ"

"بھئی اب کتابیں پڑھنے کا وقت ہی کہاں ہوگا"

"کیوں نہیں ہوگا ــــــ"

طاہر نے اک ہنستی مسکراتی نگاہ اس پر ڈالی پھر شوخی سے بولا۔

"اب تم جو آگئی ہو ــــــ"

شگو نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی فطری شوخی اور بے تکلفی بھلا تکلفات کی پابند ہو سکتی تھی مسکراتے ہوئے بولی۔ "میرے آنے کا مطلب یہ کہ تم مطالعہ ہی چھوڑ دو ــــــ"

"ظاہر ہے ایسا ہی ہوگا ــــــ"

"کیوں ہوگا ــــــ"

"ضرور ہوگا ــــــ"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے ــــ اس ہنسی میں کتنی اپنائیت تھی۔ دونوں نے ہی محسوس کی۔

چند لمحے دونوں ہنسی کے خوبصورت احساس سے محظوظ ہوتے رہے۔

پھر

شگو بولی "میں تو چار سال بعد فری ہوئی ہوں ــــــ رزلٹ تک ذہن کو زہ دم رکھوں گی"

"کیا مطلب ــــــ"

"مطلب یہی ہے کہ یہ فالتو وقت خوب انجوائے کروں گی"

"کیسے ــــــ ؟"

"ایسے کہ ــــــ تمہارے ساتھ گپ شپ لڑایا کروں گی۔ تاش لڈو اور کیرم بلا کروں گی۔ کبھی کبھی پکچر بھی دیکھنے جایا کروں گی۔"

"میرے ساتھ اکیلی ــــــ"

"جی نہیں ــــــ تمہارے ساتھ سب کے ساتھ ــ سمجھے ــــــ"

"اچھا اور ــــــ"

"اور ــــ اور ــــــ صبیحہ آپا اور ربیعہ کا دماغ چاٹا کروں گی۔ پھپھو کے س بیٹھ کر پرانی باتیں سنا کروں گی"

طاہر نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور ہنستے ہوئے بولا۔ "امی نے تمہیں بہت سر چڑھا رکھا ہے"

"جلتے ہو ــــــ ؟"

"نہیں تو ــــــ"

"پھر ــــــ"

"خوش ہوتا ہوں ——"

"اچھا ——"

"پوچھو تو سہی کیوں خوش ہوتا ہوں ——"

"کیوں ——"

"امی راضی تو جہاں راضی ——" طاہر نے شوخی سے اپنی آنکھیں
آنکھوں میں ڈال کر کہا۔

"اس شوخی سے وہ طاہر کی بات کا مطلب تو سمجھ گئی لیکن سمجھ کر نا
ہنستے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب —— ؟"

"مطلب وقت آنے پر سمجھاؤں گا" وہ اسی مسحور کن انداز میں بولا
شگو کے گالوں پر شفق سی چھوٹی —— لیکن جلد ہی سنبھل کر بولی۔

"وہ —— وقت —— ابھی بہت دور ہے ——"

"دور نزدیک کی پرواہ نہیں —— وقت ہے تو نا —— ہوں ——
شیگی ——"

"ہٹو —— کوئی کام کی بات کرو ——"

"اس سے زیادہ کام کی بات کیا ہوگی"

شگو نے بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھا اور کرسی آگے ؟
ہوئے بولی۔

"اس منزل تک پہنچنے کے لئے بڑا طویل اور کٹھن راستہ طے کرنا

کیا سمجھے ——"

"وہ میں بھی جانتا ہوں۔ سب سمجھتا ہوں۔ لیکن اس راستے پر قدم رکھ چکا
ہوں اب مسافتیں طے کرنا ہی ہیں"

شگو نے ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور شوخی سے بولی۔

"اچھا جی —— اس راستے پر قدم رکھ چکے ہیں جناب ——"

"مدتوں سے رکھ چکا ہوں محترمہ ——"

"واقعی ——"

"کیا تم نہیں جانتیں ——"

"اوں ہوں ——"

"جھوٹ بولتی ہو —— سب کچھ جانتی ہو ——"

"یعنی ——"

"یعنی —— یعنی ——"

"طاہر کچھ کہہ نہ سکا۔ ہاں اس بات پر دونوں نے پھر اک مشترکہ قہقہہ لگایا۔ بات
سمجھنے سمجھانے یا جاننے بوجھنے کی تھوڑا ہی تھی۔ برسوں سے دونوں اک بندھن
میں جکڑے چلے آرہے تھے —— بچپن میں یہ معصوم پیار تھا —— لڑکپن میں یہ
دوستی بن گیا۔

اور ——

اب ——

جوانی اپنے نکھار اور تازگی کے ساتھ اُمڈ آئی تھی۔ تو یہ پیار اور دوستی

محبت کے اٹوٹ رشتے کا روپ دھار چکے تھے۔

تھوڑی دیر دونوں باتیں کرتے رہے۔

پھر طاہر نے پوچھا۔

"کچھ کھیلو گی ــــ تاش کیرم ــــ لڈو ــــ"

"نہیں بھئی ــــ"

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"کیوں ــــ"

"ابھی تو میں نیچے جاؤں گی۔ سب سے ملنے ــــ"

"کوئی برسوں بعد تو نہیں آئی ہو۔ ہر ہفتے دوسرے ہفتے آ کر رہتی تھیں
سب سے مل بھی لیتی تھیں۔"

"تو کیا نہ جاؤں ان کے پاس ــــ"

"چلی جانا ــــ ابھی تو بیٹھو ــــ"

شگو کھڑی رہی۔

"پلیز بیٹھو نا ــــ" طاہر نے بڑی لجاجت سے پوچھا۔

شگو اس پر اک ادا کے دلربائی سے نگاہ ڈالتے ہوئے پھر کرسی پر بیٹھ
سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ شام ابھی اترنے کی نہیں تھی۔ موسم بڑا خوبصورت تھا۔
آسمان پر بدلیاں تیر رہی تھیں۔

سورج غروب ہو رہا تھا اور اس کی کمزور اور نڈھال کرنیں اترتی شام کے
کے راستے میں مزاحم ہو رہی تھیں بوجھل ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے

ماحول کو چھیڑ جاتے تھے۔ سردیوں کی آمد آمد تھی ــــ خوشگواری کا احساس ذہنوں میں
آپ ہی آپ اتر رہا تھا۔

دونوں پھر باتیں کرنے لگے۔

"تمہاری نوکری کیسی جا رہی ہے ــــ" شگو ادھر ادھر کی باتوں کے
بعد پوچھا۔

"فی الحال تو صرف جیب خرچ ہی نکل رہا ہے۔"

طاہر نے ہنس کر کہا۔

"بس ــــ"

"ہوں ــــ"

"اسی جاب سے چمٹے رہو گے۔"

"نہیں تو ــــ کئی جگہ اپلائی کیا ہوا ہے۔ یہ تو وقت گزاری کے لئے کر
لی تھی۔ چار پیسے آ ہی جاتے ہیں نا ــــ آپا جی سے جیب خرچ تو نہیں مانگنا پڑتا۔
ربیعہ اور صبیحہ آپا کے لئے بھی امی کو تھوڑا بہت دے دیتا ہوں ــــ ظہیر کی فیس
میں دیتا ہوں۔"

"یعنی بہت کام کے ہو گئے ہو ــــ" وہ ہنسی۔

"سدا سے ہوں ــــ اب تھوڑا ہی ہوا ہوں ــــ"

"اچھا ــــ"

"ہاں ــــ"

"بس پھر ٹھیک ہے۔ چمٹے رہو ــــ"

"اوں ہوں ـــــ اپنے پلان بھی تم سے کچھ کم نہیں ـــــ"

"سنو تو ـــــ"

طاہر نے میز پر رکھی کتابوں کی طرف انگوٹھے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا

"انہیں دیکھ رہی ہو ـــــ"

"ہاں ـــــ"

"انہیں ایسے ہی نہیں گھول کر پی رہا ـــــ"

"تو کیا ارادہ ہے ـــــ"

"سی ایس ایس کا امتحان دوں گا"

"سچی ـــــ"

"ہاں ـــــ"

"خوشی کی بات ہے ـــــ"

"ہونی بھی چاہیئے ـــــ یہ سب کچھ تمہاری خاطر ہی ـــــ"

"میری خاطر ـــــ"

"بالکل ـــــ ہم جانتے ہیں ہماری یہ سرکار کسی معمولی ملازم کو نگاہ پر لانے والی نہیں۔ بڑے اونچے آدرش ہیں ان کے ـــــ اس لئے ہی"

شگو ہنس پڑی اور بولی۔

"آسمان پر تیر مارو گے تو کھجور تک جائے گا ہی ـــــ تم جانتے ہو وہ لوگ بالکل اچھے نہیں لگتے جو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ بس یہی تھا۔ اتنا ہی تھا۔ غریبی کو تقدیر کے نام پر جھیلتے رہتے ہیں۔"

"جانتے ہیں سرکار جانتے ہیں ـــــ" وہ ہنس کر بولا۔

"اس لئے انہی خطوط پر اپنے آپ کو ڈھال رہا ہوں ـــــ"

شگو مسکراتی رہی۔

وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس سلسلے میں ـــــ میں اور بھی بہت کچھ کر رہا ہوں ـــــ"

"وہ کیا ـــــ؟"

"پچھلی دفعہ تمہیں بتایا تو تھا ـــــ"

"کیا ـــــ"

"معمّے حل کر کے بھیجتا ہوں۔ شاید کوئی بڑا انعام نکل آئے"

شگو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"نکلا کوئی ـــــ"

"نہیں ـــــ فی الحال تو جیب ہی سے خرچ کر رہا ہوں"

"پیسہ حاصل کرنے کے لئے یہ شارٹ کٹ اچھا ہے۔ لیکن کچھ اور ـــــ"

"کچھ اور یہ ہے کہ ہر ماہ تنخواہ میں سے تھوڑے سے پرائز بانڈ بھی خرید رہا ہوں ـــــ"

"بہت خوب ـــــ"

"دیکھا ـــــ"

"نکلا بھی کوئی یا ایسے ہی ـــــ"

"فی الحال تو کوئی نکلا نہیں ـــــ لیکن امید تو ہے ـــــ کسی دن ـــــ"

اچانک ہی فرسٹ پرائز نکل آئے گا ــــــ"

شگو خوشی سے دونوں ہاتھوں کو الجھا کر سختی سے آنکھیں میچتے ہوئے

" طاہر کتنا اچھا ہو جو پانچ لاکھ کا بانڈ نکل آئے "

" نکلے گا تو اپنا کام چلے گا نا ــــ" طاہر نے مسکرا کر کہا۔ شگو نے تشکر سے اسے دیکھ کر سر ہلا دیا۔

" مجھے جاب مل گئی نا ــــ تو ــــ" شگو بولی۔ " تو میں بھی بانڈ ضرور خریدا کروں گی ــــ"

" پانچ تمہارا نکل آئے پانچ میرا ــــ"

" ہائے کبھی ایسا ہو تو ــــ"

" ہو جائے تو پھر ــــ کام چلے گا نا ــــ"

طاہر نے ہاتھ پھیلایا۔

" بالکل چلے گا ــــ" شگو نے شوخی سے اس کے ہاتھ پر

طاہر نے اس کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا

" چھوڑو طاہر ــــ"

شگو خوشی کے خول سے باہر نکلی تو طاہر کے ہاتھ کی مضبوط گرفت کا سارا وجود جھنجھنا اٹھا۔

" اوں ہوں ــــ"

طاہر نے ہاتھ اور زور سے دبایا۔

" چھوڑو بھی ــــ" شگو نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑانا چاہا۔

" ہمت ہے تو چھڑا لو " طاہر نے اس کی آنکھوں میں حسین سی سرگوشی کی۔

شگو کی بے باکی اور نڈر پن سب ہوا ہو گئے۔ چہرے پر شفق پھیل گئی ہونٹ کپکپائے اور نگاہیں جھک گئیں۔

" واہ شگو ــــ" طاہر نے بڑے پیار سے سر جھکا کر اس کے جھکے جھکے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی۔

اس نے سر اور جھکا لیا ــــ

" یہ نیا انداز ــــ کتنا قاتل ہے شگو ــــ کاش تم سدا اسی انداز میں میرے سامنے بیٹھی رہو ــــ"

آخری بار زور سے دبا کر طاہر نے اس کا ہاتھ ہولے سے چھوڑ دیا۔

وہ چند لمحے بے دم سی بیٹھی رہی۔

پھر ــــ

ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیچے جانے کی بجائے وہ اپنے گھر کی طرف مڑ گئی

طاہر اسے پیار بھری نظروں سے تکتا رہا۔

"اماں ـــــــ"

"ہاں ـــــــ"

"بڑے دنوں سے آپا نہیں آئی ـــــــ"

"مصروف ہو گی ـــــ سارا دن بال بچوں کے جھنجھٹ ہی میں گزر جاتا ہے وسیم کو بھی فرصت نہیں ہو گی۔ ورنہ چکر لگا جاتا"

"میں آپا کے ہاں ہو آؤں ـــــــ"

اماں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ وہ تو آپا کے گھر جانے کے نام سے گھبراتی تھی۔ تنگ گلیوں سے گزر کر جانا اسے اچھا نہیں لگتا تھا پھر آپا کا گھر سا محل دو محلا تھا جو وہاں خوشی سے جانے کو تیار ہوتی۔ اماں جب بھی جاتی ساتھ چلنے کو کہتی لیکن وہ ناک منہ چڑھا کر انکار کر دیتی۔

"آپا کو ساتھ ہی لے آنا ـــــ"

اس کا جواب ہوتا۔

لیکن ـــــــ

آج ـــــــ

وہ آپا کے ہاں جانا چاہ رہی تھی۔

"جاؤں اماں ـــــ"

اس نے اماں کی حیرانگی نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے آج ـــــ" اماں جو دھونے کے لئے میلے کپڑے اکٹھے کر کے نل کے پاس رکھ رہی تھی بولی۔

"بس جی چاہ رہا ہے ـــــ" وہ اٹھلائی۔

"آپا بھی تو بڑے دن ہو گئے نہیں آئی ـــ شادو رقی منو اور جھینگے کو بھی دیکھنے کو جی چاہ رہا ہے"

"دیکھ شگو ان کے بچے کو جھینگا نہ کہا کر ـــــ شائستہ کی تو خیر ہے کسی دن وسیم نہ برا مان جائے"

"اماں ـــــ" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"وہ جھینگا سا ہی تو لگتا ہے ـــــ بیچارہ ـــــ اب پانچویں صاحب بہادر کس حلئے میں تشریف لائیں گے ـــــ؟ وہ ـــــ"

"شگو ـــــ"

اماں نے برا سا منہ بنا کر اسے گھورا۔ "پانچواں آئے یا چھٹا۔ تو بک بک نہ کیا کر۔ زیب نہیں دیتی تجھے یہ باتیں ـــــ"

شگو پھر کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔ "ا

"اوہ میری ماں ـــــ تو بھی کتنی سادہ ہے۔ میں نے نرسنگ کی ب
بچے کی آمد سے پہلے اور بعد کی ساری باتیں ہمیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اوہ میری
ماں ـــــ"

شگو نے آگے بڑھ کر ماں کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔

"ہٹ ـــــ"

اماں نے اس کے بازو گلے سے نکالنا چاہے۔

شگو نے چپ سے ماں کے گال کو پیار کر لیا۔ ہنستے ہوئے بولی۔

"نرس اور ڈاکٹر سے کوئی پردہ نہیں ہوتا اماں ـــــ جب میں نوکری کر لو
تو یہ سب کچھ میرے روز کا معمول ہوگا۔ سمجھیں اماں ـــــ میں آپا کے ہاں ب
اس لئے جانا چاہتی ہوں کہ انہیں مشورہ دوں۔ بہت کمزور ہو رہی ہیں کوئی ٹانک ک
چاہیئے انہیں۔ خوراک اچھی رکھنا چاہیئے۔ وہاں جانے کا ایک مقصد یہ بھی ہ
کہ انہیں یہ سب کچھ بتاؤں ـــــ"

اماں کچھ نہیں بولی۔

شگو نے پھر پوچھا۔

"اب اجازت ہے جاؤں آپا کے ہاں ـــــ"

"جاؤ ـــــ"

"تھینک یو مام ـــــ"

شگو نے بڑے اسٹائل سے پھر ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر شوخی سے
کہا۔ اماں مسکرانے لگیں۔

شگو اندر چلی گئی ـــــ کپڑے نکالے استری کئے۔ پھر غسل خانے میں چلی گئی تھوڑی دیر بعد وہ جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ کپڑے اس کے پاس کچھ زیادہ نہیں تھے۔

نہ ہی قیمتی تھے۔ لیکن وہ کپڑے پہنتی بڑے سلیقے سے تھی۔ ہر وقت تراش خراش کرتی رہتی۔ ڈیزائن بناتی۔ کانٹ چھانٹ کرتی۔ یوں پرانے کپڑوں کو بھی نئے فیشن کا بنا لیتی تھی۔

اب بھی اس نے ایسا ہی ایک خوبصورت جوڑا پہنا ہوا تھا۔ پلین اور پھولدار پیازی رنگ کے سوتی کپڑے کا شلوار کرتا تھا۔ دوپٹہ پرانا ہی رنگوا کر میچ کر لیا تھا۔ کٹے بال بڑی خوبصورتی سے سنوارے تھے۔ رولر تو اس کے پاس تھے نہیں۔ لوہے کے راڈ ہی نیم گرم کر کے جہاں جہاں بالوں کو ابھارنا ہوتا تھا اس کے گرد لپیٹ کر سیٹ کر لیتی تھی۔ گیلے بالوں کو گول برش بھی پھیر پھیر کر اپنا مقصد حل کر لیا کرتی تھی۔

اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا

بہت اچھی لگ رہی تھی۔

بیگ کندھے پر لٹکاتے ہوئے وہ صحن میں آئی۔

اماں نل تلے کپڑے دھو رہی تھی شگو کو دیکھا تو جلدی سے بولی۔

"بیٹی چادر لے لے اوپر۔ ململ کی چادر پیٹی کے اوپر پڑی ہے۔"

"چادر لوں ـــــ" وہ حیرانگی سے بولی۔

"ہاں ـــــ"

"کیوں ——"

"اچھا ہوتا ہے۔ گلی محلوں میں جسم کو ڈھانپ کر ہی نکلنا اچھا ہوتا ہے (ا) تو تو نے گلے میں لٹکا رکھا ہے۔"

"اماں ——"

وہ اکڑوں ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں ——"

"یہ نئی نئی پابندیاں کیوں لگا رہی ہو مجھ پر ——"

"تو کوئی بری بات کہی ہے —— شرم و حیا اچھی چیز ہے بیٹی۔"

"چادر نہ لوں تو بے شرم بن جاؤں گی ——"

"اے جا نیئے تیرے ساتھ کون مغز کھپائے"

"اماں —— آج تک میں چادر اوڑھ کر کہیں گئی آئی ہوں —— چار سال میں رہی وہاں سے آتی جاتی رہی —— تم نے پہلے تو کبھی نہیں کہا کہ ——"

"بس اب جا بھی —— اور ہاں سن —— بچوں کے لئے کچھ ٹافیوں کا پیکٹ لے جانا۔ پیسے لے لے میرے بکس کی نکر میں رکھے ہیں۔"

"کتنے لوں ——"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"دس لے لے ——" اماں نے کہا۔

"بس یہ جائے گی نا ——"

"تو اور کیا پیدل جاؤں گی ——"

شگو اندر گئی —— دس روپے کا نوٹ نکال کر بیگ میں رکھا۔ کچھ پیسے پہلے بھی پاس تھے۔

اماں کو سلام کر کے وہ باہر نکل گئی۔

دس بجنے والے تھے گلی میں کافی چہل پہل تھی مرد تو کام کاج کے لئے جا چکے تھے عورتیں اور بچے ہی آ جا رہے تھے۔ صدیوں پرانی ہمسایہ داریاں ہوتی ہیں گلی محلوں میں ایک کنبے کی طرح مل جل کر رہنے کا احساس ہوتا ہے۔ شگو بھی باہر نکلی تو کسی کو سلام کیا۔

کسی نے اس کا حال پوچھا۔ پھیری والے سبزی پھل کی ریڑھیوں والے کئی دروازوں کے سامنے کھڑے تھے۔ عورتیں بھاؤ تاؤ کر کے سودا لے رہی تھیں شگو تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گلی کا موڑ مڑ کر دوسری گلی میں آ گئی۔ وہاں بھی جان پہچان کے لوگ تھے۔

مصطفیٰ کی گھر والی نے تو دو منٹ کے لئے روک بھی لیا حال احوال بھی پوچھا۔ پڑھائی اور امتحانوں کے متعلق استفسار کیا نتیجے کے بعد نوکری کے بارے میں بھی پوچھ گچھ کی۔

شگو گلی سے نکل کر بازار میں آ گئی۔

بازار میں خوب رونق تھی —— دکانیں کھل چکی تھیں۔ لوگ آ جا رہے تھے رکشے تانگے ریڑھے گاڑیاں موٹر سائیکل اور ویگنیں سامان اور انسان لادے لئے آ جا رہی تھیں۔

یہ بازار بڑا گنجان آباد اور پر رونق تھا شام کو تو کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔

تنگ و تاریک گلیوں کے مکین ابل پڑے تھے۔ ان کی ہواخوری یہی تھی کہ گلی محلے سے نکل کر اس بازار میں آجائیں۔ خرید و فروخت کریں۔ دودھ دہی کی دکانوں پر بیٹھ کر لسی دودھ پئیں۔

چھاجے حلوائی کے دکان کے باہر نکلے پھٹوں پر بیٹھ کر برفی جلیبیاں کھائیں اور رحمو پنواڑی سے کوک پی کر پان کھائیں ـــــ خوب گہما گہمی ہوتی تھی شام کو ـــ اس وقت بھی رش کافی تھا۔

سڑک کے دونوں طرف دکانیں تھیں۔ ہر قسم کی دکانیں موجود تھیں سبزی گوشت کریانے کی دکانیں تھیں۔ پھل کی دکانیں تھیں۔ کپڑے کی دکانیں تھیں جنرل مرچنٹ تھے۔

دھوبی نائی اور درزی کی دکانیں تھیں۔ ڈاکٹر بھی تھے اور کیمسٹ بھی۔ غرضیکہ زندگی کی ضروریات سے نپٹنے کے لئے ہر قسم کا کاروبار ہو رہا تھا دکانیں پرانی تھیں۔ کچھ عمارتیں ڈھا کر نئی بنا دی گئی تھیں۔ لوگ جمے جمائے اڈوں پر بیٹھے تھے رش اور کھپ بہت تھی اس بازار میں۔ گندگی بھی تھی۔ دکانوں کے سامنے ہی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پڑے تھے۔

دکانوں کے پھٹوں کے نیچے بہنے والے نالی نما نالے میں اکثر سیاہی رنگ کا ملغوبہ بھرا رہتا جس سے تعفن ہوتا۔ لوگ اس تعفن کے بھی عادی ہو چکے تھے۔ اسی لئے تو دکانوں ریڑھیوں اور ٹھیلوں پر کھڑے ہو کر کھانا پینا چلتا رہتا تھا۔

گندگی سے کراہت کا احساس ہی جیسے ناپید تھا۔ شگو گلی سے بازار میں

آئی۔ دائیں ہاتھ ہی رحمو پنواڑی کی دکان تھی۔ اس نے پان سگریٹ اور کوک کے ساتھ ٹافیاں بھی رکھی ہوتی تھیں۔ شیشے کے مرتبانوں میں رنگا رنگ ٹافیاں پڑی رہتیں۔ گلی کے بچے اکثر اسی دکان سے ٹافیاں خریدتے تھے۔ شگو نے دو پیکٹ ٹافیوں کے خریدے۔ بیگ میں ڈالے اور پیسے دے کر آگے بڑھ گئی۔ دو تین دکانیں چھوڑ کر چھاجے حلوائی کی دکان تھی۔ اس کی برفی بہت مشہور تھی ـــ شگو نے اپنے پیسوں میں سے بچوں کے لئے آدھ کلو برفی لی۔ یہ کوئی صاف ستھری اور نئی دکان نہ تھی۔ آدھے حصے میں شیشے کے شوکیس تھے جن میں مٹھائیوں کے تھال تھے۔

دوسرے حصے میں کڑاہے تھے۔ جن میں دودھ ابل رہا تھا۔ آٹھ آٹھ دس دس سال کے بچے مسلسل اس میں کفگیر چلا رہے تھے۔ دودھ سے کھویا بنایا جا رہا تھا اندر سے دکان کافی کشادہ تھی۔ کسی جگہ میدہ گوندھا جا رہا تھا کسی جگہ پستہ کاٹا جا رہا تھا۔

دکان میں جیسے صدیوں سے صفائی نہیں ہوئی تھی ہر چیز دھواں کھائی تھی لیکن اس کے باوجود یہ دکان بہت چلتی تھی۔ بہت عمدہ اور لذیذ مٹھائی ہوتی تھی اس کی۔ بیاہ شادی کے لوگ ٹوکروں کے حساب سے مٹھائی یہاں سے خریدتے تھے۔

شگو کو ہمیشہ ہی اس دکان سے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن وہ ہمیشہ ہی اس دکان سے مٹھائی لیتی تھی ـــــ کبھی کبھی ہوسٹل میں بھی مٹھائی لے جایا کرتی تھی۔

بیگ کندھے پر لٹکائے مٹھائی کا ڈبہ ہاتھ میں پکڑے وہ سڑک کے
کنارے چلتی اس پرانے بوہڑ کے درخت تلے آن کھڑی ہوئی جہاں دو
تھی۔ وہاں پہلے سے بھی کچھ میلے کچیلے لباسوں میں ملبوس کچھ اپ ٹو ڈیٹ
ویگن کے انتظار میں کھڑے تھے۔

"اہم ——"

سائیکل رکنے کے ساتھ ہی یہ آواز آئی تو شگو نے گھوم کر دائیں طرف
طاہر ایک پیر زمین پر ٹکائے سائیکل روک کر اسے مخاطب کر رہا تھا۔

"تم ——"

شگو کے چہرے پر بہار سی آگئی۔

"کہاں جا رہی ہو ——" طاہر نے ویسے ہی زمین پر ایک پیر ٹکا
ہینڈلوں پر جھکے جھکے پوچھا۔

"آپا کے ہاں ——"

"خیریت ——"

"یونہی جی چاہ رہا تھا ملنے کو ——"

"اچھی بات ——"

"تم کہاں جا رہے ہو ——"

"جا تو ادھر ہی رہا تھا۔ ایک دوست کے گھر ——"

طاہر نے شگو کے سراپا پر ایک پیار بھری نگاہ ڈالی۔
پھر سائیکل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس پہ جا رہا ہوں۔ تمہیں ساتھ

جانے کی بات نہیں کر سکتا ——"

شگو مسکرائی۔

"کیا ہوتا جو تمہارے پاس گاڑی ہوتی —— ہوں ——"

"کیا بات تھی —— کس شان سے آفر کرتا تمہیں لفٹ کی —— ہیں نا ——"

"بالکل ——"

"کوئی بات نہیں —— وہ وقت بھی آجائے گا —— انشاءاللہ ——
جب اس سائیکل کی بجائے ما بدولت کے پاس گاڑی ہوگی۔"
اس نے سائیکل کے ہینڈلوں پر ہاتھ مارے۔ شگو اسے دیکھ کر مسکراتے
ہوئے بولی۔

"سائیکل اور کار کا درمیانی فاصلہ بہت زیادہ ہے طاہر صاحب۔"

"ہم یہ فاصلہ پاٹ لیں گے حضور ——"

"اے ——"

"کیا ہے ——"

"جگہ تو دیکھو کہاں کھڑے ہو —— ایسی باتیں ——"

"اوہ —— واقعی —— لوگ جانے کیا سمجھیں گے ——"

"تو بھاگو یہاں سے ——"

"جا رہا ہوں ——"

"آپا کی طرف آؤ گے ——"

"آؤں گا —— تم کب تک وہاں ہو ——"

"چار پانچ بجے آؤں گی ——"

"ٹھیک ہے —— بائے ——"

"بائے ——"

طاہر نے پیڈل پر پیر رکھا اور سائیکل گھما کر واپس لے جاکر [illegible] ویگن آرہی تھی لوگ اس پر جھپٹ پڑنے کو تیار ہو رہے تھے۔ [illegible] بڑھی۔ اتفاق ہی سے فرنٹ سیٹ پر صرف ایک عورت اور ایک بچہ بیٹھے [illegible] اسے آسانی سے جگہ مل گئی۔

طاہر سیڑھیاں اتر کر صحن میں آیا۔ وہ لائبریری سے کتابیں لینے جا رہا تھا آج دفتر سے چھٹی تھی اس لیے لائبریری جانے کا سوچا تھا۔

صحن میں رشیدہ کھڑی تھی ظہیر کی قمیض ہاتھ میں تھی اس کا کالر کچھ پھٹ گیا تھا صبیحہ سے کہہ رہی تھی کہ کالر الٹا دے۔

صبیحہ کونے میں رکھے تخت پر مشین لیے بیٹھی تھی۔ ربیعہ کی ایک قمیض سی رہی تھی۔ آج ربیعہ تاکید کر کے کالج گئی تھی کہ قمیض ضرور سل جائے۔ طاہر صحن سے ڈیوڑھی کی طرف جانے لگا تو رشیدہ نے پکارا۔ "طاہر ——"

"جی امی ——" وہ دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے بولا۔

"کہاں جا رہے ہو ——"

"باہر ——"

"وہ تو دیکھ ہی رہی ہوں ——"

"کس کام سے جا رہے ہو ——" صبیحہ نے جھکا ہوا سر اٹھا کر دیکھا۔

"ظاہر ہے ——" طاہر بولا۔

"آپ لوگوں کو کوئی کام ہو تو بتا دیں ——"

"بیٹے ——"

امی بولی "تمہارے ابا کہہ گئے تھے دکان پر آنا ——"

"دکان پر ——"

"ہاں ——"

"کیوں ——"

صبیحہ نے فخر سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابا جی ٹی وی لے کر آ رہے ہیں ہمیں ——"

"سچی ——"

"ہاں بیٹے تم سب اصرار کر رہے تھے نا —— آج انہوں نے کر ہی لیا ہے۔ کہ گئے تھے دکان پر آ جانا۔ اپنی پسند کا ٹی وی لے لینا۔"

"واہ وا ——"

طاہر نے ہاتھ اونچا کر کے نعرہ لگایا۔

"خوب مزہ آئے گا ——" صبیحہ بولی۔

"شکر ہے ٹی وی آئے گا۔ دوستوں کے گھر دیکھنے کے لئے نہ جانا گا ——" طاہر نے کہا۔

"ابا جی نے وعدہ کیا ہے فرج بھی لے دیں گے ——" صبیحہ بڑے فخریہ انداز میں کہا۔

طاہر مسکرا کر بولا۔

"لگتا ہے ابا جی آج کل خوب مال بنا رہے ہیں —— زمین خریدنے کی بھی باتیں ہو رہی ہیں ——"

رشیدہ ظہیر کی قمیض مشین کے قریب رکھتے ہوئے بولی۔ "سب کچھ تمہاری خاطر ہی کر رہے ہیں نا۔ خدا کا شکر ادا کیا کرو ——"

"وہ تو کرتے ہی ہیں ——" صبیحہ بولی۔

"وہ زمین بھی مل جائے تو ابا جلد ہی بنگلہ بھی بنوا لیں گے۔"

"ابھی تو زمین ہی کا پیسہ اکٹھا کر رہے ہیں ——" رشیدہ بولی۔

"کٹڑی بیچنے کا سوچ رہے ہیں۔ وہ بک گئی تو زمین خرید لیں گے۔"

"بک جائے گی ——"

طاہر نے کہا "ابا جی نے بہت سے پراپرٹی ڈیلروں سے کہہ رکھا ہے۔ اس ٹوٹی پھوٹی کوٹھڑیوں والی کٹڑی کے رکھنے کا فائدہ بھی تو کچھ نہیں امی کسی اچھے علاقے میں زمین خرید کر گھر بنوائیں گے۔"

"زمین تو تمہارے ابا خرید دیں گے ——" رشیدہ ہنس کر بولی۔

"مکان بنانے کے لئے ہاتھ پاؤں تم ہلاؤ نا ——"

"میں ——"

طاہر نے سینے پر انگلی رکھ کر پوچھا۔

"تو اور ——" صبیحہ نے ہنس کر کہا۔

"وہ تو ایک ہی صورت میں ممکن ہے ——"

"کیسے ——؟"

"میرا کوئی معمہ نکل آئے یا پرائز بانڈ کا انعام ——"

وہ ہنس کر بولا۔

صبیحہ نے آنکھیں گھماتے ہوئے شوخی سے کہا۔ "شگو نے تمہیں بھی پر لگا دیا ہے ——"

"شگو نے ——" طاہر نے سر جھکا کر چند لمحوں بعد اٹھایا۔

"تو اور ——" صبیحہ بولی۔ "وہی تمہیں دولت کمانے کے ایسے نسخے بتاتی رہتی ہے۔"

"کچھ غلط بھی نہیں ہیں۔ تم دیکھو نا آپا۔ پانچ لاکھ کا انعام نکل آئے تو۔ کتنا شاندار گھر بن سکتا ہے ——"

"خیالی دنیا سے نکل آؤ طاہر میاں ——"

"یہ خیالی دنیا حقیقت بھی بن سکتی ہے —— آخر ہر ماہ لوگوں کے نکلتے ہی ہیں ——"

"نکلتے ہیں۔ لیکن صرف انہی کے سہارے خواب دیکھنے چھوڑ دو"

صبیحہ نے مشین کی ہتھی پر ہاتھ رکھا۔

پھر بولی ——

"بھول بھلیوں میں بھٹکنا چھوڑ دو طاہر سی ایس ایس کی تیاری شروع کی ہے تو پورے خلوص اور محنت سے کرو۔"

"ہاں بیٹے ——" رشیدہ بولی۔ "محنت رائیگاں نہیں جاتی۔

زندگی کے کسی شعبے میں کی جائے۔ اپنے باپ کی طرف دیکھو۔ کاروبار کو بڑھانے پھیلانے کے لئے انہوں نے کتنی محنت کی ہے۔ خدا اس کا پھل بھی دے رہا ہے۔ خدا کرے تمہارے انعام بھی نکل آئیں —— لیکن صرف اسی پر تکیہ نہ کرو ——"

"امی ——"

وہ ہنس کر بولا "یہ تو میرا سائیڈ بزنس ہے۔ ورنہ آپ سب جانتے ہیں کہ میں اچھی جاب کے لئے بھی تگ و دو کر رہا ہوں اور سی ایس ایس کی تیاری کے لئے بھی سنجیدہ ہوں۔ ابھی لائبریری سے کتابیں ہی لینے جا رہا تھا ——"

"جاؤ خدا تمہیں تمہارے ارادوں میں کامیاب کرے اور ہاں لائبریری سے ہو کر دکان پر چلے جانا ——"

"وہ تو ضرور جاؤں گا امی —— آج ٹی وی آ ہی جائے گا ——"

طاہر ڈیوڑھی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "آپا ٹی وی رکھنے کی جگہ بنا دینا بیٹھک ہی میں رکھنا پڑے گا۔"

"ہاں ——"

صبیحہ خوشی سے بولی۔ "تم لاؤ تو سہی۔ جگہ بھی بن جائے گی۔"

طاہر باہر چلا گیا تو رشیدہ تخت کے کنارے ٹکتے ہوئے صبیحہ سے بولی۔

"شگو کے متعلق طاہر سے اس طرح بات نہ کیا کر ——"

"کیوں نہ کیا کروں ——" صبیحہ نے ہاتھ روک کر کہا۔

"بالکل اپنے رنگ میں رنگے جا رہی ہے طاہر کو۔ اسے تو دولت کے سوا اور کسی شے کا نام ہی لینا نہیں آتا ـــــ آپ نہیں دیکھ رہیں کہ اب طاہر بھی ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھے رہو اور دولت کے انباروں کی خواہش کرتے رہو۔ یہ کوئی اچھی بات ہے۔"

"لیکن یہ تو اچھی بات ہے کہ طاہر جائز ذریعوں سے دولت کمانا چاہتا ہے۔ مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے ـــــ اور ـــــ"

"دولت کو اتنا بھی اپنے دل و دماغ پر مسلط نہیں کر لینا چاہیے امی ـــــ"

"وہ تو ٹھیک ہے ـــــ"

"آپ محسوس نہیں کر رہیں۔ کہ طاہر بھی اب شگو بنتا جا رہا ہے ـــــ ہر وقت یہی سوچتا رہتا ہے ـــــ یہی کہتا رہتا ہے ـــــ یہ آسائش ہو۔ یہ سہولت ہو ـــــ"

امی نے ہنس کر کہا۔

"تم سب ہی کتنے ہو۔ اکیلا وہ تو نہیں۔ اب ٹی وی کے لئے اصرار کیا تھا وہ ابھی آیا نہیں کہ تم فرج کی باتیں کرنے لگی ہو۔ فرج آگیا تو شاید گاڑی کے لئے کہنے لگو ـــــ"

"نہیں امی ـــــ"

"یہ انسانی فطرت ہے صبو ـــــ"

"لیکن یہ فطرت شگو میں تو خیر شروع سے کچھ زیادہ ہی تیز تھی اب طاہر میں بھی ہوتی جا رہی ہے۔"

رشیدہ ہنس پڑی۔

صبیحہ نے ماں کو دیکھ کر کہا۔

"امی یہ کوئی اچھی بات تو نہیں۔ انسان کو اپنے حالات میں خوش رہنا چاہیے اتنا لالچی اور حریص نہیں ہونا چاہیئے۔"

"ٹھیک ہے ـــــ"

"شگو تو ہوائی دنیا بسائے رہتی ہے ـــــ طاہر کو تو اس سحر میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے ـــــ"

رشیدہ نے مسکرا کر اس کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"دونوں ایک سے ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ اچھی اور خوش آئند بات ہے کہ دونوں کے حالات ایک سے ہیں۔"

"یعنی ـــــ"

"یعنی یہ کہ زندگی بھرپور انداز میں گزارنے کے لیے خیالات کی ہم آہنگی بہت ضروری ہوتی ہے ـــــ"

رشیدہ نگاہوں ہی نگاہوں میں بیٹی کو اشارہ کر کے مسکرا دی۔

پھر بولی ـــــ

"طاہر اور شگو ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، بچپن کا ساتھ ہے۔"

"ہوں ـــــ"

صبیحہ نے کوئی جواب نہیں دیا ـــــ مشین کی ہتھی کو گھمایا اور ربیعہ کی قمیض سینے لگی ـــــ

طاہر لائبریری جانے کی بجائے سیدھا دکان پر گیا۔
ابا اور سیلز مین گاہکوں سے نپٹ رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر ایک طرف بینچ پر بیٹھا دکان کا جائزہ لیتا رہا۔
ابا فارغ ہوئے تو وہ شوق سے بولا۔

"ابا جی آپ نے دکان پر آنے کو کہا تھا ——"

رفیق بیٹے کے شوق کو دیکھتے ہوئے تجاہل عارفانہ سے بولے۔

"میں نے ——"

"ہاں امی نے بھیجا ہے ——"

"کس لئے ——"

"وہ ——"

"وہ ابا جی آپ نے آج ٹی وی لینے کا ——"

"وہ تو میں نے مذاق کیا تھا تمہاری امی سے ——"

"ابا جی —— آپ ——"

"منہ اتر گیا بس ——"

رفیق نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

طاہر ابا کا منہ دیکھنے لگا۔

"میاں گھبراؤ نہیں —— لے دیں گے آج ٹی وی بھی" رفیق نے اپنی چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
اور پھر کیش والی صندوقچی کھول کر طاہر کو نوٹوں کی الگ رکھی گڈی دکھاتے

کہا "یہ پیسے الگ ہی رکھ دیئے ہیں میں نے —— تھوڑی دیر بیٹھو پھر چلتے ہیں۔ اسلم میرا دوست ہے اس کی دکان سے خریدیں گے کچھ چھوٹ بھی دے گا اور —— چیز بھی اچھی —— وہی بتائے گا —— کہ کس برانڈ کا اچھا رہے گا ——"

"کونسا لیں گے ——"

"ارے میاں کہا ہے نا اسلم ہی بتائے گا۔ مجھے کیا پتہ ہے کون سا اچھا ہے۔"

"ابا جی میرا مطلب ہے بلیک اینڈ وائٹ لیں گے یا کلرڈ ——"

"کلرڈ یعنی رنگین —— اے میاں ابھی تو سادہ ہی لے لو —— رنگین کے تو پیسے ...."

"لیکن ابا جی ——" طاہر لجاجت سے بولا۔ "اب لینا ہے تو رنگین ہی لے لیں ——"

"واہ صاحبزادے —— پتہ ہے دونوں کی قیمتوں میں کتنا فرق ہے۔"

"کتنا ——"

"کم از کم دس ہزار کا ——"

طاہر کچھ نہیں بولا۔ سر جھکا کر صرف کندھے اچکائے ابا ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ رفیق اپنے سیلز مین سے مخاطب ہوا جو کپڑے کے تھان سمیٹ رہا تھا۔

"سنی صاحبزادے کی بات —— رنگین ٹی وی لینا چاہتے ہیں۔"

"میں نے تو یونہی بات کی تھی ابا جی۔ وہ اتنا مہنگا ہے تو رہنے دیں۔ وہی چلے گا۔ ابھی تو پورے محلے میں صرف ملک صاحب ہی کے ہاں رنگین ٹی وی آیا

ہے ۔ باقی سب کے تو بلیک اینڈ وائٹ ہی ہیں ۔"

"سب کے ہاں ابھی کہاں آئے ہیں بیٹے ——" رفیق نے فخر سے کہا۔

"بمشکل چھ سات گھروں میں ہیں ——"

طاہر چپ بیٹھا رہا۔ رفیق خود ہی بولے۔ "میاں زمین بھی لے رہا ہوں تمہارے لیے، اس کے لئے پیسے جمع نہ کرنا ہوتے تو تمہیں رنگین بھی لے ابھی تو اس سے گزارہ کرو۔ نیا گھر بنے گا تو اس میں رنگین ٹی وی ہوگا بے

ٹی وی آگیا ——

گھر میں عید تھی جیسے —— بھاگم بھاگ ہو رہی تھی۔ طاہر نے الیکٹریشن کے ساتھ مل کر بڑا سا پچھے والا انٹینا اوپر کی ممٹی پر لگایا تھا۔

ربیعہ صبیحہ نے ساری بیٹھک کی ترتیب بدلی تھی۔ ایک کونے میں جہاں تکونی میز پر مٹی کے رنگین گلدان میں کاغذی پھول رکھے تھے۔ ٹی وی کے لئے جگہ بنائی تھی۔ اس کا رخ کچھ اس طرح رکھا تھا کہ اگر گلی محلے کے لوگ بھی دیکھ چاہیں تو گلی میں کھلنے والی کھڑکیوں سے انہیں ٹی وی سکرین نظر آ سکے۔

ظہیر تو اپنے دو تین دوستوں کو ٹی وی دیکھنے کی دعوت بھی دے آیا

صبیحہ بھی مامی اور شگو کو ٹی وی آنے کی خبر دے آئی تھی۔

سب بہت خوش تھے ——

بہت خوش ——

اس خوشی میں اضافہ تو اس وقت ہوا جس وقت شگو کی امی کھوئے کے پیڑوں کا ڈبہ لیے آگئی۔

سب پروگرام شروع ہونے کے انتظار میں ٹی وی کے سامنے بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ رفیق بھی دکان سے آ گئے تھے ربیعہ نے بھی رات کا کھانا پہلے ہی سے تیار کر لیا تھا۔ صبیحہ بھی جلدی جلدی کالج کا کام نپٹا چکی تھی۔ ظہیر اور صغیر بھی اپنے دوستوں کو بلا لائے تھے۔

شگو بھی آگئی تھی ——

طاہر کرتا دھرتا تھا۔ پروگرام شروع ہونے میں کچھ وقت تھا۔ لیکن وہ کئی بار بٹن دبا کر ٹی وی آف کر چکا تھا۔ تجسس اور اشتیاق سب کے چہروں سے مترشح تھا۔ رشیدہ بھی پھول نہ سما رہی تھی اور رفیق بھی خوش ہو رہا تھا۔

"ٹی وی دیکھنے تو رہتے ہیں ——" طاہر بولا۔ "لیکن آج اپنے گھر میں ٹی وی دیکھیں گے۔ کتنی خوشی ہو رہی ہے۔"

"واقعی ——" ربیعہ بولی۔

"اب تو میں بھی کالج میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ پروگراموں پر کھل کر تبصرہ کیا کروں گی۔ کتنا فخر محسوس کر رہی ہوں میں۔"

"خوشی کی بات تو ہے ہی —— کوئی نئی چیز بھی خریدی جائے تو خوشی ہوتی ہے۔" ربیعہ بولی۔

شگو نے ربیعہ کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

"آپا یہ آپ کہہ رہی ہیں ——"

"ہاں ——"

"تو پھر —— آپ مجھے کیوں اکثر دوشی ٹھہراتی ہیں ——"

"کیا مطلب ——"

"بھئی میں بھی تو یہی کہتی ہوں کہ نئی نئی چیزیں ——"

"تم تو پیسے کی باتیں کرتی ہو ——" ربیعہ نے منہ بنا کر اس کی بات کاٹی

شگو چمک کر بولی۔

"ہاں پیسے ہی سے تو نئی نئی چیزیں خریدی جاتی ہیں۔ اور نئی نئی چیزیں گھر میں آئیں تو خوشی ہوتی ہے ——"

"بالکل ٹھیک ——" طاہر نے شگو کی طرف داری کی۔ "پیسہ بڑی اہم اور بڑی ضروری چیز ہے۔"

"تم تو شگو کی زبان بولو گے ——"

ربیعہ نے کہا۔

"شگو کی زبان غلط بھی نہیں ہے ——" صبیحہ نے جلدی سے کہا۔

"پیسے کے بہت مزے ہیں آپا —— دیکھو نا —— ٹی وی پیسے ہی سے آیا ہے نا ——"

"ٹی وی کے بعد فرج آئے گا، کار آئے گی۔ سب پیسے سے ہی آئیں گے نا۔ اور ان سب چیزوں کے آنے سے خوشی ملے گی مزہ آئے گا۔"

"یہی تو میں کہتی ہوں ——" شگو نے کہا۔

"پیسہ خوشیوں کا منبع ہے ——"

"ضروری نہیں ——" ربیعہ نے زور سے کہا۔

"ہے ——"

طاہر، شگو اور صبیحہ بولے۔

چاروں میں اسی موضوع پر بحث ہونے لگی۔

رفیق اور رشیدہ ہنستے مسکراتے ان کی باتیں سننے لگے کبھی کبھی وہ بھی لقمہ دے دیتے۔

زیادہ گرما گرمی ہوئی تو رفیق نے ہاتھ اٹھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی تم سب نے تو مچھلی بازار بنا دیا کمرے کو —— آرام سے دھیرج سے باتیں کرو —— لڑ کر ہی تو اپنا موقف بیان نہیں کرنا چاہیے۔"

"آپ ہی بتائیں پھوپھا ——" شگو نے کہا۔ "پیسے کی اہمیت ہے یا نہیں ——"

"ہے ——" رفیق مسکرائے۔

"اباجی ——" ربیعہ بول بول کر منہ سرخ کئے تھی —— بولی

"آپ ——"

"سنو بیٹی ——" رفیق نے سب کو پرسکون ہوتے کہ۔ پھر سمجھانے کے انداز میں بولا۔

"پیسہ اہم ضرور ہے —— لیکن اس سے زندگی کی خوشیاں نہ جا سکتیں ——"

"خریدی جا سکتی ہیں پھوپھا جی ——" شگو نے ان کی بات اچک

"اب دیکھو نا ایک ٹی وی آیا ہے —— پیسے سے ہی آیا ہے! کتنی خوشی ہو رہی ہے سب کو —— اس کا مطلب یہ ہوا کہ پیسے خریدی جا سکتی ہے۔"

رفیق نے شگو کی دلیل پر مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ تو شگو کے ما اور صبیحہ نے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔

صبیحہ انہیں قائل کرنے کے لئے زور سے بولی۔ "ساری خوشیاں خریدی جا سکتیں تو امیر لوگوں کو کوئی دکھ ہی نہ ہوتا —— شاداں ہی رہتے ——"

"شاداں و فرحاں رہتے ہیں ——" شگو نے جھٹ سے کہا۔

صبیحہ کچھ کہنے کو تھی کہ رشیدہ نے شگو سے کہا۔ "یہ بات غلط تمہاری ——"

"ہاں بیٹی ——" رفیق متانت سے بولے۔

"زندگی کی خوشیاں پیسے سے نہیں خریدی جا سکتیں، صبیحہ نے ٹھیک کہا ہے ایسی بات ہوتی تو سب پیسے والے پرسکون اور مطمئن ہوتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا دولت مندوں کو بھی دکھ ملتے ہیں صدمے پہنچتے ہیں۔ ان کے دل خوشیوں سے خالی ہوتے ہیں۔ غم سے ناآشنا نہیں ہوتے وہ لوگ بھی ——"

"یہ تو انسان کے دکھ ہیں پھوپھا ——" شگو بھی تیزی سے بولی۔

"دکھ صدمے غم بیماری یہ سب انسان کے دکھ ہیں۔ امیر یا غریب کی بات نہیں، آپ بتائیں۔ امیروں غریبوں کے ہاں نہیں آتی۔ حادثے امیروں کا سکون برباد کرتے ہیں، تو کیا غریب ان سے محفوظ رہتے ہیں۔ ناکامی امیروں پر مسلط ہوتی ہے تو کیا غریبوں کو چھوڑ دیتی ہے۔"

شگو زور و شور سے اپنے دلائل سے سب کو قائل کر رہی تھی۔ طاہر تو مرعوب تھا ہی۔ رفیق اور رشیدہ بھی چپ ہو گئے تھے۔

وہ چند لمحے رکی پھر بولی۔

"غریبوں پر یہ باتیں زیادہ وارد ہوتی ہیں۔ امیر لوگوں کے پاس ان سب چیزوں سے نپٹنے کے لئے پیسہ ہوتا ہے بیمار پڑ جائیں تو اچھے سے اچھے ہوسپٹل میں ساری سہولتیں پیسے کے ساتھ میسر آجاتی ہیں، لندن اور نیویارک چلے جاتے ہیں علاج کے لئے —— غریب آدمی اپنی کھولی میں پڑا پڑا بیماری اور غربت کے کرب سے بنر دآزما ہوتا رہتا ہے۔ ہماری دادی کی مثال سامنے ہے۔"

"بالکل سچ ——" طاہر بولا۔

"یہ بات غریبوں نے اپنی تسلی کے لئے گھڑ رکھی ہے کہ دولت ساری خوشیاں

نہیں خرید سکتی —— میں کہتی ہوں خرید سکتی ہے۔ ہر سکھ ہر خوشی۔ ہر
ہر آسائش۔ مشترکہ اسلیئے بھی ہیں۔ وہ بھی میں کہوں گی کہ دولت سے جھیلنے
جاتے ہیں۔ ایک ہی غم جو غریب ناساعد حالات میں جھیلتا ہے۔ امیر ایسے
طریق سے سہتا ہے۔ اپنے آرام دہ ایئرکنڈیشن کمرے میں نرم و گداز بیڈ پر
کر جھیلتا ہے۔ میں کہتی ہوں امیروں کے رنج و غم بھی ان کی طرح ٹھاٹھ وا
ہیں۔ غم غلط کرنے کے لیئے ہوٹلوں کلبوں کا رخ کرتے ہیں۔ بیرون ملک
پر چلے جاتے ہیں —— واہ —— وا ——"

شگو بڑے جوش میں باتیں کر رہی تھی۔ بیٹھک میں سناٹا سا چھا گیا
سب اس کی باتیں سن رہے تھے۔

"پھوپھو —— آپ سب کیسے دولت کی اہمیت اور افادیت سے
سکتے ہیں۔ میری اماں کی مثال لیں —— بیوگی ان کے لیئے عمر بھر کا روگ
غریب تھی نا ——"

ساری عمر محنت کر کر کے ان کے ہاتھ شل ہو گئے۔ آنکھیں کمزور ہو گئیں
وہ اک مالدار بیوہ ہوتیں تو یہ غم اور دکھ ان کے قریب بھی نہ بھٹکتے ——
کا ایک ہی غم ہوتا —— بس —— غم روزگار تو نہ جھیلنا پڑتا۔ زندگی
سہل ہوتی —— یا ——"

شگو نے اپنے دلائل کو وزنی کرنے کے لیئے کئی مثالیں دیں
ایک مثال اپنی آپا کی بھی دی۔

وہ کل ہی آپا کے ہاں گئی تھی۔ بڑا دکھ ہوا تھا اسے دیکھ کر گھر کی حالت

بچوں کے کپڑے ناکافی اور بوسیدہ تھے۔ خود کتنی بدل گئی تھی۔ رنگت دھندلا گئی
تھی۔ پہننے اوڑھنے کا جیسے سلیقہ ہی بھول گیا تھا۔ وسیم کی ناکافی آمدنی نے یہ حالت
بنا رکھی تھی۔

"آپا کے پاس بھی دولت کی فراوانی ہوتی تو رنگ ہی اور ہوتا پہلے سے
زیادہ خوبصورت ہو گئی ہوتی۔ بچوں کے چہرے چمک رہے ہوتے۔ خوبصورت
گھر ہوتا۔ سہولت کی چیز میسر ہوتی —— وہ تب زیادہ خوش ہوتی۔ یا اب
ہے۔ بتائیں نا ——"

"جیت گئیں جیت گئیں ——" رفیق اور طاہر نے بیک وقت کہا۔

"باتوں میں تو تم سے کوئی جیت ہی نہیں سکتا شگو جی"۔ ربیعہ نے بھی ہار ماننے
کے انداز میں کہا۔

"چلو اب بحث مباحثہ بند ——" صبیحہ نے دونوں ہاتھ اونچے کرتے
ہوئے کہا۔

"صبیحہ آپا —— دولت بڑی شئے ہے ——" شگو نے مسکراتے
ہوئے کہا۔

"سارے جہاں کی خوشیاں خرید سکتی ہے۔ خوبصورت کوٹھیاں۔ لمبی لمبی کاریں
فرج کنڈیشنر۔ ٹی وی۔ وی سی آر۔ یہ سب چیزیں خوشیاں ہی تو دیتی ہیں آج
ٹی وی آنے سے آپ کو تجربہ ......"

"بس بس —— طاہر بولا۔ "پروگرام شروع ہونے والا ہے صرف
تین منٹ باقی ہیں ——"

"ہاں بھئی —— اب توجہ ٹی وی کی طرف ہو ——"

سب پھر سے ہنسنے مسکرانے لگے۔

"مامی کو بھی بلا لاؤ ربیعہ ——" رشیدہ نے تہمینہ کی غیر حاضر

کرتے ہوئے کہا۔

"میں آگئی ——" تہمینہ اندر آتے ہوئے بولی۔

"مبارک ہو سب کو ——"

"کس بات کی ——" طاہر نے مامی کے ہاتھ میں پکڑے ڈبے

دیکھا ——

"ٹی وی خریدنے کی ——" وہ رشیدہ کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی

مٹھائی کا ڈبہ اس نے رشیدہ کو دے دیا۔

"یہ کیا ——" رشیدہ بولی۔

"مٹھائی لگتی ہے ——" رفیق بولا۔

"تھوڑے سے پیڑے لائی تھی —— مبارک خالی ہاتھ تو دینے

آنا تھا ——"

"اوہ مامی ——" سب بچے بولے۔ "زندہ باد ——"

"اس کی کیا ضرورت تھی بھابی ——" رشیدہ نے ڈبے کا ڈھکنا کھو

سب ڈبے پر جھپٹ پڑے۔ کسی نے ایک کسی نے دو پیڑے اٹھا

"ارے بدتمیزو ——" رشیدہ چلائی۔

"کھانے دو —— کھانے دو ——" تہمینہ نے پیار سے

آج خوشی کا موقعہ ہے —— بدتمیزی نہیں کہتے اسے ——"

"آپ بھی تو لیں ——" رشیدہ نے بچے کھچے پیڑے تہمینہ کے سامنے رکھ دیئے۔

"پہلے بھائی صاحب کو دو ——"

رفیق نے ڈبے میں سے ایک پیڑا اٹھا لیا۔ پھر رشیدہ اور تہمینہ نے بھی

پیڑے لئے۔

سب ہنستے مسکراتے شور مچاتے مٹھائی کھانے لگے۔

"مامی ——" طاہر نے پیڑا کھاتے ہوئے کہا۔

"کیا ——"

"یہ تو ٹی وی آیا ہے —— چھوٹی سی چیز —— تو آپ پیڑوں کا ڈبہ

لے آئی ہیں ——"

"تو کیا ہوا —— خوشی کی بات ہے۔ منہ میٹھا کر لیا سب نے۔"

"وہی تو کہہ رہا ہوں ——" طاہر بولا "یہ تو ٹی وی آیا ہے آپ کلو پیڑے

لائیں۔ جو اباجی نے اتنی بڑی زمین خریدلی تو ——"

"تو کیا —— پھر ٹوکرہ مٹھائی کا لے آؤں گی۔ خدا کرے تمہارے اباجی

زمین خریدلیں۔"

"نہیں زمین سے زیادہ اس ٹوکرہ بھر مٹھائی کا مزہ آئے گا" طاہر بولا۔

دوسرے بہن بھائیوں نے بھی اس کی تائید کی۔

سب ہنستے مسکراتے رہے۔

ٹی وی پروگرام شروع ہونے کا وقت ہوگیا۔ طاہر نے سوئچ دبایا اور ٹی وی

آن کر دیا۔

ایک دم سے شاں شاں کی آوازیں آئیں، سکرین پر ننھے ننھے تارے
ہو گئے تصویر آئی نہ آواز

سب بے تابی سے پوچھنے لگے "کیا ہوا خراب نکلا ٹی وی ٹھیک
طاہر بٹن گھماتے ہوئے کبھی ٹی وی سکرین اور کبھی اس کے پیچھے جھک کر
لگا ایڈجسٹ کرنے میں کچھ وقت لگ گیا۔

پھر تصویر آئی — اور دو چار لمحے دوسرا بٹن گھمانے کے بعد آواز
آ گئی۔ اناؤنسر پروگراموں کی تفصیل بتا رہی تھی۔
سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔

چھوٹے سے کوٹھڑی نما کمرے میں تھوڑی پاور کا برقی قمقمہ ناکام سی روشنی بکھیر
رہا تھا۔ سردیوں کی رات ٹھٹھری ہوئی تھی۔ دروازہ اور کھڑکی بند ہونے کے باوجود کمرے
کی یخ بستگی کم نہیں ہوئی تھی۔ پرانے چوبی پلنگ پر شگو رضائی میں دبکی پڑی تھی
اس کے ذہن میں مسلسل اور غیر مسلسل خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اماں فرش
پر پرانی دری ڈالے مشین گھرر گھرر چلا رہی تھی۔ سلے اور ان سلے کپڑے قریب
ہی پڑے تھے۔ دھاگوں کی ٹوکری قینچی اور انچ ٹیپ بھی پاس ہی رکھے تھے۔
مشین پر جھکے جھکے وہ تھک جاتی تو قلعی اکھڑی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی۔
یہاں پر پہلے چارپائی پڑی رہتی تھی۔ جب سے شگو آئی تھی یہ چارپائی اٹھوا دی تھی۔
اماں نے اس کمرے سے سارا فالتو سامان اٹھا کر برابر والی کوٹھڑی میں جہاں پیٹی
اور لوہے پرانے صندوق رکھے رہتے تھے۔ ڈال دیا تھا۔ یہ کمرہ اپنے اور اماں کے
رہنے کے لئے سیٹ کر لیا تھا۔ ایک طرف پلنگ ڈالا تھا دوسری دیوار کے
ساتھ دونوں کرسیاں رکھ دی تھیں۔ ایک ہلتی ٹانگ والی میز بھی بچھا دی تھی سامنے

دیوار کے پاس اماں کی مشین کی چوکی رکھدی تھی۔ اماں سلائی کا زیادہ کام رات
ہی کرتی تھی۔

دن تو گھر کے کام کاج ہی میں گزرتا تھا۔ شگو کے آجانے سے
کام بھی بڑھ گیا تھا یوں بھی شگو کی خاطر صفائی ستھرائی کا زیادہ ہی خیال ر
تھا۔ روز ہی برآمدے اور صحن کا فرش دھوتی۔ بیٹھک میں پڑے پرانے
شکستہ سامان کی صفائی روز ہی کرنا پڑتی۔ کرسیوں میزوں پر ڈالے گئے کپڑے
ہر تیسرے دن دھونا پڑتے۔

پھر صبح دوپہر شام چولہا بھی جھونکنا پڑتا۔ دن میں کوئی نہ کوئی احوال پر
کو آ بھی جاتا۔ وہ بھی کسی دن رشتے داروں عزیزوں کو ملنے چلی جاتی۔ رات از
تو سارے کاموں سے فارغ ہو کر وہ مشین لے بیٹھتی۔ عینک کے نمبر
جا رہے تھے۔

شگو اس وقت اماں کے متعلق ہی سوچ رہی تھی عمر گزر گئی تھی
کرتے۔ اس کا صلہ کیا ملا تھا۔ بمشکل گزر بسر ہوتی تھی۔ کاروبار میں لگایا ہوا
سا سرمایہ نفع نہ دے رہا ہوتا۔ تو شاید گزر بسر نہ ہوتی۔ کھانا پینا اور پہننا اوڑ
ہی چل رہا تھا۔

گھر کی کوئی چیز خریدنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئی تھی وہی اماں کے جہیز
کا شکستہ اور پرانا فرنیچر تھا۔ وہی برتن تھے۔ وہی بکس۔ وہی پیٹی وہی پا
دو بینڈ کا تباہ حال ریڈیو۔ گوں گوں کرتا پنکھا۔ اور گھر گھر چلنی پرانی مشین
جب اماں کی شادی ہوئی ہو۔ تب شاید یہی چیزیں اچھے متوسط طبقے کی علا

سمجھی جاتی ہوں۔

لیکن

اب تو زمانہ ترقی کر گیا تھا۔ سہولت کی کتنی برقی چیزیں آگئی تھیں۔ سِل بٹے
پر مصالحہ پیسنے کی بجائے گرائینڈر عام ہو چکا تھا کھانے کی چیزیں محفوظ رکھنے
کے لئے فرج اور فریزر آ گئے تھے ایرکنڈیشنر کمرے ٹھنڈے کرتے اور
ہیٹر سردی کو نگل لیتے تھے۔

فوم کتنا عام ہو گیا تھا۔

لیکن

اس گھر میں سہولت کی ایسی چیزوں کا دور دور تک پتہ نہیں تھا اماں اب
بھی کنالی میں پانی بھر کر دودھ کی دیگچی اور بچا ہوا سالن محفوظ کرنے کے لئے
اس میں رکھتی تھی۔

سل بٹے پر مصالحہ پیستے اس کی انگلیاں گھس گئی تھیں۔ مصالحوں کا مستقل
رنگ ناخنوں پر چڑھ گیا تھا۔

گرمیوں میں ٹھنڈے پانی کی ضرورت کورے گھڑے سے ہی پوری کی جاتی
تھی برف بازار سے منگوائی جاتی تو بوری کے ٹکڑے میں لپیٹ کر
رکھی جاتی تھی۔

شگو رضائی میں دبکی یہی باتیں سوچ رہی تھی۔ اپنے اوپر اسے ترس نہیں آ
رہا تھا اسے اپنے غریب ہونے پر کبھی ترس نہیں آتا تھا۔

ہمیشہ

اور ہمیشہ
غصّہ آتا تھا۔ اور وہ اس سے نپٹنے کے لئے پلان بناتی رہتی تھی۔

"امّاں ——"

شگو نے رضائی سے منہ نکالا۔

اماں کا ہاتھ مشین کی ہتھی پر رک گیا۔ سر اٹھا کر شگو کو دیکھتے ہوئے

"تو جاگ رہی ہے سوئی نہیں ابھی تک ——"

"تمہاری مشین کی گھر گھر سونے دیتی ہے ——"

"کیا کروں۔ یہ کپڑے صبح دینے ہیں۔ سلائی ملے گی تو راشن پانی چلے
گھی تو بالکل ہی ختم ہے۔"

"امّاں ——"

شگو کروٹ بدل کر ماں کو دیکھنے لگی جس نے پرانے سے سوئیٹر کا
لنڈے سے خریدا ہوا اونی شال کندھوں پر ڈال رکھا تھا۔

"ہوں ——"

"اماں میں سوچ رہی تھی ——"

"کیا ——"

"سوچ رہی تھی کہ ہم غریب کیوں ہیں ——؟"

اماں نے سوئی میں تاگہ ڈالتے ہوئے اسے دیکھا۔
مسکرائی اور بولی۔

"غریب تو نہیں ہیں۔ خدا کا شکر ہے سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوئے

"غریبی نسل در نسل چلتی ہے کیا ——؟"

"کن الجھنوں میں پڑ جاتی ہے تو —— خدا نے تجھے پتہ نہیں کیوں غلط
گھرانے میں پیدا کر دیا۔"

شگو ماں کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اماں نے سرزنش کرتی نظروں سے اسے دیکھ کر کہا۔ "تجھے تو کسی دولتمند
گھرانے میں پیدا ہونا چاہیئے تھا۔"

وہ ہنس کر بولی۔

"قصور کس کا ہے ——"

"قسمت کا ——"

اماں سنجیدہ تھی۔

"اس قسمت کو میں بدلوں گی ماں ——" وہ بڑے جوشیلے انداز
میں بولی ——

اماں چپ چاپ ترپائی کرنے لگی۔

شگو کی باتیں مہمل اور بے وقعت لگا کرتی تھیں اسے۔ یہ باتیں نئی
تھوڑا ہی تھیں ——

شروع ہی سے وہ ایسی باتیں کرتی تھی اس کے بھیجے میں تو شاید
کوئی اور بات آتی ہی نہ تھی۔

ماں نے قمیض کے دامن کی ترپائی کرتے ہوئے ہولے سے کہا" سوجا
اب۔ اوٹ پٹانگ باتیں نہ کیا کر۔"

"نیند آئے گی تو سو جاؤں گی ____"

"جاگنا ہے تو پھر کوئی اچھی اچھی باتیں کر ____" اماں دانت سے دھاگا کاٹتے ہوئے بولی۔

"او ہاں ____ کیا سوچا ہے تو نے ____"

"نوکری کا ____"

"ہاں ____"

"اس کلینک میں نہیں کروں گی ____"

"کیوں ____؟"

"کسی کام کا نہیں ____ گندہ مندہ ____ تین چار کمرے ہیں ایک ہی ڈاکٹر ہے جو سارا کام چلا رہی ہے۔"

"تنخواہ بھی بہت کم ہے حکومت نے ہماری تنخواہیں مقرر کر دی ہیں لیکن ____

یہ پرائیوٹ کلینک ____"

اماں جلدی سے بولی "جب تک اچھی جگہ نہیں ملتی ____ یہی نوکری کر لے تجربہ ہی ہو گا نا ____"

"نہیں ماں ____"

اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"نوکری کروں گی تو کسی اچھے کلینک میں ____ جہاں ڈیوٹی دینے اور تنخواہ لینے کا مزہ بھی آئے ____"

"شگو ____"

"ہاں ماں ____"

"تو زندگی کے ہر شعبے کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا چاہتی ہے۔ ایسا کبھی ہوا بھی ہے ____"

"ہو گا ____"

"اور ضرور ہو گا۔ میری پیاری پیاری ماں۔ تو دیکھ لے گی ____"

"یہ وچار خیالی دنیا کے ہیں بیٹی۔ عملی دنیا اس سے بڑی مختلف ہے تو نے ابھی عمل کی دنیا میں قدم نہیں رکھا ____"

شگو چپ چاپ چت پڑی چھت کی کڑیوں پر نگاہ جمائے رہی۔

اماں نے اک گہری سانس لی اور بڑبڑائی۔ "خدایا اس بچی کا مستقبل روشن اور تابناک کرنا!"

شگو نے یہ بات سن لی۔ ہنس کر ماں ہی کے انداز میں بولی۔

"خدایا میری ماں کو ہدایت دینا کہ آپا کی طرح مجھے بھی جہنم میں نہ جھونک دے ____"

اماں کو شگو کے انداز پر ہنسی آ گئی ____ مسکراتے ہوئے اسے دیکھا شگو بھی شوخی سے مسکرا دی۔

"ٹھیک کہا ہے نا اماں ____"

"تو ٹھیک ہی کہتی ہے بیٹی ____ غلطی تو ہم سے ہی ہوتی ہے۔"

"میری دفعہ غلطی نہیں کرنا اماں ____" وہ ماں کو ہنسانے کے لئے

نگاہیں گھما کر مسکراتے ہوئے بولی ۔

اماں نے سر اثبات میں ہلایا ۔

"اماں ——"

"ہاں ——"

"تو سچ مچ شادی کرنے کا سوچتی ہے ——"

"کیوں —— کیا شادی نہیں کرنی تیری ——"

"اکیلی رہ لے گی ——"

"چار سال سے رہنی نہیں آ رہی ——"

"اوں ہوں ——"

"کیا ——"

"میں تجھے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی اماں ۔ ہم ماں بیٹی عمر بھر ساتھ رہیں گی میں نوکری کروں گی اور تمہیں بٹھا کر کھلاؤں گی —— کوئی کام نہیں کرنے دوں گی —— نوکر رکھ لوں گی تیرے لئے اور یہ سلائی ولائی بھی ختم کروا دوں گی سمجھیں میری ماں ——"

اماں اس کی باتوں پر مسکراتی رہی ——

"اماں میری باتیں سن رہی ہو سمجھ رہی ہو نا ——"

"تو میری فکر نہ کیا کر —— اتنی گزر گئی ۔ باقی بھی گزر جائے گی ——"

"لیکن میں نے کہا نا تجھے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی ——"

اماں نے سر ہلایا کچھ سوچا ۔ زیر لب مسکرائی ۔ پھر نگاہوں میں ذرا

انداز لئے اسے دیکھتے ہوئے بولی ۔ "جی تو یہی چاہتا ہے ۔ تجھے قریب ہی بیاہوں ——"

نگو کی آنکھیں چمک اٹھیں ماں کی بات سمجھ تو گئی بنتے ہوئے بولی ۔

"کیا مطلب ——"

"مطلب یہ کہ تیری شادی بھی ہو جائے اور تو میری نظروں کے سامنے بھی ہر وقت رہے ۔"

نگو جان بوجھ کر ہنستے ہوئے بولی ۔ "گھر داماد خریدو گی ——"

اماں اس کی بات پر ہنس پڑی —— ۔ "بیٹا تو اپنا ہی ہے ۔ کیا ہو جو داماد ——"

نگو کروٹ بدلتے ہوئے ماں کو پیار سے دیکھتے ہوئے بولی ۔ "بن جائے گا لیکن ابھی نہیں ——"

"ابھی نہیں ——"

"منزل دور ہے ماں ——"

"کیسے —— ؟"

"ایسے کہ جس طرف تیرا اشارہ ہے نا ۔ وہ ابھی اس قابل نہیں ہوا ۔ ڈھنگ کی ڈگری ملی ہے ابھی نہ کچھ ہے اس کے پاس ——"

"اے ہے —— اللہ کا دیا کیا نہیں ۔ اب تو زمین بھی خرید لی ہے ۔ کوٹھی بنوانے کا ارادہ ہے —— اور کیا چاہیے —— چاہتے بھی تمہیں بہت ہیں ۔ اور کیا چاہیے ۔"

"بہت کچھ ــــــ یہ سب ناکافی ہے ــــــ" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی
اماں نے اسے گھور کر دیکھا۔

وہ پھر بے ساختہ ہنس پڑی۔

"بہت باتیں نہ بنایا کر ــــــ وہ لوگ تمہارا ہاتھ مانگیں تو اس سے بڑی خوش
قسمتی اور کیا ہوگی ــــــ"

اماں طاہر کی تعریف کرنے لگی۔ طاہر اور شگو کی ایک دوسرے میں دلچسپی کا
بھی علم تھا۔

شگو نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اس کی آنکھوں میں بڑے حسین خواب
گھلنے لگے۔ پھر ان گھلتے بہتے خوابوں میں ہی کھو کر وہ سو گئی۔

اماں کافی دیر سلائی کی تر پائی کرتی رہی۔ صبح اس نے یہ کپڑے دینا تھے۔

شگو ہاتھ میں لفافہ پکڑے اوپر آئی۔ درمیانی دروازے سے جھانک کر
دیکھا طاہر چھت پہ ہی تھا۔ وہ اس طرف پشت کیے کرسی پر بیٹھا تھا۔ قریب ہی
چوکڑی مارے ظہیر بیٹھا اس سے حساب کا سوال سمجھ رہا تھا۔ دائیں دیوار کے ساتھ
پڑی کھری چارپائی پر خالی پلیٹ نمک کی شیشی اور چھری کے علاوہ پلاسٹک کی ٹوکری
اور دھلے کپڑے بھی پڑے تھے۔ چارپائی کے اردگرد فرش پر مالٹوں اور کینوؤں
مونگ پھلی اور چلغوزوں کے چھلکے بھی بکھرے پڑے تھے لگتا تھا گھر والوں نے
آج اوپر بیٹھ کر خوب کھانے پینے کی عیاشی کی تھی۔

شگو دبے پاؤں سے آگے بڑھی۔ کرسی کی پشت پر آکر رک گئی طاہر
ظہیر کو کوئی مشکل سوال سمجھا رہا تھا طاہر کی آواز میں جھلاہٹ تھی اور وہ اس
سے پوچھ رہا تھا۔

"سمجھے یا پھر سمجھاؤں ــــــ"

ظہیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ طاہر نے پھر پوچھا۔

"بولتا کیوں نہیں ـــــ نہیں سمجھا ـــــ" اس کی چپ سے
گیا۔ ایک تھپڑ رسید کیا۔

"بولتا کیوں نہیں ـــــ"

ظہیر نے گال پر ہاتھ رکھ کر بُرا سا منہ بنایا۔

"جواب دے ـــــ"

طاہر پھر غرایا تو ہنستے ہوئے شگو اس کے سامنے آتی ہوئی بولی،

"توبہ توبہ ـــــ اتنا رعب جھاڑ رہے ہو۔ سمجھ گیا اسے فاک...
بڑے غصیلے ہو تم تو ـــــ"

"پاگل ہے یہ بالکل ـــــ بار بار پوچھ رہا ہوں بتا ہی نہیں رہا۔ چل...
سمجھا تو کل ماسٹر سے جا کر سمجھ لینا ـــــ"

ظہیر جلدی سے کاپیاں کتابیں سمیٹنے لگا۔ خلاصی ہو گئی تھی۔ اس...
متشکرانہ شگو کو دیکھا۔

پھر کتابیں اٹھا کر نیچے چلا گیا۔

"یہ کیا ہے ـــــ" طاہر نے شگو کے ہاتھ میں پکڑے لفافے...
ہوئے پوچھا۔

"انٹرویو کی کال آئی ہے ـــــ" شگو لفافہ پنکھے کی طرح...
ہوئے بولی۔

"کہاں سے ـــــ" تم نے تو کئی جگہ درخواستیں دے رکھی ہیں۔
"شبنم پولی کلینک سے ڈاکٹر رحمان ـــــ"

"وہ ـــــ وہ جو کینٹ سے اِدھر والی بڑی سڑک پر ہے۔ نئی عمارت"
"ہاں ہاں وہی ـــــ بڑا شاندار کلینک ہے۔ صاف ستھرا۔ بالکل نیا بنا ہے
...دیدہ زیب سہولتیں ہیں اس میں۔ ایرکنڈیشنڈ ہے سارے کا سارا۔ سامان بھی
...لکل نیا ہے ـــــ"

"کب ہے انٹرویو ـــــ"

"دو کو ـــــ"

"اچھا ہے تمہیں جاب مل جائے ـــــ"

"ملنا چاہیئے ـــــ یہی تو میرا آئیڈیل کلینک ہے ـــــ"

طاہر اس کی بات پر ہولے سے مسکرایا۔ اس کی طرف دیکھا اور چند
...لمحے چپ چاپ دیکھتا رہا۔

"کیوں ـــــ"

وہ دوسری کرسی کی پشت پر کھڑی تھی۔

"بیٹھو تو ـــــ"

"پہلے بتاؤ کیوں اس طرح مجھے تک رہے ہو ـــــ"

"بھئی تکنے پر پابندی تو نہیں ـــــ آنکھیں اپنی ہیں، جیسے چاہیں دیکھیں"

شگو کرسی ذرا پرے ہٹا کر بیٹھ گئی۔

"آج کیا کرتی رہیں سارا دن ـــــ" طاہر نے ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لی۔
وہ اب بھی اسے انہیں چھپتی چھپتی نظروں سے تک رہا تھا
شگو نے جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگی تھی۔

"لگتا ہے آج مامی کا ہاتھ بٹاتی رہی ہو سارا دن۔ اچھا ہے لڑکیوں کو کاموں کی مشق کرنا چاہیئے ـــــ تمہارے کپڑے ملگجے سے ہو رہے خوب کام کیا ہے نا ـــــ"

"اماں آپا کی طرف گئی ہیں ـــــ میں نے سوچا آج اماں کا کام ہی کر

"بڑی مہربان ہو رہی ہو ـــــ"

"یہ تم آنکھوں ہی آنکھوں میں شوخی سے مسکرا کیوں رہے تھے۔

"حد ہو گئی ـــــ اب آنکھوں ہی آنکھوں میں شوخی سے مسکرا بھی اجازت نہیں ـــــ"

"خاص خاص موقعوں پر ہی ہم ایسے مسکرا نے ہو ـــــ"

"یہ بات ـــــ"

"ہاں ـــــ"

"شکریہ ـــــ"

"کس بات کا ـــــ"

"میری کوئی بات تو تمہیں اچھی لگتی ہے نا ـــــ"

طاہر نے شوخ ہوتے ہوئے کہا۔ تو شگو نے بری طرح گھور کر کہا نے کہا کہ تمہاری یہ بات مجھے اچھی لگتی ہے ـــــ"

"اس نے ـــــ" طاہر نے مستی سی آنکھوں سے چھلکا دل پر ہاتھ رکھ دیا۔

شگو نے اک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی۔ پھر جبراً سنجیدہ بنتے ہو

"اسے قابو ہی میں رکھو ـــــ"

"اداس ہوں ـــــ" وہ بھی شوخ ہو کر بولا۔ "اب میرے بس میں نہیں رہا ـــــ"

شگو اس کی شوخی سے کچھ جھینپ سی گئی۔ دونوں بچپن کے ساتھی تھے۔ حجاب تو مانع نہیں تھے۔

شروع ہی سے بے تکلف تھے۔ کچھ شگو کی طبیعت ہی بے باک اور نڈر تھی۔ اس لئے دونوں بے دھڑک ملتے تھے۔ پہروں اکٹھے بیٹھے گپیں لگاتے۔ کھیلتے ہنستے اور لڑتے جھگڑتے تھے۔ شگو طاہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کر لیتی تھی ـــــ طاہر بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کیا کرتا تھا ـــــ

لیکن ـــــ

اب ـــــ

کبھی کبھی ـــــ

شگو طاہر کی بے باک نظروں سے گھبرا سی جاتی۔ اس کی بولتی اور ہر وقت کچھ کہتی نظروں کا مفہوم جانتی تھی۔ لیکن یہ جاننا گالوں پر سرخی اور نگاہوں میں جھینپ جانے کی کیفیت سے بھی دوچار کر دیتا تھا۔ دل ایسے ہی بے اختیارانہ دھڑک اٹھتا۔ اور من کے اندر موسیقی کا ترنم گونجنے لگتا۔

وہ اپنی اس کیفیت سے ناآشنا نہ تھی۔ جانتی تھی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ دوستی محبت کا رنگ بدل رہی تھی اور محبت شاید عشق کے در پر دستک دے

رہی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اب دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لئے بے تاب رہتے۔ شگو ادھر نہ آتی تو طاہر ادھر چلا جاتا۔ طاہر نہ آتا تو شگو ادھر کھینچی چلی جاتی۔

آنے جانے پر پابندی تھوڑا ہی تھی۔ پھر بھی دونوں معقول بہانے تراشں لیا کرتے ——

"ہاں تو یہ انٹرویو کا لیٹر آیا ہے ——" طاہر نے پیار بھری نگاہ سے اسے دیکھتے ہوئے بات بدلنے کو بات کی۔

"ہاں ——"

وہ مسکراہٹ لبوں میں دبا کر بولی۔

"دو تاریخ کو ہے ——"

"ہوں ——"

"خدا کرے تمہارے آئیڈیل کلینک میں تمہیں جاب مل جائے" طاہر نے جان بوجھ کر اس کی بات دہرائی۔

"اچھا تو تم اس وقت میرے آئیڈیل کلینک کہنے پر ہی عجیب انداز سے مسکرائے تھے۔"

"ہوں ——"

طاہر کرسی کے ہتھے پر کہنیاں ٹکائے دونوں ہاتھوں کی پوریں آپس میں ملاتے ہوئے پھر اسی انداز میں مسکرایا۔

"کیوں ——" شگو نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں ——"

"پھر بھی —— تمہارا رویّہ کچھ معنی رکھتا ہے ——"

"بڑی قیافہ شناس ہو ——"

"کچھ ایسی بدھو بھی نہیں ——"

"وہ تو جانتا ہوں مانتا ہوں ——"

"پھر ——"

"یونہی شگو ——"

وہ کرسی پر آگے ہوتے ہوئے بولا۔

"یونہی —— کچھ ——"

"کیا —— ؟"

"کچھ خوف سا آجاتا ہے کبھی کبھی ——"

"کس سے ——"

"تم سے ——"

"مجھ سے ——"

"ہاں ——"

"لیکن کیوں ——"

"ڈرتا ہوں کہیں اپنے آئیڈیلز کے چکر میں پھنس کر تم کھو ہی نہ جاؤ ——"

شگو دھیرے سے مسکرا دی اور بڑے تفاخر سے اسے دیکھ کر بولی۔

"میرے آئیڈیلز سے ڈرتے ہو ——"

"نہیں —— ان آئیڈیلز کے چکر میں کہیں تم کھو ہی نہ جاؤ۔ یہ آئیڈیل ہیں تمہارے ——"

وہ بڑے اعتماد سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"گھبراؤ نہیں —— کھو نہیں سکتی ——"

"یہ تمہارا یقین ہے —— لیکن —— کبھی کبھی یقین بھی چکر د ہے ——"

"میں اپنی جدوجہد جاری رکھوں گی اپنے آئیڈیل کو پانے کی۔"

"اسی سے تو میں ڈرتا ہوں —— ہر وہ چیز مل تو نہیں جاتی جس کی خواہش کرتا ہے ——"

"اس کے لئے تگ و دو تو کی جا سکتی ہے ——"

"تگ و دو ناکام بھی ہو سکتی ہے ——"

"چلنے سے پہلے ہی سوچ لیا جائے کہ منزل نہیں ملے گی —— ؟"

"یہ نہیں ——"

"تو ——"

"تم نے —— سچ کہوں تو —— تم نے جائز و ناجائز خواہش اپنے اوپر مسلط کر رکھا ہے شگو —— یہی خوف رہتا ہے یہ لے نہ ڈوبیں ——"

وہ بڑے تیقن سے مسکراتے ہوئے بولی۔ "میری زندگی کا

ان آئیڈیلز کو پانا ہے طاہر —— اور میں جب تک زندہ رہوں گی انہیں تلاش کرنے کے لئے ہاتھ پیر مارتی رہوں گی ——"

"کھو جاؤں گی ——"

"کوئی بات نہیں ——"

"لیکن —— لیکن میں ایسا نہیں چاہتا ——"

وہ بڑے پیار سے اسے دیکھ کر مسکرائی پھر سر جھکا کر ہولے سے بولی۔

"میں کھو بھی گئی تو کوئی بات نہ ہوگی۔ اس لئے کہ تم —— تم بھی میرے ساتھ ہو گے ——"

"شگو ——"

طاہر نے بے اختیارانہ ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ شگو نے اسی بے اختیاری سے اس کا ہاتھ چھوا اور پھر چھوڑ دیا۔

دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو ایک ہو جانے والی نگاہوں سے تکتے رہے۔

پھر ——

شگو نے مسکرا کر کہا۔ "طاہر —— میں نے بچپن ہی سے کچھ سہانے خواب پال رکھے ہیں —— لیکن ان خوابوں کی صرف اپنی ذات کا محور نہیں بنایا۔ جب بھی انہیں دیکھا۔ ان میں مرکزی حیثیت تمہاری رہی ——"

"اوہ شگو ——" وہ سرشار سا ہو گیا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تمہارے بغیر تو میرے سارے خواب ادھورے

ہیں ———"

وہ بے پناہ خوشی سے سرشار ہو کر ہنسا ۔" تو گویا میں بھی تمہارے آئیڈیلز میں سے ایک ہوں ———"

اس نے اثبات میں سر ہلایا ۔

" میں ہر قدم پر تمہارا ساتھ دوں گا نگو ——— تم ——— تم نہیں جانتیں کہ میرے دل میں تمہارے لیے کتنی محبت ہے ۔"

وہ سر جھکائے گلابی ہوتی بولی ۔ " جانتی ہوں طاہر ———"

طاہر کا جی چاہا شگو کو بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لے ۔ یہ لڑکی یہ موہنی سی پیاری سی لڑکی اپنے اوٹ پٹانگ نظریات اور خواہشات کے باوجود اسے کتنی عزیز تھی ۔ کتنی پیاری تھی ۔ یہ وہی جانتا تھا ۔

رشیدہ نے ڈیوڑھی میں داخل ہو کر کالے برقعے کا نقاب الٹا ۔

" آجاؤ بھابی ——— اِدھر ہی آجاؤ ———" اس نے گلی میں کھڑی تہمینہ سے کہا ، جو چادر اوڑھے ہوئے تھی ۔

" نہیں اب گھر ہی چلتی ہوں ۔ شگو اکیلی ہوگی ۔ دوپہر کا کھانا بھی بنانا ہے ۔" وہ بولی ۔

" کوئی بات نہیں ——— ابھی تو زیادہ وقت نہیں ہوا ———" رشیدہ برقعے کے اوپر کا حصہ اتارتے ہوئے بولی ۔

تہمینہ اندر آگئی ۔ سفید چکن لان کی چادر اس نے بھی اتار کر بازو پر ڈال لی دونوں کسی عزیزہ کی خبر گیری کو گئی تھیں ۔ روز ہی ارادہ کرتی تھیں ۔ لیکن کوئی نہ کوئی کام پڑ جاتا ، آج صبح ہی صبح ناشتے سے فارغ ہو کر رشیدہ نے جانے کا پروگرام بنا کر تہمینہ کو بھی تیار ہونے کا کہہ بھیجا تھا ۔ دونوں نند بھاوج احوال پرسی کو گئی تھیں گھنٹہ بھر رکنے کے ارادہ سے گئی تھیں ۔ لیکن باتوں میں وقت کا پتا ہی نہ چلا ۔

بڑی بھابی بھی وہاں آئی ہوئی تھی گھنٹے کی بجائے دو گھنٹے لگ گئے۔

رشیدہ کو تو خیر واپسی کا اتنا تردد نہ تھا گھر پہ ربیعہ تھی۔ چولہے چوکے کا کام اس نے سنبھالا ہوا تھا۔ سبزی گوشت رفیق حسب معمول صبح ہی صبح لے کر دے گئے تھے۔ ہاں تہمینہ کو واپسی کی فکر تھی۔ شگو نے ہانڈی روٹی کا بار کب سنبھالا۔ پھر گھر میں سبزی تھی نا دال۔ شگو سے پکانے کو کہہ کر بھی نہ گئی تھی۔ اسی لئے اب گھر جانا چاہتی تھی۔

لیکن

رشیدہ نے اپنے ہاں ہی آجانے کو کہا تو وہ اندر آگئی۔ کچھ اتنی زیادہ دیر بھی تو نہیں ہوئی تھی۔ ماں بیٹی کے لئے پکنا ہی کتنا ہوتا تھا۔ ایک پلیٹ سالن اور تین پھلکے دونوں کے لئے کافی ہوتے تھے۔

دونوں بڑی بھابی کی باتیں کرتی صحن میں آگئیں۔

بیٹھک کا دروازہ کھلا تھا اور اندر سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

"کوئی آیا ہوا ہے ——" تہمینہ نے کہا۔

"ہاں ——" رشیدہ برقعے کے بٹن کھولتے ہوئے بولی۔ "لگتا تو ایسا ہی ہے۔ جانے کون ہے ——"

"پھپھو وہی لوگ آئے ہیں ——" شگو ایک دم ہی بیٹھک سے نکل آئی ماں اور رشیدہ کو سلام کرنے کے بعد اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"وہی کون ——" رشیدہ نے برقعے کے پچھلے حصے کے بٹن کھولتے ہوئے ہولے سے پوچھا۔

"وہی —— ربیعہ آپا کو دیکھنے نہیں آئے تھے پچھلے ہفتے ——" شگو نے دھیمی آواز میں کہا۔

"اچھا —— وہ ملک سلیمان کے گھر سے —— زینب کے ساتھ"

رشیدہ جلدی سے برقعہ اتارتے ہوئے تجسس گھبراہٹ اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولی۔

"زینب کون ——"

شگو کی امی نے چادر تخت پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"اے بھابی وہی زینب —— رشتے کرواتی ہے نا —— وچولنی"

"اچھا اچھا ——"

"دوبارہ آئے ہیں یہ لوگ لگتا ہے رشتے کی بات چلے گی" رشیدہ نے گھبرائی گھبرائی آواز میں کہا۔

"اللہ کرے ہو جائے رشتہ ——"

تہمینہ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔

رشیدہ نے بھی برقعہ تخت پر رکھ دیا۔

"ربیعہ کہاں ہے ——"

"اوپر ——"

"اوپر —— کیوں ——"

"وہ ساتھ والی آپا زینت کے بیٹے کو آواز دینے گئی ہیں۔ چائے کیلئے بازار سے کچھ منگوانا تھا۔ گھر پہ تو اور کوئی تھا نہیں ——"

"ہونا کون ـــــ طاہر دفتر بچے اسکول صبیحہ کالج ـــــ"
رشیدہ نے کہا۔

"اچھا بیٹی میں اندر چلتی ہوں۔ تم اچھی سی چائے بنا کر لے آنا۔ ساتھ
میوہ اور پھل بھی ـــــ"

"وہ تو ہم نے ان کے آگے رکھ دیئے ـــــ"

"بھلا کون کون آیا ہے ـــــ"

شگو نے ایک ہاتھ کی انگلیاں پھیلا کر دوسرے ہاتھ کی انگلی
گننا شروع کیا۔

"لڑکے کی اماں ـــــ نمبر ایک ـــــ نمبر دو لڑکے کی بھابی، نمبر
لڑکے کی چاچی۔ نمبر چار لڑکے کا بھتیجا ـــــ"

"مرد بھی آئے ہیں ـــــ"

شگو کی امی نے پوچھا۔

شگو ہنس پڑی۔

"آٹھ نو سال کا مرد ہے۔ لڑکے کا بھتیجا ـــــ پکا مرد ـــــ بوسکی کا کر
کے ٹی کی شلوار، کلائی پر پاؤ بھر کی گھڑی ـــــ"

"اے چپ رہ ـــــ"

شگو کے ہنسنے پر امی نے ڈانٹا۔

رشیدہ بیٹھک کی طرف بڑھ گئی۔

"آؤ بھابی تم بھی ـــــ" اس نے تہمینہ سے بھی کہا۔

شگو نے ہنس کر ماں کو دیکھا اور بولی۔ "اماں بالکل دو بئی مارکہ لوگ ہیں۔
عورتوں نے بھی خوب بھڑ کیلے۔ لش لش کرتے ریشمی کپڑے پہن رکھے ہیں۔ یہ
موٹے موٹے کڑے سونے کے اور . . . ."

"تو چپ رہے گی یا ـــــ"

شگو ہنستے ہوئے بولی۔ "جا کر دیکھ لیں اماں ـــــ"

"کیا دیکھ لوں ـــــ"

"دو بئی مارکہ لوگ ـــــ"

"بیٹا دو بئی ہی گیا ہوا ہے ان کا۔ اچھے لوگ ہیں ـــــ اللہ کرے ربیعہ کا
رشتہ ہو جائے"

وہ بھی بیٹھک کی طرف بڑھ گئی۔

شگو باورچی خانے کی طرف گئی ـــــ اور الماری سے چائے کے برتن
نکال کر ٹرے میں رکھنے لگی۔

نزہت کا دس گیارہ سالہ بیٹا شفیع آ گیا چائے کے لئے لوازمات منگوانا
تھے۔ ربیعہ نے اسے پیسے دیئے اور چیزیں بتا دیں۔

"بھاگ کر لا میرے بھائی ـــــ"

ربیعہ نے کہا۔

"بہت اچھا ہے یہ ـــــ"

"ابھی آیا باجی ـــــ"
شفیع تعریف سے خوش ہو گیا۔

"ہاں دیکھو ____ چیزیں تازہ لانا ____ باسی بھی تھما دیتے ہیں دکاندار" وہ بولی۔

"واہ باجی ____" شفیع نے کہا۔

"بھلا مجھے باسی چیزوں کا پتا نہیں چل سکتا ____"

"اچھا اچھا ____" ربیعہ جلدی سے بولی۔

"لے یہ ٹوکری لے جا ____ اور جلدی لے آ سب چیزیں۔ شاباش تیرے آنے تک چائے بن جائے گی ____"

شفیع چلا گیا ____ تو ربیعہ نے چولہا جلایا۔

چائے کا پانی رکھ کر شگو کی طرف دیکھا جو الماری سے برتن نکال کر کپڑے سے صاف کر رہی تھی۔

شگو کام کرتے ہوئے ربیعہ کو چھیڑنے بھی لگی ____

"ربیعہ آپا ____ آپ پر اتنی گھبراہٹ کیوں مسلط ہے ____" اس نے شوخی سے آنکھیں نچائیں۔

"مجھ پر گھبراہٹ کیوں مسلط ہونے لگی ____" ربیعہ نے پرسکون ہونے کا مظاہرہ کیا۔

"بڑے ٹھسے کی عورت ہیں آپ کی ساس ____"

"شگو تو نے خود ہی ساس بنا دی میری ____"

"دوبارہ آئی ہیں آپ کی تعریفوں کے پل باندھ رہی ہیں، گھر بار پسند آ گیا ہے پھر ساس کو ساس کہنے میں کیا برائی ہے"

"جی ____ شگو ____" وہ جلدی سے بولی۔

"ں آپا ____ بہت پسند آئی ہیں آپ انہیں ____"

"جھوٹ مت بول ____"

"مجھے کیا پڑی جو جھوٹ بولوں ____ آدھا گھنٹہ ان کے پاس بیٹھی رہی، بس تعریفیں ہی کیے گئیں وہ ____"

"اچھا ____"

"ہاں ____"

"تو ____ تو ____"

"تو رشتہ طے سمجھو ____ اب پھپھو کوئی میرا مطلب ہے بین میخ نہ نکالیں ____"

ربیعہ چپ ہو گئی۔ بین میخ نکالنے کی گنجائش کہاں تھی۔ ایک بار منگنی ٹوٹ چکی ں کے بعد جو لوگ بھی آئے تھے۔ دوبارہ نہیں آئے تھے۔ پچیس چھبیس برس رہی تھی وہ۔

امی اور ابا تو رشتے کی فکر میں گھلے جا رہے تھے۔ ابا کو تو بلڈ پریشر اور شوگر جیسے موذی مرض نے بھی شاید اسی فکر کی وجہ سے گھیر لیا تھا۔ کہیں بات بنتی نہ تھی۔

یہ رشتہ شہر ہی سے آیا تھا۔ رشید صاحب نے تو ہر ملنے والے ہر عزیز رشتہ دار کے علاوہ رشتہ کروانے والی کئی ڈچولینوں سے کہہ رکھا تھا۔ زینب رشتے کروانے میں خاصی ماہر تھی۔ کھاتی پیتی خوب تھی۔ پیسے بھی اچھے جھاڑ لیتی تھی۔ لیکن

رشتہ ضرور کروا دیتی تھی۔ اب تو اس نے اپنی باقاعدہ فیس مقرر کر
رشتہ ہو جانے پر گھر والے خود بھی خوشی سے اسے بہت کچھ د
رشیدہ سے بھی اس نے سو روپیہ رشتہ لانے کے وعدے پ
لیا تھا۔

پچھلی دفعہ بھی تیس روپے لے گئی تھی۔ لیکن یقین دہانی بھی کرا گ
کروا دے گی۔ بات تو نصیب کی ہوتی ہے۔ رشتوں کے بندھن
بندھ جاتے ہیں۔

لیکن

اس دنیا میں وسیلے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے ہی بند
مضبوط وسیلہ زینب بھی تھی۔ کئی متفکر اور پریشان والدین کے س
بیٹیوں کے بوجھ اتروا چکی تھی۔ کئی بیٹوں کے ماؤں کو اچھے گھروں ک
سیرت اور پاکباز بہوئیں دلا چکی تھی۔

ملک سلیمان شریف آدمی تھا۔ نوار اور بان رسی کی چھوٹی س
اپنا تھا۔ تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ بڑے بیٹے کی شادی کو آٹھ
تھے۔ بہو ساتھ ہی رہتی تھی۔ بیٹا دوبئی چلا گیا تھا۔ دوبئی جانے سے
پلٹ گئی تھی۔ اب تو اس نے دونوں چھوٹے بھائیوں کو بھی
برسنے لگا تھا۔

تین بیٹیوں کی بڑی دھوم سے شادیاں کر دی تھیں۔ گھر وال
بھر گیا تھا۔ فرج۔ ٹی وی۔ وی سی آر سے لے کر باورچی خانے ک

تھی۔ قیمتی ریشمی پارچات کی کمی نہ رہی تھی۔ اماں نے آخری بیٹی کا جہیز بھی
لیا تھا۔

اب وہ دوسرے بیٹے کے لیے بہو تلاش کر رہی تھی۔
رشیدہ انہیں بہت پسند آئی تھی۔ اسی لیے آج دوبارہ آئی تھیں۔ یہ پھیرا باقاعدہ
طلب کرنے کے لیے تھا۔

رشیدہ اور تہمینہ ان کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔
لڑکے کی ماں اپنے شریف اور کماؤ بیٹوں کی تعریفیں کرتے ہوئے کہہ رہی
"اللہ کا بڑا فضل ہے۔ میرے تینوں بیٹے باہر ہیں۔ کسی چیز کی کمی نہیں رہنے
انہوں نے گھر بھر دیا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی ہے ورنہ ہم
حال تھے۔ ہمیں تو صرف نیک لڑکی چاہیے۔ زینب نے آپ لوگوں کی بہت
کی ہے۔ بیٹی بھی ہمیں بہت پسند آئی ہے۔"

"مہربانی آپ کی ـــــ" رشیدہ انکساری سے بولی۔
"آپ ہمارے متعلق جہاں سے چاہیں پوچھ لیں۔ پوری طرح تسلی کر لیں۔ انشاءاللہ
کے معیار پر پورا اترے گا سب کچھ ـــــ"

رشیدہ سر جھکائے ہنستی رہی۔ تہمینہ نے کہا۔
"بہن جی ـــ یہ تو قسمت کے لکھے کا کھیل ہے۔ ہماری بچی کا نصیبہ آپ
سے منسلک ہے تو رشتہ ہو جائے گا۔"

"ہم تو رشتہ لے کر ٹلیں گے ـــــ" لڑکے کی بھابی نے ہنس کر کہا۔
"لڑکوں میں کسی بات کی کمی نہیں۔ تعلیم یافتہ ہیں۔ کماؤ ہیں۔ شریف ہیں۔ ہم

تو ایک کا نہیں دونوں کا رشتہ لیں گے ۔"

" دونوں کا ـــــــ " رشیدہ اور تہمینہ نے حیرت ملی خوشی سے

لڑکے کی اماں مسکرائی ۔ پھر سر ہلاتے ہوئے کہا ۔ " دونوں

کرنا ہے ۔ آپ کی دوسری بیٹی بھی تو ہے نا ۔ اب کہاں اور رشتے تلاش

سوچا ہے دونوں کا یہیں کریں ۔"

" جی ـــــــ ؟ جی ـــــــ ؟ " رشیدہ کی تو زبان ہکلا ہکلا گئی ۔

" دونوں کام اکٹھے ہی کرنے ہیں ہم نے ـــــــ " لڑکے کی چا

" ایک بیٹی کا نہیں ہمیں دونوں بیٹیوں کا رشتہ چاہیئے ۔ ہم نے تو

ہے دونوں ہماری بیٹیاں بنا دیں ۔"

رشیدہ تو کچھ کہہ ہی نہ سکی ۔ اسے تو شاید اپنی سماعت پر ہی یق

شگو چائے کی چیزیں ٹرے میں رکھ کر لے آئی ۔ درمیانی میز پر پلیٹ

نے ٹرے خالی کی اور چائے کے برتن لانے کو چلی گئی ۔

دوسرے پھیرے میں وہ چائے اور پیالیاں وغیرہ لے آئی

چائے بنائی اور بڑے سلیقے سے مہمانوں کو پیش کی ۔

" یہ آپ کی بچی ہے ـــــــ " چاچی نے تہمینہ سے پوچھا ۔

" جی ـــــــ " رشیدہ بولی ۔ " یہ میری بھابی ہیں اور شگو میری بیٹ

" بڑی ہنس مکھ ہے ـــــــ " لڑکے کی بہن نے شگو کی تعریف

" آپ کے آنے سے پہلے ہمارے پاس بیٹھی خوب ہنستی ہنسا

رشیدہ اور تہمینہ مسکرانے لگیں ۔ شگو اٹھ کر چلی گئی ۔

بات چیت کے انداز اور ماحول کی خوشگواری سے اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ لوگ رشتہ ضرور پکا کریں گے اس لئے وہ ربیعہ کو یہ خوشخبری سنانے کے لئے بیٹھک سے صحن میں آ گئی ۔

چائے کے بعد بھی باتیں ہوتی رہیں ۔ وہ لوگ دونوں رشتہ لینا چاہتے تھے ۔ بہت خواہشمند تھے ، سوچنے اور چھان بین کرنے کا وقفہ بھی دے رہے تھے ۔ انہیں شادیوں کی جلدی تو تھی ، لیکن یہ بھی چاہتے تھے ، کہ لڑکیوں کے والدین اپنی پوری پوری تسلی کر لیں ۔

شبنم پولی کلینک شہر کی سب سے بڑی شاہراہ پر واقع تھا۔ اس کی عمارت بالکل نئی تھی اور خاص طور پر کلینک ہی کے لئے بنوائی گئی تھی۔ ڈاکٹر سمیع اور ان کے امیر کبیر بھائی نے جو بزنس مین تھے اس کلینک کا منصوبہ بنایا تھا۔ شہر میں اور بھی کلینک تھے۔ لیکن جدید سہولتوں سے آراستہ مکمل کلینک دو ایک ہی تھے۔ اس علاقے میں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ پیسہ سمیع کے بڑے بھائی اشفاق نے لگایا تھا۔ پلان ڈاکٹر سمیع کا تھا۔

پورا کلینک ایرکنڈیشنڈ تھا۔ شہر کے چوٹی کے ڈاکٹر جز وقتی پریکٹس کے لئے یہاں آتے تھے۔ ان کے شعبے الگ الگ تھے۔ ہر شعبے میں مکمل اور جدید سامان موجود تھا۔

ریڈیالوجی کے شعبے کو ریڈیالوجسٹ ڈاکٹر نواز احمد سنبھالے ہوئے تھے اس شعبے میں ایکسرے مشینیں تھیں۔ ای۔ سی۔ جی کی سہولت میسّر تھی۔ انجوکارڈیوگرافی اور ایکوکارڈیوگرافی کی مشینیں اور اپریٹس موجود تھے۔

جگر، پتے، آنتوں اور پیٹ کی دیگر بیماریوں کے لئے الٹرا ساؤنڈ سکیننگ مشین بھی تھی۔ برین سکیننگ اور گردوں کی امراض کی تشخیص کے لئے بھی مشینیں موجود تھیں۔ سٹریچرز اور وھیل چیئرز بھی ماڈرن تھیں۔

یورالوجسٹ ڈاکٹر رحمان اسی کلینک میں اپنا شعبہ سنبھالے تھے۔ پتھالوجی سیکشن ڈاکٹر عمر ملک کے پاس تھا۔ بائیوآپسی کی جاتی تھی۔ مائیکرسکوپس تھے۔ ہوموگلوبن چیک کرنے اور بلڈ کاؤنٹ کے لئے کمپیوٹرائزڈ مشینیں تھیں۔

آپریشن تھیٹر بھی بالکل نیا اور جدید سامان سے آراستہ تھا۔ سٹیریلائز کئے اوزار ہوتے تھے۔ ڈاکٹروں کے گاؤن اور دستانے بھی آٹوکلیو مشین میں جراثیم سے پاک کئے جاتے۔ آپریشن تھیٹر میں ماڈرن ایڈجسٹیبل لائٹس بھی موجود تھیں۔

گائنی کا ڈیپارٹمنٹ بھی تھا۔ ہر سہولت وہاں بھی میسّر تھی۔ مریضوں کے لئے دس کمرے بھی جدید سہولتوں سے مزیّن تھے۔ پندرہ بیڈ کا ایک وارڈ بھی تھا۔ صفائی ستھرائی کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ جمعدار اور جمعدارنیاں فینائل اور جرم کش ادویات میں بھیگے کپڑے ہر وقت فرشوں پر پھیرتے نظر آتے تھے۔ استقبالیہ پر چاق و چوبند نرسیں ڈیوٹی پر موجود رہتیں۔ مریضوں اور ان کے لواحقین کو مختلف شعبوں کی معلومات فراہم کرتیں۔ یہیں فون بھی رکھے رہتے تھے۔ رابطے کا یہ ذریعہ سب کے لئے تھا۔

ڈی لکس کمروں میں صاف ستھرے فولڈنگ بیڈ تھے۔ کرسیاں تھیں۔

سامان رکھنے کے لئے الماریاں تھیں، فولڈنگ میزیں تھیں — ملحقہ باتھ روم تھے —

یہ مہنگا ترین کلینک تھا اور یہاں دولت کی فراوانی سے پالی ہوئی بیماریاں ہی آتے تھے۔ اتنے اخراجات کا متحمل عام آدمی کہاں ہو سکتا تھا مجبور ہو کر متوسط طبقے کا آدمی یہاں ایڈمٹ ہو بھی جاتا تو بیماری چاہے ٹھیک بھی ہو جاتی خرچے کی بیماری اعصاب پر مسلط ضرور ہو جاتی۔

ڈاکٹرز کے علاوہ یہاں چاق و چوبند اور سمارٹ سمارٹ نرسوں کی بھی … کھیپ تھی، یہ تربیت یافتہ نرسیں الگ الگ شعبوں میں متعین تھیں جو اپنے … بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتی تھیں۔

مہنگا ترین کلینک ہونے کے باوجود اس کی ریپوٹیشن بہت اچھی تھی علاج بڑی تندہی سے ہوتا تھا۔ ڈاکٹروں کا رویہ مریضوں سے مشفقانہ تھا، نرسیں خوش اخلاقی اور خدمت گزاری کے حقیقی جذبے سے سرشار تھیں، دن ہو یا رات ڈاکٹروں سے ملنا مشکل نہ تھا — نرسوں کی ڈیوٹی بھی دن اور رات ہوتی تھی۔

ڈسپنسری اور کینٹین بھی ساتھ ہی تھیں۔ دوائیاں دستیاب تھیں اور مریضوں کے ساتھ آنے والے لواحقین کو چائے کوک اور کھانے پینے کی چیزیں آسانی سے مل جاتی تھیں۔

اسی کلینک میں ڈاکٹر آصف رحیم تھے جو کینسر کی تشخیص کے ماہر گردانے جاتے تھے۔ انہیں اپنے شعبے میں ایک نرس کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر رحیم نے

اس کے لئے اشتہار اخبار میں دیا تھا جس کے جواب میں بہت سی درخواستیں آئی تھیں۔

شگو نے بھی اپلائے کیا تھا۔ اب اسے انٹرویو کال آئی تھی۔

اس کلینک میں نوکری پانا بڑی بات تھی۔ ایک تو یہ کہ یہاں بڑے ڈاکٹروں کے قریب رہ کر تجربہ زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے تنخواہیں بھی گورنمنٹ سکیل سے کچھ زیادہ ہی دی جاتی تھیں۔

شگو کا تو یہ آئیڈیل کلینک تھا۔ اتنا عمدہ ماڈرن اور صاف ستھرا کلینک جو پورے کا پورا ایرکنڈیشنڈ تھا۔ جس کا ساز و سامان جدید تھا۔ جس کا فرنیچر نیا اور چمکتا دمکتا تھا۔ جس میں ڈاکٹروں کے ریٹائرنگ رومز کی طرح نرسوں کے آرام کرنے کے بھی خوبصورت فرنیچر اور کارپٹس سے آراستہ کمرے تھے۔

شگو یہاں ملازمت کرنے کی دلی متمنی تھی، کال آئی تو اس کا شوق اور بڑھ گیا بہرصورت یہ نوکری پانے کا اس نے تہیہ کر لیا۔

ڈاکٹر سعدیہ سے اس کی ٹریننگ کے دوران ملاقات ہوتی رہی تھی اس سے مراسم بہت اچھے تھے، اس نے اس سے کسی اچھے کلینک میں پاس ہونے کے بعد جاب دلانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

یہ کال آئی تو اسے ڈاکٹر سعدیہ سے ملنے کا خیال آیا، کیا عجب اس کی یہاں کوئی واقفیت نکل آئے اور اسے یہ نوکری دلانے میں کچھ مدد کر سکے۔

اس بات کا ذکر اس نے طاہر سے بھی کیا۔

"ٹھیک ہے ـــــ" وہ بولا۔

"مل لو ڈاکٹر سعدیہ سے ـــــ ڈاکٹروں کے آپس میں تعلقات اور مراسم تو ہوتے ہی ہیں ـــــ"

"ڈاکٹر سعدیہ کے گھر جانا چاہیئے ـــــ"

"پتہ معلوم ہے کہاں رہتی ہے ـــــ"

"پتہ تو ہے ـــــ لیکن میں کبھی گئی نہیں۔ کینٹ میں رہتی ہیں"

"کسی کو ساتھ لے کر چلی جاؤ ـــــ"

"کسے لے جاؤں ـــــ"

طاہر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر مؤدبانہ جھکتے ہوئے کہا۔

"بندہ حاضر ہے ـــــ"

"لے چلو گے مجھے ـــــ"

"بالکل ـــــ بڑی خوشی سے۔ امی سے پوچھ لو ـــــ"

"اماں کیا کہیں گی ـــــ کام میں نے تلاش کرنا ہے، اب تو مردوں کی طرح دوڑ دھوپ کرنا پڑے گی ـــــ"

"ہم کس لئے ہیں جناب ـــــ" طاہر نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا ـــــ

"کل میں گاڑی لے آؤں گا اپنے دوست سے مانگ کر ـــــ"

"گاڑی ـــــ"

"ہاں تو اور کس طرح کینٹ جاؤ گی ـــــ بس سے ـــــ ؟ اُف ہوں ـــــ"

"گاڑی مل جائے گی ـــــ"

"کیوں نہیں ـــــ"

"بس پھر ٹھیک ہے ـــــ"

"کس وقت چلو گی ـــــ"

"صبح دس گیارہ بجے۔ جمعہ ہے نا ڈاکٹر سعدیہ گھر پہ مل جائے گی ـــــ"

"ٹھیک ہے ـــــ تیار رہنا ـــــ میں لے چلوں گا۔"

"تیار رہوں گی ـــــ"

"اچھا اس خوشی میں ایک کپ چائے پلا دو نا ـــــ" طاہر نے کرسی پر پھیلتے ہوئے کہا۔

"رشوت ـــــ" وہ شوخی سے بولی۔

"یہی سمجھ لو ـــــ" وہ اس کی شوخی سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

"بنا لاتی ہوں ـــــ"

شگو ہنستے ہوئے چارپائی سے اٹھی۔

"لیکن جیسی بھی بنے پینا پڑے گی ـــــ"

"جیسی بھی سے کیا مطلب ـــــ ؟"

"اچھی بُری جیسی بھی بنے ـــــ"

"تمہیں چائے بنانا بھی نہیں آتی ـــــ"

شگو نے مسکرا کر سر نفی میں ہلایا۔

"اماں ہی بناتی ہیں ـــــ"

طاہر نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے شوخی سے اسے دیکھا اور بولا۔

" کباڑا کر دو گی اس کا جس کے پلے بندھو گی۔ چائے بنانا نہیں آتی، کھانا پکانا آنے کا تو سوال ہی نہیں شاید ــــ بدقسمت بیچارہ ــــ"

شگو کی ہنسی چھوٹ گئی۔ شرارت کے موڈ میں بولی ۔ " اللہ جانے کون بدنصیب ہو گا ــــ"

" جانتی نہیں ہو اسے ــــ" طاہر آگے کو جھک آیا ۔

" اوں ہوں ــــ"

وہ شوخی سے آنکھیں نچاتے ہوئے بولی ۔

" پھوٹ گئی اپنی قسمت ــــ" طاہر نے بھی اپنے دونوں ہاتھوں پر سر گرا کر ہنستے ہوئے کہا۔

شگو کا قہقہہ فضا میں بکھر گیا ۔

پھر وہ سامنے ہی باورچی خانے میں گھس گئی طاہر صحن میں کرسی پر بیٹھا محظوظ ہوتا رہا ــــ

باورچی خانے میں تھوڑی دیر کھٹ پٹ کرنے کے بعد شگو نے چائے بنائی۔ پیالی میں ڈالی اور وہ باہر نکل آئی ۔

" یہ لیجئے جناب ــــ"

اس نے پیالی طاہر کی طرف بڑھا دی ۔

" ایسی چائے عمر بھر نہ پی ہو گی ــــ"

طاہر نے پیالی لی۔ چائے کو دیکھا۔ جان بوجھ کر منہ بنایا پھر پیالی ہونٹوں سے

لگا کر گھونٹ بھرا ۔

چائے اچھی بنی تھی۔ طاہر نے شگو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ " یونہی کہہ رہی تھیں چائے بنانا نہیں آتی ــــ"

وہ خوش ہو کر بولی ۔

" اچھی ہے ــــ"

" بہت اچھی ــــ"

" واقعی ــــ"

" ہاں ــــ"

" ایسے ہی کہہ رہے ہو ــــ"

" لو خود گھونٹ بھر کر دیکھ لو ــــ" طاہر نے پیالی اس کی طرف بڑھائی۔

شگو نے آگے بڑھ کر پیالی لینا چاہی ــــ لیکن وہ ہاتھ میں پکڑے پکڑے بولا ۔

" بھرو گھونٹ ــــ"

شگو نے پیالی کے ساتھ ہونٹ لگا دیئے۔

طاہر نے نگاہیں اس کے جھک آنے والے چہرے پر جما دیں۔ شگو گھونٹ لے کر سیدھی کھڑی ہو گئی ۔ " بس ایسے ہی ہے ــــ"

" نہیں تو ــــ"

طاہر نے اس کی جھوٹی چائے پی لی ۔

" ارے ــــ" شگو جلدی سے بولی ۔

"ہاں ——" طاہر نے جواب دیا۔

"میری جھوٹی چائے پی رہے ہو ——" شگو نگاہ غلط انداز اس پر ڈا
ہوئے مسکرائی۔

"تم نے بھی تو میری جھوٹی چائے پی ——" طاہر نے اس کی آنکھو
جھانک کر کہا۔

شگو ہنس پڑی ——

طاہر نے بھی اس ہنسی میں اس کا ساتھ دیا۔

دونوں

یونہی

ہنستے چلے گئے۔

اور

اماں سیڑھیاں اتر کر نیچے نہ آجاتی تو شاید ہنستے ہی چلے جاتے۔

شگو تیار ہو کر کمرے سے نکل آئی۔ اماں صحن میں پرانا لحاف ادھیڑ رہی تھی
ت میلا ہو رہا تھا۔ دھو دھلا کر پھر سے بھروانا تھا۔

"اماں ——" وہ بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے لحاف دیکھ کر بولی۔

"ہاں ——" اماں دھاگہ کھینچتے ہوئے کہا۔ وہ صحن کے فرش پر لحاف
پھیلائے بیٹھی تھی۔

"کیوں ادھیڑ رہی ہو اسے ——"

"میلا ہو گیا ہے دھو کر پھر ——"

"اماں ——"

"ہوں ——"

"تھوڑے دن صبر نہیں کر سکتیں تم ——"

"کیا مطلب ——"

"مطلب یہ کہ میری نوکری لگ جائے تو پرانے لحاف کی جگہ نیا لحاف

بن جائے ——"

"اماں اس کی بات پر مسکراتے ہوئے بولی۔ "بہت کچھ بننے کو ہے
نوکری تو پالے ——"

"بس تیری دعا چاہیئے اماں ——"

وہ دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

"یہ ملازمت مل گئی نا تو مزہ آجائے گا۔ جتنی رقم تیرے ہاتھ میں تین مہینے
ہوتی ہے نا۔ اتنی مجھے ایک مہینے میں ملا کرے گی۔ اس لیے تو کہہ رہی ہوں
گدڑی کو پرے پھینک دو۔"

"تو جا اپنے کام —— مجھے لگا رہنے دے ——"

"عادت سے مجبور ہو —— گھسی پرانی چیزوں کو ہی بنانے سنوار
میں لگی رہتی ہو ——"

"اچھا اماں میری —— مجھے نصیحتیں نہ کر —— جا اپنے کام ——"

"جا رہی ہوں —— دعا کر تو بس ——"

"اللہ کرے تیرا کام بن جائے —— میری تو ہر سانس تیرے
بن جاتی ہے ——"

"اوہ میری ماں ——"

شگو نے جھک کر ماں کے گال پر پیار کر لیا۔

"جیتی رہو ——" اماں نے دعا دی۔

شگو صحن کی دیوار پر لگے آئینے کی طرف مڑی۔ زنگ آلود پرانے

اپنا چہرہ دیکھا۔ نک سک سے درست تھا اس نے بالوں پر آہستگی سے
ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں ٹھیک کیا۔

پھر کالی سویٹر کے بٹن بند کیے۔

"السلام علیکم ——"

طاہر نے ڈیوڑھی سے صحن میں آتے ہوئے کہا۔

اماں نے سلام کا جواب دیا۔

شگو ایک دم مڑی۔ طاہر کو دیکھا۔

اس نے براؤن پتلون کے ساتھ آف وائٹ قمیض پہن رکھی تھی۔ براؤن جرسی
تھی۔ وہ ہینڈسم اور بیحد سمارٹ لگ رہا تھا۔

شگو نے آنکھیں مٹکائیں۔

"کیوں ——" طاہر نے گردن قدرے اکڑاتے ہوئے پوچھا۔

"نئی شرٹ خریدی ہے ——"

"جی ہاں ——"

"تمہاری ڈاکٹر سعدیہ سے ملنے جو جانا تھا ——"

"واہ ——"

"ٹھیک ہے نا ——"

"ہاں —— چلو ——"

"چلو ——"

طاہر نے چابی انگلی کے گرد گھماتے ہوئے کہا۔

"اچھا اماں ـــــ خدا حافظ ـــــ"

شگو ڈیوڑھی کی طرف بڑھتے ہوئے بولی ۔

"جلدی لوٹ آنا ـــــ" اماں نے تاکیدی انداز میں کہا۔

"اماں دیر سویر کی اب عادی ہو جاؤ ـــــ" اس نے پلٹ

کو دیکھا ۔

"نوکری کرنا ہے اب مجھے ـــــ"

"آج تو نوکری پر نہیں جا رہی نا ـــــ"

"نوکری کے سلسلے میں تو جا رہی ہوں ۔ پھر اکیلی تو نہیں جا رہی، ط

ساتھ جا رہی ہوں ـــــ"

"ہاں مامی ـــــ آپ بے فکر رہیں ۔ میں لے کر جا رہا ہوں،

لے کر آؤں گا ـــــ"

طاہر نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا ۔

"بس آپ دعا کریں آج اس کی سفارش لڑانے کی ٹرائی کرتا

بھر لیں ـــــ"

"اچھا بیٹے جو خدا کو منظور ہوا وہی ہو گا ـــــ جاؤ ـــــ اللہ

ہو ـــــ"

دونوں آگے پیچھے صحن سے ڈیوڑھی میں آ گئے ۔ اماں نے

انہیں دیکھا ـــــ

کتنی پیاری جوڑی ہے ـــــ"

اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"خدا کرے یہ جوڑی ابدی بندھن میں بندھ جائے ـــــ"

پھر

اس نے دعا کی قبولیت خود ہی آمین کہا ۔

اس رشتے کے ہو جانے کی اسے بڑی چاہت تھی ۔ یقین بھی تھا۔ طاہر کی

س بھی جانتی تھی ۔

اس کے گھر والوں کی نیت کا بھی پتا تھا۔ لیکن جب تک باقاعدہ رشتہ نہ

اسے تسلی کیونکر ہو سکتی تھی ۔

دعا کا سہارا ہی لئے ہوئے تھی اور یہ سہارا بڑا مضبوط بھی تو تھا ۔

طاہر اور شگو گلی میں آ گئے ۔ گلی میں حسب معمول خاصی رونق تھی ۔ ریڑھی ٹھیلے

صدائیں لگا رہے تھے ۔

عورتیں گھروں کے دروازوں پر کھڑی جھانک تاک کر رہی تھیں ۔ سبزی پھل خرید

تھیں،

بچے بھی گلی میں کھیل کود کے لئے نکل آئے تھے۔ آج چھٹی تھی نا۔ سارا دن

کے بچوں نے مل کر گلی میں ہی ادھم مچانا تھا ۔ مرد بھی آ جا رہے تھے۔ کسی

پیچھے تھیلا رکھا تھا کسی کے پیچھے ٹوکری ۔

بازار سے سودا سلف چھٹی کے دن ہی لاتے تھے۔ پھٹ پھٹ کرتے

سائیکل بھی گزر رہے تھے ۔

"ادھر آؤ ——"

طاہر نے پچھلی گلی کی طرف اشارہ کیا۔

"ادھر ——" شگو نے حیرانگی سے کہا۔

"گاڑی نہیں لائے ——" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے بولی۔

"لایا ہوں —— پچھلی گلی میں کھڑی ہے۔ ناظم سے مانگی ہے۔"

"ناظم کے پاس گاڑی ہے ——"

"سکوٹر ہے ——"

"تم تو گاڑی کا کہہ رہے تھے ——"

"گاڑی نہیں ملی ——"

"تو سکوٹر پہ لے جاؤ گے مجھے ——"

"کیا حرج ہے ——"

"نا بابا ——" وہ گلی کے موڑ پر رک گئی۔

"کیوں ——"

طاہر نے حیرت سے پوچھا۔

"میں ——"

"میں —— تمہارے ساتھ ——" وہ قدرے لجائی۔

"اوہ —— آؤ بھی ——" طاہر نے بے تکلفی سے کہا۔

"نہیں ——"

"ضد نہ کرو —— چلو آؤ ——"

"رکشے پہ چلتے ہیں ——"

طاہر کو غصہ آگیا۔ منہ بن گیا ——

گھور کر اسے دیکھا اور بولا۔

"میرے ساتھ جانے میں اعتراض ہے ——"

"ارے نہیں —— اعتراض کیوں ہونے لگا —— اعتراض ہوتا تو پروگرام کیوں بناتی ——"

"گاڑی نہیں لا سکا اس لئے ——"

"سمجھتے کیوں نہیں ہو —— گاڑی ——"

"جی ہاں آپ جناب تو گاڑی کے بغیر جا ہی نہیں سکتیں —— سکوٹر کی سواری میں سبکی ——"

"اللہ طاہر —— کیا کہہ رہے ہو ——"

"تو پھر چلتی کیوں نہیں ——"

"تمہارے ساتھ سکوٹر پہ ——"

"اچھا —— شرم آتی ہے ——"

شگو نے سر اثبات میں ہلایا۔ تو وہ ہنس کر بولا۔ "ماڈرن تو بڑی بنتی ہو اچھا چلو آؤ ——"

وہ شرمائی شرمائی اس کے ساتھ چل پڑی۔

ناظم کے گھر کے باہر ہی سکوٹر کھڑا تھا۔ طاہر نے بڑھ کر سکوٹر سنبھالا۔ خود بیٹھتے ہوئے بولا۔ "چلو بیٹھو ——"

شگو اس کے ساتھ لگ کر بیٹھتے ہوئے سچ مچ ہی جھجک
لیکن ——

طاہر نے ابھی ابھی خفگی کا مظاہرہ کیا تھا وہ اسے خفا نہیں کر سکتی تھی
پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پچھلے کیسریئر کو اس نے ایک ہاتھ سے مضبوطی
لیا۔ یہی کوشش کی کہ طاہر سے جسم مس نہ ہو ——

طاہر نے سکوٹر سٹارٹ کیا —— اور پھر ہولے ہولے اینٹوں والی
سے سڑک پر لے آیا۔

"چلانا آتا ہے نا ——" شگو نے پوچھا۔

"گرا نہ دینا کہیں ——"

"گرایا تو خود بھی ساتھ گروں گا ——" وہ ہنس کر بولا۔ "جنم جنم کے
سمجھیں۔ مرے تو اکٹھے ہی مریں گے ——"

"مت نکالو ایسی باتیں منہ سے ——"

"پھر چپکے سے بیٹھی رہو —— میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لو، پکڑ
سے، اور ہاں توازن برابر رکھنا۔ اِدھر اُدھر ہلیں جلیں تو بس —— شیگی
اگلے جہاں پہنچ سکتے ہیں ——"

"ہائے ——"

شگو کے لبوں سے نکلا۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر
لیکن ——

اپنا جسم طاہر کی پشت سے قدرے دور ہی رکھا ——

طاہر نے سڑک پر آتے ہی سپیڈ تیز کر دی۔ دو ایک جگہ جمپ لگے شگو
پوری کی پوری طاہر کی پشت سے جا ٹکرائی۔

"لے ہے ——" طاہر شوخی سے بولا۔

"کیا ہے ——" وہ جھنجھلائی۔

"ایک تو سکوٹر پہ میرے پیچھے بیٹھتی نہیں تھیں۔ ایک ——"

"کیا ایک ——"

"ایک چمٹی جا رہی ہو ——" وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

وہ جھنجھلا کر پرے ہٹ گئی —— ہولے سے مکا اس کی پشت پر
جماتے ہوئے بولی۔ "طاہر کے بچے ——"

"ابھی تو شادی بھی نہیں ہوئی —— تم بچے ——"

"اللہ طاہر تم ——"

"ہوں ——"

"سیدھے سیدھے راستہ ناپو —— ایسی باتیں مت کرو ——"

"ایسی باتیں کرنے کو ہی تو تمہیں ساتھ لایا ہوں ——"

"ایکدم فضول ہو تم ——"

"نہیں اچھی لگتیں میری باتیں ——"

وہ چپ ہو گئی۔

"بتاؤ نا شگو ——"

"کیا بتاؤں ——"

"نہیں اچھی لگتیں میری باتیں ——"

"نہیں ——"

زور سے کہتے ہوئے اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ کی گرفت مضبو
کرتے ہوئے سر اس کی پشت سے ٹکا دیا۔

انکار میں اقرار تھا ——

طاہر سرشار ہو گیا —— ——

یونہی باتیں کرتے وہ کینٹ آ گئے۔ سٹریٹ نمبر اور گھر کا نمبر شگو کو پتہ تھ
وہ بتاتے گئی۔ گھر پانے میں دونوں کو خاص دقت نہیں ہوئی۔ گلی کا ایک راہگ
سے پوچھا۔ اور لین میں آ کر گھر خود ڈھونڈ لیا۔

کشادہ اور صاف ستھری لین درختوں سے گھری تھی۔ بڑے خوبصورت ب
بنے ہوئے تھے۔ جن میں درخت پھولدار جھاڑیاں اور بیلیں بڑی ہنات سے
تھیں ——

یہ پوری کالونی نئی تھی اس لئے جدید طرز کے خوبصورت گھر بنے ہوئے
تھے۔ لوہے کی گرل کے بڑے بڑے آہنی گیٹ تھے۔ جن کے اندر صاف
شفاف ڈرائیو وے تھے۔

سائیڈ پر چھوٹے بڑے لان تھے۔ پھول تھے سبزہ تھا۔ عام کوٹھیوں کے
سامنے ہی ڈرائینگ رومز تھے۔ کسی ڈرائینگ روم کی بڑی بڑی کھڑکیوں کے
ٹِنٹڈ گلاسز نظر آتے تھے۔ کسی کے سادہ شیشوں کے آگے کھنچے پردے
دکھائی دے رہے تھے۔

شہر کی تنگ تنگ گلیوں سے نکل کر دونوں جیسے اس ہری بھری جنت
میں آ گئے تھے۔

"کتنا خوبصورت علاقہ ہے ——" طاہر نے کہا۔

اس نے سکوٹر روک دیا۔

"ایسے علاقے ہی میں گھر ہونا چاہیئے ——" شگو بولی۔

"ضرور ہو گا شگو صاحبہ ——" طاہر بڑے اطمینان سے بولا۔ "اباجی نے
اسی جیسے علاقے میں ایک کنال زمین خرید دی ہوئی ہے۔"

شگو کے چہرے پر بڑے خوشگوار تاثرات تھے —— وہ سکوٹر سے
اتر کر کھڑی ہو گئی۔

طاہر سکوٹر سٹینڈ پر کھڑا کرتے ہوئے اس کے سراپا پر پیار بھری مسکراتی
نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔

"جلد ہی گھر بھی بنا لیں گے ——"

"اتنی جلدی بھی نہیں بنے گا ——"

"بنانا تو پڑے گا —— تمہاری خاطر ——"

"میری خاطر ——"

"تو اور ——"

"ایسے ہی ——"

"ہاں جناب —— گھر بنے گا تو تمہیں اپنانے کی جرأت ہو گی نا ——"

"چلو ہٹو ——" شگو فرطِ مسرت سے لال ہو گئی۔

طاہر نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اس کی بلائیں لے لیں۔

شگو مڑ کر ساتھ والے گیٹ کے پاس آگئی۔ اور بیل پر انگلی رکھ دی۔ ڈاکٹر سعدیہ کا گھر تھا۔ پھولوں پودوں درختوں اور بیلوں میں گھرا ہوا بے حد خوبصورت گھر جس کے پورچ میں اس کی گاڑی بھی کھڑی تھی۔ دوسری گاڑی گیٹ سے باہر تھی۔ شاید یہ اس کے شوہر کی تھی۔

گیٹ بند تھا

بیل دینے پر اندر کا دروازہ کھلا اور ایک ملازم اندر سے باہر آگیا۔ پیچھے ہی دم ہلاتا سفید بالوں کا گولا سا رشین کتا بھی بھونکتا چلا آیا۔

"کون ہیں آپ ——— کس سے ملنا ہے ———"

"یہ ڈاکٹر سعدیہ صاحبہ کا گھر ہے نا ———"

"جی ہاں ———"

"مجھے ان ہی سے ملنا ہے ———"

"کیا کام ہے ———"

"کچھ ہے آپ ڈاکٹر صاحبہ کو اطلاع کر دیں ———"

"آپ کا نام ———"

"شگفتہ ——— رشید ———"

شگو نے ملازم کو اپنا پورا اور اصلی نام بتایا تو پشت پر سکوٹر کے قریب کھڑے طاہر کے ہونٹوں پر تبسّم لہرا گیا۔

"شگفتہ ——— شگو ——— شیگی ——— ایک نام کی تین شناختیں" اس نے ایک لمحہ کو سوچا۔

ملازم اب کوئی اور سوال کر رہا تھا ——

"میں پیشینٹ نہیں ہوں —— ڈاکٹر صاحبہ سے کسی کام کے سلسلہ [illegible] ملنا ہے ——"

شگو جھلائے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"ڈاکٹر صاحبہ چھٹی کے دن کم ہی ملتی ہیں۔ آپ انتظار کریں، میں انہیں [illegible] کرتا ہوں۔ ہاں کیا نام بتایا تھا؟"

"شگفتہ —— شگو —— شگی کچھ بول دینا ——" طاہر نے [illegible] کی جگہ جواب دیا۔

تو ملازم حیرانگی سے طاہر کو تکنے لگا۔ گیٹ اس نے اب بھی کھولا [illegible] طاہر گیٹ کے قریب آکر گرل کو پکڑتے ہوئے ملازم سے بولا۔

"یار گیٹ تو کھولو۔ تم تو جرح کئے جا رہے ہو۔ کیا ہم تمہیں شکل [illegible] سے مجرم دکھائی دے رہے ہیں؟"

"نہیں صاحب نہیں ——" ملازم خفت سے مسکراتے ہوئے گیٹ کھولنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحبہ کو اطلاع کرو ہمیں ان سے ضروری ملنا ہے" اند[illegible] ہوئے شگو بولی۔

"آپ اِدھر بیٹھیں ——" ملازم نے چمن کے کنارے رکھے [illegible] طرف اشارہ کیا۔

"میں انہیں اطلاع کرتا ہوں، دراصل چھٹی کے دن ڈاکٹر صاحب [illegible]

آرام کرتے ہیں۔ اس لئے ——"

"اوہ خدایا —— تم جاؤ تو سہی ——" شگو نے کہا۔

"اچھا اچھا ——" ملازم اندر چلا گیا۔

"آجاؤ نا طاہر ——"

شگو نے گیٹ سے باہر کھڑے طاہر سے کہا۔

"میں یہیں رکوں گا، تم مل لو ڈاکٹر سے ——" اس نے کہا۔

"وہاں کیا کرو گے آجاؤ یہیں ——"

"میں گھوم پھر کر یہ بنگلے دیکھوں گا ——"

"ایسے ہی ——"

"ایسے ہی نہیں —— اپنے گھر کا کچھ آئیڈیا ہو جائے گا۔ بڑے خوبصورت خوبصورت نقشے ہیں ان کے —— کوئی پسند کر لوں گا۔"

شگو بنچ کی طرف بڑھ گئی۔

یہ بنچ خوبصورت سے لان کے کنارے پڑا تھا۔ گھاس کا مخمل فرش تھا۔ کناروں پر کیاریوں میں رنگا رنگ پھول کھلے تھے فرنٹ وال پر بیلیں چڑھی تھیں۔ پرلی طرف پھیلے پھیلے گھنے گھنے درخت تھے۔ ڈرائینگ روم کا بیرونی برآمدہ تو پھولدار بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ سرخ سرخ گملوں میں بھی پھول کھلے ہوئے تھے۔

"جو گھر باہر سے اتنا خوبصورت تھا یقیناً اندر سے بھی خوب سجا ہوا ہوگا ——" شگو سوچ رہی تھی۔

وہ پنچ کے قریب ہی کھڑی ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھی ——— کہ دروازہ کھلا اور ایک آٹھ نو سالہ خوبصورت صحت مند اور بڑا ہی پیارا بچہ جس نے گرے پینٹ کے ساتھ گرین کلر جرسی پہن رکھی تھی اپنی سائیکل لیے باہر نکلا آیا اس کے پیچھے پیچھے چھ سات سالا بچی جس نے پھولا پھولا فراک اور اسی کے ہم رنگ سویٹر پہن رکھا تھا۔ بھاگی آئی۔ دونوں بہن بھائی یقیناً سعدیہ کے بچے تھے۔ بچی کے بال بیحد خوبصورت تھے اور فراک کے ہمرنگ ربن سے بندھے تھے بچی کے ہاتھ میں بڑی سی سونے جاگنے والی جاپانی گڑیا بھی تھی۔ دونوں بچے لان میں اتر گئے۔

بچی نے اپنی گڑیا لان میں پڑی کین کی کرسیوں میں سے ایک پر پھینک دی۔ اور بھائی کے پیچھے بھاگنے لگی جو سائیکل گول چکر میں چلائے جا رہا تھا۔ شگو کو خوبصورت لباسوں میں ملبوس پیارے پیارے بچوں کو دیکھ کر شاذ آپا کے بچوں کا خیال آ گیا۔

کتنا فرق تھا ان بچوں اور ان بچوں میں ———

شکلیں تو ان کی بھی بری نہ تھیں۔

لیکن لباس ——— ! ہمیشہ ہی ناکافی ——— لڑکوں کی گھٹنوں تک چھوٹی ڈھیلی ڈھیلی نکریں۔ بے رنگ جرسیاں ——— ان دھلے چہرے۔ جرابوں سے بے نیاز جوتے۔ گھسے پھٹے چپل ——— بوسیدہ ربڑ کے بوٹ، لڑکیوں کے چھینٹ اور کاٹن کے گھر سلے کپڑے۔

وہ جانے اور کیا کچھ سوچ جاتی۔ کہ ملازم آ گیا۔

"آجائیں بی بی ——— ڈاکٹر صاحبہ بلا رہی ہیں ———"

وہ خیالات سے چونکی۔

سر اثبات میں ہلایا۔ دوپٹہ درست کیا۔ بیگ ٹھیک سے کندھے پر لٹکایا اور ملازم کے پیچھے پیچھے گھر کے اندرونی دروازے کی طرف چل دی۔

ڈاکٹر سعدیہ لاؤنج میں ایک صوفے پر بیٹھی تھی۔ پینتیس چھتیس سالہ سمارٹ سی عورت تھی۔

اس وقت سادہ سے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کالی کشمیری کڑھائی والی شال اوڑھے ہیٹر کے سامنے صوفے پر بیٹھی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔ پچھلے لان کی طرف شیشے کی بڑی سی دیوار تھی۔ جس کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ اور عقبی لان کا منظر نظر آ رہا تھا۔

وہاں بھی گھاس کے مخمل فرش پر کرسیاں پڑی تھیں اور گھنے گھنے درختوں پھولدار بیلوں اور کیاریوں میں لگے موسمی پھولوں سے بڑا سہانا منظر نظر آ رہا تھا۔ سنہری دھوپ ہر چیز پر پھیلی تھی۔

نکھار ہی نکھار تھا ———

لاؤنج بڑی آراستہ پیراستہ تھی۔ صاف ستھری آرائشی چیزیں۔ کارپٹ فرنیچر ڈیک وی سی آر۔ ہر چیز قرینے اور نفاست کا منہ بولتا ثبوت تھی ——— لاؤنج ہی سے ڈرائینگ روم کا در نظر آتا تھا۔ جو کھلا تھا۔ اور ڈرائینگ روم کا کچھ حصہ لاؤنج میں سامنے والے صوفے پر بیٹھنے سے نظر آتا تھا ڈرائینگ روم جہاں تک شگو دیکھ سکی بڑا ہی خوبصورت تھا۔ خوبصورتی میں اضافہ ان

قدرتی پودوں سے بھی ہو رہا تھا جو کین کی ٹوکریوں میں نفاست سے
ہوئے تھے۔

شگو مسحور سی نظر آ رہی تھی۔ اس کا تصور ان ساری چیزوں سے
مطابقت رکھتا تھا ___ ایسے لگ رہا تھا ___ وہ اسی فضا کی اسی ا
اسی گھر کی متلاشی ہے۔

"اؤ تم ہو ___"

ڈاکٹر سعدیہ نے شگو کے سلام کرنے پر میگزین ایک طرف ر
ہوتے اسے دیکھ کر کہا۔

"جی ___" وہ انکساری سے بولی۔

"آؤ بیٹھو ___" ڈاکٹر سعدیہ نے اپنے قریب صوفے پر ہا
ہوئے اشارہ کیا۔

شگو آگے بڑھ کر ڈاکٹر کے قریب بیٹھ گئی۔

"کیسے آئیں ___ ہاں تمہارا رزلٹ تو نکل گیا۔ پاس ہو گئی ہو نا؟

"جی ___"

"گڈ ___ اب کیا کر رہی ہو ___"

"ابھی تو کچھ نہیں کر رہی ___"

"جاب کے لئے کہیں ٹرائی نہیں کی ___"

"کی ہے ___"

"ہوں ___"

ڈاکٹر سعدیہ نے سر ہلایا ___

پھر وہ موسم کی باتیں کرنے لگی ___

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد سعدیہ نے کہا۔ "کیسے پہنچی ہو میرے گھر۔
پتہ معلوم تھا ___"

"جی ___"

"اکیلی آئی ہو ___"

"نہیں ___"

"ساتھ کوئی آیا ہے ___"

اس کی بجائے ملازم بولا۔

"ایک صاحب ساتھ ہیں ___ باہر کھڑے ہیں ___"

"میرے کزن ہیں ___" شگو بولی۔

"تو انہیں باہر کیوں کھڑا کر آئیں بلا لو نا ___"

شگو کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ڈاکٹر نے ملازم سے کہا۔

"جاؤ انہیں بلا لاؤ ___"

"اچھا صاحب ___"

"اور ہاں آ کر چائے بنا لاؤ ___"

"جی بہت اچھا ___"

ملازم کے جانے کے بعد سعدیہ پھر شگو سے باتیں کرنے لگی۔ وہ بڑی
مشفق اور خوش اخلاق خاتون تھی۔ شگو کے ساتھ تو اس کا رویہ ہمیشہ ہی دوستانہ

ہونا تھا۔

شگو نے شبنم پولی کلینک والی جاب اور انٹرویو کال کا اسے بتایا۔

"میں آپ کے پاس اسی سلسلے میں آئی ہوں ـــ آپ میری ہیلپ کر
تو ـــ"

ڈاکٹر سعدیہ نے انٹرویو کال دیکھی تو ہنستے ہوئے بولی۔

"شیگی تمہارا کام بن جائے گا ـــ"

"جی ـــ جی ـــ" شگو کو یقین نہیں آیا۔

سعدیہ نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

"کہہ دیا نا تمہارا کام ہو گیا ـــ"

"کیا سچ ـــ"

"شیگی ـــ یہ نرس کی جاب ـــ"

"جی ـــ"

"ڈاکٹر آصف کو نرس کی ضرورت ہے ـــ"

"جی ـــ"

"جی ڈاکٹر آصف میرے میاں ہیں ـــ" وہ ہنس کر بولی۔

"واقعی ـــ"

"بالکل ـــ بہت لکی ہو تم ـــ یہ انٹرویو کال تمہیں آ گئی۔ آصف کو چاق و چوبند اور فرض کی سنجیدگی سے ادائیگی کرنے والی نرس کی ضرورت ہے۔ اور تم میرے خیال میں اس معیار پر پورا اترو گی۔"

"شکریہ ڈاکٹر ـــ میں پوری لگن اور محنت اور لگن سے کام کروں گی۔"

"میں ابھی تمہیں آصف سے ملوا دوں گی ـــ"

ملازم کے ساتھ طاہر اندر آ گیا ـــ

"آؤ بھئی تم باہر کیوں کھڑے تھے ـــ" ڈاکٹر سعدیہ نے طاہر سے خوش اخلاقی سے کہا۔

طاہر نے مؤدبانہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے سلام کیا اور قدرے پرے رکھی فوم کی گدیوں والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

ملازم چائے بنانے چلا گیا۔

اور ڈاکٹر سعدیہ اٹھ کر دائیں ہاتھ والے کے اندر چلی گئی ـــ یہ شاید اس کا بیڈ روم تھا ـــ

اندر سے ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ کوئی خوبصورت دھن بج رہی تھی ـــ ریڈیو یا ٹیپ پر ـــ"

اس کے اٹھتے ہی طاہر نے اشارے سے پوچھا۔

"کیا بنا ـــ"

"ہو گیا کام ـــ" وہ ہولے سے خوش ہو کر بولی۔

"واقعی ـــ"

"ہاں ـــ"

"یقین دلا دیا ڈاکٹر نے ـــ"

"بالکل ـــ ان کے شوہر ہی کو تو چاہیئے نرس ـــ"

"اچھا ——"

"ہاں —— ڈاکٹر آصف شبنم کلینک میں ہی ہوتے ہیں۔ کینسر کے کیس ان کے پاس آتے ہیں ——"

طاہر گردوپیش دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

پھر بولا۔

"کتنا خوبصورت گھر ہے۔ لگتا ہے جنت کا گوشہ ہے ——"

"واقعی ——"

شگو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ تھوڑی دیر ہوئے ہوئے اور اشاروں میں باتیں کرتے رہے۔

پھر ——

ڈاکٹر سعدیہ اندر سے نکل آئی۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر آصف تھے جنہوں نے سواتی چغہ پہن رکھا تھا —— بڑے پروقار سنجیدہ اور مدبر لگ رہے تھے ——

آصف نے دونوں پر نگاہ ڈالی۔ سلام کا جواب دیا۔ طاہر نے اٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔

"بیٹھو ——"

ڈاکٹر خود بھی ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

سعدیہ کچن میں چلی گئی ——

نوکر کو چائے اور دیگر لوازمات لانے کا کہہ کر واپس آ گئی۔ ڈاکٹر آصف

شگو اور طاہر سے باتیں کر رہے تھے۔

سعدیہ نے شگو کا بہ حیثیت نرس آصف سے تعارف کروایا۔ اس کی خوب تعریف کی۔

ٹریننگ کے دوران ہونے والی ملاقاتوں کا ذکر کیا۔

آصف نے شگو سے نرسنگ کے متعلق چند سوالات کئے۔ شگو نے اندر ہی اندر پھیلتی گھبراہٹ کے باوجود تسلی بخش جواب دیئے۔

ڈاکٹر سعدیہ نے آصف سے بڑی زوردار سفارش کی۔

شگو مطمئن ہو گئی ——

ملازم چائے کی ٹرالی لے آیا۔ نفیس برتن —— نیکن ٹی کوزی ہر چیز صاف ستھری تھی۔ ڈرائے فروٹ گولڈن کناروں والی شیشے کی کٹوریوں میں تھا —— بسکٹ بھی انہی کے ڈیزائن کی پلیٹ میں تھے۔

سعدیہ نے چائے بنا کر سب کو دی۔ ایسی نازک اور خوبصورت پیالی پکڑتے ہوئے شگو کو ڈر لگا کہیں ہاتھ سے پھسل کر ٹوٹ نہ جائے۔ ویسے اس پیالی میں چائے پینے کا لطف ہی تو آگیا۔

چائے کے دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

"آپ ان کے بھائی ہیں ——" ڈاکٹر آصف نے طاہر سے پوچھا۔ طاہر کے ہاتھ سے پیالی ڈول گئی۔

شگو جلدی سے بولی۔

"جی میرے کزن ہیں ——" طاہر اس پر اک مسحور سی نگاہ ڈال کر مسکرا دیا۔

سعدیہ اور آصف دونوں کو دیکھ کر مسکرائے۔ سعدیہ بولی۔ "کزن

شاید کچھ اور بھی ہیں ——"

وہ ہنس پڑی۔

"منگیتر ——" طاہر نے اس کی بات کا جواب ہولے سے دیا

شگو جیسے اچھل پڑی۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ گھور کر اس نے طاہر کو دیکھا

نے اس کی طرف دیکھے بغیر بسکٹ اٹھالیا۔

سعدیہ اور آصف مسکرانے لگے۔

کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔

پھر ڈاکٹر آصف اٹھتے ہوئے بولے۔ "یوں کرو —— مس ——

"شیگی ——" سعدیہ نے کہا۔ "اس کا نام شگفتہ ہے۔ شی

نک نیم ہے ——"

"ہوں —— تو مس شگفتہ —— آپ یوں کریں کہ کل —— آپ

پانچ بجے کلینک آجائیں —— میں ڈاکٹر سمیع سے آپ کو متعارف کروا دوں

اور اپنی مسز کی خاطر سفارش بھی کر دوں گا۔ ویسے بھی آپ میرے

پورا اتر رہی ہیں۔ کل شام پانچ بجے آجانا ——"

"جی بہت اچھا ——" شگو بھی اٹھتے ہوئے بولی۔

طاہر اور سعدیہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

ڈاکٹر نے اسے تسلی دی۔ جاب دلانے کا وعدہ کیا۔ شگو شکریہ ادا

لگی۔ ڈاکٹر آصف بولے۔ "جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے تمہیں سب

مجھے سمارٹ خوش خلق اور خوش شکل نرسیں اچھی لگتی ہیں۔ مریضوں پر نرسوں کی
شخصیت اور رویے کا بہت اثر پڑتا ہے۔ خیر ڈاکٹر سمیع مالک و مختار ہیں۔
کل آجانا۔ بات کریں گے۔"

وہ شیشے کی دیوار کے پار اپنے لان کو دیکھنے لگے پھر بولے۔

"یقیناً تمہیں یہ جاب مل جائے گی ——"

شگو نے شکریہ ادا کیا اور جانے کی اجازت لی۔ اس نے دیکھا ڈاکٹر کی باتوں
سے طاہر کا موڈ کچھ بدل سا گیا تھا۔

طاہر نے سکوٹر اسٹارٹ کیا۔ شگو جم کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ آپوں آپ
نے ہاتھ طاہر کے کندھے پر رکھ دیا۔ جھجک جو آنی دفعہ محسوس ہوتی تھی اب
ہو گئی تھی۔

"چلو ——" وہ بولی۔

طاہر چل پڑا —— شگو خوبصورت کوٹھیاں اور بنگلے دیکھ رہی تھی کوٹھیوں
پورچوں میں چمکتی گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ کسی کسی بنگلے میں تو تین تین گاڑیاں
تھیں۔ کسی کوٹھی سے نئے ماڈل کی گاڑی نکل رہی تھی۔ کسی کے اندر گاڑی جا رہی تھی
چمنوں میں خوبصورت گرم لباسوں میں ملبوس بچے کھیلتے دکھائی دے رہے تھے
کسی لان میں ماڈرن سی لڑکیاں نظر آرہی تھیں۔

کسی میں سنجیدہ سنجیدہ عمر کے بزرگ بھی بچوں کے ساتھ باتیں کر رہے تھے
بیرے خانسامے اور ملازم ٹائپ مرد بھی کوٹھیوں کے اندر اور باہر چلتے پھرتے
دکھائی دے رہے تھے۔

بھنگیں بھی صفائی میں مصروف دکھائی دے رہی تھیں۔ طاہر سکوٹر چلا رہا
تھا۔ وہ چپ تھا۔

شگو کو ایک دم ہی اس کی چپ کا احساس ہوا۔

"طاہر ——"

وہ چپ رہا۔

"اے ——"

"کیا ہے ——"

"چپ کیوں ہو ——"

"کیا کروں ——"

"باتیں ——"

وہ کچھ نہیں بولا۔

شگو اپنا چہرہ اس کے کندھے کے قریب لاتے ہوئے بولی۔

"کس بنگلے کا نقشہ پسند آیا ——"

"سب ہی اچھے ہیں ——"

"بعض تو بہت ہی اچھے ہیں ——"

"ہاں ——"

"ڈاکٹر سعدیہ کا گھر کتنا پیارا ہے ——"

"ہوں ——"

"دونوں میاں بیوی ڈاکٹر ہیں۔ بہت کماتے ہیں۔ ویسے دونوں باذوق بھی

لگتے ہیں۔ لاؤنج اتنی خوبصورتی سے آراستہ تھی۔ باقی سارا گھر بھی تو ایسا ہی ہوگا۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا سارا گھر گھوم پھر کر دیکھوں ——"

"دیکھ لیتیں —— حسرت تو نہ رہتی ——"

"حسرت تو رہے گی طاہر صاحب —— جب تک اسی طرح کا گھر نہیں بن جاتا ——"

وہ کچھ نہیں بولا۔

شگو تصوراتی دنیا میں ڈوبتے ہوئے بولی "کاش مجھے بھی میڈیکل میں داخلہ مل جاتا"

"ڈاکٹر بن جاتیں ——" طاہر نے کہا۔

"نیت تو اب بھی ہے ——"

"نرسنگ تو آزما لو پہلے ——"

"وہ تو جاب مل جائے گی۔ میں نے سوچ رکھا ہے۔ کچھ عرصہ نوکری کر کے پیسہ جمع کروں گی۔ پھر میڈیکل میں داخلہ لے لوں گی۔"

"ڈاکٹر بن کر پیسہ بنانے کی مشین بننے کا ارادہ ہے ——"

"پیسے بنانے کی مشین بڑی کارآمد ہوتی ہے طاہر —— ارد گرد دیکھو۔ یہ شاندار کوٹھیاں —— یہ قیمتی کاریں —— یہ ساز و سامان —— پیسے سے ہی آتا ہے ——"

"ہوں ——"

"زندگی کا مزہ پیسے سے ہی ہے طاہر —— کیا ٹھاٹھ ہیں پیسے والوں کے؛

"ہوں ——"

"میں تو ڈاکٹر سعدیہ کے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ یونہی شائستہ آپا کے بچوں کا خیال آگیا۔ وہ بھی بچے ہیں اور یہ بھی ——"

"بہت پیارے اور شائستہ بچے تھے ڈاکٹر سعدیہ کے ——"

"امیر والدین کے بچے تھے نا ——"

"ہاں ——"

"آپا کے بچوں کو دیکھا ہے —— انہیں صاف ستھرا تو کبھی دیکھا ہی نہیں اچھے کپڑے کبھی پہن بھی لیں تو جچتے نہیں ان پر —— پتہ نہیں کس طرح کے ہیں وہ ——"

"ہیں تو اسی طرح کے —— بس رہن سہن کا فرق ہے۔ مس شگی صاحبہ"

"پھر ہوئی نا پیسے کی اہمیت ——"

"اس سے انکار کون کر سکتا ہے ——" طاہر بولا۔

"لیکن ——"

"ہمارے طبقے کے لوگ اس حقیقت کو جاننے سے بھی تو گریز کرتے ہیں ——"

"احمق ہیں ——"

طاہر اس ہری بھری لین سے نکل کر بڑی سڑک پر آگیا۔ یہاں تیز تیز ٹریفک تھی۔ گاڑیاں ویگنیں ٹرک ٹیکسیاں رکشے سکوٹر تانگے ریڑھے آ جا رہے تھے ——

سڑک کے کنارے کنارے پیدل چلنے والے بھی تھے مصروفیت، بھاگ دوڑ لگی ہوئی تھی۔

"دعا کرو طاہر مجھے یہ جاب مل جائے ــــ" شگو نے اُمید افزا لہجے میں کہا۔

"ڈاکٹر آصف نے تو سلیکٹ کر لیا ہے نہیں ــــ" وہ چھپے چھپے لہجے میں بولا۔

"لیکن جاب تو ڈاکٹر سمیع دیں گے ــــ"

"ڈاکٹر آصف سفارش کریں گے۔ بڑی پرزور ــــ بڑی پرجوش۔"

"کیا مطلب ــــ"

وہ چند لمحے چپ رہا ــــ

پھر تلخ لہجے میں بولا ــــ

"اسے خوش رو۔ خوش خلق اور سمارٹ نرسیں اچھی لگتی ہیں نا ــــ"

"اوہ ــــ"

شگو تفاخر سے مسکرائی۔

"بہت بری لگی مجھے اس کی یہ بات ــــ"

"سچی ــــ"

"ہاں ــــ"

"اسی لئے منہ بنایا تھا ــــ"

"کیوں نہ بناتا ــــ"

"بے وقوف ہو ــــ"

"کیوں ــــ"

"ڈاکٹر کی پوری بات نہیں سنی تھی ــــ"

"کیا ــــ"

"وہ کہہ رہے تھے ــــ نرسوں کی شخصیت اور رویے کا مریضوں پر اثر پڑتا ہے ــــ"

"ہونہہ ــــ"

"اپنے لئے تو نہیں کہہ رہے تھے وہ ــــ"

"جانے دو ــــ"

"طاہر ــــ"

"ہوں ــــ"

"کیسی باتیں کر رہے ہو ــــ"

"بری لگتی ہیں ــــ"

"طاہر ــــ"

"ہوں ــــ"

"اتنی رکھائی اور تلخی سے مت بولو ــــ"

"بہت اچھا ــــ"

"طاہر ــــ"

"میں ناراض ہو جاؤں گی ــــ"

وہ چپ رہا ــــ

شگو بولی ۔

" اتنی سی بات سے برا مان گئے ۔ بھئی مجھے تو دن رات مردوں کے
رہنا ہو گا۔ ڈاکٹروں سے مریضوں سے کلینک میں مریضوں کے ساتھ ان
لواحقین سے نپٹنا ہو گا ــــ یہ تو میرے پیشے کا تقاضہ ہے۔ تم تو ذرا
ہی سے منہ پھلا بیٹھے ــــ آگے کیا ہو گا ــــ ہوں ــــ "

وہ پھر بھی چپ رہا ــــ ۔

" دل بڑا کیجئے حضرت ــــ " شگو اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ
ڈالا۔ پھر وہ خود ہی ہنس پڑی ۔

" حاسد کہیں کے ــــ "

" بس مجھے غصہ آ گیا تھا ــــ "

" اب اتر گیا ــــ "

" تھوڑا تھوڑا ــــ "

شگو کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔

چند لمحے خاموشی سے گزر گئے ۔

اب دونوں مال روڈ پر آ گئے ۔

یہاں بھی کافی رونق تھی ۔ بڑی بڑی دکانوں پر خریداری ہو رہی تھی ، شام کو
بہت رش ہوتا تھا ۔ اس وقت رش تو نہیں تھا پھر بھی کافی گہما گہمی
بھیڑ تھی ۔ مال روڈ سے ہوتے دونوں بیرونی سڑک پر آ گئے ۔ جو نسبتاً کم

" طاہر ــــ " شگو نے بڑے دلار سے اس کا نام لیا ۔

" ہوں ــــ "

" کل بھی چلو گے میرے ساتھ ــــ "

" کہاں ــــ "

" شبنم کلینک ــــ ڈاکٹر آصف نے بلایا ہے کل شام ــــ "

" میں نہیں جاؤں گا ــــ "

" کیوں ــــ "

" ایسے ہی ــــ "

" یہ کیا بات ہوئی ــــ "

" بابا ــــ پھر تمہارے کسی ڈاکٹر نے تمہاری تعریف کر دی تو ــــ "

" موڈ آف ہو جائے گا ــــ "

" ہاں ــــ "

شگو ہنس پڑی ۔

طاہر بولا ــــ

" میں برداشت نہیں کر سکتا شگو ــــ "

" کیا ــــ "

" کوئی دوسرا مرد تمہاری اس بے باکی سے تعریف کرے "

" طاہر ــــ تم تو ذرا سی بات کو خواہ مخواہ بڑھا رہے ہو ــــ "

" شگو ــــ "

"ہوں ——"

"سچ کہوں —— تو مجھے کبھی کبھی بڑا خوف آتا ہے ——"

"کس بات سے ——"

"تمہیں —— تمہیں کوئی —— مجھ سے چھین نہ لے ——"

شگو چپ ہوگئی ——

"پیسے کی اہمیت میں بھی تسلیم کرتا ہوں۔ کوٹھی کار بینک بیلنس کی خو
مجھے بھی ہے —— لیکن ——"

"لیکن کیا ——"

"لیکن ڈر لگتا ہے —— کہ یہی چیزیں میرے اور تمہارے درمیان ——"

"طاہر ——" شگو نے اپنے ہاتھ کی گرفت اس کے کندھے پر سخت کر دی۔ "تم ایسی بات ذہن میں لاتے ہی کیوں ہو ——"

"خود بخود آجاتی ہے اور کبھی کبھی تو بے طرح پریشان بھی کرتی ہے:"

"میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ زندگی کی جس آسائش آسودگی اور شان کا میں نے تصور کیا ہے، اس کا محور ہمیشہ تم رہے ہو"

"سچ شگو ——"

"یقین کیوں نہیں آتا ——"

"پتہ نہیں ——"

"کیسے یقین دلاؤں ——"

"میں نہیں جانتا ——"

"یہ فضول سے وہم ذہن سے نکال دو ——"

"کوشش تو بہت کرتا ہوں —— لیکن —— کبھی کبھی ——"

"شاید اس لئے —— کہ —— کہ —— تم نہیں —— جانتے —— میرے لئے کیا ہو ——"

"کیا ہوں ——"

وہ دھیمی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "ایک گانا ہے۔ تم نے بھی سنا ہوگا۔

"تمہیں میری منزل تمہیں میری پوجا۔ تمہیں دیوتا ہو —— تمہیں —— دیوتا ہو"

شگو نے اس کے کندھے سے سر لگاتے ہوئے دھیمے سروں میں یہ مصرع گنگنایا۔

"سچ شگو ——" وفور مسرت سے بے تاب ہو کر طاہر نے گردن موڑ کر اسے دیکھنا چاہا۔

لیکن ——

اس کا چہرہ دیکھ نہ سکا۔ ہاں اس کا چہرہ اپنے کندھے کے ساتھ محسوس کر کے سرشار ہوگیا۔

"مامی ــــ ما ــــ می ــــ" صبیحہ نے جنگلے سے آدھا دھڑ
لٹکاتے ہوئے زوردار آہستگی سے آواز دی۔

جواب نہ پاکر وہ سیدھی کھڑی ہوئی۔ پھر سے مامی کو پکارا اور پلک کر زینے
کی طرف آئی ــــ

"مامی ــــ" اس کی آواز میں شوق بھری گھبراہٹ اور گھبراہٹ آمیز
تجسس تھا ــــ

وہ دھڑ دھڑ کرتی سیڑھیاں اتر کر نیچے صحن میں آ گئی۔

"مامی ــــ" اس نے تہمینہ کو کمرے سے صحن میں آتے دیکھ کر…

"کیا ہے صبو ــــ" تہمینہ نے پوچھا۔

"بڑی جلدی میں ہو کیا ــــ"

"ہاں مامی ــــ"

وہ بھاگ کر اس کے قریب آ گئی۔ سانس پھولا پھولا تھا اور آنکھوں میں…

…پک تھی۔ نیلی اور سرخ چارخانی شال اس نے کندھوں پر ڈال رکھی تھی۔
…بٹ کا قرمزی سوٹ سلا ہوا تھا۔ لنڈے سے ڈھونڈ کر خریدی ہوئی سویٹر
…بھی نئی لگ رہی تھی۔ اس نے پاؤں میں اسفنجی چپل پہنے ہوئے تھے چہرے
…ر سرخی جھلک آئی تھی۔

"خیر تو ہے ــــ"

تہمینہ کے ہاتھ میں سلی ہوئی فلالین کی قمیض تھی۔ وہ مشین پر ہی بیٹھی تھی۔
…بو کی آواز سن کر باہر آئی تھی۔

"خیر ہی ہے مامی ــــ"

"امی نے آپ کو بلایا ہے ــــ" وہ جلدی سے بولی۔

"مجھے بلایا ہے ــــ"

اس نے سوئی قمیض میں ٹانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ــــ وہ ــــ وہ لوگ پھر آئے ہیں ــــ پھر آئے ہیں مامی
امی نے آپ کو بلایا ہے ــــ" مارے شوق اور تجسس کے اس کے منہ
سے پوری بات نہ نکل رہی تھی۔

"وہ ــــ وہ کون ــــ"

"اے ہے ــــ مامی وہ لوگ جو ربیعہ آپا کے رشتے کے لئے
پچھلے ہفتے آئے تھے ــــ"

"اچھا ــــ اچھا ــــ"

"گھر پہ کوئی بھی نہیں ہے بازار جانے والا۔ امی نے آپ کو بلایا ہے ان

کی خوب خاطر داری کرنا ہے۔ چیزیں منگوائی ہیں بازار سے ــــ"
کہاں ہے ــــ"

تہمینہ ہولے سے مسکرا دی۔ پھر اس کے سر پر شفقت سے
ہوئے بولی۔

"لگتا ہے ربیعہ کے رشتے میں تمہاری وجہ ہی سے دیر ہو رہی"

"میری وجہ سے ــــ"

"ہاں ــــ"

"وہ کیسے ــــ"

"بھئی شاید اسی لئے کہیں ہو نہیں پاتا تھا۔ کہ دونوں بہنوں کا ایک
ہی گھر میں ــــ"

"کیا ــــ امی ــــ"

"تیرا بھی رشتہ مانگ رہے ہیں ــــ"

"ہائے نہیں امی ــــ"

وہ وفور جذبات سے امی سے لپٹ گئی۔

"تجھے بتایا نہیں کسی نے ــــ"

تہمینہ اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے سامنے
ہوئے مسکرائی۔

صبو نے شرما کر مسکرا کر سر جھکا کر کہا۔

"نہیں ــــ"

تہمینہ ہنس پڑی۔

"چلو اچھا ہے دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں جاؤ گی۔ لوگ تو بہت اچھے ہیں۔
پیسے والے بھی ہیں، خدا تم دونوں کا نصیب اچھا کرے"

"اچھا امی ــــ چلیں نا ــــ"

"تو چلیں میں آتی ہوں ــــ کپڑے بدل لوں۔ بالکل ہی میلے ہو گئے ہیں"

"ہاں ــــ ہاں بدل لیں۔ یہ دوپٹہ بھی میلا ہو رہا ہے اور ہاں امی شگو کو
پوچھ رہی تھی میں ــــ"

"وہ سامنے ملک صاحب کے ہاں گئی ہے ــــ اس کی بیگم نے
بلا بھیجا تھا ــــ"

"اچھا تو میں چلتی ہوں آپ آجائیں ــــ"

"کون کون آیا ہے ــــ"

"پتہ نہیں ــــ دو تین عورتیں ہیں اور دو مرد دو تین بچے ــــ"

"مرد بھی ہیں ساتھ ــــ"

"ہاں شاید لڑکے کا ابا اور بھائی ہیں ــــ"

تہمینہ ہنس کر اس کے سر پر ہولے سے چپت لگاتے ہوئے
بولی۔ "لڑکے کا نہیں لڑکوں کا ــــ"

"ہائے امی ــــ" وہ شرما کر سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔

تہمینہ اندر مڑی۔ کھونٹی کے ساتھ ساٹن کی کریم کلر شلوار اور پھولدار قمیض
لٹک رہی تھی۔ اس نے دروازہ بھیڑا۔ اور جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگی۔

کپڑے بدل کر اس نے بالوں میں کنگھا کیا۔ ربڑ کے چپل اتار کر اکلوتی
ایڑھی کی جوتی پہنی۔ سگو کا کالا سویٹر بھی کھونٹی پر لٹک رہا تھا۔ وہ بھی اتار کر
بکس میں سے سفید بارڈر والی شال نکالی۔

سفید پوشی کا بھرم تو وہ ہمیشہ ہی رکھتی رہی تھی۔ آج تو خاص بات تھی۔
کے لئے لوگ آئے تھے۔ انہیں اچھا تاثر دینا ضروری تھا۔ وہ ڈیوڑھی
کنڈی اندر سے چڑھا کر سیڑھیوں کی طرف آ گئی ــــ چھت سے ہی
کے ہاں جانا تھا۔

رشیدہ کے تو خوشی اور گھبراہٹ سے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے
تھے۔ آج وہ لوگ باقاعدہ رشتہ لینے کے لئے آئے تھے۔ ایک پھل
ٹوکری اور دو کلو مٹھائی کا ڈبہ شگن کے طور پر ساتھ لائے تھے۔ رشیدہ
کی طرف لپکی۔

"بھابی آج وہ لوگ رشتہ لے کر ہی جائیں گے ــــ"

"حرج کیا ہے ــــ" تہمینہ بولی۔ "شکر کر خدا کا اتنے اچھے لوگ
گئے ہیں اور ایک کا نہیں دونوں کا رشتہ اتنی چاہت اور خواہش سے
مانگ رہے ہیں۔"

"چاہت کا اظہار تو بہت ہی کر رہے ہیں ــــ"

"پھر کیا سوچنا ــــ ان لوگوں کے متعلق پوری چھان بین تو رفیق بھائی
نے کر ہی لی ہے ــــ"

"وہ تو ہے ــــ جس سے پوچھا بہت تعریف کی ان کی ــــ"

"اتنا ہی کرنا ہوتا ہے ــــ باقی سب تو اللہ کے سپرد ہوتا ہے۔"

رشیدہ نے سر اثبات میں ہلایا۔ پھر بولی۔

"بھابی گھر پہ کوئی بھی نہیں ہے ــــ دوپہر کا کھانا تو کھلانا پڑے گا انہیں۔"

"چائے وائے پلائی۔"

"ہاں بھجوائی ہے۔ اب کھانے کا سوچ رہی ہوں ــــ طاہر کے ابا کو
بھی بلانا ہے ــــ"

"یوں کرتی ہوں کہ سیدھی دکان پر ہی چلی جاتی ہوں۔ رفیق بھائی بھی آ جائیں
گے اور دوپہر کھانے کا بندوبست بھی کر لیں گے۔ چرغے ورغے لے آئیں
گے۔ ایک ہانڈی تو پکائی ہی ہو گی۔"

"بس آپ طاہر کے ابا کو بلا لائیں۔ سب کچھ لے آئیں گے۔"

"جاتی ہوں ــــ تم جا کر بیٹھو ان کے پاس ــــ لڑکیاں کر لیں گی
سب کچھ ــــ"

"وہ تو کر لیں گی ــــ آپ جائیں جلدی سے بلا لائیں انہیں ــــ رکشے
پر ہی جائیں ــــ"

"تم فکر نہ کرو میں ابھی گئی ــــ اور ابھی آئی ــــ تم جاؤ مہمانوں کے
پاس ــــ"

"آپ ــــ"

"میں پہلے دکان پہ ہو آؤں۔ پھر آؤں گی اندر ــــ"

"اچھا ــــ"

رشیدہ بیٹھک میں چلی گئی۔

تہمینہ بھی ڈیوڑھی کی طرف مڑی۔

"مامی ——" باورچی خانے سے ربیعہ نکل آئی۔

تہمینہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی، اس خوشی میں حیا کا عنصر بھی شامل تھا۔ گو پچیس چھبیس سال کی ہو رہی تھی، لیکن اس وقت بالکل نوعمر سی لڑکی لگ رہی تھی۔

اس نے نیلا فلیٹ کا پھولدار سوٹ پہن رکھا تھا اور رشیدہ کی کریم ک... اوڑھ رکھی تھی۔

"کیا ہے بیٹی ——" تہمینہ نے پوچھا۔

"مامی —— اباجی سے کہیں گھی کا ڈبہ بھی لیتے آئیں۔" اس نے ... کے انداز میں کہا۔

"بالکل تھوڑا سا ہے —— ایک ہانڈی کا ——"

"اچھا ——"

"پھل بھی ادھر ہی سے لیتے آئیں۔ گوشت مل جائے تو وہ بھی۔ گھر پھر جائیں گے تو دیر ہو جائے گی کھانے کو ——"

"یہ بھی ٹھیک کیا تو نے ——"

"چاول گھر پہ ہیں آپ کے آنے تک میں چن کر بھگو دوں گی، اور ——"

"اور کیا ——"

"کھیر بنا لوں مامی ——"

"ضرور بنا لے —— دودھ ہے نا ——"

"وہ میں شفیع سے منگوا لیتی ہوں ——"

"چل پھر جلدی کر —— چاول نکال —— صبیحہ کدھر گئی —— اسے بھی ساتھ لگا لے ——"

"وہ شگو کو سامنے والے سے بلانے گئی ہے۔"

"اچھا ——"

تہمینہ چادر کی بکل ٹھیک سے مارتے ہوئے ڈیوڑھی کی طرف بڑھ گئی۔ ربیعہ پھر باورچی خانے میں چلی گئی۔

آج وہ بہت خوش تھی۔ رواں رواں گنگنا رہی تھی جیسے ایک بار منگنی ٹوٹ جانے کے بعد جو بھی رشتہ آیا پلٹ کر لوٹا نہیں —— یہ لوگ تیسری بار آئے تھے —— اور آج تو اس نیت سے آئے تھے کہ رشتہ طے کر کے ہی اٹھیں گے ——

تہمینہ کو جلدی تھی۔ پیدل جانے دیر ہونے کا امکان تھا۔ بازار میں آئی تو رکشہ مل گیا۔ اس بھرے پرے بازار میں سواری ملنا مشکل نہ تھی۔ بسیں ویگنیں رکشے تانگے سبھی مل جاتے تھے۔

رکشے والے کو دکان اور بازار کا پتا بتا کر اس نے کہا۔

"ذرا جلدی چلنا بھائی ——"

"بہت اچھا ——" رکشے والے نے کہا۔

دس منٹ میں رکشہ رفیق کی دکان پر پہنچ گیا۔ تہمینہ پیسے دے کر دکان

میں آگئی۔

رفیق کسی گاہک سے بات کر رہا تھا۔ تہمینہ کو دیکھ کر چونکا۔ بات اُدھوری چھوڑ کر بولا۔

"کیسے آئیں بھابی ——"

"تمہیں بلانے آئی ہوں رفیق بھائی۔ مہمان آئے ہیں گھر پہ ——"

"مہمان ——"

"اے وہی رشتے والے —— آج ان کے مرد بھی آئے ہیں۔ کچھ دیر کے لئے گھر چلو ——"

"اچھا ——"

وہ اپنے ملازم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جو اب گاہک کو کپڑا دکھا رہا تھا۔

"اسلم —— میں گھر جا رہا ہوں۔ تم ان صاحب کو ساری ورائٹی دکھا دینا"

"اچھا جی ——"

رفیق کاؤنٹر کے گرد گھوم کر باہر نکل آیا تہمینہ بھی قریب آگئی جس جس چیز کی ضرورت تھی اسے بتا دی۔

"میں آپ کو پھل لے دیتا ہوں۔ آپ جلدی سے لے جائیں۔ باقی چیزیں میں لے کر ابھی آیا۔ آپ دکان ہی میں بیٹھیں۔ میں اس ریڑھی والے سے پھل لے آؤں ——"

تہمینہ بنچ پر بیٹھ گئی۔

رفیق پھل لینے چلا گیا۔

سیل مین نے گاہک کو کپڑا دے دیا اور پیسے لے کر گلے میں ڈال دیئے۔

گاہک کپڑے کا پیکٹ لے کر دکان سے نکل گیا اس کے نکلنے سے پہلے ہی دو عورتیں خریداری کے لئے آگئیں۔ اسلم ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

تہمینہ کے بیٹھے بیٹھے ہی اسلم نے کم از کم پانچسو روپے کا کپڑا بیچا رفیق کا کاروبار خاصہ چل رہا تھا۔ تہمینہ کو دلی خوشی ہوئی۔

شائستہ بمعہ بچّوں کے آئی ہوئی تھی۔ آئی تو چند گھنٹوں کے لئے تھی، لیکن اماں نے دو دن کے لئے روک لیا۔ شگو نے بھی اصرار کیا تو وہ رک گئی۔ بچوں نے خوب ادھم مچایا۔ امّاں نے بھی سنگترے مالٹے اور مونگ پھلی لا لاکر ان کے سامنے ڈال دی۔

بچّے چھپٹ جھپٹ کر اڑتے رہے۔ سارے گھر میں چھلکے ہی چھلکے نظر آرہے تھے۔ شگو دن میں تین چار بار جھاڑو لگا چکی تھی، لیکن صفائی ستھرائی رہتی کیونکر روکا تو اس نے بڑے اصرار سے منع بچوں کو ــــ لیکن دوسرے دن ہی اکتا گئی تھی ــــ

"اللہ کرے مرجاؤ تم سب کے سب ــــ" اس نے دوسرے دن بھی جب تیسری بار جھاڑو لگایا۔

اور ابھی جھاڑو رکھا بھی نہ تھا کہ بچوں نے پھر سے اجاڑا ڈال دیا۔ صرف گند ہی نہیں ڈالا۔ چنیم چہاڑ بھی شروع کر دی تو وہ اکتا کر انہیں بددعائیں دینے

لگی ــــ

"ائے ہے شگو ــــ" اماں نے اس کے منہ کی بات چھپٹ لی۔

"کیوں کوس رہی ہو بیچاروں کو ــــ"

"آپ نہیں دیکھ رہیں کیا ادھم مچا رکھا ہے ــــ"

"کوئی بات نہیں بچے ہیں ــــ"

"نرالے ہی بچے ہیں ــــ"

"سب ایسے ہی ہوتے ہیں ــــ"

"ہونہہ ــــ ایسے بچے صرف غریبوں ہی کے ہوتے ہیں۔"

"اے چپ رہ ــــ کیا بک بک لگا دیتی ہے۔ شائستہ سن لے گی تو جی برا ہوگا اس کا ــــ"

شائستہ چھت پر تھی ــــ ماں بیٹی کی باتیں سن رہی تھی۔ جنگلے کے قریب پڑی چارپائی پر لیٹی تھی۔ آنے والے بچے نے طبیعت بیحد پژمردہ اور نڈھال کر رکھی تھی۔

شگو کی باتوں کا اس نے کبھی برا نہیں مانا تھا۔ اس کی عادتوں سے واقف تھا اس کے اونچے آدرشوں سے آگاہ تھی۔ اس کی خیالی جنتوں کا اسے علم تھا۔ لیکن یہ بھی جانتی تھی کہ شگو کے خواب اور آدرش حقیقت کی دنیا سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ اسی لئے اسے کبھی کبھی اس پر بڑا ترس بھی آتا تھا اور اس کی باتوں کا اسی لئے برا نہیں مانا کرتی تھی۔

"اماں ــــ" اس نے جنگلے کی طرف کروٹ بدل کر اوپر ہی سے کہا۔

"میرا جی بُرا نہیں ہوتا — کہنے دے اسے جو کچھ کہہ رہی ہے میرے کو شیطان تو ہیں ہی۔ اسی لئے تو میں انہیں لے کر کہیں نکلتی نہیں —

"یہ کیا جواز ہے آپا ———" بانسی تیلیوں کا جھاڑو ہاتھ میں پکڑے فرش پر بیٹھے بیٹھے بولی۔

"بچوں کو تمیز کو سکھانی چاہیئے ———"

"تو خالہ ہے —— سکھادے نا ——"

"میں سکھا سکتی ہوں۔ ایک ایک مکّا سب کی کمروں میں لگا دوں تو سیدھے ہو جائیں ——"

"آئے ہائے ——— مار کھا کھا کر تو پکے ڈھیٹ ہو چکے ہیں۔ کس کس کا سیدھا کروں گی۔"

"ایک دو ہونے تو ———"

"شگو ———" اماں نے جلدی سے شگو کی بات کاٹی اور آنکھیں دکھاتے ہوئے بولی۔

"لا اِدھر دے جھاڑو۔ میں خود لگا لیتی ہوں۔ دو دن کے لئے بیچارے رہ کیا گئے یہاں کاٹنے کو دوڑ رہی ہے۔"

"بس غلط باتوں کی حمایت کئے جاؤ۔ اسی لئے تو یہ سمجھتے نہیں ہیں، کپڑوں کا حال دیکھو۔ ابھی گھنٹہ بھی نہیں ہوا سب کو نہلا دھلا کر پہنائے تھے۔ جانور ہیں جانور۔ انسان کے بچے تو لگتے ہی نہیں۔"

اماں نے زبردستی جھاڑو اس کے ہاتھ سے لینا چاہی لیکن اس نے

ماں کا ہاتھ پرے کر دیا۔

اور پھر سے کاغذ چھلکے اور آدھ چھلے مالٹے سمیٹنے لگی۔ بچوں پر اُسے بے تحاشا غصّہ آ رہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ گند مچا رہے تھے یا آپس میں لڑ جھگڑ کر چیخ دھاڑ مچا رہے تھے۔ اسے تو غصّہ اس بات پر آ رہا تھا کہ یہ ڈھیر سارے بچے شائستہ ہی کے ہاں کیوں پیدا ہو گئے تھے۔ پیدا ہو ہی گئے تھے تو غریب کیوں تھے۔

ان کے پاس ڈھنگ کے کپڑے کیوں نہیں تھے۔ ان کے چہروں پر معصومیت تو تھی شائستگی کیوں نہیں تھی۔ یہ بچے —— یہ بچے ڈاکٹر سعدیہ کے بچوں جیسے کیوں نہیں تھے۔

مہذب

شائستہ

خوش پوش

ایٹی کیٹس سے آشنا

انتہائی سمارٹ

بڑے ہی پیارے

وہ سوچ رہی تھی۔ اور اس کا دل کہہ رہا تھا — کہ یہ سب دولت کے کرشمے تھے۔

شائستہ کے پاس تو کھینچ تان کر گزر بسر کرنے کو بھی کافی نہیں تھا اسے شائستہ کی بے وقوفی پر غصّہ آنے لگا۔ جو بچے پیدا کرنے کی مشین بن چکی

تھی۔ دماغ میں عقل بھی نہ رہی تھی۔ شاید ذہنی تسکین اور آسودگی کے لئے دن بچہ جن لیتی تھی وہ ۔ شگو کو اس پر بے طرح غصہ آرہا تھا۔

لیکن

رات وہ تینوں بڑے بچوں کو اپنے بستر میں گھسائے بیٹھی انہیں مزے مزے کی کہانیاں سنا رہی تھی ۔

بچے بھی پیار پاکر اس سے لپٹے جا رہے تھے ۔

"انٹی اور سنائیں ——" رفی نے پہلی کہانی ختم ہوتے ہی فرمائش کی۔ منو نے بھی تائید کی۔

"انٹی کے بچے سو دفعہ کہا ہے۔ انٹی نہیں آنٹی کہتے ہیں" شگو نے اس کی گال پر چٹکی بھری۔

"میں تو آنٹی ہی کہتی ہوں ——"

شادو نے جلدی سے کہا۔

"یہ ہمیشہ انٹی کہتا ہے —— ہزار دفعہ کہا ہے انٹی نہیں آنٹی کہتے ہیں" شگو نے کہا۔

"آن ٹی ——"

"بس یوں کہا کرو ——"

"اچھا انٹی ——"

"پھر انٹی ——"

"آن ٹی ——"

شگو بچوں سے بار بار آنٹی کہلوا رہی تھی۔ شائستہ ساتھ والی چارپائی پر لیٹی تھی۔ آخر کہہ اٹھی۔

"بھئی سیدھا سادا خالہ لفظ ہے جو —— کتنا پیارا لگتا ہے —— انہیں خالہ کہنے دو ——"

"آپ تو بس ——"

شگو نے گھور کر بہن کو دیکھا۔

"کبھی ترقی نہیں کر سکتیں آپ —— لکھ لیں میری بات۔ کسی اچھی چیز کو اپنانے کی صلاحیت ہے ہی نہیں آپ میں —— یہی چیزیں آپ اپنے بچوں کو منتقل کر رہی ہیں ——"

"شگو جی ——" شائستہ بولی۔

"ہم جو کچھ ہیں وہی اپنے آپ کو سمجھتے ہیں —— آنٹی کہنے سے نہ ہماری حیثیت بدل جائے نہ تمہارا رتبہ —— کھوکھلی باتوں سے دور رہا کرو شگو —— اب تم بچی نہیں رہی ہو —— کل کلاں مجھ ایسی زندگی سے رابطہ ——"

"خدا نہ کرے ——" شگو تڑاخ سے بولی۔ "میں —— میں اس وقت تک شادی کرنے کا نام ہی نہ لوں گی جب تک مجھے میرے خوابوں کی تعبیر نہ ملے گی"

"بیٹھی رہنا ساری عمر ——"

"کوئی حرج نہیں ——"

"یہ سب تصوراتی باتیں ہیں میری جان ——"

"میں ان میں حقیقت کا رنگ بھروں گی ——"

"دیکھ لوں گی ——"

"دکھا دوں گی ——"

"ایک بات پوچھوں ——"

"ہوں ——"

"یہ جو تو نے اتنے مہنگے مہنگے خواب آنکھوں میں سجا رکھے ہیں ان کی تعبیر کیسے ہوگی۔ اتنی دولت آئے گی کہاں سے —— خود کمائے گی یا کوئی ۔"

"میں خود ہی کماؤں گی ——"

"اور شادی بھی اس سے کروں گی —— جو میرے خواب پورے کر سکنے کا اہل ہوگا ——"

"کیا سمجھیں ——"

شگو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

شائستہ نے مترحم نظروں سے اسے دیکھا۔ کتنے وثوق سے کہہ رہی شگو —— وثوق ٹوٹ جائے تو انسان بکھر جاتا ہے کہیں شگو بھی۔

گھبرا کر شائستہ نے سر کو ہولے سے جھٹکا دیا۔

"خدا کرے تیرے خواب پورے ہوں ——"

اس نے دل سے دعا کی۔

شگو اب پھر بچوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"چلو دعا کریں سب ——"

اس نے بچوں سے کہا۔

"کیا دعا کریں آنٹی ——" رقی بولا۔

"انٹی کے بچے ——"

اس نے رقی کے سر پر ہولے سے چپت لگائی۔

"دعا کریں مجھے نوکری مل جائے —— شبنم کلینک میں ——

پھر ——"

"پھر —— کیا ہوگا آنٹی ——"

شادو منو اور رقی نے پوچھا۔

پھر

"پھر مجھے ڈھیر سارے پیسے ملیں گے اور ان پیسوں سے میں سب سے پہلے تمہارے لئے اچھی اچھی چیزیں خریدوں گی۔ شادو کے لئے ریڈی میڈ فراک، منو اور رقی کے لئے پیاری پیاری نکریں اور نئی شرٹس۔ جوتے، موزے، سوئیٹریں ——"

"سچی ——"

سب بچے شوق سے بولے۔

"ہاں ——" شگو بولی۔

"سارے پیسے خرچ کر دوں گی تم لوگوں کے لئے ——"

"آنٹی ——" شادو نے جھٹ سے کہا۔ "مجھے سونے با[ل]
والی گڑیا لے دیں گی ——"

"ہاں ——"

"اور مجھے سائیکل لے دیں دو پہیّوں والی —— جیسی جوہر کے پا[س]"
رقی نے کہا۔

"لے دوں گی ——"

"اور مجھے چھک چھک کرنے والی ریل گاڑی۔ جیسی ندیم کے پا[س]"
منو بولا۔

"ہاں لے دوں گی ——"

بچے بڑھ چڑھ کر فرمائش کرنے لگے۔ شگو کی طرف سے انکار نہیں
تھا اس لئے وہ بڑھتے ہی چلے جارہے تھے۔ ان کے ذہن میں جو
خواہشیں تھیں وہ سب ہی فرمائشیں بن گئیں۔

شگو بھی بڑے دلار سے سنتی گئی اور فرمائشیں پوری کرنے کی ہامی بھ[رتی]
گئی ——

شائستہ پہلے تو سنتی رہی۔ جب بچے بالکل ہی بے قابو ہو گئے
تو اس نے انہیں ڈانٹا اور شگو سے بولی۔

"کیوں ان سے جھوٹے وعدے کر رہی ہو ——"

"جھوٹے کیوں —— سب کچھ لے دوں گی —— نوکری
تو جائے ——"

"نوکری ملے گی کہ خزانہ ہاتھ آ جائے گا ؟ جھوٹے بھروسوں کی خود بھی عادی ہو
بچوں کو بھی ——"

"اچھا آپ چپ رہئے —— یہ ہمارا اور بچوں کا معاملہ ہے۔ ہم نپٹا لیں گے
کیوں بچو ——"

"ہاں آنٹی ——"

سب اس سے پیار سے لپٹ گئے۔

"لیکن ——"

"لیکن کیا ——"

"یہی کہ دو شادیاں کریں گے کیسے ——"

"اری بھاگوان —— خدا کا شکر ادا کر۔ ایک بیٹی کے رشتے کے لئے
رہی تھی۔ دونوں کا مل رہا ہے۔ اتنی چاہت اور اصرار سے مانگ رہے
اور پھر گھر بھی اچھا ہے ور بھی۔ اور کیا چاہیے تجھے"

"سب ٹھیک ہے —— لوگ بھی بہت اچھے اور سیدھے سادے
چھل نہیں ہے ان میں —— اب تو کئی بار مل چکے ہیں —— ہم بھی
ہاں دو تین بار ہو آئے ہیں۔ بہت پرخلوص اور محبتی لوگ ہیں۔ دھن دولت
بھی ہے۔ تین لڑکے باہر سے کما کما کر لا رہے ہیں۔ روپے پیسے کی
کمی ہو گی ——"

"پھر ——"

"سوچ تو اپنا رہی ہوں۔ دو شادیوں کے لئے کتنا پیسہ چاہیئے۔ بندوبست
ہو جائے گا ——"

"اللہ نے چاہا تو ہو جائے گا —— تو فکر نہ کر —— اب وہ لوگ آئے
تو ہاں کر دیں گے ہم ——"

"پیغام تو آ گیا ہے۔ اس جمعہ کو آ رہے ہیں وہ ——"

"بس اللہ کا نام لے کر ہاں کر دیں گے ——"

"شادیاں جلد کرنے کا کہہ رہے تھے ——"

"کوئی بات نہیں —— دو چار مہینے کی مہلت تو ملے گی"

"فکرمند اسی لئے تو ہیں ——"

"پھر وہی بات ——"

"اے ہے —— تم بات سمجھو تو —— ربیعہ کے لئے تو پھر کچھ نہ
کچھ بنا کر رکھا ہے میں نے —— صبیحہ کے لئے تو ایک جوڑا کپڑوں کا بھی نہیں
میں تو سوچ رہی ہوں ——"

"کیا ——"

"ان سے صاف کہہ دیں ——"

"کیا ——"

"کہ بڑی کی شادی اس سال کر دیتے ہیں —— چھوٹی کی منگنی ——
اگلے سال چھوٹی کی شادی کر دیں گے —— بی اے بھی کر لے گی
تب تک ——"

رشیدہ اور رفیق باتیں کر رہے تھے۔

اتنا پیسہ واقعی پاس نہیں تھا کہ دونوں بیٹیوں کی ڈولیاں ایک ساتھ اٹھ سکتیں۔

لیکن

رفیق چاہتا تھا کہ بیٹیوں کا بار جیسے ہو ایک بار ہی سر سے اتر جائے۔ شوگر اور بلڈ پریشر کا مریض تھا۔ یہ بیماری ابھی ابتدائی نوعیت کی تھی۔ کبھی کبھی اس کا حملہ شدید بھی ہوتا تھا۔ زندگی ابھی تک تو ان سے بڑی سہولت سے نپٹ رہی تھی۔

لیکن

کیا

خبر کب کس وقت چپکے سے ہی ہار مان جائے اور دم ہوا ہو جائے

اسی لئے رفیق چاہتا تھا کہ کم از کم بچیوں کے بوجھ سے آزاد ہو جائے دو بیٹیاں تھیں اور خوش قسمتی سے دونوں کے لئے موزوں رشتے مل رہے تھے وہ چاہتا تھا دونوں کی شادیاں جیسے بھی ہوں کر دے۔

لیکن

رشیدہ متفکر تھی۔

رسم و رواج کی زنجیریں جکڑے ہوئے تھیں ـــ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ وہ لوگ خواہ کتنے بھی اچھے کیوں نہ ہوں ـــ بنا جہیز کے تو بیٹوں کو بیاہنے سے رہے۔

ربیعہ کے لئے رشیدہ نے کافی کچھ بنا رکھا تھا۔ بد دل اور مایوس ہو کر وہ جہیز بنانا چھوڑ نہ دیتی تو اب تک دو پیٹیاں چیزوں سے بھر لی ہوتیں رشتے آتے تھے اور پھر لوٹ کر نہیں آتے تھے۔ اسی بات نے رشیدہ کو بد دل کر دیا تھا۔ اسے تو امید و یقین تھا ہی نہیں کہ ربیعہ بھی بیاہی جائے گی۔ پچیس سال کی ہو رہی تھی۔

لیکن

قسمت کی بات رشتہ آ گیا تھا۔ اتنا اچھا اتنا خوش بخت کہ ربیعہ کے ساتھ صبیحہ کی قسمت بھی کھل رہی تھی۔

رشیدہ کے ذہن میں آئی تجویز معقول تھی ـــ اس لئے رفیق نے تائید کی۔

"ہاں یہ بات وہ لوگ مان جائیں تو ہمیں کافی سہولت ہو سکتی ہے۔"

"یہی تو میں سوچتی ہوں ـــ"

"آئیں گے تو بات کر لیں گے ـــ"

"اگر وہ نہ مانے تو ـــ"

"تو ـــ ہمیں ماننا پڑے گا ـــ"

"یعنی دونوں شادیاں ـــ"

"تو اور ـــ"

"کریں گے کیسے؟ یہی تو مسئلہ ہے ـــ"

"اللہ مالک ہے کر لیں گے کسی نہ کسی طور ـــ اب اس بات پر رشتہ چھوڑنا

بھی تو حماقت ہے۔"

"آئے ہائے ــــ رشتہ چھوڑنے کا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں۔ کہاں ملتے ہیں رشتے۔ اپنے گھر میں ہی دیکھو۔ بیٹی کی منگنی ٹوٹ گئی۔ کتنے سال ہو گئے رشتے کی آس بھی توڑ ڈالی تھی میں نے ــــ"

رفیق نے ایک طویل سانس لی یہ سانس خاصی اطمینان بخش تھی۔

"آپا رابعہ کو دیکھو تین جوان بیٹیاں بیٹھی ہیں۔ رشتے نہیں مل رہے۔ بڑی تو شاید تیس سال کی ہو رہی ہے۔"

"ہوں ــــ"

"اور بھائی نجیب کی دونوں بچیاں ــــ ربیعہ سے بڑی ہیں ــــ"

"لطیف کی شہلا بھی صبیحہ کی ہم عمر ہے ــــ"

"ہاں ــــ اسی لئے تو رشتہ چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتے یہ تو اللہ تعالیٰ کی کوئی خاص ہی کرم نوازی ہے۔ جو وہ لوگ ہم پر اس طرح ریجھ گئے۔"

"بالکل بالکل ــــ"

"میں نے تو ابھی صبیحہ کا سوچا بھی نہیں تھا۔ لیکن اب کریں کیا؟"

"یہی کہ ایک کی شادی کر لیں۔ دوسری کی منگنی۔ پھر تو دیکھو ــــ کیا پتہ مان ہی جائیں ــــ"

"اگر نہ بھی مانیں تو کوئی بات نہیں کچھ کر ہی لیں گے۔"

رشیدہ نے بے یقینی سے شوہر کو دیکھا۔

وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"پگلی کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا ہی ــــ خدا کا شکر کرو ــــ اتنا پتے ہے ہمارے ــــ"

"دکان سے زیادہ سے زیادہ کپڑا ہی آسکتا ہے ــــ باقی بھی بہت کچھ ہونا ہے ــــ"

"اس بہت کچھ کے لئے بھی ہے ہمارے پاس ــــ"

"کہاں ہے ــــ"

"زمین ــــ"

"وہ پلاٹ ــــ"

"ہاں ــــ کیا حرج ہے بیچ دیتے ہیں ــــ"

"اور ــــ اور ــــ وہ کوٹھی بنانے کی ــــ"

"بن جائے گی قسمت میں ہوئی تو۔ بے گھر سے تو نہیں ہم۔ خدا کا شکر ہے اپنی چھتوں تلے بیٹھے ہیں۔ خدا نے چاہا تو پھر کما لوں گا زمین اور کوٹھی کے لئے۔ یہ وقت بھی نبھانا ہے نا ــــ"

رشیدہ نے کچھ سوچتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

"ہرج کیا ہے ــــ اپنا پلاٹ ہے ــــ اپنے پیسے سے خریدا ہے ــــ کافی منافع پر بکے گا ــــ شادیوں کا مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔"

"ہے تو ٹھیک بات ــــ"

"اب تو مطمئن ہو گئی ہو نا ——"

"بالکل، بہت بوجھ تھا میرے دماغ پر ——"

"بھلی لوگ بوجھ میرے سر پہ ہی رہنے دیا کر —— تو فکرمند نہ ہوا کر
اللہ نے چاہا تو تیری بیٹیوں کی ڈولیاں دھوم دھام سے اٹھواؤں گا۔"

رفیق نے کہا

"اللہ آپ کو صحت اور زندگی دے ——"

رشیدہ نے دعا دی۔

"بس اسی کی ضرورت ہے ——"

رفیق نے رشیدہ سے کہا۔

رشیدہ کے ذہن سے جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا، واقعی زمین اپنے ہی پیسے سے خریدی ہوئی تھی۔

بیچی جا سکتی تھی۔

دو ہی تو بیٹیاں تھیں۔

ان کی شادیاں اچھی طرح سے ہو پائیں تو فکر کا ہے کا۔

باقی رہے لڑکے تو ان کی کیا فکر —— تھوڑے سے پیسے سے بھی کام چل جائے گا۔

رشیدہ رفیق کے حوصلہ دلانے سے تازہ دم ہو گئی۔ اس جمعہ کو لڑکے والوں نے آنا تھا۔

وہ چار دن پہلے ہی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ خوشی خوشی سارے

کام کروانے لگی۔

بیٹھک کی چیزیں ٹھیک کروائیں۔ پردے دھلوائے۔ دری جھاڑ کر بچھوائی۔ صوفے کے غلاف دھو دھلا کر استری کر کے ڈالے۔

"امی ——"

اس نے ربیعہ نے پوچھ ہی لیا۔

"بڑی خوش نظر آ رہی ہیں ——"

"خوشی کی بات تو ہے ہی ——" رشیدہ ہنس کر بولی۔

"میں تو ایک بار سے بھی نپٹنے سے مایوس ہو چکی تھی۔ اللہ نے دو اتار دیئے ——"

ربیعہ سر جھکا کر بولی۔

"لیکن امی —— اتنا خرچہ ——"

"سب ہو جائے گا —— تو فکر نہ کر۔ تجھے ہر چیز دوں گی۔ صبیحہ تیرے حصے کا نہیں لے جائے گی ——"

اماں نے کہا۔

"یہ میں نے کب کہا —— میں تو فکرمند ——"

ربیعہ نے اماں سے کہا۔

"کہا نا فکر کی ضرورت نہیں ——" رشیدہ نے کہا اور پھر اسے اپنی تجویز بتائی۔

ربیعہ بولی "اگر وہ لوگ نہ مانے تو ——"

"تو کیا دونوں پار ——" وہ ہنس پڑی۔

ربیعہ نے صوفہ کو ٹھیک کرتے ہوئے ہولے سے کہا۔

"مگر کیسے امی ——"

"اسے تیرے ابا نے پلاٹ خریدا تھا نا ——"

"ہاں ——"

"وہ بیچ دیں گے ——"

"لیکن امی —— کوٹھی ——"

"وہ بھی بن جائے گی —— نہ بھی بنی تو کیا ہوا —— ہم اپنے فرض سے تو سرخرو ہو جائیں گے۔"

ربیعہ کچھ سوچنے لگی۔

"کیا سوچ رہی ہو ——" رشیدہ نے پوچھا۔

"طاہر بیچنے دے گا —— پلاٹ ——" ربیعہ نے کہا۔

"کیوں نہیں بیچنے دے گا ——"

رشیدہ بولی۔

"وہ تو ابھی سے بڑے بڑے خوبصورت گھروں کے نقشے جمع کر رہا ہے۔" ربیعہ بولی۔

"کرتا رہے۔ کام آئیں گے۔ دو چار سال بعد ہی سہی۔"

"لیکن امی ——"

"کیا ——"

"اسے بڑی مایوسی ہوگی ——"

"اسے ہٹ —— کونسا اس کی کمائی سے خریدا تھا پلاٹ۔ مایوسی ہوگی تو ہوتی رہے ——"

"وہ —— وہ —— جو ——"

"کیا ——"

"کچھ نہیں ——"

"پھر بھی ——"

"امی —— شگو تو اسے جینے نہیں دے گی ——"

رشیدہ ہنس کر بولی۔ "تجھے شگو سے کیا بیر ہو گیا ہے۔"

"بیر نہیں امی ——" وہ جھٹ سے بولی۔ "شگو مجھے بھی اچھی لگتی ہے لیکن۔ اس کی بعض باتیں . . . ."

"چھوڑ اس کی باتوں کو ——"

"لیکن طاہر تو اس کی بات کو صرف آخر مانتا ہے۔ پھر پر یکبر ہو جاتی ہے وہ تو اونچے سٹینڈرڈ اور دولت کی ریل پیل کی دیوانی ہے۔ طاہر بھی اسی کے رنگ میں رنگا جا رہا ہے۔"

"تو چھوڑ ان باتوں کو ——" رشیدہ نے بیٹھک پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "شگو کون سی سمجھ دار سیانی ہے۔ ابھی تک بچپنا ہے اس میں۔ پھر قسمت کی کیا خبر۔ اللہ شاید اسے سب کچھ دے دے۔"

ربیعہ ہنس کر بولی۔ "اسی لئے تو کہہ رہی ہوں پلاٹ بیچنے سے

طاہر اور شگو

" کچھ نہیں ہوگا ـــ " رشیدہ نے کہا۔ اور پھر اٹھ کر باہر جاتے ہوئے بولی۔

" بے بیٹھک تو ٹھیک ہوگئی ہے۔ اب بتا کل پکانا کیا کچھ ہے۔ بہت خاطر مدارات کریں گے اس دفعہ ان کی۔ یاد رکھیں گے وہ بھی "

ربیعہ نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔

شگو کو اپائنٹمنٹ لیٹر ملا تو خوشی سے دیوانی سی ہوگئی۔ بھاگی بھاگی اندر آئی۔ اماں مشین پر جھکی تھی ـــ شگو نے ان کے گلے میں باہیں ڈال کر انہیں جھنجھوڑ ڈالا۔

" اماں ـــ اماں ـــ "

اماں بوکھلا سی گئی۔ " اے کیا ہوا ہے۔ میرا گلا تو چھوڑ دو۔ دبیچے جا رہی ہے کچھ بتا بھی ـــ "

" یہ لیٹر ـــ اماں ـــ یہ خط ـــ "

" کس کا ہے ـــ "

" مجھے نوکری مل گئی ہے ـــ "

" سچی ـــ "

" ہاں اماں ـــ یہ دیکھ خط آیا ہے۔ دس تاریخ سے کام پر آجانے کا لکھا ہے ـــ "

"خدا تیرا شکر ہے ——" اماں نے کہا۔

"بہت اچھی جگہ ملی ہے ——"

شگو نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔

اماں کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ

شگو نے کہا۔

"یہ تشکر کے آنسو ہیں اماں ——"

اماں نے اک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اللہ کا شکر ا

چاہیئے بیٹی ——"

اماں باقاعدہ رونے لگی۔

شگو نے حیرانی سے ماں کو دیکھا۔

پھر ان کے گلے میں باہیں ڈال کر ان کے گال پر پیار کرتے

بولی۔

"مجھے پتا ہے تو کیوں رو رہی ہے ——"

اماں نے ململ کے دوپٹے سے آنسو پونچھ ڈالے۔

"بیٹی کی نوکری سے خوشی نہیں ہوئی نا" شگو نے بجھے بجھے

تو اماں نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "پگلی خوش کیو

ویسے ہی خیال آگیا تھا کہ آج تیرا باپ زندہ ہوتا تو —— تجھے نوکری

کیوں پڑتی"

شگو نے اک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "نوکری تو پھر بھی میں ضرور کرتی

لیکن — یہ ہے کہ ابا اگر زندہ ہوتے تو پھر میں نرس کی بجائے ڈاکٹر ضرور بنتی۔

ا نہیں ——"

"تو خدا کو منظور ہو وہی ہوتا ہے ——" اماں نے پھر سے مشین چلانے

وہ قمیض کی آستین جوڑ رہی تھی۔

شگو نے ہتھی پر ہاتھ رکھ کر مشین روکتے ہوئے کہا۔

"بس اماں —— اب آپ کا یہ سلسلہ ختم کوئی ضرورت نہیں لوگوں

کے کپڑے سینے کی"

اماں مسکرا کر بولی۔ "ٹھیک ہے چھوڑ دوں گی۔ یہ جو آئے رکھے ہیں وہ تو

سی لوں۔ پھر —— ابھی تو نوکری کا بلاوہ ہی آیا ہے۔ تنخواہ تو نہیں آگئی۔ جب

تو لانے لگے گی تو چھوڑ دوں گی یہ سب"

"یہ بھی ٹھیک ہے ——"

شگو اٹھ کھڑی ہوئی۔

اماں گھرر گھرر مشین چلانے لگی۔

شگو نے مڑتے ہوئے کہا۔

"اماں میں پھپھو کو بتا آؤں ——"

"بتا آؤ ——" اماں نے قمیض سیتے ہوتے کہا۔

شگو تیزی سے کمرے سے نکل آئی۔

تیز تیز قدم اٹھاتے صحن عبور کیا۔

ڈیوڑھی میں آئی ——— اور دروازہ کھول کر گلی میں نکل آئی ——— وہ
بھاگی ———

برابر ہی میں تو پھپھو کا دروازہ تھا۔ وہ دوڑ کر دروازے میں داخل
اور جیا گنے کے سے انداز میں ڈیوڑھی عبور کرنے لگی کہ اندر سے آ
والے سے ٹکرائی۔

"اوہو ——— کون ——— تم ——— شگو ———" طاہر نے حیر

وہ اس سے ٹکرائی تھی اسی تیزی سے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔

"مجھے جاب مل گئی ہے طاہر ——— یہ لیٹر ملا ہے آج ———" وہ
سے بکی جا رہی تھی۔ چند لمحے تو اسے احساس ہی نہ ہوا ——— کہ وہ
کے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں جکڑی اس کے سینے سے لگ
ہے ———

"بہت بہت مبارک ہو ———" طاہر نے اسے بازوؤں کے
میں سختی سے کس لیا۔

"اوئی ——— یہ ——— ہٹو بھی ———"

شگو کو ایک دم ہی جو احساس ہوا تو جاب کی خوشی بھول کر اپنے آپ
طاہر کے بازوؤں سے چھڑانے لگی۔

وہ بری طرح گھبرا گئی۔ طاہر نے مسکراتے ہوئے اسے ایک بار
سے بھینچ کر بازو ڈھیلے کر دیئے۔

وہ پھسلتی مچھلی کی طرح اس کے بازوؤں سے نکل کر پرے ہوتے ہوئے

اسے گھورنے لگی۔

اس کا دل اچھل اچھل کر حلق میں آنے لگا تھا۔

طاہر شوخی سے بولا۔

"مبارک نہ دینا ———"

"ہٹو ———" وہ بمشکل اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

"لو ہٹ گیا ———"

طاہر نے ایک طرف ہوتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"حکم کے بندے ہیں سرکار ———"

"تمہیں ہو کیا رہا ہے ———" وہ اس پر مسکراتی نگاہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھی۔

"کوئی آ جاتا تو ———"

وہ اور شوخ ہو کر بولا۔ "کوئی آ کیسے جاتا۔ ان بند بند گھروں کی لمبی لمبی نیم تاریک ڈیوڑھیوں کا یہی ایک تو فائدہ ہے۔"

"عمر گزر گئی ان ڈیوڑھیوں میں آتے جاتے۔ تمہیں فائدے اب نظر آنے لگے ہیں ———"

اس کی شوخی سے محظوظ ہوتے ہوئے وہ صحن کی طرف بڑھی۔

"فائدہ اٹھانے کی عمر ہی اب آئی ہے میری جان۔" وہ اس کے پیچھے آتے ہوئے ہولے سے بولا۔

"ارے بس کرو ——— بہک رہے ہو ———" وہ بھی اسی لہجے میں سرزنش

کرتے ہوئے بھاگ کر صحن میں آ گئی۔

طاہر باہر چلا گیا۔

سامنے والے کمرے سے صبیحہ باہر آ رہی تھی۔

"صبو — مجھے جاب مل گئی —" وہ لیٹر اونچا کرتے ہوئے بلند آواز سے بولی۔

"اچھا —" صبیحہ خوش ہو گئی۔ "کیا اسی کلینک میں —"

"ہاں شبنم کلینک میں — بہت بڑا بہت خوبصورت اور مہنگا کلینک ہے —"

"تنخواہ اچھی ملے گی نا —"

"ہاں — تنخواہ کے علاوہ الاؤنسز بھی ہیں اور بھی بہت سی رعایتیں"

"پھر تو عیش ہو گی تمہاری —"

"بالکل — خوب پیسے کماؤں گی"

"کیوں — وہاں کیا رشوت لینے دینے کا بھی سلسلہ ہے!"

"اے ہٹ —"

"تو پھر کیسے بنائے گی۔ لے دے کے تنخواہ ہی ہو گی نا —"

"یہ تھوڑی بات ہے —"

صبیحہ ہنس پڑی۔ شگو کے گال پر پیار سے چٹکی کاٹتے ہوئے بولی۔

"تیرے لئے تھوڑی ہی ہے —"

دونوں ہنستے ہوئے اندر آ گئیں۔

رشیدہ گھر پہ نہیں تھی۔ بڑی ممانی کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھی ربیعہ دیوار کے ساتھ لگی چارپائی پر لیٹی تھی۔ صبیحہ اور شگو کی باتیں اس نے سن لی تھیں شگو کے کمرے میں آتے ہی بولی۔

"نوکری مل گئی —"

"ہاں —"

"مبارک ہو —"

"آپا پہلے یہ مٹھائی کھلائے پھر مبارک دیں گے" صبیحہ دھم سے چارپائی پر پڑے تہہ شدہ کپڑوں پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اٹھ اٹھ — میں کپڑے تہہ کر کر کے تھک گئی ہوں تو اوپر چڑھ بیٹھی۔ ربیعہ نے اس کی پشت پر ہلکا سا ٹھوکہ دیا۔

"آپا —" شگو نے دروازے کے پاس کھڑے کہا۔ "اسے بھی عقل سکھانا۔ ساتھ جا رہی ہے تمہارے —"

"ایسے ہی —" صبیحہ کے انگ انگ سے جیسے ہنسی کے فوارے چھوٹنے لگے۔ "آپا کے ساتھ نہیں جا رہی میں"

"کیوں —" شگو نے پوچھا۔

"اس سال آپا — اگلے سال میں —" صبیحہ نے شوخی سے اپنے سینے پر انگل رکھ کر نگاہیں گھمائیں۔

"یہ تو جب نا — جو وہ لوگ مان جائیں" ربیعہ نے کہا۔

"کیا بات ہے کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے" شگو نے میں رکھی پرانی میز

کے کنارے پر ٹکتے ہوئی بولی۔

"بات کچھ بھی نہیں ——" ربیعہ نے کہا۔

"کچھ کیوں نہیں ——" صبیحہ ہنسی۔

"بھئی تمہیں پتہ نہیں ہے کہ وہ لوگ دونوں رشتے مانگ رہے ہیں" ربیعہ بولی۔

"ہاں پتہ ہے ——" شگو نے اشتیاق سے کہا۔

"امی کا خیال ہے ——" صبیحہ بولی "کہ پہلے آپا کا رشتہ ہو جائے وہ بخیر و عافیت سسرال سدھار جائیں۔ پھر میری باری آئے۔"

"ہونا بھی ایسے ہی چاہیئے" شگو بولی۔

"کیوں ——" صبیحہ نے شرارت سے منہ بنایا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ وہ لوگ دونوں رشتے مانگ رہے ——" ربیعہ نے کہا۔ "اور —— اور —— دونوں شادیاں بھی مارچ میں ہی کرنا چاہتے ہیں۔"

"یعنی ——" شگو نے جھٹ سے انگلیوں پر مہینے گنے، "یعنی صرف دو ماہ بعد ——"

"ہاں ——"

"ہائے اللہ اتنی جلدی ——"

"ان کی مرضی ——"

"گھر سونا ہو جائے گا تم لوگوں کے جانے کے بعد ——"

صبیحہ شوخی سے آنکھیں نچاتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولی۔ "اس سونے پن کو تم پر کر دینا۔"

"اے ہٹ ——" شگو نے اسے گھورا۔

"کیا سمجھیں ——" صبیحہ نے اسے چھیڑا۔ "میں نے کوئی خاص بات تو نہیں کہی۔"

"برابر میں گھر ہے —— تم ہر وقت آتی جاتی رہتی ہو۔ گھر کا سونا پن دور ہو جائے گا۔"

شگو مسکرانے لگی۔

ربیعہ نے صبیحہ سے کہا۔

"یہ اس گھر میں ایسے ہی تھوڑا آئے گی۔"

"تو پھر اس گھر کیسے آئے گی ——" صبیحہ مستی بھرے انداز میں بولی۔

ربیعہ نے کہا۔ "اس کے لئے تو کوٹھی بنے گی گاڑی آئے گی پھر ان —— محترمہ کی سواری آئے گی۔"

شگو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ربیعہ کے لہجے میں جو ہلکی سی طنز کی چبھن تھی اس نے قطعی محسوس نہ کیا۔

"ہیں نا ——" ربیعہ نے شگو کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"بالکل ——" وہ ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔

"میں آپ لوگوں جیسی نہیں جناب ——"

"وہ تو ظاہر ہے ——" دونوں بولیں۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ لوگوں کو پھپھو نے ایک دم ہی سے گول کر دیا۔
آپا کی تو خیر ـــ اس صبیحہ کو دیکھو ـــ پڑھائی کو خیر باد اور سسر
کی تیاری ـــ"

"بری بات ہے کیا ـــ" صبیحہ نے پوچھا۔
"پتہ نہیں ـــ تم تو خوش ہونا ـــ"
"بالکل خوش ہوں ـــ" صبیحہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "خوش کیوں
نہ ہوؤں۔ اتنی اچھی جگہ شادیاں ہوں گی، بہت کمار ہے ہیں وہ سب بھائی؛
"تیرے والا بھی ـــ" شگو نے چھیڑا۔

"وہ سب سے زیادہ کمارہا ہے سعودی عرب میں ہے۔ آپا والا قطر
دونوں کے پاس گاڑیاں ہیں، سجے سجائے فلیٹ میں رہتے ہیں۔ اے سی
لگے ہوئے ہیں فلیٹوں میں۔ بھئی سچی بات ہے ہم نے تو کبھی خواب میں
بھی نہیں سوچا تھا۔ ہوائی جہازوں پر آیا جایا کریں گی ہم۔ کیا سمجھیں۔"
صبیحہ مزے لے لے کر باتیں کر رہی تھی۔ من میں ربیعہ کے بھی پھلجھڑیاں
چھوٹ رہی تھیں۔ مسکراہٹوں کو دبا دبا کر بہن کو تک رہی تھی۔
شگو بھی ان کی خوشی میں شریک تھی۔
لیکن
یہ دوبئی مارکہ نو دو لیتئے اسے پسند نہیں تھے۔ یہ لوگ "تانگوں اور رکشہ
سے اٹھ کر سیدھے ہوائی جہازوں تک پہنچ گئے تھے۔ یہاں دو چار سو کی
نوکری کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔ وہاں ہزاروں لاکھوں کما رہے تھے دولت

آ رہی تھی ان لوگوں کے پاس۔
لیکن
جانے کیوں دولت ان کو جچتی نہ تھی۔ امیر ہو کر بھی امیر نہ لگتے تھے۔ عادتوں
میں ٹھہراؤ نہیں آیا تھا۔ سوچوں کے انداز نہیں بدلے تھے۔ سلجھے ہوئے
نہیں لگتے تھے۔ کچھ نہ کچھ چھچھورا پن تھا ابھی ایسے لوگوں میں۔
جانے یہ حقیقت تھی یا نہیں۔

بحر حال
شگو کے خیالات و تاثرات ان کے متعلق ایسے ہی تھے۔

شگو نے نیا یونیفارم پہنا اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بالوں کو سنوارنے لگی۔ پرانا اور جگہ جگہ سے تڑخا ہوا زنگ آلود آئینہ اسے کوفت دے رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ پہلی تنخواہ ملتے ہی وہ ایک بڑا سا آئینہ ضرور خریدے گی۔

"تیار ہو گئی ——" اماں چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے باورچی خانے سے باہر آ گئی۔

"بس اماں تیار ہوں ——" اس نے برش پھیرتے ہوئے مڑ کر ماں کو دیکھا۔

"کپڑے ٹھیک سلے ہیں نا ——"

"ہاں ٹھیک ہیں —— یہ کپڑا بھی اچھا ہے —— رفیق پھوپھا نے بہت اچھے کے لئے دی تھی۔"

"بہت پیار کرتا ہے نا تجھ سے ——"

"نوکری ملنے کا تحفہ دیا ہے یہ کپڑا ——"

"خدا اسے خوش رکھے۔ صحت اور زندگی دے ——"

"صحت تو پھوپھا کی خراب ہی ہوتی جا رہی ہے۔ پرہیز کرتے ہی نہیں شوگر بڑھ جاتی ہے بعض اوقات کتنے کمزور دکھائی دیتے ہیں۔"

"بیماری بھی ہے اور فکر بھی ——"

"فکر کیسی ——"

"تو دو بیٹیوں کی شادی کرنا ہے ——"

"وہ تو بہت خوش ہیں ——"

"خوش تو ہیں ——"

اماں پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"دونوں کے لئے بیک وقت موزوں رشتے مل گئے۔ لیکن شادیاں بھی تو کرنی ہیں۔"

"پھوپھو چاہتی تھی پہلے آپا کی شادی ہو جائے۔" شگو بولی۔ "لیکن وہ لوگ مانتے ہی نہیں۔ مصر ہیں کہ دونوں شادیاں اکٹھی ہوں۔ ان کے تینوں بیٹے اکٹھے ہی چھٹی پر آ رہے ہیں۔ بار بار تینوں کو اکٹھے چھٹی ملے نہ ملے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے ——"

شگو چائے کی پیالی لبوں سے لگاتے ہوئے بولی۔

اماں چارپائی پر پڑے دھلے کپڑوں کو الگ الگ کرنے لگی۔

شگو آج ڈیوٹی پر جا رہی تھی۔

پہلا دن تھا۔ کچھ عجیب سے تاثرات تھے۔ نیا یونیفارم پہنا تھا نئے جوتے
بھی کل شام ہی خرید سے تھے۔ ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا اور اب بال بھی نفاست
سے بنا رہی تھی۔

"جاب آپا کیسے کرے گی ——" اماں نے پوچھا۔

"یہ تو پتہ کرنے پر ہی طے ہوگا —— شاید وہاں سے کوئی بس ادھر آتی جاتی
ہو —— بس یا ویگن ہوگئی تو اچھا ہے۔ ورنہ رکشہ سے آنا جانا پڑے گا:

"آج رکشے سے جائے گی ——"

"نہیں ——"

"تو —— بس ——"

"نہیں اماں آج مجھے طاہر چھوڑنے جائے گا —— پہلا دن ہے نا۔ اکیلے
جاتے ہوئے کچھ ——"

اماں نے اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

بولی کچھ نہیں —— یہ بھی نہیں پوچھا طاہر کے ساتھ رکشے ٹیکسی میں
جائے گی یا پیدل —— وہ کئی بار دبی زبان میں شگو سے کہہ چکی تھی کہ طاہر سے
اب اتنی بے تکلفی نہ برتا کرے۔ لیکن وہ کب سنتی تھی اماں کی بات۔ اسے تو یہ
بات معیوب لگتی تھی نہ بری ——

اماں بھی اسی لیے چپ ہوگئی تھی۔

تیار ہوکر اس نے اماں کو سلام کیا۔

اس کے سامنے جھکتے ہوئے بولی۔ "اماں آج میں پہلی بار کام پر جا رہی ہوں

دعا —— میں کامیاب رہوں ——"

اماں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر اس کی پیشانی پر
بوسہ دیا۔

"جا بیٹی —— تیرا اللہ نگہبان ہو ——"

شگو نے بیگ بازو پر لٹکایا اور سلام کر کے گھر سے باہر نکل آئی۔
صبح بیدار ہو چکی تھی زندگی اپنے معمول پر رواں دواں تھی۔ گلی میں کافی رونق
چہل پہل تھی، سائیکل سکوٹر آ جا رہے تھے۔ دفتروں اور کاروباری اداروں
میں جانے والے لوگ گھروں سے نکل رہے تھے۔ بچے اپنے بستے اٹھائے
جا رہے تھے۔
کئی پھیری والے بھی آ گئے تھے۔ دودھ والے بھی گھر دودھ دے کر
جا چکے تھے۔
گلی محلوں میں موذن کی صبح کی اذان کے ساتھ ہی دن کا آغاز ہو جاتا ہے لوگ
نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں۔ لیکن بیدار صبح ہی صبح ضرور ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں میں
روایات اور قدریں کسی نہ کسی طور اب بھی موجود ہیں۔ گھر کی عورتیں صبح اٹھتے
ہی کام کاج میں لگ جاتی ہیں۔
برتن کھنکنے اور شر شر جھاڑو دینے کی آوازیں ہر گھر سے صبح ہی صبح
آنے لگتی ہیں۔
بچوں کا شور شرابا بھی طلوع سورج کے ساتھ ہی فضاؤں میں گھل مل جاتا ہے
اور چولہوں سے دھوئیں بھی جلدی اٹھنے لگتے ہیں۔

ان لوگوں کی راتیں بھی شام کو اتر آتی تھیں۔ سرِ شام کھانا کھایا۔ ان
تھکے ہارے جسموں کو بستر کا سکون ملا اور نیند کی دیوی نے اپنے پر پھیلا
لیکن
آج کل راتوں کے یہ رویے کچھ بدل گئے تھے۔ ٹی وی نے رات کو
بنا دیا تھا۔

اب
یہاں بھی رات شام کو نہیں اترتی تھی۔ محلے میں جن جن گھروں میں ٹی وی
رات گئے تک چہل پہل رہتی تھی۔ جن کے گھروں میں ابھی یہ آسائش جلوہ گر
ہوئی تھی وہ بھی دوسرے گھروں میں جاکر دیکھتے تھے۔ کچھ لوگ ٹی وی
میں رکھ کر گلی میں کھلنے والی کھڑکیاں کھول دیا کرتے تھے اس طرح ناآسودہ
آسودگی حاصل کر لیتے تھے۔

کھڑکیوں پر جمگھٹے سے لگے ہوتے اور لوگوں کو گھنٹوں کھڑے رہ کر
سے لطف اٹھانا بھی گراں نہ گزرتا۔

شگو پھپھو کے گھر آئی۔ پھپھو صحن میں ہی مل گئی۔ وہ دودھ کا پیالہ
اپنے کمرے میں جا رہی تھی۔

"پھپھو ——" شگو نے زوردار سلام کے بعد کہا۔

"وعلیکم السلام —— آؤ شگو —— اوہ اچھا —— آج نوکری پر
ہونا ——"

پھپھو نے پیار سے اسے دیکھا۔

"پھوپھا چلے گئے دکان پر ——" شگو نے پوچھا۔ "میں تو انہیں اپنا یونیفارم
دکھانے آئی تھی۔"

"گھر پہ ہی ہیں۔ ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں آج ——"

"ہائے اللہ —— کہاں ہیں ——"

"اندر ——"

"کیا ہوا ——"

"کمزوری بہت محسوس کر رہے ہیں ——"

"میں دیکھوں انہیں ——"

"ہاں آؤ ——"

رشیدہ دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کے پیچھے شگو بھی تھی اندر داخل
ہونے سے پہلے ہی صبیحہ آ گئی۔ اس نے ابھی رات والے چھینٹ کے کپڑے
پہن رکھے تھے۔ بال بھی نہیں بنائے تھے —— وہ طاہر کا کمرہ صاف کر
کے آئی تھی۔

"ہیلو شگو ——" اس نے جان بوجھ کر ہیلو کہا۔ شگو کی رگ جانتی تھی ایسی
باتیں تو اسے پسند تھیں۔

"ہیلو ——" وہ اٹھلا کر بولی۔

"آج ڈیوٹی جائن کر رہی ہو ——"

"ہاں ——"

"بیسٹ آف لک ——" وہ ہنس پڑی۔

"تھینکس ——"

شگو نے بڑے فخر اور پیار سے کہا۔

پھر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم تیار نہیں ہوئیں ——"

"کس لئے ——" صبیحہ بولی۔

"کالج نہیں جانا ——"

"چھوڑ دیا ——"

"نہیں ——"

"سچی ——"

"شادی کی خوشی میں ——"

"ہوں ——"

"بہت بے وقوف ہو ——"

"شکریہ ——" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

شگو نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ پر صبیحہ اسے بالکل بدھو اور بیوقوف لگ رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس سے ہمدردی جتانے لگی اس حماقت پر اسے رحم آیا۔

کونسا کسی ریاست کا شہزادہ اسے مل گیا تھا جو وہ اتنی خوش تھی۔ نہیں ایف اے بھی پاس کیا ہوا تھا اس لڑکے نے یا نہیں۔ بی اے نہ پتہ تو اس کے گھر والوں نے شاید آپوں آپ ہی لگا دی تھی۔ سعودی عرب

میں کونسا بہت بڑا افسر لگا ہوا تھا۔

پر خیر ——

شگو کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔ کیونکہ پھوپھا رفیق اسے پکار رہے تھے۔

وہ ——

جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ سامنے ہی اونچے چوبی نکیئے والے پھوپھو کی شادی کے پرانے سے پلنگ پر رفیق نیم دراز تھے۔

شگو نے سلام کیا۔

اور ——

پھر ——

جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "کیا ہوا پھوپھا جی ——"

ربیعہ امی کا بستر ٹھیک کر رہی تھی۔ چادر پھیلاتے ہوئے شوخی سے بولی۔ "شگو اب تو تم باقاعدہ نرس بن گئی ہو ——"

"ہوں ——"

"آج کام پہ جا رہی ہو نا ——"

"ہاں ——"

"میری مانو ——"

"کیا ——"

"اب تم امی کو آنٹی اور ابا کو انکل کہا کرو۔ پھوپھی اور پھوپھا جیسے پرانے

القاب تمہارے منہ سے بالکل نہیں سجتے ——"

" واقعی ——" شگو خوش ہو کر بولی۔ ربیعہ کی چوٹ تھی بھی غیر محسوس
اسے شگو نے تو نہیں، ہاں رشیدہ نے محسوس کیا اسی لئے ربیعہ کو گھورا
ربیعہ منہ پھیر کر مسکرانے لگی۔

رفیق نے شگو کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ " واہ وا —— ہماری بیٹی تو
واقعی نرس دکھائی دے رہی ہے "

" ہاں انکل ——"

رفیق اور رشیدہ ہنس پڑے۔

رفیق قدرے توقف کے بعد بولا۔ " اے بیٹی انکل اور آنٹیاں
جیسے تھوڑا ہی ہوتے ہیں —— ہم دکاندار قسم کے لوگوں پر پرانے القاب
ہی اچھے لگتے ہیں ——"

" نہیں انکل ——" شگو کو تو موقع ہاتھ لگا تھا۔ شوخ ہوئی جا رہی تھی
رفیق پھر ہنس پڑا۔

" ہاں تو آج ڈیوٹی دینے جا رہی ہو ——" وہ کچھ دیر بعد بولا۔

" بالکل انکل جی ——"

" بڑا اچھا لگ رہا ہے بیٹی پر یونیفارم ——"

" آپ نے جو کے ٹی دی تھی نا اسی کا سلوایا ہے ——"

" واہ —— وا ——"

" اور دیکھیں پھوپھا ——"

" ادن ہوں انکل ——" ربیعہ نے اس کی بات درمیان ہی سے اچک لی۔

" ہاں انکل —— میں نے تین یونیفارم نبوائے ہیں، لیکن آج پہلے دن آپ
کے دیئے ہوئے کپڑے کا یونیفارم پہن کر جا رہی ہوں —— یونہی کر رہی ہوں
مس سے ——"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

" بابرکت ہوگی ——" پھپھو بولی۔

" انشاءاللہ ——" رفیق نے کہا۔

" ہاں تو —— میں پوچھنا بھول ہی گئی۔ آپ کی طبیعت کو کیا ہوا۔ شوگر
زیادہ تو نہیں ہو گئی ——"

شگو نے ہمدردی اور پیار سے پوچھا۔

" ہو گئی ہے تو ہونے دو —— اب فکر کس بات، اپنی بیٹی باقاعدہ نرس
بن گئی ہے، تیمارداری تو کرے گی اور زیادہ بیمار پڑ گئے تو ٹھاٹھ سے اپنے
شاندار کلینک میں علاج کروا لے گی، کیوں ——؟"

شگو حامی بھرتے بھرتے رک گئی۔ جلدی سے بولی۔ " اللہ نہ
کرے جو آپ اتنے بیمار ہوں۔ ویسے اب میں آپ کی شوگر خود ہی باقاعدگی
سے ٹسٹ کیا کروں گی۔ اور دوائی بھی کھلایا کروں گی —— پرہیز بھی مکمل
کروایا کروں گی "

" جیتی رہو ——" پھپھو نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔

" پرہیز والی غلط بات ہے ——" رفیق نے ہنس کر کہا " باقی سب ٹھیک"

"دیکھوں گی آپ کیسے......"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی صغیر کتابیں اٹھائے میں آگیا اور شگو سے بولا۔

"آپا بھائی جان بلا رہے ہیں"

"اچھا — آئی —" شگو نے بیگ کا فیتہ کندھے پر درست کیا، پھپھو اور رفیق کو سلام کر کے ربیعہ کو "بائے" کہا۔ اور مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

گلی میں سکوٹر لئے طاہر اس کا منتظر تھا۔

وہ آج پھر دوست سے سکوٹر مانگ کر لایا تھا۔ شگو کو کینٹ تک چھوڑنے کا وعدہ جو کیا تھا۔

شگو باہر آئی

طاہر اسے دیکھتا رہ گیا۔ آج وہ واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"کیوں —"

شگو نے کچھ شرمیلی ادا سے اسے دیکھا۔

"ایمان سے بہت اچھی لگ رہی ہو —" طاہر بے اختیار بولا۔

"چلو پھر جلدی سے مجھے ڈراپ کر آؤ —" وہ بولی۔

"یہیں بیٹھو گی"

"کیا حرج ہے۔ کون دو فرلانگ پیدل چل کر پچھلی سڑک تک جائے۔

بری بات ہے۔ پتہ ہے۔ گلی والے لوگوں کا۔ باتیں بنائیں گے۔"

"بنانے رہیں اب ان سے ڈر ڈر کر جینے سے تو رہے اور جب گھر والوں کو اعتراض نہیں تو انہیں کیا —"

شگو اچک کر پچھلی سیٹ پر بیٹھنے لگی۔

"بھئی سٹارٹ تو کرنے دو۔ گرانے لگی تھیں ابھی —"

طاہر نے سکوٹر اسٹارٹ کیا۔ شگو اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔

پتہ نہیں محلے والوں نے انہیں دیکھا یا نہیں۔ دونوں اس بات سے بے پروا ہو گئے۔ انہیں تو ایک دوسرے کی قربت کا احساس تھا بس۔ قربت جو دہکتے جسموں کی حدت سے تپ رہی تھی۔

شگو نے کام تو بڑے شوق اور خلوص سے شروع کیا لیکن وہ جلد ہی اکتا گئی شبنم کلینک میں ہر فرد کی کارکردگی معیاری تھی۔ ڈاکٹر سمیع نے ڈسپلن رکھا ہوا تھا یہ ٹھیک ہے کہ یہ مہنگا ترین کلینک تھا لیکن یہاں علاج بھی پوری ایمانداری سے کیا جاتا تھا اور مریضوں کی دیکھ بھال اور سہولت کے لئے بھی بہت کچھ ہوتا تھا۔ موت زندگی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

باقی شبنم پولی کلینک کے ڈاکٹرز نرسیں اردلی اور دوسرا سارا عملہ دیانتداری سے کام کرتا تھا۔ کسی مریض یا اس کی دیکھ بھال کے لئے ساتھ آئے ہوئے فرد کو عملے سے کبھی شکایت نہ ہوئی تھی۔ اسی لئے لوگ یہاں آتے تھے۔ اور دوسرے کلینکس پر اس کلینک کو ترجیح دیتے تھے شفقت اور محبت سے مریض کی دیکھ بھال ہو تو بیماری آدھی رہ جاتی ہے۔ یہ مقولہ یہاں صحیح ثابت ہوتا تھا۔

ڈیوٹی کو پورے خلوص سے ادا کرنے والے ڈاکٹرز اور مستعدی سے کام

کرنے والی نرسیں موجود تھیں انتظامیہ بڑی سخت تھی۔ کلینک کا نظام بڑی ترتیب طریقے اور سلیقے سے چل رہا تھا۔

ڈاکٹر سمیع کسی کی کوتاہی یا سستی برداشت نہیں کرتے تھے یہاں ہر فرد کو آٹومیٹک مشین کی طرح کام کرنا ہوتا تھا۔

شگو نے شروع میں تو آٹومیٹک مشین بن کر کام کیا۔ اس کی ڈیوٹی ڈاکٹر اسد کے ساتھ تھی۔ صبح ڈاکٹر اسد راؤنڈ لیتے تو وہ تھرمامیٹر سٹیتھوسکوپ سلور کی ٹرے میں رکھے ان کے ساتھ ہوتی۔ ہر کمرے میں مریض کے چارٹ پر اس کی کیفیت ڈاکٹر کے بتانے پر لکھنا اس کا کام تھا۔ بخار۔ پلس اور بلڈ پریشر دیکھ کر ڈاکٹر اسے نوٹ کرنے کی ہدایت دیتا۔ شام کو بھی جب ڈاکٹر راؤنڈ لیتا وہ اس کے ساتھ ہوتی۔ سارا دن بھی مریضوں کی تیمارداری میں گزرتا۔

انہیں وقت پر دوائی دینا۔ ٹمپریچر لینا اس کے ذمے تھا۔ صبح وارڈن سے بیڈ شیٹس اور پلو کور لا کر دوسری نرس کے ساتھ بستر بدلنا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔

روز روز ایک سے کام کر کے وہ اکتا سی گئی۔ امتحان کے بعد چھٹیاں رہی تھیں۔ رزلٹ آنے تک بیکار تھی۔ گھرداری اماں کے سپرد تھی اس نے چند ماہ بڑے آرام سے گزارے تھے۔

اب ایک دم جو آٹومیٹک مشین بننا پڑا تو وہ گھبرا گئی۔ ویسے بھی کونسا اس کا

دلپسند کام تھا۔ وہ تو دوسروں سے اپنی خدمت کروانے کے سہانے خواب دیکھتی چلی آئی تھی۔

یہاں دوسروں کی خدمت کرنا پڑتی تھی۔

کسی کا بستر ٹھیک کرنا ہے۔

کسی کو دوائی دینا ہے۔

کسی کو کھانا کھلانا ہے۔

کسی کا بی پی چیک کرنا ہے۔

کسی کو سہارا دے کر وھیل چیئر پر بٹھانا ہے۔

کسی کو ٹرالی پر لٹا کر آپریشن تھیٹر پہنچانا ہے۔

کسی کا یورین ٹسٹ کروانے کے لئے بھیجنا ہے۔

کسی کی بلڈ رپوٹ لانی ہے۔

سارے ہی ناپسندیدہ کام تھے اس کے لئے۔ خدمت گزاری کا جذبہ تھا ہی کب اس میں۔ اسے پچھتاوا آتا کہ کیوں اس نے نرسنگ کی تھی۔

لیکن ——

وہ ڈاکٹر بھی تو نہ بن سکتی تھی۔ بیوہ ماں کے وسائل کہاں تھے اور وہ خود بھی نوانتے نمبر نہ لے سکی تھی کہ پری میڈیکل میں داخلہ ملتا۔

لیکن ——

اب ——

وہ کلینک میں ڈاکٹرز کو دیکھتی تو حسد محسوس کرتی۔ کتنی شان تھی ڈاکٹروں کی

ٹھاٹھ سے کلینک آتے تھے۔ مریضوں کو دیکھتے تھے، ایڈمٹ کرتے تھے دوائیاں لکھتے تھے اور باقی ساری دیکھ بھال نرسوں کے ذمے ڈال کر بھاری بھاری فیسوں سے جیبیں بھر لیتے تھے۔

کاش وہ بھی ڈاکٹر ہوتی۔ یہ خدمت گزار لونڈی نہ بنتی۔

خدمت گزار لونڈی۔ جس کی کوئی وقعت تھی نہ عزت۔ اس نے جلد ہی محسوس کر لیا تھا کہ نرس کا معاشرے میں کوئی خاص مقام نہیں ہے عزت نہیں ہے وقعت نہیں ہے۔

مقام ہے تو ڈاکٹروں کا۔

عزت ہے تو ڈاکٹروں کی۔

وقعت ہے تو ڈاکٹروں کی۔

وہ ہر وقت یہی سوچتی رہتی اور ایسی ہی سوچوں نے اسے اپنے پیشے سے کسی حد تک متنفر بھی کر دیا۔

وہ کام میں تساہل برتنے لگی۔

لیکن

تساہل کا ایک لمحہ بھی اس کلینک میں گوارہ نہیں تھا۔ یہ الارم کی طرح بج اٹھتا تھا اور ڈاکٹر سیمع کے چوکنے کانوں تک پہنچ جاتا تھا۔

کسی مریض کے ساتھ وہ قدرے رکھائی سے پیش آئی تھی۔ بڑبڑ کرتی وہ سٹاف روم میں چلی آئی۔

یہاں ڈیوٹی سے فارغ نرسیں گپ شپ لگا رہی تھیں۔ رچنا اور بیلا نے

تو چائے منگوائی ہوئی تھی۔ سٹاف نرس نجمہ اپنے بیگ سے سینڈوچ نکال کر دونوں کو آفر کر رہی تھی۔

"کیا ہوا شیگی ——" رچنا نے اس کو منہ پھیلائے دیکھا تو پوچھ لیا۔

"تنگ کر دیا اس چڑچڑی بڑھیا نے ——" شیگی دھم سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کس بڑھیا نے ——" بیلا نے پوچھا۔

"وہ روم نمبر نائن میں ہے۔ صبح سے دماغ چاٹ لیا ہے بار بار بلاتی ہے میں تو اب چھوڑ کر چلی آئی ہوں۔ جہنم میں جائے۔"

"کیا ——"

بیلا رچنا اور نجمہ نے حیرت سے بے اختیارانہ کہا۔

شگو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

سر صوفے کی پشت پر ڈال کر آنکھیں موند لیں اور بولی۔ "میں تو اب نہیں جاؤں گی۔"

نجمہ جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب آئی اور حیرانگی سے بولی۔ "کیا کہہ رہی ہو شیگی۔ تم یہاں ملازم ہو۔ نرس ہو۔ تمہارے پیشے کا تقاضہ ہے اور اس کلینک کے سخت ڈسپلن ——"

"جہنم میں جائے ڈسپلن —— تنگ آ گئی ہوں میں تو ——" شگو نے سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

رچنا بولی۔ "لگتا ہے نوکری نہیں کرنا تجھے۔"

بیلا نے کہا۔ "خوش قسمت ہو جو یہاں نوکری ملی ہے۔ یہ نوکری چھوٹ گئی تو پھر ایسی جگہ ملے گی نہیں ——"

"میں نوکری چھوڑنے کا تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں ——" شگو نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

سٹاف نرس نجمہ نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔ "باتیں تو نوکری چھوڑنے والی کر رہی ہو ——"

شگو چپ رہی تو رچنا بولی۔

"تم ابھی جاؤ —— پیشتر اس کے کہ —— کہ نمبر نائن کی پیشنٹ کمپلینٹ کرے۔ تم اس کی دیکھ بھال کرو۔"

"ابھی تو میں نہیں جاؤں گی ——" شگو نے ضد کی۔

"بے وقوف لڑکی ——" ادھیڑ عمر نجمہ نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"تم نرس ہو۔ یہاں تمہیں تمہارے کام کے عوض سے تنخواہ ملے گی۔ مریض صحت یاب ہونے پر اپنے طور پر بھی تمہیں خوش کریں گے۔"

"میں نے خیرات، زکوٰۃ نہیں لینی ——" شگو نے جھٹ سے کہا۔

"نہ لو —— لیکن تنخواہ تو لو گی —— اس کے عوض کام بھی کرنا پڑے گا ——" نجمہ نے کہا۔

"بعض پیشنٹس ایکسٹرا کام لیتے ہیں۔" اس نے گلہ کیا۔

"نہیں شیگی ——" رچنا بولی۔ "یہ ان کا حق ہے وہ جو اتنی بھاری

بھاری فیسیں دیتے ہیں۔ اتنے بڑے بڑے اخراجات برداشت کرتے اور صحت یاب ہونے پر نرسوں ڈاکٹروں اور دیگر عملے کو خوش کرنے کے علاوہ بڑے بڑے ڈونیشنز بھی کلینک کو دیتے ہیں۔ نرس سے خدمت لینا ان کا حق ہے ——"

"ہونھ ——" شگو نے ناک سے آواز نکالی۔

شاف نرس نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"اٹھو —— جاکر اپنے پیشینٹ کی خبر لو —— ایسا نہ ہو کہ وہ کمپلینٹ کر دے —— بات ڈاکٹر سیمع تک پہنچی تو بوریا بستر گول ہو جائے گا ——"

شگو نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

بیلا نے ہنس کر کہا۔ "نئی ہے نا —— یہاں کے قوانین اور قاعدے نہیں جانتی پوری طرح ——"

"جاؤ بے وقوفی نہیں کرو۔ اپنے رویے کی تلافی کرو۔ بات ڈاکٹر سیمع تک نہیں پہنچنی چاہیئے ——"

لیکن ——

بات ڈاکٹر سیمع تک خدا جانے کیسے پہنچ گئی۔ روم نمبر ۱ کی مریضہ نے خود تو شکایت نہیں کی تھی۔

لنچ بریک میں شگو شاف روم میں آئی۔ نصر ماس سے چائے انڈیلی اور قیمے کا پراٹھا نکال کر کھانے لگی۔ پراٹھا اس نے دوسری لڑکیوں کو بھی آفر

کیا۔ رچنا اس کی دوست بن گئی تھی۔ اس نے ایک نوالہ توڑا۔ باقی لڑکیوں نے شکریہ کہہ دیا۔

سب اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ کھانے کے لیئے لے کر آتی تھیں چائے کینٹین سے منگوا لیا کرتی تھیں۔ شگو گھر سے چائے لے کر آتی تھی کینٹین کی چائے میں سے تو اسے دوائیوں کی بو آتی تھی۔

سب باتیں کرتے ہوئے کھانے پینے میں مصروف تھیں۔ زیادہ تر باتیں پیشنٹس ہی کی ہو رہی تھیں۔

"روم نمبر چھ میں نیا مریض آیا ہے اتنا ینگ اور ہینڈسم ہے۔ پر بیچارہ درد سے تڑپ رہا ہے" ناصرہ نے کہا۔ سب اس سے بیماری کی نوعیت پوچھنے لگیں۔ شگو چائے پیتی رہی۔

"مسز عمران کا کیا ہوا ——؟" شاہدہ نے بیلا سے پوچھا۔

"میں انہیں کے ساتھ تو تھی صبح سے لیبر روم میں"

"ڈلیوری ہو گئی ——"

"ہاں ——"

"کیا ہوا ——"

"بیٹا ——"

"سچ ——"

"ہاں ——"

"بہت خوش ہوں گے وہ سب لوگ ——"

"اتنے خوش کہ بچے کی دادی نے اسی وقت پانچسو روپے مجھے پکڑا دیے
یہ خوشخبری سب سے پہلے میں نے انہیں دی تھی"
کئی نرسوں نے رشک سے اسے دیکھا۔ پانچسو روپے
ان کے لئے بہت زیادہ تھے نا۔
شگو نے بھی سنا۔ اسے بیلا کو پانچ سو روپے ملنے پر رشک نہیں
ہوا تھا۔ ہاں وہ ان لوگوں کی امارت سے مرعوب ہو گئی، جنہوں نے خوشخبری
دینے والے کو پانچ سو روپے تھما دیئے تھے۔
وہ پیراٹھے کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے بولی۔ "بہت امیر ہوں گے
"ایک تو امیر ——" بیلا نے کہا۔ "دوسرے پورے پندرہ سال بعد
بچہ ہوا ہے مسز عمران کے —— مجھ سے وعدہ کیا ہے انہوں نے
کہ بچے کی خوشی گھر جا کر کریں گے۔ تو مجھے بھی بلائیں گی۔ اور شاندار
تحفہ بھی دیں گی ——"
"تیری تو عیش ہو گئی ——" دو تین لڑکیاں بولیں۔
"بالکل ——"
پھر ——
وہ سب اس سے پانچسو روپے کی خوشی میں ٹریٹ لینے کا اصرار کرنے
لگیں —— لنچ بریک ختم ہو گئی۔
سب نے اپنا اپنا کھانا پینا ختم کیا۔ شگو نے تھرماس بند کیا
باتھ روم میں جا کر ہاتھ منہ دھویا بالوں میں برش پھیرا اور باہر آ گئی۔

بعد شیگی ——" شگو کمرے سے نکلنے والی تھی۔ کہ چپڑاسی نے
اسے پکارا۔
"کیا ہے رحمو ——"
"آپ کو ڈاکٹر صاحب نے بلایا ہے ——"
"مجھے ——"
"یس سر ——"
"کس ڈاکٹر نے ——"
"ڈاکٹر سمیع صاحب نے ——"
"سمیع صاحب نے ——؟" شگو نے گھبرا کر پوچھا۔
اس کے ساتھ کھڑی بیلا اور رچنا بھی حیران ہوئیں۔
"جی ——"
"ابھی ——"
"جی ہاں ——"
"تم چلو میں آتی ہوں —— اپنے آفس میں ہیں وہ ——"
"جی ہاں ——"
"اچھا تم جاؤ ——"
رحمو کے جاتے ہی رچنا اور بیلا نے اس کے پہلو میں ٹھوکا دیتے ہوئے
کہا، "بس —— ہو گئی کمپلینٹ ——"
"لیکن کس نے ——" شیگی پریشان ہو گئی۔

"کسی نے ٹوکی ہوگی ——" بیلا بولی۔ پھر سرگوشی کے انداز میں
متنبہ کیا۔
"سٹاف نرس نجمہ کے سامنے ہی تو بک بک کر رہی تھی تو۔"
رچنا نے کہا۔ "تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا شگی ——"
شگو پریشان ہوگئی۔
رچنا اور بیلا نے اسے ڈاکٹر سمیع کے پاس جانے کے لئے کہا۔
"وہاں زیادہ بڑبڑ نہیں کرنا —— سوری بول دینا —— سمجھیں۔
اکڑ دکھائی تو نوکری سے نکال دی جاؤ گی —— ڈاکٹر سمیع صاحب بہت
سخت قسم کے آدمی ہیں ——"
وہ ——
وہ ڈرتی۔ سہمی۔ ڈاکٹر سمیع کے آفس کی طرف چل دی۔
اور ——
واقعی ——
ڈاکٹر سمیع تک کمپلینٹ پہنچ چکی تھی۔
شگو ان کے شاندار آفس میں داخل ہوئی۔
ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر نظر پڑتے ہی سمجھ گئی۔ وہ بہت متین اور
سنجیدہ نظر آرہے تھے۔
"دیکھو شگی ——" ڈاکٹر سمیع نے چند رسمی باتوں کے بعد کہا۔ "یہ
کلینک چل ہی اپنے ڈسپلن اور اچھی کارکردگی کی وجہ سے رہا ہے۔"

وہ چپ رہی۔
ڈاکٹر چند منٹ اسے لیکچر دیتا رہا ——
شگو سر جھکا کر کھڑی رہی۔
ڈاکٹر صاحب نے یہاں کے قواعد ضوابط بھی سرسری طور پر اس کے
سامنے دہراتے ہوئے کہا۔
"یہ سب باتیں آپ کو بتا دی گئی تھیں ——"
"یس سر ——" وہ ہولے سے بولی۔
"مجھے شکایت ملی ہے ——"
"سوری سر ——"
ڈاکٹر چند لمحے چپ رہا۔
پھر ——
تنبیہی لہجے میں بولا۔
"میں اس دفعہ آپ کو صرف وارننگ دے رہا ہوں۔ آیندہ محتاط رہنا
ہوگا۔ یہ بھی محض اس وجہ سے کہ ایک تو آپ نئی ہیں —— دوسرے ڈاکٹر آصف
نے آپ کی پرزور سفارش کی ہوئی ہے۔"
"تھینک یو ڈاکٹر ——"
ڈاکٹر نے اسے اب قدرے ملائمت سے سمجھایا۔ اخلاقی تقاضوں اور
احساس فرض کی باتیں کیں۔
وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"اب آپ جا سکتی ہیں۔ یہ پہلی اور آخری وارننگ ہے۔ آئندہ
شکایت نہ ملے۔ سمجھ گئیں نا ——"

"یس سر ——"

"اب آپ جا سکتی ہیں ——"

"تھینک یو سر ——"

وہ آفس سے باہر آ گئی۔

شام گھر آکر اس نے ساری باتیں طاہر کو بتائیں پھر ہنستے ہوئے بو

"آج بوریا بستر گول ہو جانا تھا اپنا ——"

"کیا فرق پڑتا —— یہاں نہیں کہیں اور مل سکتی تھی ملازمت : طاہر
اس کی تسلی کے لئے کہا۔

"نہیں طاہر —— ایسی ملازمت کہیں اور نہیں مل سکتی ——" شگ
نے کہا۔

"تو پھر ہوش مندی سے کام لیا کرو ——"

طاہر نے سمجھایا۔

"بس غصہ آجاتا ہے —— اکتاہٹ ہونے لگتی ہے ——"
نے کہا۔

"وہ تو ہوگی۔ میں حیران ہوں۔ تم لوگوں کی خدمت کیسے کرتی ہو۔ تمہا
خمیر میں تو یہ شے ہے ہی نہیں ——"

طاہر حیرانگی سے بولا۔

شگو بولی : مجبوری ہے —— یہ راہ اپنائی ہے تو اس پر چلنا بھی پڑے
گا ——"

"اس امید پر کہ یہ راہ کسی شاندار منزل پر ختم ہوگی —— ہے نا ——"

شگو نے بڑے پیار سے اسے دیکھا اور سر ہولے سے ہلاتے ہوئے
بولی۔ "خیال تو یہی ہے ——"

طاہر اس کی پیار بھری نگاہ سے بہک گیا تھا۔

"شیگی ——"

"کیا ہے ——"

"تم پاگل تو نہیں ہو ——"

"کیوں ——"

"یہ ابھی ابھی جو صاحب ادھر گئے ہیں ——"

"ہاں ——"

"ان سے اتنی بدتمیزی سے کیوں پیش آئیں ——"

"تمیز سے پیش آنا ایسے بے ہودہ لوگوں کو سر چڑھانے کے۔"

"بے ہودہ —— کیا بک رہی ہو ——"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ وہ کئی دنوں سے میری راہ میں آنے کی کوشش، ہے۔ خواہ مخواہ باتیں کرنے۔"

"اری پاگل —— جانتی ہے وہ کون ہے ——"

"ہوگا کوئی —— مجھے کیا غرض پڑی ہے جاننے کی ——"

"غرض ہے —— اور جو تو سمجھ رہی ہے نا کہ وہ تجھ سے خواہ مخواہ باتیں کرنے کی کوشش کرتا ہے یا تیری راہ میں آتا ہے —— تو یہ تیری غلط فہمی ہے —— یا محض اتفاق —— اسے کیا پڑی ہے —— کہ اک معمولی نرس ——"

"نرس معمولی سہی —— لیکن میں معمولی نہیں ہوں۔"

"شیگی پتہ ہے وہ کون ہے ——"

"بیلا میں نے کہا نا مجھے جاننے کی ضرورت نہیں ——"

"بے وقوف وہ اس کلینک کے مالک کا بیٹا ہے —— ڈاکٹر سمیع کا بھتیجا ——"

بیلا کے انکشاف پر شیگی نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

بیلا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"بیوقوف لڑکی —— اپنا مزاج ٹھکانے پہ رکھا کر —— ورنہ نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھے گی کسی دن۔"

شیگی اب بھی حیران حیران نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کلینک کی ساری مینجمنٹ اب اس کے ہاتھ ہے۔ ڈاکٹر سمیع کے بھائی نے اب چارج بیٹے کو دے دیا ہے۔ مراد حال ہی میں کوئی مینجمنٹ کا کورس کر کے امریکہ سے آیا ہے ——"

"اچھا ——"

"تجھے تو گردوپیش کی کچھ خبر ہی نہیں ہوتی ——"

"بیلا میں نے تو اس سے ایک دفعہ نہیں دو تین دفعہ —— بدتمیزی کی ہے ——"

"کیا شکل وصورت سے تجھے وہ آوارہ اور بے ہودہ لگتا تھا؟"

"میں نے —— میں نے اس کی شکل وصورت کی طرف کبھی دیکھا ہی نہیں ——"

"اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تو اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتی ہے اس لئے یہ سمجھی کہ وہ جان بوجھ کر تیری راہ میں آ رہا ہے۔ اس کا آفس ہی اس طرف ہے —— اس برآمدے سے گزر کر جانا ہوتا ہے اب یہ اتفاق ہے کہ جب وہ جاتا ہے تجھے کسی روم میں جانا ہوتا ہے —— یا اسے آنا ہوتا ہے۔"

"ہاں ——"

"مکراتی تو رہی ہے اس سے اور غصہ اس پر جھاڑتی رہی ہے۔"

"شاید —— شاید —— بیلا ایسا ہی ہوتا ہو ——"

"آج بھی میں نے دیکھا غلطی تیری تھی۔ لیکن تو اس پر برس پڑی، وہ خاموشی سے آگے نکل گیا۔"

شگو پریشان سی بیلا کو تکنے لگی۔

"تجھے یہاں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے۔ تیری ایک کمپلینٹ سیمع تک جا چکی ہے۔ مراد بھی بگڑ گیا تو چھٹی ہو جائے گی۔"

"ہاں —— لیکن اب میں کیا کروں —— مراد صاحب پر میرا امپریشن خراب ہی پڑا ہوگا۔"

"تو اور کیا ——"

"اب کیا کروں —— کہیں واقعی وہ مجھے چلتا نہ کر دیں —— آج تو میں نے ——"

"یوں کر ——"

"کیا ——"

"ان کے کسی ایکشن لینے سے پہلے ہی تو انہیں سوری بول دے اور کہہ دے کہ تم انہیں جانتی نہیں تھیں، اس لئے ——"

"بدتمیزی ہو گئی ——"

"ہاں ——"

"لیکن ——"

"لیکن ویکن کچھ نہیں، اپنی جاب کا تحفظ چاہتی ہو تو قصور مان لے۔ ورنہ ہو سکتا ہے مراد سیمع سے بات کریں، اور ڈاکٹر سیمع جو تجھے پہلے ہی وارننگ دے چکے ہیں۔ غصے میں آ کر تجھے نوکری سے نکال دیں۔ پاگل لڑکی اس کلینک جیسی نوکری تجھے اور کہیں نہ ملے گی۔"

"وہ تو ہے ——"

"اور آئندہ سے اپنا بھیجہ جگہ پہ رکھ کر —— نوکری تیری طرح نہیں کرتے۔ اور پھر نرس کی جاب —— بڑے صبر وتحمل اور خوش اخلاقی کی متقاضی

ہوتی ہے۔ مانا کہ تو بہت اچھے گھرانے کی لڑکی ہے۔ تجھے نرس نہیں بننا تھا۔ تیرے آدرش بہت اونچے ہیں۔ لیکن یہ بھی مت بھول کہ تو ہمارے ملازمت کر رہی ہے۔ بحیثیت ایک نرس کے تجھے حد سے زیادہ خندہ خوش اخلاق اور شائستہ ہونا چاہیئے۔"

شگو بیلا کی باتوں سے زیادہ مراد کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جو اس کلینک کا مالک تھا۔ جس کے ہاتھ میں اس کلینک کی مینجمنٹ تھی۔ جو امر سے تعلیم حاصل کر کے آیا تھا۔

اور ـــــ

جس کے ساتھ آج تو اس نے اچھی خاصی بدتمیزی کی تھی۔

"بیلا ـــــ"

"ہاں ـــــ"

"میں ابھی جا کر معذرت نہ کر لوں مراد صاحب سے ـــــ"

"کر لو ـــــ برائی کیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہارے بارے میں غلط رائے قائم کر چکا ہو، معذرت کرنے سے یہ غلط فہمی دور ہو سکتی ہے"

"جاؤں ـــــ"

"ہاں اس وقت تم فارغ ہی ہو ـــــ"

"تین بجے روم نمبر تین کے مریض کو دوائی دینی ہے۔ ابھی آدھ گھنٹہ ہے۔ جاؤں ـــــ"

"جاؤ ـــــ"

بیلا بھی اس وقت فری تھی، دونوں سٹاف روم کے برآمدے میں کھڑی تھیں۔

"آؤ میرے ساتھ ـــــ" شگو نے اس سے کہا۔

"میں کیا کروں گی ـــــ"

"مجھے اکیلے جاتے ڈر لگتا ہے ـــــ"

"ڈر کی کیا بات ہے۔ کھا تھوڑا ہی لے گا تجھے ـــــ جا ـــــ ضرور ـــــ تیرا امپریشن ٹھیک ہو جائے گا اس معذرت سے۔"

شگو نے معذرت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اپنے حق میں یہی اچھا تھا اسی لئے وہ مراد کے آفس کی طرف چل دی۔

اس پر قدرے گھبراہٹ طاری تھی۔ ندامت کا احساس بھی ہو رہا تھا خوفزدہ سی بھی تھی ـــــ پھر بھی ہولے ہولے قدم اٹھاتی مراد کے آفس کی طرف جا رہی تھی۔

برآمدے میں آکر وہ رک گئی۔ دوپٹہ ٹھیک کیا یونیفارم کی سفید کوٹی کے بٹن لگائے۔

"کس سے ملنا ہے سسٹر ـــــ" برآمدے کے پرلے سرے سے چپڑاسی ادھر آکر بولا۔

"مراد صاحب سے ـــــ اندر ہیں ـــــ" شگو نے ہولے سے پوچھا۔

"ہاں ہیں ـــــ"

"میں اندر جا سکتی ہوں ——"

"آپ ٹھہریئے۔ میں پہلے انہیں اطلاع کر دوں ——"

"کیا کہوگے ——"

"آپ اپنا نام بتا دیں ——"

"مس شگفتہ ——"

"اچھا آپ ٹھہریں —— میں صاحب سے پوچھ لوں۔ ہو سکتا ہے بہت مصروف ہوں ——"

چپڑاسی اندر چلا گیا۔

شگو برآمدے کے ستون سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

چند لمحوں بعد چپڑاسی باہر آ گیا۔

"آپ اندر جا سکتی ہیں مسٹر ——"

"اچھا ——"

شگو نے پھر سے دوپٹہ درست کیا۔

بالوں پر ہاتھ پھیرا اور دھک دھک کرتے دل کو سنبھالتے ہوئے دروازے میں داخل ہو گئی۔

بڑا آراستہ پیراستہ آفس تھا دبیز قالین۔ بھاری پردے چکنی آفس ٹیبل کے پیچھے گھومنے والی گدے دار کرسی۔ ٹیلیفون فائیلیں، میز کے ادھر پڑیں تین کرسیاں۔ دیوار پر بڑی سی قائد اعظم کی تصویر۔ پینٹنگز دیوار گیر الماری۔ بک شیلف اور خوبصورت سی وال کلاک۔

مراد ریوالونگ چیئر پر بیٹھے تھے فون پر کسی سے باتیں کر رہے تھے۔

شگو کو دیکھا، ہاتھ سے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

شگو چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گئی اور پھر چپکے چپکے ہی اس نے مراد کا جائزہ لیا۔

سانولے سلونے رنگ کا بیحد سمارٹ اور ہینڈسم نوجوان تھا وہ ——

اس کے طبقے کی چھاپ اس کے چہرے پر تھی۔ اعلیٰ تعلیم نے اس چھاپ کو زیادہ ہی نمایاں بنا دیا تھا۔

دو منٹ تک وہ فون پر کسی سے بات کرتا رہا۔ اس دوران وہ غیر شعوری طور پر کرسی کو ہولے ہولے دائیں بائیں گھمائے جا رہا تھا۔

فون رکھ کر وہ شگو کی طرف متوجہ ہوا۔ کرسی کی پشت سے کمر ٹکا کر وہ قدرے تن کر بیٹھ گیا

شگو کا دل اور بھی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ چہرے پر سرخی اور زردی ڈھل ڈھل کر آنے لگی۔

"یس مسٹر ——" وہ بڑے دلنشین انداز میں بولا۔

"فرمائیے ——"

"جی ——" وہ اس کے لہجے سے مرعوب ہو کر بولی۔

"کس کام سے آئی ہیں ——" وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

شگو حیران ہو کر اسے تکنے لگی۔

کیا اس نے اسے پہچانا نہیں تھا؟

"ہوسکتا ہے اس نے کسی بات کا نوٹس ہی نہ لیا ہو۔ میں خواہ مخواہ ہی آگئی سوری کہنے ——"

شگو نے ایک لمحہ کے لئے سوچا۔ دل ہی دل میں بیلا کو کوسا۔

"جی کہیے ——" وہ کچھ آگے کو جھک آیا۔

شگو اب آ ہی چکی تھی تو معذرت کر لینا ہی چاہیئے تھی۔ اس لئے وہ قدرے جھجکتے ہوئے بولی۔

"میں آپ —— سے —— سوری کہنے آئی ہوں" وہ ہکلائی۔

"جی ——" وہ بڑی دلچسپی سے اسے مسکرا کر دیکھا۔ "سوری۔ مجھ سے —— کیوں ——"

شگو عجیب الجھن میں پڑ گئی۔ پلکیں جھپکا جھپکا کر اسے دیکھا وہ بڑی دلچسپی سے اسے تک رہا تھا۔

شگو سرخ ہو گئی۔

"میں نے —— میں نے آج آپ سے برآمدے میں۔ جب آپ سے ٹکرا گئی —— بہت —— بدتمیزی ——"

"اوہ ——" وہ میز پر ہاتھ مارتے ہوئے ہنس پڑا۔ "تو —— تو آپ تھیں ——"

"جی ——"

"اچھا —— اچھا ——"

"سر میں معذرت خواہ ہوں۔ میں نے آپ کو پہچانا —— نہیں تھا نہ مجھے پتہ تھا کہ آپ اس کلینک کے مالک ہیں —— سوری سر ——"

وہ ہولے ہولے مسکرائے گیا —— اور بڑی دلچسپی اور شوق سے شگو کو دیکھتا رہا۔

"سوری سر ——" شگو نے دوبارہ کہا۔ تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے آئندہ کسی شریف آدمی کے پیچھے پنجے جھاڑ کر یونہی نہ پڑ جایا کیجیے گا"

"بہتر سر ——"

"آپ کا نام ——"

"شیگی ——"

"شیگی ——"

شگو گھبرا کر بولی "شگفتہ سر ——"

"شگفتہ ——"

"یس سر ——"

"شیگی نک نیم ہے ——"

"جی ——"

"ہوں ——"

"میں جاؤں سر ——"

"جا سکتی ہیں ——"

وہ اٹھی۔ مراد بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ جانے کو مڑی تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"آپ یہاں نہ آتیں تو میں شاید پہچان نہ پاتا کہ اتنی اکھڑ لڑکی کون سی ہے۔ سسٹرز کے یونیفارم ایک سے ہوتے ہیں نا ــــ لیکن ــــ اب خیر ــــ"

وہ بے اختیار گھبرا گئی۔

دل ہی دل میں پھر بیلا کو کوسا۔ جس نے بات کا بتنگڑ بنا دیا تھا۔ وہ یہاں آتی نہ وہ اسے پہچان پاتا ــــ معاملہ تو اب نازک ہو گیا ہے اگر اس سے کوئی غلطی کوئی کوتاہی، کوئی بدتمیزی ہو گئی ــــ تو ــــ یہ دم گرفت میں آ

"میں جاؤں سر ــــ"

"جا سکتی ہیں ــــ"

"تھینک یو سر ــــ"

مراد نے آہستگی سے سر ہلاتے ہوئے ہاتھ سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سر جھکائے کمرے سے نکل آئی۔

مراد اسے دیکھتا رہا۔

اور ــــ جب شگو نے برآمدے میں آ کر پیچھے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ ــــ تب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔

شام گہری ہو رہی تھی۔ شگو کلینک کے بیرونی گیٹ پر کھڑی رکشے کا انتظار کر رہی تھی۔ آج اسے تنخواہ ملی تھی۔ پہلی تنخواہ۔ وہ بہت خوش تھی ان پیسوں کو خرچ کرنے کے دل ہی دل میں منصوبے بنا رہی تھی۔ یہ بھی خوش کن سوچ ذہن میں آ رہی تھی کہ ہر ماہ اتنی رقم اب اسے باقاعدگی سے ملا کرے گی، اس رقم میں فی الحال وہ پیسے شامل نہیں تھے جو مریض صحتیاب ہو کر کلینک چھوڑتے وقت اپنی خوشی سے نرسوں میں بانٹ جایا کرتے تھے۔ شگو کو یہ پیسے لینا اچھا نہیں لگتا تھا۔

کچھ سبکی کا احساس ہوتا تھا وہ اسے خیرات کا نام دیتی تھی، اسی بات پر اس کی بیلا اور رچنا سے کئی بار بحث ہو چکی تھی ــــ وہ دونوں اسے سمجھاتیں تھیں۔

اس دن بھی ایک سیٹھ نما مریض ڈسچارج ہوا تھا تو اس نے اپنے اوپر اور تینوں نرسوں کو جاتے ہوئے سو سو روپیہ دیا۔ شگو نے پیسے نہیں

لئے۔ سیٹھ سے اس کے حصے کے پیسے بھی پکڑ لئے۔

جب تینوں سٹاف روم میں آئیں تو بیلا نے شگو کے حصے کا
لہراتے ہوئے کہا۔

"نہیں لینا تمہیں ——"

"نہیں ——"

"کیوں ——" رچنا نے پوچھا۔

"بس —— مجھے یوں پیسے لینا اچھا نہیں لگتا ——"

"نئی نئی آئی ہو نا۔ ابھی اکڑ ہے ——"

"یہی سمجھ لو ——"

"اری پگلی ——" بیلا بولی۔ "یہ پیسہ جانے والے اپنی خوشی سے
دیتے ہیں —— ہماری محنت کا انعام ہوتا ہے۔ ہماری خدمت کے بدلے
خوش ہو کر دیتے ہیں۔"

رچنا نے بھی اس کی تائید کی۔

"انعام ہوتا ہے —— بالکل —— اور بھئی انعام نہ بھی ہو۔ پیسہ تو
ہوتا ہے —— سچی بات ہے کہ ہمیں تو پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"بالکل ——" بیلا بولی۔ "یقین کرو میں اپنی پوری تنخواہ گھر
دیتی ہوں۔ اسی تنخواہ سے میرے دو بھائی تعلیم پا رہے ہیں ایک میڈیکل
کر رہا ہے دوسرا انجینئرنگ —— ان کے سارے خرچے بابا میری تنخواہ
سے پورے کرتے ہیں —— میں اپنا کپڑا لتا۔ جوتے کوسمیٹکس

پیسے سے خریدتی ہوں —— جو اوپر سے ملتے ہیں۔ کیا ہرج ہے۔ ہوں ——"

"بالکل ——"

بیلا کی تائید کرتے ہوئے رچنا بولی۔

"میں بھی ایسے ہی کرتی ہوں۔ جوتے کپڑے اسی پیسے سے لیتی ہوں۔
تنخواہ جمع رہتی ہے۔ کبھی کبھی ماں تنخواہ میں سے کچھ پیسے لے لیتی ہے۔
ورنہ پوری تنخواہ جمع ہو جاتی ہے —— میرے بینک میں کافی پیسے جمع
ہو گئے ہیں۔"

پچھلے ہفتے میرے پاس چھ سو روپیہ اسی طرح جمع ہو گیا تھا ایک مریضہ
نے تو بیٹا پیدا ہونے کی خوشی میں یہ ایئرنگ مجھے دیئے تھے۔

شگو نے اس کے کانوں کی طرف دیکھا۔ بڑے خوبصورت اور نفیس
ایئرنگ تھے۔

"کیا سونے کے ہیں ——" شگو نے پوچھا۔

"ہاں —— نہیں تو پیتل کے ——" وہ بولی۔ "میں نے تو اس
کی دیکھ بھال بھی تو بہت اچھی طرح کی تھی۔ دوست بن گئی تھی میری۔ خاص طور
پر ملنے آئی ہے مجھے۔"

"تم اسے خیرات کہو گی ——" بیلا کے ایئرنگ دیکھتے ہوئے رچنا
نے شگو سے کہا۔

شگو چپ ہو گئی۔

"بھئی ہمیں تو پیسے سے غرض ہے —— خیرات ہو یا انعام فرق کیا

پڑتا ہے ــــــ"

"میں تو ہمیشہ اسے اپنی محنت کا انعام سمجھ کر لیتی ہوں۔"

"ہے بھی انعام ــــــ"

"تو پھر یہ سو روپیہ ــــــ لو گی ــــــ"

شگو چپ رہی۔

"میں تمہاری امانت سنبھال کر رکھے جا رہی ہوں، پورے چار سو پچاس روپے جمع ہو گئے ہیں۔"

"واقعی ــــــ"

"ہاں ــــــ میری ایمانداری کی تعریف کرو میڈیم ــــــ"

"اگر اس نے یہ پیسے نہ لیے تو کیا کرو گی ان کی ــــــ"

"ایک شاندار سی دعوت اڑائیں گے ان پیسوں سے ــــــ"

"بہت اچھا ــــــ گڈ آئیڈیا ــــــ پروگرام بنا ہی ڈالو دعوت کا۔"

"نہیں ــــــ ابھی نہیں ــــــ خواہ مخواہ ضائع نہیں کرنا چاہئیں چند اور انتظار کرو گی۔ میڈیم کا دماغ شاید ٹھکانے آ ہی جائے ــــــ"

"ہوں ــــــ"

یہ پیسے رچنا ہی کے پاس تھے۔

شگو نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

تنخواہ کے پیسے ہی بیگ میں ڈالے وہ کئی پلان بنا رہی تھی۔

رکشہ ابھی نہیں آیا تھا۔

وہ انتظار میں کھڑی تھی کہ اندر سے باہر آتے ہوئے شاندار سی گاڑی اس کے قریب رک گئی۔

اس نے گردن گھما کر دیکھا۔

گاڑی میں مراد بیٹھا تھا۔

اس نے گیٹ سے قدرے پرے ہٹ کر گاڑی کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

مراد نے کھڑکی سے گردن نکال کر اسے دیکھا۔

"ہیلو ــــــ مس ــــــ" اس نے کہا۔ شاید اس کا نام وہ بھول چکا تھا۔

"یس سر ــــــ" شگو اس کی طرف دیکھتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں بولی۔

"یہاں کھڑی ہیں ــــــ"

"جی ــــــ رکشے کے انتظار میں ہوں ــــــ"

"آئیے میں آپ کو جہاں جانا ہے ڈراپ کر دوں گا ــــــ"

وہ گاڑی سے باہر نکل آیا۔

گیٹ کے قریب کھڑے چوکیدار نے ہاتھ اٹھا کر اسے سلام کیا۔ سر کے اشارے سے جواب دیتے ہوئے وہ گاڑی کی چابی انگلی پر گھماتے ہوئے شگو کے پاس آیا

"کہاں جانا ہے آپ کو ــــــ" وہ دلچسپی سے شگو کو تکتے ہوئے بولا۔

"جی گھر ——"

"آئیں میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔ شام گہری ہو رہی ہے۔ آپ کی ڈیوٹی
بجے تک ہوتی ہے نا ——"

"جی ——"

"تو آیئے ——"

"نہیں —— تھینک یو سر —— میرا رکشہ آنے والا ہی ہے"

"آپکا رکشہ ——"

"جی —— میں نے آنے جانے کے لیے رکشہ لگوایا ہوا ہے"

"اگر نہ آیا تو کیسے جائیں گی"

"بس —— بس میں چلی جاؤں گی —— ویسے رکشہ آتا ہی ہوگا۔

شکریہ سر ——"

وہ سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔

مراد واپس گاڑی کی طرف آیا۔

چوکیدار نے پھر اسے سلام کیا۔

وہ گاڑی میں بیٹھ گیا —— گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے اس نے
شگو کو دیکھا۔

شگو نے دانستہ رخ دوسری طرف پھیر لیا۔

وہ گاڑی نکال کر لے گیا۔

شگو اس کی چمکتی دمکتی سبک خرام گاڑی کو دیکھتی رہی۔

"کیا حرج تھا لفٹ لے ہی لیتی ——" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔
"کتنی شاندار گاڑی تھی۔ مزہ آجاتا بیٹھنے کا ——"

لیکن

اپنی اس سوچ پر وہ آپ ہی جھنجھلا گئی۔

یہ جھنجھلاہٹ رکشے پر اتری۔ جس نے آج دیر کر دی تھی۔

"بی بی ——" رکشے والا اپنا قصور مانتے ہوئے گڑگڑایا۔ "دور کی
سواری مل گئی تھی۔ خدا کی قسم وہاں سے خالی رکشہ لے کر آیا ہوں۔ ٹریفک کا حال
آپ جانتی ہیں۔ یہاں پہنچتے دیر ہو گئی"

"یہ دیر معمول نہ بن جائے ——" وہ رکشے میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"نہیں بی بی آئندہ ایسا نہیں ہوگا ——" وہ بولا۔

یہ رکشہ رفیق نے کروا کے دیا تھا وہ رکشے والے کو جانتا تھا۔ اعتباری
آدمی تھا۔

رفیق کی وجہ سے وہ شگو کی ڈانٹ ڈپٹ سن لیتا تھا۔ آج بھی وہ اسی
لئے شگو کی تلخ ترش باتیں سن کر بھی مؤدبانہ لہجے میں بات کر رہا تھا وہ
بڑبڑا کرتی رہی۔

رکشے والا اپنی راہ پر چل دیا۔

وہ رکشے سے اتری۔ گلی میں سے تیز تیز قدم اٹھاتے گھر کی طرف
بڑھی۔ اماں بیرونی دروازے ہی میں کھڑی اس کی راہ تک رہی تھی۔ دیر سے
پریشان تھیں۔

شگو کو آتے دیکھا تو جان میں جان آئی۔

"آج اتنی دیر لگا دی، میرا تو دل ہول رہا تھا ——" اس کے دہلیز پر قدم رکھنے سے پہلے ہی اماں بولی۔

شگو نے آگے بڑھ کر ان کے گلے میں بازو ڈال دیئے۔ "اوہ میری اماں میری اماں —— میری ممی —— میری ——"

"چلی ہٹ —— مت دیر سے آیا کر ——" اماں نے خفگی ظاہر کی۔

شگو اماں کی گردن میں بازو ڈالے ڈالے انہیں صحن کی طرف لے چلی اماں نے بازو نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دروازہ تو بند کر لینے دے ——"

"کر لینا پہلے یہاں بیٹھو ——" اس نے اماں کو شکستہ سی کرسی پر بیٹھا دیا۔

"دیر کیوں کر دی ——"

"رکشہ دیر سے آیا تھا۔ کچھ دیر یہ مٹھائی خریدنے میں ہو گئی، ویسے اماں دیر اب ہوا ہی کرے گی —— عادی ہو جاؤ —— کل سے تو میری باقاعدہ ڈیوٹی ہے۔"

"اچھا چھوڑو —— یہ لو منہ میٹھا کرو ——"

شگو نے ہاتھ میں پکڑا مٹھائی کا ڈبہ کھولا اور ایک ٹکڑا اٹھا کر ماں کے منہ میں ڈالتے ہوئے بولی۔

"مبارک ہو اماں —— آج میں پہلی تنخواہ لائی ہوں"

مٹھائی کا ٹکڑا جیسے اماں کے حلق میں پھنس گیا۔ دکھ اور خوشی کے جذبات گڈمڈ ہو گئے۔ ہاتھ بڑھا کر شگو کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی چوم لی۔ آنکھیں بھر آئیں، انہیں دوپٹے کے آنچل سے پونچھ لیا۔

شگو نے مسکراتے ہوئے مٹھائی کا ڈبہ قریب پڑی چارپائی پر رکھ دیا اور بیگ کھول کر پیسوں کا لفافہ نکال کر اماں کی جھولی میں ڈال دیا۔ اماں آبدیدہ نظروں سے لفافے کو تکنے لگی۔

شگو مسکراتے ہوئے بولی۔ "اماں کھول کر تو دیکھو۔ گن لو۔ پوری تنخواہ تمہاری ہے۔"

"جیتی رہو بیٹی ——"

"خوش ہو نا ——"

اماں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شگو نے ہنس کر کہا

"چہرے سے تو نہیں لگتا ——"

اماں کے آنسو گالوں پر ڈھلک آئے۔

"اوہو ہو —— تم تو رونے لگیں، اماں پوری باقاعدگی سے۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے —— ہوں —— یہ خیال آیا ہو گا —— کہ میں تمہاری بیٹی ہونے کے بجائے بیٹا ہوتی ہیں نا —— یا پھر ابو یاد آ گئے ہوں گے ہوں —— چلو چھوڑو —— اماں —— سب ٹھیک ہے۔ تمہارا بیٹا بھی ہوتا نہ کماتا۔ جتنا میں کماؤں گی۔ ٹھیک ہوں —— چلو اٹھو —— ایک پیالی

گرما گرم چائے کی پلا دو ۔ میں منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو ——"

اماں لفافہ پکڑتے پکڑتے اٹھیں ۔

"ہاں دھو لو منہ ہاتھ —— تمہارے کپڑے اندر کھونٹی پر لٹکا کر رکھے ہیں میں نے ——"

"اچھا اماں ——" وہ بیگ کا فیتہ کندھے پر سے اتارتے ہوئے سامنے والے کمرے میں چلی گئی ۔

شگو کو اب پورا مہینہ نائٹ ڈیوٹی کرنا تھی ، شام سات بجے سے صبح سات بجے تک کلینک ہی میں رہنا تھا ۔ رات کی ڈیوٹی تکلیف دہ تو تھی لیکن اس طرح پورا دن اپنا ہوتا تھا ۔

رات کو فرصت کے وقت سسٹرز شاف روم میں تھوڑی بہت نیند بھی نکال لیتی تھیں ۔ دو تین گھنٹے صبح بھی سو لیتیں اس طرح تھکاوٹ بھی دور ہو جاتی اور دن کو دوسرے کام بھی کر لیتیں ۔

شگو نے شام ڈیوٹی پر جانا تھا ۔ اس لئے آج اس نے بازار جانے کا پروگرام بنایا ۔ تنخواہ مل ہوئی تھی ۔ کچھ چیزیں اپنے لئے کچھ اماں کے لئے ۔ اور کچھ گھر کے لئے خریدنا تھیں ۔

"اماں ——"

"کیا ہے ——"

"اماں —— کچھ پیسے دے دیں ——"

"کہیں جا رہی ہو ——"

"ہاں بازار جا رہی ہوں —— آپ چلیں گی ساتھ ——"

"میں —— میں نے تو شام تک بیگم صاحبہ کے کپڑے تیار کرنے ہیں ——" اماں بولی۔

"ربیعہ آپا یا صبیحہ سے پوچھتی ہوں۔ وہ شاید چلیں ساتھ۔ نہ بھی گئیں تو میں اکیلی ہو آتی ہوں ——"

"لینا کیا ہے بازار سے ——"

"اماں ——"

"ہاں بتاؤ نا ——"

"اماں —— مجھے تنخواہ ملی ہے ——" وہ ہنس کر بولی۔

"تنخواہ لو ملی ہے ——" اماں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"اوٹ پٹانگ چیزوں پر خرچ نہ کرنا"

"اماں یہ تنخواہ تو خرچ ہو گی ساری کی ساری ——"

"ساری کی ساری ——"

"ہاں اماں —— بہت سی چیزیں لانی ہیں۔ اس جمعہ کو ربیعہ آپا اور صبیحہ کی منگنی ہے نا ——"

"ہوں ——"

"اچھے سے کپڑے نہ بنواؤں اپنے لیے —— آپ کے لیے۔ شائستہ کے بچوں کے لیے"

اماں چپ ہو گئی۔

شگو انہیں بہلاتے پھسلاتے ہوئے بولی۔

"پہلی تنخواہ میں سے میں نے بچوں کے لیے کپڑے ضرور لانا ہیں۔ منگنی پر پہن لیں گے"

"اچھا بھئی ——" اماں اٹھتے ہوئے بولی۔

"جو جی میں آئے کر ——"

"تو لائیں پیسے ——"

"کتنے دوں ——"

"چار پانچ سو ——"

اماں نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

شگو چمکارتے ہوئے بولی۔

"انتیس دن بعد پھر ڈھیر سے پیسے لے آؤں گی"

"پیسے لائے گی تو سہی —— جمع کرنا سیکھ —— میں تو سوچ رہی ہوں ایک کمیٹی ڈال دوں —— اکٹھا روپیہ مل جائے تو کوئی بڑی چیز بنا لینا"

"بڑی چیز ——"

"ہاں از قسم زیور ——"

"اوہ ماں —— فکر نہ کر سب کچھ بن جائے گا" شگو نے مسکرا کر کہا۔

"یہ زیور والا معاملہ ابھی بہت دور ہے ——"

اماں نے گھور کر اسے دیکھا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اماں باورچی خانے سے نکل کر کمرے میں آ گئی۔ شگو بھی اس کے پیچھے پیچھے آ گئی۔

اماں نے اپنے بستر کا سرہانہ اٹھایا۔ نیچے سے لوہے کی چابی نکالی اور بائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ اوپر تلے رکھے دو بکسوں میں سے اوپر والا بکس اٹھا کر نیچے رکھا۔ نچلے بکس کو لوہے کا تالہ لگا ہوا تھا۔ اماں نے فرش پر بیٹھے ہوئے تالا کھولا۔

صندوق میں کچھ ریشمی جوڑے پڑے تھے۔ ایک طرف دو تین مخملیں ڈبیاں بھی تھیں۔ جن میں زیور نام کی صرف دو انگوٹھیاں اور ایک جوڑی کانوں کے بالے تھے۔

کپڑے ہٹا کر اماں نے نیچے سے ایک چھوٹا سا بٹوہ نکالا۔ اسی میں اماں اپنی کمائی رکھتی تھی۔ تنخواہ بھی اس نے اسی میں ڈال دی تھی۔

اماں نے بڑی احتیاط سے بٹوہ کھولا ــــ اور چار سو کے لال نوٹ نکال کر شگو کی طرف بڑھائے۔

"ایک اور اماں ــــ" شگو نے بہ منت کہا۔

"بس کافی ہیں ــــ بچوں کے لئے زیادہ قیمتی کپڑے مت لانا۔"

"بہت اچھا ــــ" شگو نے نوٹ پکڑتے ہوئے کہا۔ "بس ایک اور دے دو اماں۔ پانچسو کچھ زیادہ تو نہیں ہیں۔"

"بہت زیادہ ہیں ــــ"

"نہیں ــــ دے دو نا اماں ــــ"

اماں نے پچاس کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"دے بھی دو ماں سو روپیہ۔ ایسی بھی کیا کنجوسی۔ دن گزرتے دیر نہیں لگے گی، پھر تنخواہ آ جائے گی۔ اور ماں وعدہ رہا آئندہ میں تنخواہ میں سے اپنا جیب خرچ نہیں لیا کروں گی۔"

"تو ــــ تو جیب خرچ نہیں لے گی۔"

اماں نے ہنس کر کہا۔

"ہاں اماں ــــ نہیں لوں گی۔ یہ خرچہ میں پورا کر لیا کروں گی۔"

"کیسے ــــ"

شگو نے اماں کو بتایا کہ مریض صحتیاب ہونے پر خاصے معقول پیسے نرسوں میں بانٹ جاتے ہیں۔

اس مہینے تو اس نے یہ پیسے نہیں لئے تھے۔

لیکن

لینے میں ہرج ہی کیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ پیسے وہ اب لیا کرے گی۔ اپنا جیب خرچ انہیں سے پورا کیا کرے گی جیسے دوسری لڑکیاں کر رہی تھیں۔

اماں نے سو روپیہ اسے اور دے دیا۔

اس نے خوش ہو کر ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر ان کے گال پہ پیار کر لیا۔

پھر پیسے بیگ میں ڈالے ـــــ ماں کو خدا حافظ کہا اور پھپھو کے ہاں چل دی۔

گھر میں پھپھو تھی نہ ربیعہ آپا اور نہ ہی صبیحہ۔ تینوں ہی بازار گئی ہوئی تھیں۔

ظہیر گھر پہ تھا۔

"شگو آپا وہ سب ہی بازار گئی ہیں ـــــ آپ کو مل جائیں گی وہیں۔"

ظہیر بولا۔

"ٹھیک ہے۔ میں چلتی ہوں ـــــ"

شگو گھر سے باہر آگئی۔

گلی میں حسبِ معمول خاصی چہل پہل تھی۔

بازار میں بھی بڑی رونق تھی۔

شگو ویگن لینے کے لئے دائیں ہاتھ مڑ گئی ـــــ دوکانوں کے ساتھ ساتھ چلتے وہ ویگن سٹینڈ پر آئی ـــــ جہاں چند منٹ بعد اسے ویگن مل گئی وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

ویگن بازار کے سرے پر ہی رکتی تھی۔ وہ ویگن سے اتر کر فٹ پاتھ پر چلنے لگی ـــــ جو چیزیں خریدنا تھیں ـــــ اس کی فہرست اس نے بیگ میں ڈال رکھی تھی۔

سب سے پہلے وہ اماں کے لئے خوبصورت سا جوڑا خریدنا چاہتی تھی اس لئے ریشمی کپڑے کی دوکانوں کی طرف بڑھنے لگی۔

یہ بازار بھرا پڑا تھا۔ سڑک پر گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ دوکانوں کے سامنے بھی گاڑیاں پارک کی ہوئی تھیں۔ کافی بھیڑ تھی ـــــ دوکانوں میں خاصا رش تھا

لوگ آجا رہے تھے۔

شگو نے ایک بڑی سی دکان سے اماں کے لئے ہلکے فان رنگ کا خوبصورت جوڑا خریدا اسی کے ہمرنگ براؤن پھولوں والا دوپٹہ لیا۔ اپنے لئے بھی شوخ رنگوں والا ریڈی میڈ جوڑا لیا۔

شائستہ کے بچوں کے لئے اس نے درمیانی قیمتوں والے ریڈی میڈ کپڑے خریدے۔

سستے سستے کھلونے لئے۔

تھوڑا سا ڈرائی فروٹ ایک ریڑھی والے سے خریدا۔ اور بیکری سے ایک کیک بھی لیا۔

چیزوں سے لدی پھندی وہ ویگن سٹینڈ کی طرف آرہی تھی ـــــ کہ کسی نے پکارا۔

"مس شگی ـــــ"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ مراد تھا۔

"آپ سر ـــــ"

شگی نے اس کے خوبصورت سراپا پر اک نگاہ ڈالی۔

"ہاں ـــــ بہت شاپنگ کر ڈالی ـــــ لائیے ـــــ" اس نے شگو کا وزن ہلکا کرنے کے لئے اس کے ہاتھ سے بیگ لفافے اور ڈبے لینا چاہیئے۔

"نہیں سر ـــــ" شگو نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کر لئے۔

"تکلف نہ کریں ــــ لائیں ــــ میں اٹھالیتا ہوں" مراد نے اس کے ہاتھ سے دونوں بڑے بیگ لے لیے۔

"کہاں جا رہی ہو ــــ ابھی اور شاپنگ کرنا ہے"

"نہیں ــــ"

"واپس جا رہی ہیں ــــ گھر ــــ"

"جی ــــ"

"کیسے جائیں گی ــــ"

"رکشہ یا ٹیکسی لے لوں گی ــــ"

"اگر مناسب سمجھیں تو ــــ میں آپ کو ڈراپ کر دوں"

شگو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دیکھا۔ وہ بڑے حسین انداز میں اصرار کر رہا تھا۔

شگو کچھ نہیں بولی۔

"آیئے ــــ" مراد نے کہا۔

وہ مسحور سی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

وہ اپنی گاڑی کی طرف آیا۔ چم چم کرتی گاڑی پر شگو کی نگاہیں پھسلنے لگیں۔ کیا حرج تھا لفٹ لینے میں۔ اس دن تو اس نے صرف سوچا تھا لفٹ لینے پر رضامند ہو گئی۔

مراد نے گاڑی کھولی پچھلی سیٹ پر اس کے تھیلے لفافے اور ڈبے رکھے ــــ

پھر دوسری طرف آکر فرنٹ سیٹ کی اسے پیش کش کی۔

"تھینک یو ــــ"

وہ کچھ لجاتے کچھ شرماتے سیٹ پر بیٹھ گئی۔

مراد اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ شگو نے اک نگاہ اس پر ڈالی، اتنا ہینڈسم اتنا باوقار تھا وہ ــــ

شگو نرم اور آرام دہ سیٹ پر کچھ اکڑی اکھڑی بیٹھی تھی۔

"آرام سے تشریف رکھیے مس شیگی ــــ" مراد نے شائستگی سے شگو سے کہا۔

"جی ٹھیک ہوں ــــ"

شگو گھبراہٹ بھرے لہجے میں بولی۔

مراد نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

پھر پارکنگ لائن سے ریورس کر کے گاڑی نکالی۔ بھیڑ میں سے وہ آہستہ آہستہ گاڑی نکال کر سڑک پر لے آیا۔

"آج شاپنگ ڈے تھا آپ کا ــــ"

مراد نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"جی ــــ آج دن بھر فارغ تھی ــــ"

شگو نے کہا۔

"نائٹ ڈیوٹی ہے ــــ"

مراد نے پوچھا۔

"آج سے شروع ہے ——" شگو بولی۔

وہ مختصر مختصر سی باتیں کرتے بیرونی بڑی سڑک پر آ گئے۔ بیرونی چوڑی سڑ
جس کے دونوں طرف کشادہ کشادہ بڑی بڑی خوبصورت خوبصورت دکانیں تھیں
دکانوں کے چوڑے برآمدے تھے ان کے باہر بھی کافی جگہ گاڑیاں اور آنے جا
والوں کے لئے چھوڑی گئی تھی۔

شگو گاڑی میں بیٹھ کر اک انوکھی سی خوشی محسوس کر رہی تھی۔ بہت لطف
آ رہا تھا۔

مراد سے اب جھجک بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

گاڑی رواں دواں چلی جا رہی تھی۔

یہاں ٹریفک کافی تھی۔ لیکن اک تنظیم کے ساتھ گاڑیاں آ جا رہی تھیں، ف
پاتھوں پر بھی لوگ آ جا رہے تھے۔

"سر ——" شگو نے آہستگی سے کہا۔

"ہوں ——"

"سر آپ نے مجھ سے یہ تو پوچھا ہی نہیں —— کہ میں نے کہاں جانا ہے"
شگو بولی۔

اس کی ضرورت نہیں سمجھیں ابھی ——"

"کیوں ——"

"اس لئے —— کہ ابھی ہم نے کسی اچھے سے ریسٹورانٹ میں جا
بیٹھیں گے ——"

اس نے مستی بھری نگاہوں سے شگو کو دیکھا، تو وہ گھبرا کر بولی۔

"نہیں سر ——"

پھر اس نے کئی بار انکار کیا۔ گھر جلدی جانے کا کہا۔

"اوہ کم ان ——"

وہ دلفریب انداز میں بولا۔ اس نے گاڑی اک خوبصورت ریسٹوران کے
کے سامنے روک دی تھی۔

شگو نے انکار کرنا چاہا لیکن اس کا اصرار اتنا خوبصورت اور پر زور تھا
کہ وہ گاڑی میں بیٹھی نہ رہ سکی۔

"کیا حرج تھا ——" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

"ایسی جگہوں پہ جانے کا اسے شوق بھی تو تھا۔ شوق پورا ہو جائے تو خوشی
ہوتی ہی ہے"

مراد نے گاڑی بند کی اور شگو کو ساتھ لے کر شیشے کا دروازہ کھول کر اندر
آ گیا۔

بیحد خوبصورتی سے سجے ہوئے ہال میں دھیما دھیما سرخ اندھیرا تھا ہلکی ہلکی
مغربی موسیقی فضا میں ترنم گھول رہی تھی۔

لوگ میزوں کے گرد بیٹھے چائے کافی اور مشروبات پینے میں مصروف تھے۔
سرگوشیوں کے انداز میں باتیں ہو رہی تھیں۔ دبی دبی ہنسیاں گھنٹوں کی طرح بج رہی
تھیں، کبھی کبھی بے لگام قہقہے بھی فضا میں بکھر جاتے۔ اور ان قہقہوں میں بچوں کا
شور بھی جھنجھنا اٹھتا۔

مراد اسے ایک کونے میں پڑی میز کی طرف لے آیا۔ اس کے آس پاس والی میزیں تا حال خالی تھیں۔ ایک میز پر ہٹ کر کوئی فرانسیسی بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک پاکستانی لڑکی تھی۔

ادھر کے ہاتھ ایک معمر سا جوڑا چائے پی رہا تھا۔ جو شاید اپنی گھریلو زندگی کی تلخیاں بھلانے یہاں آیا ہوا تھا۔ دور دور والی میزیں تقریباً بھری تھیں کسی پر سٹوڈنٹس تھے۔ کسی پر اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ گھر والوں سے چھپ کر آئی سہمی سہمی لڑکیاں۔ تو کسی پر بال بچوں والے زندگی کی بھرپور توانائیوں سے مخمور جواں لوگ۔

خوب گہما گہمی تھی۔

لیکن شور شرابا نہیں تھا۔

فضا بڑی ہی مسحور کن تھی۔

شگو پہلی بار کسی اونچے درجے کے ریسٹورانٹ میں آئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے خواب تعبیر بن گئے ہوں۔ وہ کبھی کبھی گردن گھما کر چاروں طرف دیکھ لیتی۔ کچھ گھبراہٹ بھی طاری تھی۔ لیکن آسودگی اس گھبراہٹ پر حاوی تھی۔

"میں آپ کو زبردستی تو نہیں لایا یہاں" مراد سگریٹ سلگاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"یس سر — نہ — نہیں سر —" وہ بڑبڑا گئی۔

مراد بڑے دلنشین انداز میں ہولے سے ہنسا۔ پھر سگریٹ کا کش لیتے ہوئے دیا سلائی کی تیلی ہاتھ میں ایک آدھ ہلکے سے جھٹکے سے بجھاتے ہوئے ایش ٹرے میں پھینک دی۔ وہ اس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔

سنبھل سنبھل کر جواب دیتی رہی۔

بیرہ مینو بک لے آیا۔

مراد نے اسے دیکھتے ہوئے شگو سے پوچھا۔

"کیا کھانا پینا پسند کریں گی"

"جو — آپ —" وہ پلکیں اٹھا نے گرانے بات پوری نہ کر سکی۔

"چائے یا کوک —"

مراد نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"چائے —" وہ بولی۔

مراد نے بیرے کو چائے اور اس کے ساتھ اس ریسٹورانٹ کی مخصوص چکن پیٹیز رولز اور پیسٹریز کا آڈر دیا۔

اس کے جانے بعد وہ بڑی اشتیاق بھری نظروں سے شگو کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"میرا بازار آنے کا قطعی موڈ نہیں تھا —"

"پھر — پھر آپ کیسے آ گئے سر —"

"میرا نام مراد ہے — مس شیگی —"

"جی — جی — میں جانتی ہوں —"

"پھر آپ مجھے سر کی جگہ مراد کہہ سکتی ہیں۔ میں بھی مس، کا تکلف چھوڑنا چاہتا ہوں — آپ کو صرف شیگی کہوں تو کوئی اعتراض — تو نہیں ہو گا آپ کو —"

وہ کانوں تک سرخ ہوگئی۔ گھبراہٹ ملی پرحجاب نظروں سے مراد کو دیکھا پھر میز کی چکنی سطح کو ناخنوں سے کھرچنے لگی۔

"ہاں میں کہہ رہا تھا میرا بازار آنے کا موڈ نہیں تھا —— دوسری طرف جاتے جاتے گاڑی اِدھر موڑ لی۔"

"اتفاق ہے ——"

"لیکن بڑا خوبصورت —— اِدھر نہ آتا تو آپ کیسے ملتیں ——"

شگو نے جھجک کر اسے دیکھا۔

وہ خوبصورتی سے سگریٹ دھواں اڑا رہا تھا۔

چائے آگئی ——

چائے کے دوران دونوں باتیں کر رہے تھے۔ مراد شگو کو پسند کرتا تھا، یہ بات اس نے بلا جھجک شگو کو جتلا دی۔ شگو سہم گئی۔ لیکن اپنے اندر اس نے بڑی خوشگوار سی توانائی محسوس کی۔

رات جب بستر میں لیٹ کر آنکھیں بند کیں۔ تو ان بند آنکھوں میں چمکیلی گاڑی اور شاندار ریسٹورانٹ پورے کے پورے گھس آئے۔ آج اس نے ان خوبصورتیوں کا تجربہ کیا تھا۔ اس تجربے کی لذت وہ اب بھی لینے لگی۔

پھر ——

اچانک ہی مراد کا وجود ابھر آیا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ سب کچھ قطرہ قطرہ بن کر کانوں میں اترنے لگا۔

اس نے تفاخر سے سوچا ان باتوں کے متعلق۔

لیکن ——

جانے کیوں پہلو میں چبھن سی ہوئی۔ اسے لگا اس نے طاہر کے ساتھ بے ایمانی کی ہے۔

طاہر ——

جو سدا سے اس کا اپنا تھا۔

اس نے سر کو جھٹک کر کروٹ بدلی —— سوچیں اس کے ذہن کو محصور کرنے لگیں۔

کاش مراد کی جگہ طاہر ہوتا۔ یہ چمکیلی گاڑی طاہر کی ہوتی اور اسے ریسٹورانوں اور ہوٹلوں میں گھمانے پھرانے کے لئے اس کے پاس مراد کی طرح بے تحاشا روپیہ ہوتا۔

منگنی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہوئی ۔

رشیدہ کا تو پاؤں زمین پر نہ پڑ رہا تھا ۔ اپنے سارے رشتہ داروں کو مدعو کیا تھا ۔ دونوں بھابیوں اور آپا کی بیٹیاں تو ایک دن پہلے ہی آگئیں تھیں ۔ شگو کا تو گھر والا معاملہ تھا ——— سب نے مل کر پھپھو سے اصرار کر کے ڈھولک منگائی ساری رات ڈھولک بجائی ——— گانے گائے لڈی ڈالی ——— سوانگ بھرے رت جگا منایا ۔

شگو نے بھی اس رات کلینک سے چھٹی کی تھی ۔ دو دن پہلے ہی اس نے مراد سے چھٹی کے لئے کہا تھا ۔

" میری کزنز کی منگنی ہے ——— "

" منگنی کے لئے چھٹی چاہیئے ۔ پورا دن آپ کے پاس ہے ——— " مراد نے کہا ۔

" سر رات کو ہم سب کزنز اکٹھی ہو رہی ہیں ——— "

" پھر سر ——— " مراد نے شوخی سے کہا ۔

" یہ آپ کا آفس ہے سر ——— " وہ بھی شوخی سے مسکرائی ۔

" ٹھیک ہے ——— "

مراد نے کہا پھر بولا ۔

" چھٹی کی درخواست سٹاف نرس کو لکھ کر دے دیں ——— "

" تھینک یو سر ——— "

اس نے مسکرا کر کہا اور واپس جانے کے لئے مڑی ۔

" شگی ——— " مراد نے پکارا ، وہ رکی اور پھر مڑ کر استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا ۔

" جی ——— " وہ بولی ۔

" تمہاری رات کی ڈیوٹی ہے نا ——— "

" جی ——— "

" تم پانچ بجے ہی چلی آئیں ——— ڈیوٹی تو سات بجے شروع ہو گی ——— " مراد نے کہا ۔

" سر میں نے چھٹی کے لئے کہنا تھا آپ سے ——— "

" کہہ دیا ——— "

" جی ——— "

" پھر اب فارغ ہو نا ——— "

" ہوں تو سر ——— "

"باہر چلیں کہیں ——"

"جی ——"

"حیران کیوں ہو گئیں —— باہر چلیں گھومنے پھرنے —— تم بھی فارغ ہو میں بھی ——"

"لیکن —— سر —— وہ ——"

"بہت ڈرپوک لڑکی ہو ——"

"نہیں سر —— میں ڈرپوک نہیں ہوں ——"

"تو پھر تامل کیوں ——"

"یونہی ——"

"چلو دو گھنٹے ہیں ابھی تمہارے پاس —— سٹاف روم میں بیکار بیٹھ کر کیا کرو گی ——"

وہ چپ ہو گئی۔

"کیا سوچ رہی ہو ——"

"کچھ نہیں ——"

وہ کرسی پیچھے کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں گاڑی نکالتا ہوں تم وہیں آ جاؤ ——"

"درخواست سٹاف نرس کو دے آؤں ——"

"ہاں دے آؤ ——"

مراد نے سگریٹ سلگایا اور شگو کے قریب آتے ہوئے دھواں

اس کی طرف چھوڑ دیا۔

اعلیٰ برینڈ کا سگریٹ کا۔ دھواں خوشبودار خوشبودار —— گو مراد کی یہ حرکت انتہائی بے تکلفانہ تھی اور شاید شگو ذہنی طور پر اتنی بے تکلفی کی حد چھونے کو تیار نہ تھی —— پھر بھی اسے یہ دھوئیں کا خوشبودار غبار بہت بھلا لگا۔

وہ مسکرا کر مراد کو دیکھتے ہوئے اس کے آفس سے باہر نکل گئی۔

پھر ——

درخواست دینے کے بعد وہ مراد کے ساتھ گھومنے چلی گئی۔ دونوں نے آج پھر ایک ہوٹل میں چائے پی۔

ایک چھٹی لینے کے لئے اس نے پورے دو گھنٹے مراد کی خوشی کی نذر کر دیئے۔

لیکن ——

خوشی اسے بھی بہت ملی۔

اتنے اونچے درجے کے ہوٹل میں چائے پی۔

اور ——

اتنی شاندار گاڑی میں گھومتی پھری۔

مراد جیسا ہینڈسم اور امیر ترین آدمی اس کے ہمراہ تھا جو خوبصورت نظروں سے اسے دیکھتا تھا۔ خوبصورت دھوئیں کے مرغولے اڑاتا تھا اور جس کی جیب میں لال اور نیلے نوٹ بہت سے تھے۔

منگنی کی رات خاندان کی لڑکیوں اور لڑکوں نے خوب ہلا گلا کیا۔ پھپھو رشیدہ

نے سب کو اوپر بھیج دیا تھا نیچے بزرگوں نے اپنی محفل جمانا تھی. کبھی کبھار تو کم ہونے کا موقع ملتا تھا۔

لڑکیاں ڈھولک بجا رہی تھیں۔

لڑکے تالیاں بجا رہے تھے۔

کبھی گیت ——

کبھی ٹپے گائے جاتے۔ لڑکیاں اپنی ٹولی میں بیٹھی ٹپہ گاتیں۔ جواب میں لڑکے بول سناتے۔

چھیڑ چھاڑ بھی ہو رہی تھی۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی بھی کوشش تھیں۔ جہاں کسی پارٹی کو ٹپہ بھول جاتا۔ دوسری پارٹی شور مچا دیتی ہرانے پر خوشی کا اظہار کرتی۔

اس ہلا گلا میں شگو اور طاہر بھی شریک تھے۔ ربیعہ اور صبیحہ بھی ایک کونے میں چادریں لپیٹے بیٹھی تھیں۔

رات گزر رہی تھی۔

کوئی اڑھائی بجے کے قریب طاہر جمائیاں لینے لگا۔ سارا دن بھی وہ دوڑ دھوپ کرتا رہا تھا۔

منگنی کی دعوت کے سلسلے میں سارا کام اسی نے کیا تھا اس وقت تکان محسوس ہو رہی تھی۔

"بھئی میں تو چلا ——" اس نے کہا۔

"کہاں ——" شگو نے پوچھا۔

"سونے —— سخت نیند آ رہی ہے ——"

"ابھی سے ——"

"رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے ——"

"تو کیا ہوا ——"

"بھئی نیند آ رہی ہے تم تو رات جاگنے کی عادی ہو نا آج کل نائٹ ڈیوٹی ہوتی ہے. تمہیں تو جاگنے کی عادت پڑ گئی ہے۔"

نائٹ ڈیوٹی کا کہہ کر طاہر نے شگو کو کلینک یاد دلا دیا۔

اور ——

کلینک کے ساتھ ہی شگو کی آنکھوں میں مراد کی شبیہ لہرا گئی۔

اس نے جلدی سے رخ پھیر کر طاہر کو بھرپور نظروں سے دیکھا. جو اٹھ کھڑا ہوا تھا.

وہ لاشعوری طور پر

مراد اور طاہر کا موازنہ کرنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو ——"

طاہر نے نیند سے بوجھل آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں ——" شگو بولی۔

"جاؤ جا کر سو جاؤ۔ تمہیں نیند آ رہی ہے ——"

"سخت آ رہی ہے۔ اب مجھ سے بیٹھا نہیں جا رہا۔ میں تھوڑی دیر سو کر تازہ دم ہو جاؤں گا۔ تھوڑی دیر ——"

"ہاں ——— جاؤ ———"

شگو جانے کیوں کچھ چپ سی ہوگئی۔

طاہر اور مراد کا جو موازنہ کر رہی تھی اس نے اسے پریشان کر دیا تھا، وہ تو اچھا ہوا جو طاہر نیند میں ڈوبا جا رہا تھا۔

اس کی پریشانی بھانپ نہ پایا۔

گا بجا اور ہلا گلا کر کے لڑکیاں لڑکے اس وقت سوئے جس وقت سحر کی سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔

کوئی نیچے چلا گیا۔

کوئی اوپر ہی دری پر آڑا ترچھا پڑ گیا۔

سب لڑکیاں اسی کمرے میں گھس گھسا کر پڑ رہی جس میں گا بجا رہی تھیں۔

شگو اپنے گھر چلی گئی۔

تقریباً ———

صبح دس بجے کے قریب رشیدہ نے سب لڑکیوں کو زبردستی جگایا۔

"اے ہے اٹھو بھی ——— دس بج گئے ابھی سارا گھر صاف کرنا ہے، تم لوگوں نے ناشتہ کرنا ہے۔ تیار ہونا ہے۔"

کمرے میں کھلبلی مچ گئی ——— کوئی ایک دم ہی اٹھ بیٹھی کسی نے اُوں ہاں کر کے کروٹ بدل لی۔

"بھئی اٹھ بھی چکو ———" رشیدہ نے کہا۔

ربیعہ نوکب کی جاگ چکی تھی۔ ہاں صبیحہ ویسے ہی پڑی تھی۔

رشیدہ نے کسی کو ہلایا جلایا کسی کو آوازیں دیں۔

کسی کے گال تھپتھپائے۔

سب لڑکیاں اٹھ بیٹھیں۔

بچیو ———" رشیدہ نے سب سے کہا،" جلدی سے آجاؤ نیچے ——— شتہ وشتہ کر کے تیار ہو جاؤ۔"

ابھی سے خالہ ———"

ھی سے ——— اے دس تو بج چکے ہیں، ناشتہ کرو گی۔ تیار ہو گی۔ تیاری وقت لگے گا۔ بارہ تو بج ہی جائیں گے۔"

کتنے بجے آئیں گے وہ لوگ ———"

بارہ بجے کا کہا ہے ———"

پھر تو واقعی اٹھ جانا چاہیئے ———"

ہاں بیٹیو ———" رشیدہ نے مسکراتے ہوئے سب سے کہا:" اچھے اچھے پڑے پہننا،

اچھی طرح تیار ہونا۔ بہت بڑا خاندان ہے ان کا۔ ہر گھر کے دو دو تین لڑکے ہوئے ہیں۔ ربیعہ کی ساس نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ ہمیں اور لڑکیاں بھی درکار ہیں۔ سمجھ گئی ہونا۔"

لڑکیاں ایک دوسری کو دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

دوپہر گھر میں خوب رونق تھی۔ سب نے نئے نئے ریشمی کپڑے پہنے تھے۔ لڑکیاں بھی بن سنور کر گھوم پھر رہی تھیں۔

مہمانوں کے لئے تینوں کمرے ٹھیک کئے گئے تھے۔ مردوں کے لئے ملک صاحب کے بڑے سے صحن میں شامیانے لگا کر نواری رنگا رنگ دریاں بچھوا دی گئی تھیں۔

رشتے دار اور عزیز تو کیا محلے کے لڑکے بالے بھی طاہر کے ساتھ بھاگ بھاگ کر کام کر رہے تھے۔

بیٹیوں کا معاملہ تھا نا ——

بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ یہ بات محلے والوں کے ذہنوں میں گڑی تھیں۔

نئے دور کی بے حسی ابھی ان پرانی قدروں کو نہ چھو پائی تھی۔ سب خلوص اور پیار سے گھر والوں کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

شگو بھی تیار ہو کر آئی۔

اس نے اپنی تنخواہ میں سے خریدا ہوا خوبصورت جوڑا درزی سے سلوایا جو اس کے جسم کی ساخت پر بالکل فٹ بیٹھا تھا۔ رنگ بھی بیحد پیارا تھا۔ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا۔

اور ——

اماں کے بالے بھی کانوں میں پہن لئے۔ اتنی ہی سجاوٹ بناوٹ سے کیا سے کیا بن گئی۔

وہ اوپر آئی ——

طاہر مہمانوں کے لئے یہاں بھی کرسیاں ڈلوا رہا تھا کپڑے بے ترتیب

بکھرے ہوئے۔ اس نے ابھی تک شیو بھی نہیں کیا تھا۔

طاہر نے شگو کو دیکھا۔

اور ——

دیکھتا ہی چلا گیا۔

شگو نے مسکراتے ہوئے کھنکارا۔

"کچھ لڑکے کرسیاں اٹھائے اوپر آ رہے تھے نا۔

"تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے ——" شگو اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔

"کیا بونقوں کی طرح دیکھ رہے ہو ——"

"آج تو غضب ڈھا رہی ہو ——"

"ہٹو ——"

وہ اٹھلاتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

وہ قدم بڑھا کر اس کے برابر آتے ہوئے بولا۔

"یہیں ٹھہرو نا ——"

"نیچے جا رہی ہوں ——"

"چلی جانا —— لیکن چند منٹ تو رکو ——"

"لو رک گئی —— بس ——"

طاہر اسے دیکھ کر مسکرایا۔ پھر بولا۔ "جی چاہتا ہے تم یہیں کھڑی رہو اسی طرح۔ میں اور صرف میں ہی تمہیں دیکھوں۔ کسی اور کی نظر بھی نہ پڑے۔ دیکھو شگو

ہیں وقت کے ساتھ ساتھ تمہارے معاملے میں بڑا حساس ہوتا جا رہا ہ خود غرضی کی حد تک حساس ۔"

طاہر نے کچھ اس انداز سے کہا کہ شگو مرعوب سی ہو گئی۔ اس نے ط نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ اور دیکھتے ہی مراد کی شبیہ آنکھوں میں جانے کیسے وہ کچھ گھبرا سی گئی۔

جلدی سے مڑی اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔

اس کے کانوں میں طاہر کا جملہ گونج رہا تھا۔ "کسی اور کی نظر بھی تم پر نہ پڑ اور آنکھوں میں مراد کی شبیہ تھرک رہی تھی۔ کیا وہ کسی دوراہے پر آن کھ ہوئی تھی۔ ؟

شگو مراد کی گاڑی سے نکلی ہی تھی کہ بیلا پر اس کی نظر پڑی۔ بیلا برآمدے یں سے گزر کر غالباً کسی کمرے میں جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس یں شیشیاں تھرمامیٹر اور دوسری چیزیں پڑی تھیں۔ غالباً دوائی دینے کا وقت تھا۔ بیلا نے اسے گاڑی سے اترتے دیکھ لیا۔ شگو پہلے تو کچھ جھجکی۔ لیکن پھر بڑے تفاخر سے قدم اٹھایا۔

مراد گاڑی اپنے آفس کی طرف لے گیا۔

وہ آج شگو کو ڈنر کے لئے انٹرکون لے گیا تھا۔

شام جب وہ ڈیوٹی کے لئے گھر سے آئی تھی تو وہ بیرونی لان میں ہی کھڑا تھا۔ اس وقت لان میں کافی لوگ تھے اپنے اپنے مریضوں کی احوال پرسی کے لئے آئے تھے۔

ملاقات کا وقت ابھی ابھی ختم ہوا تھا اس لئے مختلف کمروں سے بھی لوگ نکل نکل کر باہر آ رہے تھے۔

کئی چہرے بیحد پریشان تھے، کئی ہنستے مسکراتے ننھے ہسپتالوں کلینکوں کی اپنی ہی دنیا ہے۔

بیماروں اور دکھی لوگوں کی دنیا۔

جہاں موت سروں پر منڈلاتی ہے۔

اور ڈاکٹروں کا دست شفا اس سے نبرد آزما بھی ہوتا ہے زیست ا کا چکر چلتا رہتا ہے۔

ابھی چند دن پہلے ہی ایک جوان عورت ایک بچے کو جنم دیتے ہوئے فو ہو گئی۔ ڈاکٹروں کی لاکھ کوشش بھی اسے نہ بچا سکیں۔ کبھی کبھی کلینکوں کی فض نالہ و شیون سے تھرا جاتی ہے۔

لیکن

یہاں شفا پانے والوں کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ ہر روز کوئی نہ کوئی بیڈ خالی ہوتا ہے مریض کو صحتیاب ہونے پر چھٹی مل جاتی ہے۔ دکھ درد تکلیف ا ذہنی و جسمانی کرب کے مشاہدے کے لئے ہسپتال یا کلینک سے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

یہاں دکھ سے کراہتے اور اذیت سے تڑپتے مریض آتے ہیں کوئی ان کی تکلیف نہیں بانٹ سکتا بے پناہ دولت ان کی تکلیف رفع نہیں کر سکتی انہیں سکون ملتا ہے تو حساس دل ڈاکٹروں کی پرخلوص توجہ سے، خدمتگ نرسوں کے مشفقانہ رویے سے۔ اسی لئے عام طور پر یہاں کام کرنے وا ڈاکٹر اور نرسیں اپنے پیشے سے مخلص ہوتے ہیں۔

لیکن

شگوفہ واحد نرس تھی جس نے یہ پیشہ اپنایا تو تھا لیکن اس پیشے کے تقدس کو کبھی سنجیدگی سے ملحوظ نہ رکھا۔

نوکری اس نے ضرورتاً کی تھی۔

اسے پیسہ چاہیئے تھا۔

مگر جتنا پیسہ اسے چاہیئے تھا اتنا نوکری عمر بھر بھی کرتی رہتی تو نہیں مل سکتا تھا۔ پھر بھی یہ پیسہ کمانے کا ذریعہ و آغاز تھا۔ پتہ نہیں وہ کن بیوقوفوں کی جنت میں رہتی تھی۔

اس نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ بے تحاشہ پیسہ ملنا آسان نہیں ہوتا اسے امید تھی۔ یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کے سارے خواب شرمندہ تعبیر ضرور ہوں گے۔

خوابوں کی تعبیر اسے مراد کی صورت میں بھی نظر آنے لگی تھی وہ اس سے بڑی جلدی بے تکلف ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ کئی بار گھومنے جا چکی تھی۔

بہترین سے بہترین ریسٹورانوں میں چائے کے لئے گئی تھی۔ چمکیلی اور شاندار گاڑی میں بیٹھی تھی۔ آج تو اسے مراد انٹرکون میں ڈنر کے لئے بھی لے گیا تھا۔

شام گھر سے آتے ہی مراد مل گیا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے پروگرام بنا ڈالا تھا۔

"شگی ——"

"جی ——"

"آج رات کھانا باہر کھائیں گے ——"

"لیکن —— میری ڈیوٹی سات بجے سے شروع ہے ——"

"کیا ہوا ——"

"مری نہیں ہیں —— سات نمبر کمرے کا پیشنٹ میریس ہے بار بار وہاں جانا پڑتا ہے"

"تم فکر نہ کرو —— میں کسی اور نرس کی ڈیوٹی چند گھنٹوں کے لئے لگا کا کہہ دیتا ہوں ——"

"سچی ——"

"ہوں ——"

"پھر ——"

"پھر —— اب کیا اعتراض ہے ——"

"کوئی نہیں ——"

"ٹھیک ساڑھے آٹھ میرے آفس آجانا ——"

"جی اچھا ——"

"اب جاؤ ساڑھے آٹھ بجے میں تمہارا انتظار کروں گا ——"

وہ ادائے دلفریبی سے سر کو اثبات میں ہلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ڈیڑھ گھنٹہ جو اس نے ڈیوٹی دی وہ نہ دینے کے برابر تھی۔

ڈاکٹر شریف بلوچ راؤنڈ پر نکلے تو ان کے ساتھ ساتھ رہی وہ اپنے زیر علاج مریضوں کو دیکھتے رہے۔

ان کی احوال پرسی کی۔

کیفیت دیکھی۔

دوائیوں میں جہاں ردو بدل کرنا تھا کیا۔

وہ ٹرے اٹھائے اٹھائے ان کے ساتھ ساتھ رہی۔ ڈاکٹر شریف بلوچ ہر مریض کے متعلق اسے ضروری ہدایتیں دیتے رہے اور وہ یس سر۔ یس سر کر کے انہیں اپنی ڈیوٹی مستعدی سے ادا کرنے کا احساس دلاتی رہی۔

لیکن

اس راؤنڈ کے بعد وہ صرف ساڑھے آٹھ بجنے کا انتظار کرتی رہی۔ اک جانفزا احساس رگ و پے میں اتر رہا تھا۔ آج وہ باہر کھانا کھانے جا رہی تھی۔ مراد اسے یقیناً کسی بہت بڑے ہوٹل میں لے جانے والا تھا۔ بہت بڑا ہوٹل۔ شاندار ڈنر ——۔

اور ——

اور —— ایک امیرزادے کا ساتھ —— یہی تو خواب تھے اس کے یہ خواب دھیرے دھیرے حقیقت کا رنگ بنتے جا رہے تھے۔

اور ——

جب خواب حقیقت کا روپ دھارنے لگیں تو انسان خوشیوں کی خوشبو اور

مہک سے مست ہو جاتا ہے لذّت احساس میں گم وہ گرد و پیش سے بھی
بے خبر ہو جاتا ہے۔ اسے کچھ نہیں سوجھتا۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ کچھ سمجھ
نہیں آتا۔

صرف اور صرف مدہوش کن خوشیوں سے ناطہ جڑ جاتا ہے اور وہ یہی سمجھتا
ہے کہ اس نے سب کچھ پالیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ خوابوں کی اپنی ہی دنیا
ہوتی ہے۔ اپنی ہی وسعت اپنا ہی پھیلاؤ ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ حقیقت کے
سانچوں میں بالکل نہیں سما پاتے۔

انہیں سما پانا بھی نہیں چاہیئے۔

اپنے خواب جن کا گھاؤ اک خاص محور کے گرد ہو کسی دوسرے کے توسط
سے تعبیر پانے لگیں۔ تو یہ مستحسن بات نہیں ہوتی۔ مدہوش کن خوشیاں
عارضی ہوتی ہیں۔

بہت جلد محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ خوشیاں اور بے پایاں مسرتیں سطحی ہیں۔
کہیں نہ کہیں خلا ہے۔
کوئی نہ کوئی کمی ہے۔

یہ خلا —— یہ کمی ان عارضی اور سطحی مسرتوں کو ہولے ہولے نگل جاتا ہے
شگو دولت سے حاصل ہونے والی آسودگی آرام اور تعیش کے تجربے
کر رہی تھی۔ اسے لگتا تھا اس کے خواب تعبیروں میں ڈھل رہے ہیں اسے
بہت خوشی ملتی تھی۔
بڑی مسرت ہوتی تھی۔

لیکن
ہر خوشی کے سینے میں کسک تھی۔
ہر مسرت دکھی دکھی سی لگتی تھی۔
خوشی و مسرت کے ان لمحوں میں اسے طاہر سے دوری کا احساس ہونے
لگتا۔ جی چاہتا مراد کی جگہ طاہر ہو۔
ہینڈسم
سمارٹ
دلفریب باتوں سے لبھانے والا دولتمند طاہر

شگو پہلی بار کسی بڑے ہوٹل میں آئی۔ وہ مرعوب ہو ہو کر خوش ہوتی رہی
کھانا مراد نے اس کی پسند پر چھوڑ دیا۔ ویسے بھی سیلف سروس تھی۔ شگو
کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔

اس نے کھانا کھایا تو اتنا زیادہ نہیں۔ لیکن رنگا رنگ چیزیں دیکھ دیکھ کر
مرعوب و مسحور ہوتی رہی۔ کھانے تو کھانے اتنی قسم کے سلاد اس نے
زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے۔

کھانے کے بعد مراد تھوڑی دیر کے لئے گھر بھی گیا۔ اس نے کوئی پیغام
گھر پہ چھوڑنا تھا

شگو گاڑی میں ہی بیٹھی رہی۔ لیکن اتنی شاندار اور جہازی سائز کوٹھی کو
باہر ہی سے دیکھ کر اسے بخوبی پتہ چل گیا۔ کہ کوٹھی اندر سے کس خوبصورتی سے
آراستہ ہوگی۔

خوابوں کے پرت پرت اس کی خواہش اور مرضی کے مطابق آپوں آپ کھلتے جا رہے تھے۔

اگر یہ کوٹھی اس کی ہو جائے تو ــــ؟

اس کے ذہن میں یہ خیال در آیا۔

لیکن ــــ

اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ مراد کے آنے سے سوچوں کا تانا بانا بکھر گیا تھا۔

"بور تو نہیں ہوئیں ــــ" اس نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ــــ نہیں تو ــــ" وہ بولی۔

مراد نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اور لمبے چوڑے ڈرائیو وے سے گاڑی نکال کر گیٹ سے باہر آ گیا۔

شگو نے پھر اک نگاہ کوٹھی پہ ڈالی۔

"کیا دیکھ رہی ہو ــــ"

"آپ کا گھر ــــ"

"کیسا ہے ــــ"

"بہت خوبصورت بڑا شاندار ــــ میرے گھر کی طرح ــــ" شگو تصوراتی دنیا میں کھو گئی۔

"تمہارا گھر بھی ایسا ہی ہے ــــ" مراد نے قدرے حیرانگی سے اس پر نگاہ ڈالی۔

وہ مسحور سی نظر آ رہی تھی۔ ہولے سے سر ہلاتے ہوئے ہنس پڑی۔

"میرے ذہن میں اپنے ایسے ہی گھر کا تصور ہے مراد صاحب"

مراد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اس پر اک غیر محسوس سی ترحم بھری نگاہ ڈالی اور کلینک کی راہ پر ہو لیا۔

شگو کو مین گیٹ کے اندر برآمدے کے قریب ڈراپ کر کے وہ گاڑی آگے لے گیا۔ اس برآمدے میں سے گزرتے ہوئے بیلا نے شگو کو دیکھا۔

اور

شگو ایک لمحہ کو جھجکی۔

لیکن

پھر

احساس تفاخر سے گردن اٹھائے برآمدے میں چلی آئی۔

اس کے سٹاف ریٹائرنگ روم میں آتے ہی کرسچین لڑکی مس ریٹا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"لیجیے میرا کام ختم ــــ آپ آ گئیں۔ روم نمبر سیون کا پیشنٹ کو ساڑھے دس دوائی دینی ہے۔ دس منٹ میں دھیان رکھنا"

وہ اپنا بیگ اٹھا کر چلی گئی۔

شگو صوفے میں دھم سے بیٹھ گئی آتے ہی ریٹا کا اس طرح بات کرنا

اسے قطعاً اچھا نہ لگا۔

رات بیلا فرصت کے لمحوں میں کمر سیدھی کرنے صوفے پر لیٹ گئی تو شگو بھی مریضوں سے نپٹ کر آ گئی۔

باتھ روم میں جا کر اس نے ہاتھ منہ دھویا اور بالوں میں برش کرتے ہوئے بیلا کے قریب آ بیٹھی۔

بیلا نے اپنا وجود کھینچ کر اونچا کیا۔ کشن سر تلے رکھا اور اس سے ٹیک لگاتے ہوئے شگو کو بغور دیکھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو ——" شگو مسکرائی۔

"کہاں گئی تھیں ——" بیلا نے پوچھا۔

"کب ——"

"مراد صاحب کے ساتھ ——"

"اوہ —— ہم انٹر کون میں ڈنر کرنے گئے تھے ——"

بیلا سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "مراد سے بڑی پینگیں بڑھا رہی ہو ——"

شگو نے بڑے فخریہ انداز میں کہا —— "ہم دونوں بہت اچھے دوست ہیں ——"

بیلا نے اس کے سراپا پر اک بھرپور نگاہ ڈالی۔

چند لمحے چپ رہی۔

پھر ہولے سے بولی۔ "سنبھل کر رہنا۔ اس دوستی کی کہیں بہت بڑی قیمت

نہ ادا کرنی پڑے ——"

"کیا مطلب ——"

"اتنی بچی شاید نہیں ہو تم ——"

"پھر بھی ——"

بیلا نے مخمور سے شگو کو دیکھا۔ جو بالوں میں اب بھی برش پھیر رہی تھی۔ اور استفہامیہ نظروں سے اسے بھی تکتی جا رہی تھی۔

"شیگی ——"

"ہوں ——"

"مراد کے ساتھ تمہارے افیئر کے چرچے ہوں گے ——"

"کیا —— ؟" شگو کا برش کرتا ہاتھ وہیں رک گیا۔ حیرت سے اس نے بیلا کو دیکھا۔

"ایسی باتیں چھپی تھوڑا ہی رہتی ہیں ——"

"کیسی باتیں ——"

"ناسمجھ بننے کی کیوں کوشش کر رہی ہو ——"

"تمہاری باتیں ہی ایسی ہیں۔ کھل کر کہو ——"

بیلا نے پھر شگو کو غور سے دیکھا۔

"ہوں ——" شگو نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر ہلایا۔

"عجیب لڑکی ہو ——" بیلا بولی۔

"کیوں ——"

"بھئی مراد سے تمہارے مراسم بڑھ رہے ہیں۔ یہ باتیں لوگ دیکھتے ہیں سنتے ہیں اور باتیں بناتے ہیں۔ ایک نرس اور ایک کلینک کے مالک کی دوستی کس نوعیت کی ہو سکتی ہے ——"

"دوستی دوستی ہوتی ہے ——"

"کوئی قدر مشترک تو ہونی چاہیئے ——"

"قدر مشترک ہے ——"

"کیا ——"

"مراد کے پاس بے تحاشہ دولت ہے اور مجھے دولت سے مستفید ہونے کی زبردست خواہش۔"

شگو نے بڑی بے تکلفی اور سادگی سے یہ بات کہدی۔

"تو —— کیا تجھے یقین ہے کہ اس دولت سے تو مستفید ہوتی رہے گی ——" اس نے پوچھا۔

"ہو رہی ہوں —— اسے دیکھ رہی ہوں۔ اس کا تجربہ کر رہی ہوں ——"

وہ مسکرائی۔

بیلا کچھ سمجھتے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔ "تیرا کیا خیال ہے مراد تجھ سے شادی کرے گا۔"

شگو نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "وہ چاہے بھی تو میں شادی نہیں کر سکتی اس سے ——"

"کیا ——"

"بھئی بات دراصل یہ ہے —— کہ —— شادی —— وہ میں نے اپنے کزن کے متعلق تمہیں بتایا ہے نا —— طاہر —— ہم دونوں بچپن کے ساتھی ہیں۔ میں نے تمہیں اس کے متعلق سب کچھ تو بتایا ہوا ہے۔"

"اسی لئے تو میں حیران ہوں۔ کہ تم کنارہ چھوڑ کر پانی کے ریلے کے ساتھ کیوں بہتی جا رہی ہو ——"

"بیلا پلیز سیدھی طرح بات کرو اپنے پلے نہیں پڑتے یہ اشارے"

"سمجھ نہیں آتا کہ تمہیں کیا کہوں۔ تم انتہائی بے وقوف ہو یا سادہ —— محبت تمہیں طاہر سے ہے۔"

شگو نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور مراسم تم مراد سے بڑھا رہی ہو۔ اک غیر آدمی سے اتنی بے تکلفی اور مراسم بڑھانے کا مطلب نہیں جانتیں کیا ——؟"

شگو ہونقوں کی طرح اس کا منہ تکنے لگی۔

"کیا رشتہ ہے تمہارا مراد سے —— دوستی کا —— ؟ اک غیر مرد سے خالی خولی دوستی کر رہی ہو ——"

"وہ بھی کیا ایسا ہی سمجھتا ہے۔ ارے بیوقوف وہ دولتمند آدمی ہے فلرٹ کرنا اس کی ہوبی ہے۔ وہ تجھے نہ اپنائے گا۔ پری کو شیشے میں اتار رہا ہے وہ کسی دن —— موقع ملا —— تو ——"

"تو ——"

"تو ان ساری نوازشات کا —— جو وہ تم پر کر رہا ہے۔ صلہ چاہے گا۔"

"صلہ ـــــــ"

"ہاں ـــــ اور یہ صلہ پانے کے لئے تیری اجازت طلب نہیں کرے گا۔
اپنا حق سمجھ کر لے گا۔ سمجھیں ـــــ تمہیں کہیں کا رہنے نہیں دے گا میری جان
ان امیر زادوں کے جال بڑے دلفریب ہوتے ہیں۔ انسان پھنس جاتا ہے اور
جب ان سے نکلتا ہے۔ تو ـــــ تو اپنا سب کچھ لٹا چکا ہوتا ہے"

بیلا بڑی جذباتی ہوگئی۔ اپنی باتوں کی تصدیق کے لئے اس نے
عزیز سہیلی نجمہ کے اوپر بیتنے والی واردات کا قصّہ بھی شگو کو سنا دیا۔ ڈاکٹر
خاور محمود جس نے یہاں سے نوکری چھوڑ کر کوئی اور کلینک جائن کر لیا تھا
نجمہ پر اسی طرح مہربان تھا۔ اسی طرح نوازشوں کی بارش کرتا تھا۔ نجمہ اس
کے دام میں آگئی تھی۔

اوراب

وہ یہاں سے جا چکا تھا۔ کنی کترا لی تھی۔ نجمہ کسی سے کیا کہتی غلطی
بھی تھی لٹ گئی۔

لیکن سہیلی

اب اپنی تلخ تجربے کو شگو پر آزمایا جاتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس
سے دوستی بھی تھی اور اخلاقی تقاضہ بھی۔ اسی لئے اسے خبردار کرنا ضروری
تھا۔ شگو حیرت زدہ سی اس کی بات سن رہی تھی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں
ہونے لگی تھی۔

وہ بار بار کانپ جاتی ـــــ

وہ ـــــ

رات بھر سوچتی رہی۔

اور ـــــ

پھر کئی راتیں اور دن سوچتی رہی۔

سے مراد سے محبت تھی نہ پیار ـــــ ہاں اس کا احترام ضرور کرتی تھی۔
ہی احترام کے صلے اس سے بے تکلف ہو رہی تھی اس کا مطلب صرف
لت سے آسودگی حاصل کرنا تھا۔
دولت کے کرشموں کا تجربہ کرنا تھا۔ اس سے لطف و سکون حاصل
رنا تھا۔

لیکن ـــــ

بیلا نے اسے روشنی دکھا دی۔ راستہ دکھایا۔ اسے اپنی غلطی کا شدّت
ے احساس ہوا۔

زینب کا کام رشتے کروانا تھا۔ ربیعہ اور صبیحہ کا اس نے بڑی اچھی جگہ
رشتہ کروایا تھا، وہ خاصی جہاندیدہ عورت تھی گھر بار دیکھ کر بات کرتی حیثیت کا
سے کر رشتہ ڈھونڈتی۔ اب تک وہ کئی رشتے کروا چکی تھی۔ تقریباً کامیاب ہی
سارے کے سارے والدین، خاص کر لڑکیوں کے والدین تو اس کے احسا
تلے دبے ہوئے تھے۔

گو وہ رشتے کروانے کا اچھا خاصا معاوضہ لیتی تھی۔ پھر خاطر مدارات بھی
سے کروانی تھی۔ وقت بے وقت یوں بھی دس بیس روپے مانگ لیتی
رکشہ تانگہ گاڑی کا کرایہ الگ سے دھروا لیتی۔ اس کے باوجود اس کی بڑی
تھی بیٹیوں والے تو اس کے گھر تک جا پہنچتے تھے۔ معاوضے سے
زیادہ دینے کی پیش کش کرتے ہوئے رشتہ تلاش کرنے کی منتیں کر
تھے۔ لڑکے والے تو زیادہ اس کے پاس نہیں آتے تھے۔ گھر بیٹھے رشتے
جاتے تھے انہیں۔ ہاں وہ فوری طور پر یہ رشتہ اچک لیتی۔ جہاں کہیں اچھا

دیکھا، اس کا حدود اربعہ جاننے کی کوشش کرتی۔ اچھا رشتہ کروانے کا لالچ دیتی یوں لڑکے والے بھی پھنس جاتے۔

اس دن وہ رشیدہ کے ہاں بیٹھی تھی۔ ربیعہ صبیحہ پاس ہی تھیں وہ ان کے سسرال کی امارت کے مرعوب کن قصے سنا رہی تھی۔ شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی۔

ادھر بھی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لڑکیوں کے لئے جو زیور، کپڑا بن رہا تھا، اس کی تفصیل وہ انہیں سنا رہی تھی۔

تینوں خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھیں۔

رشیدہ بار بار بچیوں کے نیک نصیب ہونے کی دعا کر رہی تھی ازدواجی زندگی کی شادمانی و کامران کے لئے دعاگو تھی۔

تینوں صحن میں تخت پر ہی بیٹھی تھیں، زینب کے لئے صبیحہ کرسی لے آئی تھی، کین کے پیندے والی لکڑی کی کرسی جس پر تکیے کے کڑھے ہوئے غلاف والی گدی پڑی تھی۔

وہ باتیں کرتے کرتے رک گئی۔

طاہر سیڑھیاں اتر کر صحن میں آ گیا تھا۔ اس نے زینب کو سلام کیا اور ماں سے بولا۔

"امی میں مظہر کے ہاں جا رہا ہوں۔ کوئی کام تو نہیں ——"

"نہیں ——" رشیدہ نے کہا۔ "ویسے جلدی آ جانا۔ تمہیں پتہ تو ہے بازار کا کوئی نہ کوئی کام نکل ہی آتا ہے۔"

"اچھا ——"

وہ مڑا ہی تھا کہ صبیحہ نے آواز دی۔

"بھائی جان ——"

"کیا ہے ——" وہ پلٹ کر بولا۔

"مظہر بھائی کا سکوٹر لیتے آنا ذرا ——"

"کیوں ——"

"مجھے بازار لے جانا —— رنگائی کے دوپٹے دینے ہیں اور امی دوپٹوں کے لئے کرن اور فیتے بھی تو لانے ہیں ——"

"بڑی جلدی ہے تجھے ——" طاہر نے ہنس کر چھیڑا۔

وہ شرما گئی۔

طاہر سکوٹر لانے کا وعدہ کر کے باہر نکل گیا۔

زینب اس کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔

طاہر کے باہر جاتے ہی زینب نے پوچھا۔

"یہ تمہارا بڑا بیٹا ہے ——"

"ہاں —— بیٹوں میں بڑا —— ویسے ربیعہ سے چھوٹا ہے"

"کیا کرتا ہے —— پڑھ رہا ہے یا نوکری کر رہا ہے"

"ایم اے کر لیا ہوا ہے ——" اس کی جگہ صبیحہ بولی، اور پھر ہاتھوں کی انگلیوں سے تعداد بتاتے ہوئے ہنس کر بولی۔

"پوری سولہ جماعتیں پڑھی ہیں ——"

"ماشاءاللہ —— ماشاءاللہ ——" زینب نے سر ہلایا "اب نوکری کر رہا ہے خیر سے ——"

"ہاں ——"

"کتنی تنخواہ ہے ——"

"ہاں سی ——" ربیعہ بولی۔ "ابھی کچی نوکری ہے وقت گزاری کے لئے کرتا ہے کچھ تجربہ بھی ہو جائے گا"

"ابھی تو اس نے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنا ہے۔ بہت ہوشیار ہے ہمارا بھائی ——" صبیحہ بولی۔

"تیاری زوروں پر ہے —— ضرور پاس کرے گا ——"

"خدا کرے ——" زینب بولی "ماشاءاللہ خوبصورت جوان ہے، شریف گھرانے کا بچہ بھی شریف ہو گا"

رشیدہ اور ربیعہ اس کی تعریفیں کرنے لگیں۔

زینب بولی۔

"میں تو پہلے ہی جان گئی تھی۔ جوان بیٹا ان کی اجازت پر گھر سے قدم نکالے تو اس کی شرافت میں کیا کلام ——"

"بالکل ——" صبیحہ کو بھائی پر پیار آ رہا تھا۔ "بہت ہی اچھے ہیں ہمارے بھائی جان —— ابھی منگنی کے دن کتنا کام کیا۔ اور اب تیاریوں میں کس طرح ہاتھ بٹا رہے ہیں ——"

"ماشاءاللہ ——" زینب کی آنکھوں میں مسکراہٹ گھل گئی۔

"ایسا لڑکا ہی تو اسے چاہیے ننھا نسرین کے لیے۔ حاجی فردوز دین کی ایک اکلوتی بیٹی کے لیے ——"

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد زینب بولی۔

"شادی نہیں کروگی اس کی ——"

رشیدہ جھٹ سے بولی۔ "کیوں نہیں کروں گی زینب۔ دھوم دھام سے کروں گی۔ بس ان لڑکیوں سے فارغ ہو لوں۔ پھر اسی کی باری ہے۔"

"لڑکیوں سے تو سمجھو ہوئی کہ ہوئی ——" زینب نے ہنس کر کہا۔ "اصل مرحلہ تو رشتہ طے کرنے کا ہوتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ——" رشیدہ بولی۔ "پر ان کی شادیوں کے بعد ہی اس کا سوچوں گی ——"

"ایک رشتہ بتاؤں —— لاکھوں میں ایک ہے۔ لڑکی دیکھو تو بس دیکھتی رہ جاؤ ——" وہ بولی۔

رشیدہ نے سر نفی میں ہلایا۔

"لیکن ——"

ربیعہ کو تجسس نے ابھارا۔

"کون ہے وہ ——"

"حاجی فروز دین کی بیٹی ہے۔ دو بھائی اور باپ کویت میں ہیں۔ ایک ہی ایک بیٹی ہے۔ بارہ جماعتیں پاس سگھڑ سیانی —— چاند کا ٹکڑا ہے ٹکڑا —— جہیز اتنا ملے گا کہ گھر میں رکھنے کی جگہ نہیں ملے گی۔ بھئی کیا کیا چیزیں آ رہی ہیں باہر سے

سلمی تو مجھے ایک ایک چیز دکھائی ہے۔ باپ اور بھائی کچھ کم تو نہیں کما رہے باپ کی تنخواہ یہاں کے پینسٹھ ہزار بنتی ہے۔"

"مہینے کی ——؟" صبیحہ نے آنکھیں پھیلائیں۔

"تو اور کیا سال کی ——" زینب بولی۔

"اوئی ماں —— اتنا پیسہ ——" صبیحہ ہنس کر بولی۔

زینب نے پیار سے اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

"لے تیرے والا کم کما رہا ہے۔ ابھی تین چار سال ہوئے وہاں گئے پچیس ہزار ہو گئی ہے تنخواہ اس کی۔"

"سچی ——"

صبیحہ نے بے ساختگی سے کہا تو سب اس کی بات پر ہنس پڑے۔

"ربیعہ والے کو بھی اب وہ سعودی عرب بلا رہا ہے۔ قطر میں اتنی تنخواہ نہیں جتنی اسے ہو سکتا ہے۔ شادی کے بعد وہ اسے بھی سعودی عرب لے جائے۔" زینب بولی۔

ربیعہ مسکرانے لگی۔

زینب نے پھر طاہر کے لئے کہا۔

"کہو تو کروا دوں رشتہ وہاں —— یاد کروگی —— ایسا رشتہ چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں تو نہ ملے۔"

"لیکن ——" رشیدہ نے بے چینی سے رخ پھیرا۔

اس کی بات ادھوری ہی رہی۔ ربیعہ درمیان میں بول پڑی۔ "لیکن ماسی

طاہر کی تو ابھی پکی نوکری بھی ——"

"اسے کیا فرق پڑتا ہے انہیں۔ باپ اور دو بیٹے باہر ہیں۔ داماد کو بھی دہی بلا لیں گے۔ یہاں پکی نوکری بھی مل جائے تو کیا کما لے گا۔"

ربیعہ نے سر ہلایا۔

واقعی جہاں انہیں ہزاروں روپے تنخواہ پانے والے لڑکے مل گئے تھے وہاں بارہ پندرہ سو کی نوکری کی کیا اہمیت تھی۔

ربیعہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"بھائی جان کو بھی باہر جانا چاہیئے ——"

"وہ خود ہی لے جائیں گے ——" زینب بولی۔

"لیکن ماسی ——" صبیحہ بولی۔

"کیا ——"

رشیدہ نے جلدی سے کہا۔ "طاہر کا رشتہ میں نے گھر میں ہی کرنا ہے۔"

"گھر میں ——" زینب بولی۔

"ہاں میری بھتیجی ہے —— دیکھی بھی ہو گی تم نے۔ میں نے بچوں کے بچپن سے ہی دل میں طے کیا ہوا ہے رشتہ ——"

صبیحہ نے خوشی سے سر ہلایا۔

لیکن ربیعہ چپ رہی۔

"بہت پیاری بچی ہے اور پھر دونوں کا بچپن کا ساتھ ہے ——" رشیدہ نے کہا۔

زینب کو قدرے مایوسی ہوئی۔ پھر بولی۔

"دیکھ لو —— تمہاری مرضی —— اس رشتے کا جواب نہیں۔ لاکھوں کا جہیز ملے گا بی بی ——"

"یہ رشتہ گھر ہی میں طے سمجھو۔ ان کے ابا تو کہہ رہے تھے۔ شادی پر باقاعدہ منگنی کر دیں گے طاہر اور شگو کی ——"

صبیحہ نے خوشی سے تالی بجائی۔

ربیعہ سوچ میں پڑ کر ہونٹ کاٹنے لگی۔

زینب کے جانے کے بعد اس نے امی سے کہا۔ "کیا سچ مچ منگنی کا ارادہ ہے امی ——"

"ہاں تمہارے ابا یہی چاہتے ہیں —— انکی طبیعت خراب رہتی ہے چاہتے ہیں یہ فریضہ بھی ادا کر دیں۔"

"لیکن شگو ——"

"کیا ہوا شگو کو ——"

"وہ مان جائے گی ——"

"کیوں ——"

"امی ——" ربیعہ بولی۔ "شگو سے زیادہ عزیز ہمیں اور کون ہو گا لیکن ——"

"لیکن —— کیا ——"

"شگو کی ذہنی اڑان سے آپ واقف ہی ہیں اور طاہر ابھی پانچ سات سو

کی معمولی نوکری کر رہا ہے۔"

"تو کیا ہوا ——" صبیحہ بولی۔ "مقابلے کا امتحان بھی تو دے گا۔"

"جب دے گا تب نا ——" ربیعہ بولی۔

"تیاری تو کر رہا ہے ——" رشیدہ بولی۔

"امی ——" ربیعہ نے کہا۔ "جب طاہر مقابلے کا امتحان پاس کر کے بڑا افسر بن جائے گا۔ تب شگو کا ہاتھ طلب کرنا۔"

"تو کیا ایسے وہ نہیں مانے گی ——"

"جیسی لڑکی ہے نا وہ —— بعید نہیں کہ وہ انکار بھی کر دے۔"

"ناممکن آپا ——" صبیحہ نے جھٹ سے کہا۔ "ہاں یہ دوسری بات ہے کہ ابھی شادی پر آمادہ نہ ہو ——"

"تو ہم کون سا ابھی سے شادی کا پروگرام بنا رہے ہیں، صرف اعلان ہی کرنا ہے نسبت کا ——"

رشیدہ نے کہا۔ پھر مسکراتے ہوئے ربیعہ کی طرف دیکھا اور بولی۔ "اس کی ویسے ہی نہیں بن آتی شگو سے۔"

"نہیں امی۔ وہ مجھے بہت عزیز ہے ——"

"تو پھر ——"

"اس کی باتیں —— اس کا طرزِ عمل —— اس کی سوچ۔ ہمارے طبقے اور ماحول سے میل نہیں کھاتی۔"

"ایسے ہی بڑبڑ کرتی رہتی ہے وہ آپا ——" صبیحہ نے کہا۔ "ہوائی قلعے اور

خیالی پلاؤ —— اونہہ ——"

"اسی سے تو ڈر لگتا ہے۔ اسے کوٹھی چاہیے۔ کار چاہیے۔ لمبی چوڑی تنخواہ چاہیے ——"

"خدا دے گا ——" رشیدہ بولی۔

"کوٹھی کی آس تو گئی ——" ربیعہ بولی۔

"زمین بیچ دی ہے ——" رشیدہ بولی۔ "کیا کرتے۔ دو شادیاں کرنا تھیں۔"

"شگو کو شاید ابھی پتہ نہیں چلا۔" ربیعہ بولی۔ "کل رات بھی وہ طاہر کو کسی خوبصورت کوٹھی کا نقشہ دکھانے کا کہہ رہی تھی۔"

صبیحہ ہنس کر بولی۔ "نقشہ ہی دکھانے کا کہہ رہی تھی نا۔ بنوانے کا تو نہیں کہہ رہی تھی۔"

ربیعہ نے کندھے اچکائے ہونٹ ٹیڑھے کیے اور ہاتھوں کو ہلاتے ہوئے بولی۔ "ہمیں کیا بھئی جیسا جی چاہے کریں۔"

"اللہ بہتر کرے گا ——" رشیدہ نے کہا۔ اور اٹھ کر نل کی طرف گئی۔ عصر کی نماز پڑھنا تھی۔ نل تلے بیٹھ کر وضو کرنے لگی۔

ربیعہ اور صبیحہ اسی موضوع پر باتیں کرتی رہیں۔ ربیعہ کو کچھ اختلاف تھا جیسے صبیحہ مان نہیں رہی تھی۔

آج شگو کی آخری نائٹ ڈیوٹی تھی۔ حسب معمول وہ سر شام ہی کلینک آگئی تھی۔ آج اسے طاہر ڈراپ کر گیا تھا۔ آجکل مظہر کا سکوٹر اسی کے پاس رہتا تھا۔ بہنوں کی شادی کی خریداری کے سلسلے میں بار بار دور نزدیک کے بازاروں میں جانا پڑتا تھا۔ وہ چھوٹی موٹی چیزوں کی لسٹ جیب میں ڈال کر سڑک پر آیا تو شگو رکشے میں بیٹھنے کو تھی۔

"اے شگو——" اس نے سکوٹر اس کے قریب روک لیا۔

"کیا ہے——" شگو آج دن کا کافی حصہ اس کے ہاں گزار کر آئی تھی۔

"میں بازار جا رہا ہوں——"

"تو جاؤ——"

"تمہارے کلینک کی طرف ہی جانا ہے——"

"تو——"

"آؤ میں ڈراپ کر دوں گا——"

"اُں——"

"اُں واں نہیں——آؤ——" طاہر نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ پھر شگو کے کسی فیصلے سے پہلے ہی بولا۔ "اے بھئی——جاؤ آج چھٹی تمہیں۔ رکشے پر کوئی اور سواری لادو——"

رکشے والے نے شگو کی طرف دیکھا۔ "جاؤں بی بی——"

"جاؤ بھئی——" طاہر نے کہا۔

شگو نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

شگو اس کی طرف مڑی۔

طاہر سکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک سے بیٹھ جاؤ۔"

شگو نے بیگ کا فیتہ کندھے پر ٹھیک کیا اور اچک کر اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔

"دھیان سے بیٹھنا——میرا کندھا پکڑ لو——" طاہر نے کہا۔

"میں ٹھیک بیٹھی ہوں——" شگو نے کندھا پکڑے بغیر کہا۔

"بالکل نہیں——میرے کندھے پر تو ہاتھ رکھا ہی نہیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں——"

"جو جمپ لگا تو——"

"پھر رکھ لوں گی——"

"ابھی کیا قباحت ہے——"

"تم چلو تو——"

طاہر نے کک لگائی۔ سکوٹر نے گڑگڑ کیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے سپیڈ پکڑلی۔

طاہر نے اک غیر محسوس سا گڑھا عبور کیا۔ جمپ لگا اور شگو اس کی پشت پر آرہی۔ اس نے جلدی سے اس کی پشت کو سختی سے پکڑ لیا۔

طاہر نے اسے محسوس کیا۔

پھر ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "بچ گئیں ——"

"ہاں —— گرنے ہی لگی تھی۔"

"مجھے پکڑ نہ لیتیں تو گر ہی جاتیں ——"

"ہاں ——"

"بس پھر مجھے مضبوطی سے پکڑے رہو۔ کبھی نہیں گرو گی ——"

شگو نے اپنا ہاتھ مضبوطی سے اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اور اس ہاتھ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

طاہر سکوٹر اڑاتا بھیڑ بھاڑ سے گزرتا سڑک پر جا رہا تھا۔ دونوں باتیں بھی کر رہے تھے۔

طاہر کلینک والی سڑک پر آنے سے پہلے ہی دائیں ہاتھ مڑ گیا۔

"کہاں جا رہے ہو ——"

"کہیں تو جا رہا ہوں ——"

"تمہیں شاید خریداری کرنا ہے۔ پہلے مجھے تو ڈراپ کر دو۔"

"کر دوں گا —— خریداری بھی بعد میں ہوگی ——"

"تو کدھر جا رہے ہو ——"

"آج مابدولت بڑے اچھے موڈ میں ہیں ——"

"پھر ——"

"تمہاری خاطر مدارات کرنے کو جی چاہ رہا ہے ——"

"یعنی ——"

"چلو تمہیں کوئی اچھا سا ریسٹورانٹ دکھا دیں۔ کیا یاد کرو گی ——"

"کیا ——"

"بھئی کہیں چائے پیتے ہیں۔ کسی اچھے سے ریسٹورانٹ میں —— باہر سے تو دیکھے ہیں —— ان کے اندر بھی چل کر بیٹھو۔ چائے کا لطف لو۔"

شگو کے ہونٹوں پر آتے آتے رہ گیا کہ ریسٹورانٹ کیا ہوٹل تک میں جا چکی ہے۔

لیکن ——

رک گئی کچھ نہیں بولی۔ احساس جرم سا ہوا۔

طاہر نے اک درمیانے درجے کے چھوٹے سے ریسٹورانٹ کے سامنے اسکوٹر روک دیا۔

شگو اترے بغیر بولی "چائے پینے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی تو گھر سے پی کر آئے ہیں۔"

"گھر کی اور یہاں کی چائے میں بڑا فرق ہے مس شیگی ——" وہ بڑے فخر سے مسکرایا۔

شگو کچھ نہیں بولی۔

سکوٹر سے اُتر کر کھڑی ہو گئی۔

طاہر نے سکوٹر سٹینڈ پر کھڑا کیا اور چابی جیب میں ڈالتے ہوئے بولا۔

"آؤ ـــــ"

دونوں ریسٹورانٹ کے اندر آ گئے۔ طاہر اسے لے کر بائیں ہاتھ کی کیبن کی طرف بڑھا ـــ جہاں پردے کا انتظام تھا ـــ وہ ہال کے کسی کونے میں نہیں بیٹھا تھا۔

شگو تنگ سے کیبن میں میز کے ساتھ جڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ طاہر نے پردہ برابر کر دیا اور میز کے دوسری طرف بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کیسی جگہ ہے ـــ"

وہ کچھ نہیں بولی۔ صرف اک نگاہ طاہر پر ڈالی۔ طاہر بیحد مسرور تھا اس پر اعزازی سا نشہ چھایا ہوا تھا شگو اس کی دانست میں آج پہلی بار ریسٹورانٹ میں آئی تھی۔ نیا تجربہ یقیناً اُس کے لئے اہم تھا۔

بیرے کو اس نے ایک سیٹ چائے کے ساتھ سموسے اور پیسٹری لانے کو کہا۔

بیرہ چند منٹوں میں ہی لے آیا۔ سٹیل کا ٹی سیٹ۔ چھوٹی چھوٹی مٹی کی پیالیاں لال لال چٹنی کے ساتھ پلیٹ میں رکھے دو سموسے اور سٹیل ہی کے بے ڈھب سٹینڈ پر رکھی پیسٹریاں۔ ساری چیزیں اس نے میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس جناب ـــ"

"بس ـــ" طاہر نے شگو کی طرف دیکھا اور بولا۔

"چائے بناؤ ـــ"

شگو نے بیدلی سے چائے دانی کو پکڑا۔

"لو پہلے سموسے کھاؤ ـــ بڑے مزے کے ہیں گرما گرم" طاہر نے پلیٹ اس کی طرف کھسکا دی۔

"مجھے تو بالکل بھوک نہیں ـــ"

"کھانے تو پڑیں گے ـــ چکھ کر تو دیکھو ـــ بھوک لگ جائے گی ـــ" طاہر بولا۔

شگو نے سموسے کا کنارا توڑا اور بغیر چٹنی لگائے منہ میں ڈال لیا۔ طاہر نے پورا سموسہ چٹنی لگا لگا کر کھا رہا تھا۔ اسے بڑا مزہ آ رہا تھا۔

"کھاؤ نا ـــ" اس نے شگو سے کہا۔

سموسہ مزے دار تھا۔ شگو تکلف نہیں کر سکی۔ اس نے سموسہ اٹھا لیا اور چٹنی لگا کر کھانے لگی۔

سموسہ اپنے ہاتھ میں لے کر کھاتے ہوئے اس نے دونوں پیالیوں میں چائے بنائی۔ ایک پیالی طاہر کی طرف کرتے ہوئے دوسری اپنے سامنے رکھ لی۔

"اور ـــ"

"پھر ـــ"

گھونٹ گھونٹ چائے حلق میں اتارتے ہوئے اسے وہ ریسٹورانٹ بار

آگیا جہاں مراد نے پہلی بار اسے چائے پلائی تھی۔ کتنی مسحور کن فضا تھی کتنا خوبصورت ماحول تھا۔

ہال میں دھیمے سروں میں موسیقی کا سحر پھیلا ہوا تھا سرخی مائل سیاہ غبار سا تھا فضا میں۔ ہال میں نیم تاریک کونے میں صاف ستھرے ٹیبل پر بھینی بھینی خوشبو بکھرتے پھول گلدان میں نفاست سے سجے تھے جگہ جگہ بے حد صحت مند پلانٹ پڑے تھے۔ سرخ اندھیروں کے غبار میں ان کی ہریالی آنکھوں کو کتنی بھلی لگ رہی تھی۔ کلف شدہ صاف ستھری وردیوں والے بیرے کتنے مستعد اور کیسے تہذیب یافتہ تھے۔

مراد کتنے اعتماد سے کتنے پروقار طریقے سے اس کے سامنے بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔

طاہر سموسہ کھا کر پیسٹری اٹھا رہا تھا۔

"شگو پیسٹری بھی لونا ——" اس نے دانت سے پیسٹری کاٹتے ہوئے کہا۔ "بڑی مزیدار ہے ——"

"نہیں —— بس ——" شگو کے لہجے میں غیر محسوس سی بیزاری اتر رہی تھی۔ "میں صرف چائے پیونگی ——"

"چکھ کر تو دیکھو ——"

"نہیں ——"

"چکھو تو ——" اس نے اپنی آدھی کھائی ہوئی پیسٹری شگو کی طرف بڑھائی۔ "ذرا سی چکھ کر دیکھ لو۔ اچھی لگی تو کھا لینا نہیں تو ——"

"بھئی کہا ہے نا —— نہیں کھانا مجھے ——"

"میرے کہنے پر بھی نہیں ——"

"طاہر —— میں نے نہیں کھانا پیسٹری —— سموسہ کھا لیا ہے بس کافی ہے۔" شگو بولی۔

طاہر نے نیم کھائی پیسٹری والا ہاتھ اس کی طرف بڑھائے رکھا۔ مجبوراً شگو کو ہاتھ سے تھوڑی سی پیسٹری توڑ کر منہ میں رکھنا پڑی۔

"اچھی ہے نا ——"

"ہاں ——"

"اس ریسٹورانٹ کی پیسٹری مشہور ہے ——"

"لگتا ہے تم یہاں آتے رہتے ہو ——"

"کبھی کبھی —— کوئی دوست کھینچ لاتا ہے —— آج ——" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "آج پہلی بار اپنے خرچے پر یہاں آیا ہوں ——"

"اوہو ——" شگو کے لہجے میں تمسخرانہ کاٹ تھی۔ لیکن طاہر اسے مذاق سمجھتے ہوئے بولا۔

"میں نے سوچا آج تمہیں عیاشی کروا ہی دیں۔ آجکل اپنی جیب میں بے حساب پیسے ہوتے ہیں نا ——"

"بے حساب ——"

"ہاں ——"

"وہ کیسے ——"

"شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں —— دو چار سو روپیہ تو ہر وقت رہتا ہے اپنی جیب میں ——"

"ہوں ——"

"بھئی بڑا روپیہ خرچ ہو رہا ہے ——"

"پھوپھا نے خوب پیسہ جمع کیا ہوا تھا —— جو ——"

"جمع کیا کرنا تھا —— زمین بک گئی ہے تو ——"

"زمین ——"

"تمہیں نہیں پتہ ——"

اس نے نفی میں سر ہلایا تو طاہر بولا۔

"وہ جو اباجی نے ایک کنال زمین خریدی ہوئی تھی نا ——"

"کوٹھی کے لئے ——"

"ہاں —— کافی منافع دے گئی ہے۔ شادیاں کرنا تھیں نا، اکٹھی دو ——"

"تو —— کوٹھی کی زمین —— بک گئی ——"

"کوئی بات نہیں اباجی پھر خرید لیں گے۔ شادیوں کے بعد وہ پھر سے پیسہ جمع کرنا شروع کر دیں گے۔"

"ہوں ——"

"اسی لئے تو اپنی جیب بھی ہر وقت مالا مال رہتی ہے ——"

"واقعی ——"

"پیسے وافر تھے جیب میں اسی لئے تو سوچا عیاشی کروا دیں تمہیں ——"

شگو کچھ نہیں بولی۔ طاہر بیحد خوش تھا تفاخر محسوس کر رہا تھا۔

ریسٹورانٹ سے باہر آ کر وہ سکوٹر کی طرف بڑھا۔ شگو پیچھے بیٹھ گئی تو اس نے پوچھا۔

"مزہ آیا ——"

"کس بات کا ——"

"اجی جناب ریسٹورانٹ میں چائے پینے کا ——"

"ہاں ——" اس نے بے جان سے لہجے میں کہا۔

"اب ——"

"اب مجھے کالج ڈراپ کر دو ——"

"کہیں گھما پھرا نہ لاؤں —— ابھی تو نائٹ ڈیوٹی میں کافی وقت ہے۔"

"نہیں طاہر —— تم مجھے چھوڑ آؤ پہلے ——"

"اپنا موڈ تو ——"

"موڈ کو رہنے دو —— مجھے دو ایک کام کرنا ہیں ——"

"اچھا بھئی اچھا ——" طاہر سرشار سے لہجے میں بولا۔ وہ شگو کو ریسٹورانٹ میں چائے پلا کر بڑا فخر محسوس کر رہا تھا۔

"کسی دن تمہیں کھانا بھی کھلاؤں گا ——" اس نے کالج کے گیٹ پر اسے اتارتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"اچھا ——"

شگو بے دلی سے کہتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھی۔

"خدا حافظ ——" طاہر نے سکوٹر سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ ——" وہ اندر جاتے ہوئے بولی۔

طاہر کی خوش تفافر اور سرشاری اسے ذہنی اذیت دے رہی تھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی موازنہ کئے جا رہی تھی۔

مراد اور طاہر میں موازنہ ——

مراد جس کے لئے اونچے درجے کے ہوٹل اور ریسٹورانٹ بھی عام سی چیز تھے۔

اور ——

طاہر درمیانے سے درجے کے ریسٹورانٹ میں اسے لے جا کر خوشی اور فخر سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ بہت بڑا معرکہ مارا ہو جیسے ——

وہ الجھی الجھی ڈیوٹی روم میں آگئی۔ دن کی ڈیوٹی دینے والی دو تین نرسیں وہاں موجود تھیں وہ ان سے باتیں کرکے اپنے ذہن میں بکھری کشمکش اور موازنے کی اذیت کو کم کرنے لگی۔

پھر اسی وقت چپڑاسی اسے بلانے آگیا۔

"مراد صاحب نے بلایا ہے —— سسٹر ——" اس نے کہا تو تینوں نرسوں نے ایک دوسری کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

شگو کو بیلا کی کہی ہوئی بات یاد آگئی —— خوف کی ہلکی سی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی کو کپکپا گئی

وہ مراد کے دفتر کی طرف جاتے ہوئے اس بدنامی کے متعلق سوچ رہی تھی۔

جو متوقع تھی۔

لیکن

اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ آیندہ مراد سے نہیں ملے گی۔ قطع تعلق کرلے گی۔

اپنی غلطی کا احساس تو اسے بیلا کی پند و نصیحت ہی سے ہوگیا تھا لیکن ابھی تک وہ کوئی مستحکم فیصلہ نہ کر پائی تھی۔ آج اپنی کولیگز کی آنکھوں میں اس نے جو کچھ دیکھا اس سے ڈر گئی۔

مُراد نے اک مسحور کن مسکراہٹ سے اس کا خیر مقدم کیا اور بے تابی سے اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ "آج آپ کچھ لیٹ آئی ہیں۔ میں دو دفعہ پتہ کروا چکا تھا۔"

شگو نے اک بھرپور نگاہ ڈالی۔ پھر اس کی شخصیت سے مرعوب ہو کر سر جھکا لیا۔ اس کے اندر کشمکش جاری تھی۔ مراد اس کی آزمائش بن رہا تھا —— لیکن ——

جانے کونسی نیکی اس کے کام آئی۔ قدرت نے اسے بچا لیا۔ اس نے شعوری کوشش سے اس کشمکش سے اپنے آپ کو نکالا۔

مراد پر آج کچھ عجیب سی جنون خیز کیفیت طاری تھی اس کی آنکھوں میں گرسنگی شعلوں کی طرح سی لپک لئے تھی۔ شاید آج اس نے اپنی مہربانیوں کا صلہ لینے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔

"بیٹھو ——"

وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ مراد اس کی کرسی کی پشت پر بازو رکھتے ہوئے جھک کر سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"آج جانے کیوں مجھے تمہارا اس شدت سے انتظار تھا۔ دو دفعہ پتہ کرایا تم آئی نہیں تھیں۔

"میری رات کی ڈیوٹی ہے اور ابھی بھی وقت ہے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ——"

"آج رات کی ڈیوٹی سے چھٹی کرا دوں ——"

"کیوں ——"

"بس موڈ بن رہا ہے۔ باہر گھومیں پھریں گے۔ کھانا کھائیں گے اور ——"

"اور —— اور کیا ——"

وہ ہنس کر بولا۔ "اور —— تنہا دن ——"

"ہاں ——"

وہ اس کے کان کی لو کو ہونٹوں سے چھوتے ہوئے بولا۔ "اور پیار کریں گے —— اتنا پیار —— کہ ——"

سگو کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ سر ایک طرف ہٹاتے ہوئے وہ سختی سے صوفے کا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔

"مراد صاحب آپ ——"

مراد اپنی دھن میں بولا۔ "ہوٹل میں میرا کمرہ بک رہتا ہے —— ہم ——"

وہ مراد کا اصلی روپ دیکھ کر غصے سے کانپ اٹھی۔ بیلا نے یہ روپ دکھایا نہ ہوتا تو شاید —— شاید وہ —— انجام میں —— کوئی —— بھول کر بیٹھتی،

ایسی بھول جس کا مداوا کبھی ممکن ہی نہ ہوتا۔

وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے مراد کے عین سامنے کھڑی ہو کر تند و تیز لہجے میں بولی۔

"آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے مراد صاحب۔ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ دوستی اور بدچلنی میں فرق ہوتا ہے۔"

مراد نے ایک لمحہ کے لئے جیسے کچھ سمجھا ہی نہیں۔ لیکن جب اس نے سگو کے غصے سے کانپتے سراپا نگاہ ڈالی۔ تو اسے احساس ہوا کہ اس نے یہ ساری باتیں بے محل کہہ دی ہیں۔ ابھی پری شیشے میں اتری نہ تھی۔ مچھلی جال سے باہر تھی۔

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "برا مان گئیں ——"

"آپ کو شرافت کا دامن چھوڑتے ہوئے شرم آنا چاہیئے ——" وہ غرائی۔

"اوہ ——" وہ اس کے عین سامنے تن کر کھڑا ہوگیا۔

"میرا راستہ چھوڑ دیئے —— ورنہ میں چیخ چیخ کر کلینک سر پر اٹھا لوں گی۔" سگو بولی۔

مراد اس کے تیوروں سے ڈر گیا۔

لیکن جلد ہی سنبھل کر بولا۔

"میں نہ جانتا تھا کہ تم ایسی لڑکی ہو ——"

"ایسی ہوں —— ایسی ویسی نہیں —— سمجھے —— آئندہ میری طرف نظر بھی اٹھائی —— تو ——"

"ہوں ـــــ"

"میں نے آپ کو اک مخلص دوست سمجھا تھا ـــــ"

"دوست ـــــ" وہ ہنس کر بولا۔

شگو کو اس وقت وہ انتہائی مکروہ شکل انسان لگ رہا تھا۔ آنکھوں میں ظاہر کا چہرہ اتر آیا۔ معصوم شریف اور خلوص کی روشنی میں جگمگاتا چہرہ۔

وہ اک قہر آلود نگاہ مراد پر ڈالتے ہوئے آفس سے باہر نکلنے کو قدم اٹھانے لگی۔

"شیگی ـــــ سوچ لو ـــــ میں تم سے پیار کرنے لگا ہوں ـــــ" مراد نے کہا۔

"ہوس اور پیار کا فرق تم کیسے جان سکتے ہو ـــــ میں تمہاری اصلیت جان چکی ہوں ـــــ"

مراد اور شگو میں چند منٹ تکرار ہوتی رہی۔ شگو نے تنگ آکر جب کہا کہ وہ اس کی شکایت ڈاکٹر سمیع سے کر دے گی۔ تو وہ ڈر گیا۔

جلدی سے بولا "جاؤ بابا جاؤ ـــــ میں تمہیں سمجھ نہیں سکا تھا"

شگو اس پر اک جلتی ہوئی نگاہ ڈال کر تیزی سے باہر آگئی۔ وہ سیدھی ڈیلی روم میں گئی۔

وہاں صرف بیلا ہی تھی جو شاید ابھی ابھی آئی تھی۔

وہ صوفے پر گرتے ہوئے بیلا کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ـــــ

"کیا ہوا ـــــ؟ کیا ہوا ـــــ؟" بیلا اس کے اس طرح رونے سے پریشان ہو گئی، وہ روئے گئی۔

"کچھ بتاؤ گی بھی ـــــ ہوا کیا ہے ـــــ کیوں رو رہی ہو اس طرح ـــــ کچھ بولو نا ـــــ"

اس نے اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اونچا کیا اور کتنی دیر پوچھتی رہی۔ "کیا ہوا ـــــ؟"

شگو نے بیگ سے رومال نکال کر آنسو پونچھے۔ اور سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے آج کی روئیداد اسے سنا ڈالی۔

بیلا جیسے متوقع ہی تھی۔ کچھ زیادہ حیران نہ ہوئی آہستگی سے بولی۔ "یہ تو ہونا ہی تھا"

"تم نے پہلے متنبہ نہ کر دیا ہوتا تو ـــــ"

"خدا کا شکر کرو شگو۔ اور آئندہ محتاط رہنے کی کوشش کرنا"

"لیکن وہ ـــــ"

"وہ کچھ نہیں کرے گا۔ وہ سنجیدگی سے تمہیں پیار نہیں کر رہا تھا فلرٹ کر رہا تھا۔ بس تم نے ڈاکٹر سمیع کی دھمکی دے کر اچھا ہی کیا ہے۔ اس نے اگر کچھ گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر سمیع سے سب کچھ کہہ دینا۔ اول تو وہ ایسا کرے گا نہیں۔ لڑکیوں سے فلرٹ کرنا اس کی ہابی ہے اور ویسے بھی آجکل سنا ہے وہ مل اونر کی خوبصورت لڑکی کے ساتھ گھومتا پھرتا ہے۔ تمہارے ہاتھ سے نکل جانے کا اسے افسوس تو ہو گا ـــــ لیکن پیچھا نہیں کرے گا۔ خیر ہم سب

تمہارے ساتھ ہیں —— فکر نہ کرو —— چند دن خاموشی سے دیکھتی رہو۔ کچھ نہیں ہوگا ——"

بیلا نے اسے تسلّی دی۔

شگو بہت دن اندر ہی اندر پریشان رہی۔ یہ پریشانی امّاں نے بھی محسوس کی اور طاہر نے بھی ——

لیکن ——

شگو نے کسی کو اصل بات نہیں بتائی۔

باورچی خانے کے سامنے والے چھوٹے سے کمرے سے چارپائی دونوں کرسیاں اور برتنوں کی ڈولی اٹھوا کر ربیعہ نے زمین پر دری بچھا دی تھی۔ ایک طرف گدے ڈال کر اوپر گاؤ تکیے رکھ دیئے تھے۔ دوسری طرف بکس تھے۔ دائیں ہاتھ مشین پڑی تھی۔ اور سوئچ بورڈ کے نیچے دوہری تہری کھیس ڈال کر استری کے لئے جگہ بنا دی تھی۔

جہیز کے کپڑے سینے سلانے اور ٹانکنے کا کام یہیں ہو رہا تھا۔ صبح صبح کام سے فارغ ہو کر تینوں ماں بیٹیاں یہیں آ بیٹھتیں۔ کبھی کبھی ان کی کوئی سہیلی بھی ہاتھ بٹانے آ جاتی۔ فرصت کے اوقات شگو کے بھی یہیں گزرتے۔ اور شگو کی امی بھی شلواریں وغیرہ سی کر یہیں لے آتی۔ آجکل کام زوروں پر تھا۔ زمین بکنے سے پیسہ ہاتھ آ گیا تھا۔ اس حیثیت سے بڑھ چڑھ کر ہی خرچ ہو رہا تھا کئی جوڑوں پر طلے سلمے کا کام کروایا گیا تھا دو دو جوڑے گوٹے کے کام کے بنے تھے۔ عروسی جوڑے ٹشو کے تھے۔ ٹشو کے دوپٹوں پر بھاری کامدانی کام ہوا

تھا۔ اور لمبی لمبی کرن اور لپا کناروں پر لگایا گیا تھا۔

اس وقت ربیعہ مشین پر جھکی تھی۔ رشیدہ ایک سلی قمیض کے دائ
کر رہی تھی۔ اور صبیحہ سرمئی دوپٹے کی بانکڑی ٹانک رہی تھی۔ دری کے اوپ
چادر ڈالی ہوئی تھی۔

اس چادر پر گوٹے کرن کی تختیاں رکھی تھیں۔ لیس اور فیتے رکھے تھ
قسم کے ستارے کٹوریوں میں پڑے تھے اور رنگارنگ کرنیں بکھری تھیں
کے ڈبے میں ہر رنگ کی تاگے کی نلکیاں اور سوئیوں کے پتے رکھے ہو
تھے۔

"کچھ دوپٹے ناصرہ کو بھیج دیتے ہیں ——" رشیدہ نے دھاگہ دانتو
سے کاٹتے ہوئے قمیض کی ترپائی ختم کی۔

"ہاں امی ——" صبیحہ جلدی سے بولی۔ "جن سادہ دوپٹوں پر کناری
لگانا ہے۔ وہ تو کسی سے کروا ہی لیں۔ ناصرہ خالہ تو کئی دفعہ کہہ چکی ہیں بھجوا
دیں —— کیوں آپا ——"

"ٹھیک ہے ——" ربیعہ مشین کی ہتھی پر ہاتھ رکھ کر سیدھی ہوتے
ہوئے بولی۔ "کام تو ابھی واقعی بہت پڑا ہے کتنے جوڑے ابھی
کو پڑے ہیں ——"

"مامی نے ابھی شلواریں مکمل نہیں کیں ورنہ سات آٹھ جوڑے تو آج ہی
ٹانک لیتی ہیں ——" صبیحہ بولی۔

"امی آپ پتہ کریں جاکر۔ دو چار بھی سلی ہوں تو لے آئیں۔" ربیعہ بولی۔

"مامی پائنچے بہت اچھے بناتی ہیں ——" صبیحہ بولی۔

"عمر بیت گئی بیچاری کو کپڑے سیتے ——" رشیدہ نے ہمدردی
سے کہا۔

"اب تو شگو بھی کمانے لگی ہے —— معقول تنخواہ ہے —— اوپر سے
بھی کافی پیسے مل جاتے ہیں —— اب تو مامی کو مشین کا کام چھوڑ دینا
چاہیئے ——" ربیعہ نے کہا۔

"چھوڑ کیسے دے —— شگو کی شادی نہیں کرنا اسے کیا ——" رشیدہ بولی۔

"اس کی تنخواہ تو وہ جمع کر رہی ہے ——"

ربیعہ نے مسکرا کر ماں کو دیکھا اور پھر بولی۔

"امی —— میں کچھ کہوں گی تو آپ سمجھیں گی، میں شگو کے خلاف ہوں"

"ہاں تو یہی ——" رشیدہ بھی مسکرائی۔

"نہیں امی —— میں کہنے جا رہی تھی کہ شگو کا جو معیار ہے اس کے لئے
اسی کو برس ہا برس تنخواہ جمع کرنا پڑے گی ——"

"معیار دھرا رہ جائے گا ——" رشیدہ مسکرائی۔ "تمہارے ابا تو چاہتے تھے۔
تمہارے ساتھ ہی اس کو بھی بیاہ لائیں۔ تمہارے چلے جانے سے جو بے رونقی
ہوگی، کچھ تو اس کے آنے سے پوری ہوگی ——"

"امی ——" ربیعہ نے کہا۔ "آپ نے اس سلسلے میں کبھی مامی یا شگو
سے بات بھی کی ہے ——"

"کریں گے —— پتہ تو ابھی نہیں ہے کہ ہمارا ارادہ کیا ہے۔ تمہاری شادی

پر انشاءاللہ اسے منگنی کا جوڑا اور انگوٹھی ضرور پہنا دیں گے "

ربیعہ نے کچھ نہیں کہا۔ ہاں صبیحہ خوش ہوگئی۔ وہ طاہر اور شگو کی منگنی کی باتیں کرنے لگی۔

"اچھا امی —" ربیعہ نے مشین چلاتے ہوئے کہا۔ "یہ باتیں تو پھر بھی ہوتی رہیں گی۔ آپ ذرا امی سے سلی ہوئی شلواریں تو لے آئیں "

رشیدہ نے قمیض تہہ کر کے ایک طرف رکھدی۔ سوئی دھاگہ ڈبے میں ڈال کر دھاگے کی نلکی میں ٹانکا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ صحن ہی میں تھی کہ ڈیوڑھی سے طاہر خوشی سے سرشار تقریباً بھاگتا ہوا آیا اور آتے ہی ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر اسے دو تین چکر دے ڈالے۔

"ہرا —" وہ چلایا۔

"ارے — کیا باؤلا ہوگیا " ماں نے اس کی باہیں گلے میں سے نکالتے ہوئے رکنے کی کوشش کی۔ "کیا چکر دے ڈالے —"

"کیا ہوا امی —" دونوں بہنیں بھی بھاگی آئیں۔

ربیعہ نے طاہر کو دیکھا۔ "کیا مل گیا۔ بہت خوش لگ رہا ہے "

"مجھے تو چکرا دیا —" ماں نے کہا "پتہ نہیں کیا ملا ہے "

"ترقی ملی ہے امی ترقی —"

"یعنی —" صبیحہ بولی۔

"ترقی کا کیا مطلب —" ربیعہ بولی۔

"ترقی کا مطلب آپ نہیں جانتیں۔ میری تنخواہ دو سو روپیہ بڑھ گیا "

وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔

"مبارک ہو بھائی جان —" صبیحہ نے خوش ہوکر کہا۔

رشیدہ نے بھی خوش ہوکر دعائیں دیں۔ پھر بولی۔ "یہیں نوکری کئے جا، ترقی کرتے کرتے کچھ نہ کچھ —"

"ہونہہ —" ربیعہ نے بات کاٹی۔ "پرائیوٹ فرم میں نوکری کئے جاؤ، سال چھ مہینے بعد سو پچاس روپے کی ترقی ملے گی۔ سرکاری نوکری ہو تو بات بھی ہے —"

"وہ بھی مل جائے گی —" طاہر بولا۔

"کیسے —" ربیعہ بولی۔

"بھائی جان مقابلے کے امتحان کی تیاری تو کر رہے ہیں آپا۔ امتحان دیں گے، پاس ہوں گے۔ اور پھر بہت بڑے افسر بن جائیں گے "

"انشاءاللہ —" رشیدہ نے کہا

"پڑھائی جا کیسے رہی ہے — میں نے تو اسے دلجمعی سے پڑھتے نہیں دیکھا کبھی " ربیعہ بولی۔

"آپ کے کام ختم ہوں گے تو پڑھائی دلجمعی سے کروں گا نا۔ سی ایس ایس میں نے کرنا ہی ہے نہ کیا تو —"

"بڑا افسر نہیں بن پاؤں گا — ہیں نا —" صبیحہ شوخی سے بولی۔

"تو اور —" طاہر نے ماں کے گلے میں پھر بازو ڈال دیئے۔

"اور — بڑا افسر نہ بن پائے تو شگو — لفٹ ہی نہیں دے گی "

اس نے شوخ ہوتے ہوئے بھائی کو چھیڑا۔

ربیعہ بھی ہنس پڑی۔ دونوں بہنیں بھائی کو چھیڑنے لگیں۔ رشیدہ اپنا آپ
سے چھڑا کر اوپر چلی گئی۔ تہمینہ سے سلی ہوئی شلواریں لانا تھیں۔

دونوں بہنیں واپس کمرے میں آکر پھر سے کام میں لگ گئیں۔ طاہر بھی ا
ہی آگیا۔ تینوں باتیں کرنے لگے۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ربیعہ نے طاہر سے کہا،

"طاہر تم نے جو کچھ کرنا ہے سنجیدہ ہو جاؤ اب — امتحان دینا
تو محنت بھی کرو۔"

"میں کیسے کروں —"

"دیکھو طاہر — یہ کوئی جواز نہیں — کہ تمہیں آجکل ہمارے لئے
کے چکر لگانا پڑتے ہیں — سارا دن چلو کاموں کی نذر ہو بھی جائے تو را
کو پڑھا کرو۔"

"رات کو ان کے لاڈلے دوست جو بلا کر لے جاتے ہیں۔ نو دس بجے
سے پہلے تو لوٹتے ہی نہیں۔" صبیحہ نے کہا۔

طاہر کے جواب دینے سے پہلے ہی ربیعہ بولی۔

"دوستوں کے ساتھ بھی بیشک گھومو پھرو — خدا کا شکر ہے کہ
سبھی دوست اچھے ہیں۔ بری صحبت نہیں۔ پھر بھی طاہر تمہیں وقت ضائع نہ
کرنا چاہیئے۔ رات کو دو چار گھنٹے ضرور پڑھ لیا کرو —"

صبیحہ شوخی سے آنکھیں نچاتے ہوئے بولی۔ "ناممکن —"

"کیوں —؟" ربیعہ بولی۔

"اس لئے کہ نوکری — گھر کے کاموں میں حصہ۔ پھر دوستوں کے ساتھ
پھرنے کا وقت باقی جو وقت بچتا ہے وہ —"

"وہ کیا —" طاہر جلدی سے بولا۔

"وہ مامی کا گھر جو سامنے ہی ہے — اور — اور اوپر دروازہ بھی۔ آمنے
سامنے والوں کو وقت نہیں ہوتی نا —" وہ شوخی سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
طاہر اس کے بال مٹھی میں بھرنے کو لپکا۔ لیکن ہنستے ہنستے ربیعہ درمیان میں
آ گئی۔

طاہر بھی ہنسنے لگا

"بھائی جان محترم — ابا جی تو آپ کی منگنی کر رہے ہیں —"
جب ہنس چکے تو صبیحہ بولی۔

"کیا —" طاہر خوشی سے بولا۔ "سچ —"

"ہاں — ابا جی کا اِرادہ بن رہا ہے —" ربیعہ بولی۔

"آج کل وہ مامی سے بات کریں گے —" صبیحہ بولی۔

"ابا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی نا —" ربیعہ نے اداسی سے کہا۔
"وہ تمہاری خوشی بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"اچھا —"

"لیکن طاہر —"

"کیا آپا —"

"تم منگنی کروانے پر خوش ہو ——"

"بالکل ——"

"شگو بھی ——"

"پتہ نہیں —— ہم نے کبھی اس کے بارے میں بات ہی نہیں کی ——"

"کر لو پہلے ——"

"آپ کر لیں ——"

دونوں ہنس پڑیں۔

تھوڑی دیر دونوں بھائی کو چھیڑتی ستاتی رہیں۔ پھر ربیعہ نے سنجیدگی سے بات کرنا شروع کی۔ شگو کے خیالات اور اپنے گھریلو حالات کا کھل کر تذکرہ کیا۔

"یہ باتیں تم بھی جانتے ہو طاہر ——"

"ہاں ——"

"پھر تمہیں تو دن رات ایک کر دینا چاہیئے ——"

"پیسے کمانے کے لئے ——"

"یہی سمجھ لو —— پیسہ ویسے بھی اس گھر کی ضرورت ہے طاہر۔ ابا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ رکھی رکھائی ان دو شادیوں پر خرچ ہو جائے گی۔ جس طرح تیاری ہو رہی ہے۔ ابو کو شاید کچھ قرض بھی لینا پڑے۔ دکان سے آخر کتنا پیسہ نکلے گا۔"

"ہوں ——" طاہر سوچ میں پڑ گیا۔

"اب ابو کا سہارا تم ہو ——" ربیعہ بولی۔ "ظاہر ہے تم دکان پہ نہیں بیٹھو گے ——"

نفی میں سر ہلاتے ہوئے طاہر نے ربیعہ کو دیکھا۔

"اس لئے ضروری ہے کہ تم جلد از جلد اس قابل ہو جاؤ کہ شگو کے معیار پر بھی پورا اتر سکو۔ اور مالی طور پر مستحکم ہو جاؤ ——"

صبیحہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "کیا یہ اچھا نہیں ہو گا کہ بھائی جان بھی باہر چلے جائیں۔ لوگ کتنے کما رہے ہیں۔"

"تیس پینتیس ہزار ماہانہ ——" طاہر نے صبیحہ کو چھیڑا۔

صبیحہ قدرے شرمائی۔ لیکن جھٹ سے بولی۔ "واقعی یہ بہت بڑی رقم ہے بھائی جان ——"

"ہے تو ——"

"پھر کوشش کرو نا باہر جانے کی ——" صبیحہ نے دوپٹہ تہہ کرتے ہوئے سوئی دانتوں تلے دبا کر کہا۔

"جلد از جلد امیر ہونے کا یہی ذریعہ ہے۔"

"سوچوں گا ——"

"ضرور سوچیں بھائی جان۔ میں تو کہتی ہوں۔ یہ مقابلے وقابلے کے امتحان کا خیال چھوڑ دیں۔ شان اور ٹھاٹھ باٹھ ہی ہے۔ تنخواہ تو اتنی نہیں ملے گی۔"

"پڑھائی کی اہمیت اپنی جگہ ہے صبو ——" ربیعہ بولی۔

"لیکن پیسے کی اپنی جگہ —— اور آپا آپ جانتی بھی ہیں۔ شگو پیسے کو کتنی

اہمیت دینی ہے ــــــ"

"ہاں ــــــ" ربیعہ بولی۔ "منگنی شادی کا سوچنے سے پہلے طاہر کو پیسہ کمانے کا سوچنا چاہیئے ــــــ"

"بالکل ــــــ" صبیحہ نے کہا۔ پھر دونوں بہنیں شگو کے خیالات کے بارے میں باتیں کرنے لگیں۔

طاہر خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔

بلاشبہ ــــــ

وہ جو کچھ کہہ رہی تھیں ــــــ

سچ تھا ــــــ

شگو نے تنخواہ ماں کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اماں گن لو"

"گننے کی کیا ضرورت ہے پورے ہی ہوں گے" اماں نے پیسے ہاتھ میں لیتے ہوئے شگو کو دیکھا۔

شگو مسکرا کر بولی "اماں اب آپ کی مشین بند ــــــ"

"کیوں ــــــ"

"میں نے کہہ دیا نا۔ کیا یہ پیسے تمہارے لئے کافی نہیں ــــــ"

"بہت ہیں ــــــ"

"پھر تمہیں اب محنت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہہ دیا مشین بند آج سے ــــــ"

اماں نے پیار سے بیٹی کو دیکھا پھر بولی "میں چاہ رہی ہوں کہ مشین کو موٹر لگوالوں ــــــ"

"موٹر ــــــ"

"ہاں ـــــ بجلی سے چلتی ہے اس سے مشین ہتھی گھمانا نہیں پڑتی، بڑی بھابی نے پچھلے ہفتے ہی خریدی ہے اپنی مشین کے لیے ـــــ"

"کیا بڑی مامی بھی اُجرت پہ کپڑے سیتی ہیں ـــــ"

"نہیں ـــــ نہیں تو ـــــ انہیں کیا ضرورت پڑی ہے۔ اپنے اور بال بچوں کے کپڑے تو سیتی ہیں، مشین ہے ان کے پاس سہولت کے لیے موٹر لگوالی ہے۔ میں نے اس دن چلائی تھی ان کی مشین، گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہو جاتا ہے، نہ کندھے تھکتے ہیں نہ بازو۔ بھابی ہی نے کہا تھا کہ میں بھی موٹر لگوالوں کچھ زیادہ مہنگی بھی تو نہیں، بہت آرام ہو جائے گا"

"اماں ـــــ"

"ہاں ـــــ"

"کیا ضرورت ہے موٹر لگوانے کی۔ میں نے کہا نا ـــــ کہ اب سے یہ سلائی کڑھائی کا کام بند ـــــ"

ماں نے مسکرا کر شگو کو دیکھا۔

"بند کیسے ـــــ ابھی تو مجھے اور محنت کرنا ہے ـــــ"

"کیوں ـــــ کیا یہ پیسے کافی نہیں ہونے ـــــ"

ماں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے شگو کو دیکھا۔ شگو نے محسوس کیا کہ آج ماں بہت خوش ہے۔

ماں کبھی کبھار ہی خوش نظر آتی تھی۔ جب کوئی خاص بات ہوتی، وہ پلنگ پر ماں کے قریب کھسک آئی اور شوخی سے بولی۔ "کیا بات ہے اماں ـــــ"

"کیوں ـــــ"

"کچھ خوش نظر آ رہی ہو ـــــ"

"نہیں اچھا نہیں لگتا کہ میں خوش ہوؤں ـــــ"

"ارے اماں ـــــ تو خوش تو جہاں خوش۔ تیری خوشی سے میں نہ خوش ہوؤں گی تو اور کون ہوگا"

اماں نے پیار سے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

شگو نے ماں کی کلائیوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں اپنی شوخ مسکراتی آنکھیں ٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے اماں ـــــ"

"بہت خوشی کی بات ہے ـــــ"

"سنو تو ـــــ"

"تیرا رشتہ مانگا ہے ـــــ"

"کس نے ـــــ"

"رفیق بھائی اور رشیدہ نے ـــــ"

"سچ ـــــ"

"ہاں ـــــ"

شگو نے ماں کی کلائیاں چھوڑ دیں۔

اس کا سر جھک گیا۔

چند لمحوں کے لئے وہ خوشی اور حیا کے بارے اپنے آپ کو سنبھال نہ پائی
اماں کی کتنی خواہش تھی کہ یہ لوگ باقاعدہ رشتہ مانگیں ۔

"پوری ہوگئی تمہاری دلی خواہش ——" وہ سر جھکائے جھکائے بولی ۔

"توکیا تمہاری نہیں پوری ہوئی ——" اماں شوخی سے یوں بولی جیسے شگو اس
بیٹی نہیں سہیلی ہو ۔

شگو نے ہولے ہولے سر اٹھایا ماں کو دیکھا اور پھر ماں سے لپٹ گئی ماں
اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولی ۔

"میرے ذہن سے بوجھ اتر گیا ہے ——"

"ہوں ——" شگو الگ ہوتے ہوئے بولی ۔

"رفیق بھائی ربیعہ صبو کی شادی پر منگنی کی رسم ادا کرنا چاہتے ہیں ——"

وہ خاموش رہی ۔

اماں رفیق اور رشیدہ کی خواہش اور خوشی کی باتیں کرنے لگی ، جو شگو کے لئے
نئی نہ تھیں ۔

ان کی چاہت محبت اور خواہش کو وہ جانتی تھی ۔

"بہت بڑھیا جوڑا لائے ہیں تیرے لئے رفیق بھائی ۔ پیچھے کمخواب کا ، دوپٹے
پر بھی بہت بھاری کام کروائیں گے ——"

"میرے لئے جوڑا ——"

"ہاں ——"

"کیوں ——"

"منگنی کے لئے ——"

"کیا ضروری ہے منگنی کی رسم ——"

"کیوں نہیں —— اعلان ہو جاتا ہے ، سب کو پتہ چل جاتا ہے "

"اماں ——"

"ہاں ——"

"اس رسم کی کوئی ضرورت نہیں ——"

"کیوں اپنی خوشی سے کریں گے وہ ، تو جانتی تو ہے رفیق بھائی کی صحت گرتی جا
رہی ہے وہ بیٹے کی خوشی بھی دیکھنے کے متمنی ہیں "

"اماں ——"

"کیا بات ہے ——"

"اماں ٹھیک ہے انہوں نے رشتہ مانگا ہے آپ ہاں کر دیں ، لیکن منگنی کی رسم
ابھی رہنے دیں ——"

"کیوں ——"

وہ چند لمحے چپ رہی ۔

پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی ۔

"وہ —— وہ منگنی کے بعد شادی کی بھی جلدی مچا دیں گے "

ماں ہنس پڑی ۔ اور بولی ۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے بیٹی ۔ میں اپنی زندگی میں تیرے فرض کو نبھا لوں تو
اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی "

"اماں ـــــ میں ـــــ شادی ـــــ جلد نہیں کروں گی ـــــ"

اماں نے گھور کر اسے دیکھا۔

وہ مضبوط لہجے میں بولی ۔

"اماں طاہر کی ابھی معمولی سی نوکری ہے ـــــ اور ـــــ"

"وہ کوشش میں لگا ہوا ہے۔ شاید وہ بھی باہر ہی چلا جائے۔ سال دو سال میں
ڈھیروں پیسے کما لے گا ـــــ"

"وہ ـــــ وہ تو مقابلے کا امتحان ـــــ"

"سب نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ وہ باہر ہی چلا جائے۔ ربیعہ اور صبیحہ کے
سسرال والوں سے بات ہوئی ہے۔ شاید ان کے لڑکے آتے ہوئے اس
کا ویزا بھی لے آئیں ۔"

"یہ ساری باتیں تمہیں کس نے بتائیں ـــــ"

"کس نے بتانا تھا۔ ایک ہی گھر ہے ہمارا اور ان کا ـــــ کوئی بات چھپی
ہے ـــــ"

"لیکن طاہر نے مجھے تو کچھ نہیں بتایا۔"

اماں ہنس پڑی ۔

پھر پرمسرت لہجے میں بولی ۔

"ڈرتا ہے تم سے بیچارہ ـــــ آج ہی کہہ رہا تھا ـــــ"

"کیا ـــــ"

"کہ شگو کو دبئی مارکہ لوگ اچھے نہیں لگتے ـــــ کہیں میرے باہر جانے سے

ناراض ہی نہ ہو جائے ـــــ"

"ہوں ـــــ"

وہ خاموش ہو گئی ـــــ

اماں خوش کن لہجے میں باتیں کرتی رہی شگو نے پھر کوئی بات نہیں کی چپ چاپ
گم صم بیٹھی رہی ۔

وہ اس بات کے متعلق سوچ رہی تھی ۔

منگنی کی بات ـــــ

جو قطعاً غیر متوقع نہیں تھی ـــــ

اور ـــــ

نہ ہی اس کی مرضی کے خلاف تھی ۔ پھر بھی بہت سے عوامل اور بھی تھے
جن کے بارے میں سوچ لازمی تھی ۔

اماں نے اسے یوں سوچوں میں ڈوبے دیکھا تو من ہی من میں کچھ چونک کچھ
گھبرا سی گئی ۔ جلدی سے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا اور عجلت سے بولیں ۔

"کیا ہے شگو ـــــ خوش نہیں ہوئی تو ـــــ"

اس نے ماں کی طرف سپاٹ نظروں سے دیکھا ۔

چند لمحے دیکھتی رہی ـــــ

پھر ـــــ

سر جھکا کر ہاتھ مسلتے ہوئے بولی ۔

"خوش کیوں نہیں ہوں ـــــ"

"چپ سادھ لی ہے نا ——"

"تو کیا کروں ——"

"خوشی کے اظہار کے بڑے طریق ہیں اور تو تو —— ان طریقوں کو مجھ سے بہتر جانتی ہے۔ چپ سادھ لینا یقیناً خوشی کی علامت نہیں ——"

"ہاں اماں —— تم ٹھیک سمجھیں ——"

"تو کیا ——"

"نہیں نہیں —— ایسی کوئی بات نہیں —— میری پسند کو تم جانتی ہو۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے —— طاہر —— طاہر کو قریب پایا ہے!"

"پھر ——"

"پھر یہ کہ طاہر کے علاوہ بھی زندگی کچھ چاہتی ہے اور اماں تم جانتی ہو ——"

"جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھنا اچھی بات نہیں ——" اماں ایکدم ہی سنجیدہ ہو گئیں۔

لہجے میں کچھ ڈانٹ اور تحکمانہ عنصر بھی شامل تھا۔

پھر بھی سنبھل سنبھل کر شگوے سے بات کی۔

"بیٹی تو نے بہت بلند اور اونچے خیالی محل بنا رکھے ہیں، جس گھر میں تو نے جنم لیا ہے۔ کوئی معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔ جو تمہیں ان خیالی محلوں کو عملی صورت میں تمہارے سامنے ابھی سے لا رکھے۔ قسمت کا کچھ پتا نہیں ہوتا —— ہر ماں ہو تو منتوں میں حالات بدل جاتے ہیں —— تیری تقدیر میں یہ سب کچھ ہوا تو کے نانے بانے تو بنتی رہتی ہے تو کبھی نہ کبھی مل ہی جائے گا۔"

"اماں ——" وہ بھی سنجیدگی سے بولی۔ "اس کبھی نہ کبھی کا نہیں انتظار کر سکتی ہوں ——"

"کیا مطلب ——"

"اماں شادی کرنا ہی ہے اور یہ بھی طے ہے کہ طاہر سے کرنا ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔ "لیکن طاہر کے ساتھ مجھے زندگی کی سہولتوں آسائشوں اور رنگینوں کی بھی تمنا ہے۔ میں تم سے کئی بار کہہ چکی ہوں۔ میں آپا نہیں بنوں گی ——"

اماں چند لمحے چپ رہی۔

پھر ایک لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی۔ اسے حالات سمجھائے۔ مالی حالت سے آگاہ کیا۔

وہ سب کچھ پھر سے بتایا جو وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ یہ بھی بتایا کہ طاہر جیسے خوبرو تعلیم یافتہ اور شریف لڑکے پر جوان بیٹیوں کے کئی والدین کی نظریں ہیں جو لمبے چوڑے جہیز دینے کی پوزیشن میں ہیں۔ یہ تو اس کی انتہائی خوش قسمتی ہے کہ وہ طاہر اور اس کے گھر والوں کو بہت پسند ہے۔ بہت عزیز اور بڑی ہی پیاری ہے اس لئے وہ جہیز کو اہمیت دیئے بغیر اسے اپنانا چاہتے ہیں۔

وہ سنتی رہی، خاموشی سے صبر و تحمل سے۔

اماں تھک گئی تو غصے سے بولیں۔

"میں ہاں کر چکی ہوں —— تو ——"

وہ ہنس کر دھیمے لہجے میں بولی۔ "مجھے انکار تو نہیں۔ انکار کا میں سوچ بھی

نہیں سکتی اماں طاہر اور میں ـــــــ"

"تو پھر کیا مرگ پڑی ہے ـــــــ"

وہ مسکرا کر بولی۔ " اماں تم اب کچھ نہیں بولنا۔ ہاں کہہ دی ہے تو بس ٹھیک ہے، باقی مجھ پر چھوڑ دو ـــــ میں ـــ"

"تو کیا کرے گی ـــــ"

" طاہر سے بات کروں گی ـــــ وہ میری بات کبھی رد نہیں کرے گا۔" وہ اٹھ کر بولی۔

پھر ماں کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے لاڈ سے بولی۔

" شادی ابھی نہیں کروں گی۔ طاہر کچھ بن لے۔ میرے سہانے خوابوں کی تعبیر بن جائے۔ تب کروں گی۔"

اماں نے غصے سے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

لیکن ـــــ

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس نے نوری بوتیک سے خریدا ہوا کاٹن کا نیا جوڑا پہنا اسی نما دوپٹہ گلے ڈالا۔ بالوں میں برش پھیرا۔ آنکھوں کو نپل کا ہلکا سا ٹچ دیا اور نیچرل کلر کی لپ سٹک سے ہونٹوں میں تازگی بھری۔ اسے اپنی سہیلی کے ہاں جانا تھا۔

وہ تیار ہو کر صحن میں آئی۔

"اماں میں جا رہی ہوں ـــــ"

"جلدی آجانا ـــــ" ماں نے نل تلے وضو کرتے ہوئے کہا۔

"آجاؤں گی ـــــ"

"اکیلی جائے گی ـــــ"

"طاہر چھوڑ دے گا ـــــ"

"واپسی ـــــ"

"طاہر ہی سے کہہ دوں گی لے آئے گا ـــــ"

"تو ـــــ"

"بس اماں ـــــ" وہ مسکرائی۔ "کوئی نصیحت نہیں چلے گی ـــ طا
کے ساتھ میں ہمیشہ ہی آتی جاتی ہوں ـــ اور اب تو ـــ تم نے
ہاں بھی کہہ دی ہے۔"

"ہاں کہہ دی ہے اسی لئے طاہر سے ملنا ملانا بند کر دے ـــ"

"کیوں کر دوں ـــ"

"دستور اور قاعدے کی بات یہی ہے ـــ" اماں بولی۔

شگو ہنس پڑی۔

"اپنوں میں یہ دستور قاعدے نہیں چلتے اماں ـــ مجھے تو تمہارے
ہاں کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سب کچھ ویسا ہی ہے۔"

"ویسا نہیں ہے ـــ ذرا محتاط رہا کر ـــ"

"اچھا آج تو جانے دو ـــ" وہ تقریباً اسی وقت مظہر کے
سکوٹر پر بازار جاتا ہے ـــ"

"ضروری تھوڑا ہے ـــ"

"ہے ـــ ابھی سکوٹر سٹارٹ ہونے کی آواز نہیں آئی، یقیناً گھر
ہی ہوگا۔ مجھے ڈراپ کر دے گا۔"

شگو نے بیگ جھلاتے ہوئے کہا۔

پھر ـــ

ماں کی کوئی بات سنے بغیر خدا حافظ کہتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف
بڑھ گئی۔

اماں نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے سر ادھر ادھر ہلایا۔ اس
لڑکی کے سامنے اماں کی پہلے ہی کب چلتی تھی اب تو وہ جاب کرنے لگی تھی
خاصی ہوشیار اور سیانی ہو گئی تھی۔ من مانی کرنے کا اسے پروانہ مل گیا تھا۔

اماں دوپٹے سے ہاتھ منہ پونچھتے ہوئے اٹھی۔

گھسی ہوئی دری کی جا نماز صحن کے ایک کونے میں بچھاتے ہوئے
دل ہی دل میں کہا۔

"شائستہ سے کہوں گی ـــ اس باؤلی کو سمجھائے کہ اب طاہر سے
بے تکلفی سے ملنا جلنا چھوڑ دے۔ چاہے اپنے ہی ہوں باتیں بنانے
سے باز نہیں آئیں گے۔"

اماں نے یہی سوچتے ہوئے نماز کی نیت باندھ لی۔ تب تک شگو اوپر
جا چکی تھی۔

درمیانی دروازے سے اسے پھپھو کے ہاں جانا تھا۔

وہ گنگناتے ہوئے ادھر گئی۔

خیال تھا طاہر نیچے ہوگا۔

لیکن ـــ

وہ اپنے کمرے ہی میں تھا۔

قدموں کی آہٹ میں نغمے کی گنگناہٹ گھل کر کانوں میں اتری تو وہ کنگھی
آئینے کے پاس ہی رکھ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

شگو کو دیکھ کر وہ خوشی سے کچھ بہک سا گیا ـــ

سرشاری کے عالم میں آگے بڑھا اور وفورِ مسرت سے اس کے
کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بے اختیاری سے اسے دو ایک چکر دیتے ہوئے
بولا ——

"اوہ —— شگو —— شیگی —— شگفتہ ——"

"یہ —— یہ کیا ——" شگو اس کے اندازِ جنوں سے کچھ گھبرائی۔

وہ اسے کھینچتا ہوا کمرے میں لے آیا۔

"شگو ——" اس نے بازو وا کر دیئے۔

طاہر بہت خوش تھا۔

شگو نے سمٹنا چاہا۔

ایک طرف ہوئی ——

لیکن ——

اس نے عالمِ بے تابی میں اسے بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگایا

"کیا وحشت ہے ——"

شگو بمشکل اپنا آپ چھڑاتے ہوئے مسرور سی سرزنشی نگاہوں سے
اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

وہ اس کو دیکھ کر نورِ مسرت سے چہک کر بولا۔ "شگو میں کتنا خوش ہوں
کتنا خوش ہوں —— تمہیں ——"

"کیا مل گیا —— جو اتنے خوش ہو ——"

"تم مل گئی ہو ——"

"میں گئی کہاں تھی —— جو مل گئی ہوں ——"

"کہیں بھی نہیں —— کہیں بھی نہیں گئی تھیں۔ پر اب —— اب پکی پکی
مجھے مل گئی ہو ——"

شگو اس کی بات پر ہنسی آگئی۔

"لیکن ——"

ہنستے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"تمہارا مطلب میں نہیں سمجھی ——"

"سچی ——"

"سچی ——"

وہ حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تمہیں پتہ نہیں چلا ——"

"کس بات کا ——" وہ بولی۔

"امی نے کچھ نہیں بتایا ——"

"کیا بتانا تھا ——"

"بھئی —— یہی کہ —— یہی کہ ——"

"کیا یہی کہ ——"

وہ ہنستے ہوئے بولا "بھئی ہمارے بزرگوں نے فیصلہ کر لیا ہے۔
ہماری منگنی کرنے کا۔"

"اوہ —— اچھا ——" وہ دروازے کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ

گئی ـــــ اس نے طاہر کی بات پر کسی جذباتیت کا اظہار نہیں کیا، بلکہ کچھ چپ سی ہوگئی۔

طاہر نے اسے دیکھا،

حیرانگی سے دیکھا۔

اس کی چپ نے طاہر کے اندر اچھلتی کودتی خوشیوں کو بے دم سا کر دیا۔

وہ بڑی بے اختیاری سے کرسی کے ہتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جھک کر بولا۔

"کیا بات ہے شگو ـــــ تم ـــــ تم ـــــ تمہیں خوشی نہیں ہوئی ـــــ"

شگو نے نگاہیں اٹھائیں۔

طاہر کی خوبصورت آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بڑے دلفریب انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"یہ بات تم نے کیسے کہہ دی کہ مجھے خوشی نہیں ہوئی ـــــ"

طاہر نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔

وہ انداز دلربائی سے بولی۔

"کیا ہم ایک دوسرے کے جذبات کو نہیں سمجھتے ـــــ؟ ہمیں اپنے جذبوں کی گہرائی اور گیرائی ایک دوسرے پر عملی طور پر واضح کرنے کی ضرورت ہے ـــــ"

طاہر چپ رہا ـــــ

"بتاؤ نا ـــــ ہے ضرورت ـــــ"

"نہیں ـــــ"

"ہوں ـــــ یہ بات تسلیم کرتے ہو ـــــ"

"بالکل ـــــ"

"تو پھر تم نے کیسے کہہ دیا کہ مجھے خوشی نہیں ہوئی ـــــ"

"تم ایک دم چپ جو ہوگئیں ـــــ"

"چپ ہونے کا مطلب نہ خوش ہونا ہوتا ہے ـــــ"

"یقیناً نہیں ـــــ لیکن پھر بھی اتنی بڑی خبر پر یوں چپ سادھ لینے سے وسوسے تو پیدا ہوتے ہی ہیں نا ـــــ"

"تم میں اعتماد کی کمی ہے طاہر ـــــ اسے دور کرو ـــــ ورنہ ـــــ یہ کمی کسی وقت بھیانک صورت حال بھی پیدا کر سکتی ہے ـــــ"

طاہر بے دم سا ہو کر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے اضطراب کے عالم میں پاؤں ہلاتا رہا۔

پھر بولا "مجھے تمہاری باتوں کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی ـــــ"

"اتنے بودے تو نہیں ہو ـــــ"

"کھل کر کہو ـــــ"

"کیا ـــــ"

"ان باتوں سے کیا مطلب نکالوں ـــــ"

"ہوں ـــــ" اس نے دو ایک بار طاہر کو دیکھا۔ پھر سر جھکاتے ہوئے

کچھ سوچنے لگی۔

"کیوں شش و پنج میں پڑی ہو ــــ"

"دیکھو طاہر ــــ"

"ہوں ــــ"

"یہ خبر مجھے اماں نے سنائی تھی ــــ"

"پھر ــــ"

"پھر یہ کہ ــــ جب ہم دونوں کے گھر والے رضامند ہیں، اور ہم دونوں کے بارے میں بھی وہ اچھی طرح جانتے ہیں ــــ تو پھر رسموں ریتوں کا کیا جواز"

نگو نے کہا۔

"یعنی ــــ"

"باقاعدہ منگنی کی کیا ضرورت ــــ"

"ہرج بھی تو کوئی نہیں ــــ"

"ہے ــــ"

"کیا مطلب ــــ"

"مطلب یہ کہ منگنی ہو گئی تو پھر شادی بھی جس وقت چاہے ہو سکتی ہے"

"ہاں تو ــــ"

"طاہر ــــ" وہ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولی "میں ابھی شادی نہیں ــــ کروں گی ــــ"

"ابھی کون کر رہا ہے ــــ"

"میرا مطلب سمجھتے ہو ــــ"

"شاید ــــ اور شاید نہیں ــــ"

"طاہر تم جانتے ہو ــــ پرتعیش زندگی کے خواب میں نے کب سے دیکھنا شروع کیے تھے ــــ"

"ہاں ــــ"

"میرے ان خوابوں کے تم بھی حصہ دار ہو ــــ یقیناً تم بھی اک پرمسرت رہائش اور ہر طرح کی مادی سہولتوں سے مزین زندگی کے خواہاں ہو"

"ہوں ــــ"

"کیا تم نہیں چاہتے کہ ہمارا بھی خوبصورت سا سجا سجایا گھر ہو، گھومنے پھرنے کے لئے گاڑی ہو، نوکر چاکر ہوں، روپیہ پیسہ پاس ہو، جو آسائش بھی خرید سکیں حاصل کر سکیں"

"کیوں نہیں چاہتا ــــ یہ سب کچھ میں حاصل کروں گا تمہاری خواہش پوری کرنے کے لئے میں جان توڑ کوشش کروں گا ــــ میں تمہارے خیالات اور رجحانات سے بے خبر تو نہیں ــــ"

وہ اسے دیکھ کر تفاخر سے مسکرائی۔

طاہر جذباتی لہجے میں بولا۔

"اسی لئے تو میں سی ایس ایس کی تیاری کر رہا تھا، لیکن اب لگتا ہے دوسرا راستہ ہی ڈھونڈنا پڑے گا۔ سی ایس ایس والا خیال لمبا راستہ ہے جس کے لئے بہت وقت درکار ہے، شارٹ کٹ لینے کی سوچ رہا ہوں"

"شارٹ کٹ ——"

"ہاں شگو —— شاید تمہیں اچھا نہیں لگے گا۔ میں جانتا ہوں تمہیں ا
لگے گا۔ لیکن تم جو خواب دیکھتی چلی آرہی ہو نا —— اور جن خوابوں میں میں
برابر کا شریک ہوں —— وہ صرف اور صرف اسی طرح پورے ہو سکتے
طاہر نے کہا۔

"کیا مطلب ——" وہ بولی۔

"مطلب یہ کہ میں بھی باہر چلا جاؤں باہر جا کر لوگوں نے بے تحاشہ
کمایا ہے۔ دیکھتے دیکھتے ہی ان کے شب و روز بدل گئے ہیں معیار بدل گ
ہیں۔ دنیا کی ہر آسائش ان کے گھروں میں اتر آئی ہے۔"

شگو نے یونہی سر ہلایا۔

"اب دیکھو نا صبیحہ کے سسرال والے۔ ربیعہ کا منگیتر تیس پینتیس ہزار
لگ بھگ تنخواہ لے رہا ہے۔"

شگو کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں حیرت سے بولی۔

"واقعی ——"

"تو اور کیا —— ؟ اسی لئے تو میں نے بھی سوچا ہے کہ باہر چلا جاؤں۔
پاس تعلیم ہے قابلیت ہے۔ میں بھی ڈھیروں روپیہ کما سکتا ہوں۔
چار سال میں تیرے سارے سنہرے سپنے تکمیل پا سکتے ہیں ——"
نے کہا۔

"یہ بات ہے تو ضرور جاؤ باہر —— میں دو سال تو کیا دس سال

بخوشی انتظار کر لوں گی۔"

"تمہاری اجازت ہے تو بس اللہ کا نام لے کر سنجیدگی سے کوشش شروع
کروں گا ——"

طاہر نے جوش مسرت سے کہا۔

شگو نے بھی خوشگوار سی مسکراہٹ سے اس کی خوشی کا خیر مقدم کیا۔

"لیکن ایک بات ہے ——"

"کیا ——"

"میرے بنا رہ لوگی ——"

"بالکل رہ لوں گی ——"

"بڑی کٹھور ہو ——"

"کیوں ——"

"میں تو اس سوچ ہی سے ڈانوا ڈول ہو جاتا ہوں ——"

"بالکل نہیں ہونا ——"

"جو حکم سرکار ——"

دونوں ہنس پڑے۔

تھوڑی دیر دونوں باہر جانے والوں کی باتیں کرتے رہے۔ شگو کو خوش
دیکھ کر طاہر کو خوشی ہو رہی تھی۔

"ہم جیسے لوگوں کے لئے حالات کو جلدی کو خوشگوار پلٹا دینے کا یہی آسان
ترین راستہ ہے شگو۔ سی ایس ایس کر بھی لوں —— تو ٹھاٹھ باٹھ کی نوکری

تو شاید مل ہی جائے لیکن پیسہ تو اتنا ہی ملے گا ــــــ جتنی تنخواہ ہوگی ــــ
یہ تنخواہیں ہزاروں لاکھوں میں تو نہیں ملتیں ــــــ جبکہ باہر جا کر بندہ سال میں
لاکھوں تو کما سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے ــــــ"

"شگو ــــ میں نے بھی ہمیشہ ایسی ہی آرام دہ اور پر تعیش زندگی تمہارے
ساتھ بسر کرنے کا خواب دیکھا ہے۔ میں تمہیں ان حالات میں شادی کر کے
کبھی اپنی زندگی میں لا کر نگارش لگتہ آپا کی مثال ہمارے سامنے ہے ــــ"
طاہر نے کہا۔

"بس اسی سے تو خوفزدہ ہوں ــــــ"

"خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں جان ــــــ"

"ہٹو ــــ اس طرح مت کہو ــــــ"

"بہت اچھا سرکار ــــــ"

شگو مسکرانے لگی۔

"ہاں تو ــــ میں جس لئے آئی تھی ــــــ"

"وہ تو بعد میں بتانا ــــ پہلے یہ بتاؤ اب منگنی ــــ کی باقاعدہ ــــ
رسم کے لئے تیار ہو ــــــ"

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "بشرطیکہ شادی کے لئے جلدی نہ مچائی
جائے ــــــ"

"بالکل نہیں مچائی جائے گی ــــــ" طاہر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "وہ تو طے

ہو ہی گیا ــــــ"

"مجھے تمہارے کہے پر اعتماد کر لینا چاہیئے نا ــــــ"

"بالکل ــــ سو فیصد ــــــ میں خود نہیں چاہتا ــــ کہ جیب خالی ہو اور
جیون ساتھی کا ــــــ"

"بہت اچھے ہو ــــــ"

"سچ ــــــ"

شگو پھسلنی مچھلی کی طرح غڑاپ سے دروازے سے باہر نکل آئی۔
اور ہنستے ہوئے بولی۔

"تم بازار جا رہے ہو ــــــ"

"چالاک کہیں کی ــــــ"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

طاہر اسے پکڑنے کو لپکا۔

لیکن ــــــ

وہ جلدی سے پیچھے ہٹ کر جنگلے کے قریب چلی گئی۔ اسے ستاتے
ہوئے منہ چڑایا۔ پھر بولی۔

"میں نے اپنی سہیلی کے ہاں جانا ہے مجھے لے چلو گے۔ بازار تو تم جا
رہے تھے نا ــــــ"

"ہاں ــــ مگر ایک شرط پہ لے جاؤں گا ــــــ"

"کس پہ ــــــ"

"ادھر آؤ پہلے ——"

"اوں ہوں ——"

"آؤ نا ——"

"یہ آگئی ——" کہتے ہوئے اس نے پھر ٹھینگا دکھایا اور سیڑھیوں کی طرف ہنستے ہوئے بھاگ گئی۔

طاہر اس کی ادا پر مسکرا دیا۔

گھوم کر ایک بار پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارنے لگا۔ وہ بازار جانے کے لئے ہی تیار ہوا تھا۔ کنگھی رکھ کر اس نے آئینے پر چہرہ پر زاویے سے دیکھا۔

اور ——

پھر ——

کوئی مسرور سا نغمہ گنگناتے ہوئے سکوٹر کی چابی اٹھائی چابی انگلی کے گرد گھماتے ہوئے وہ بھی نیچے چلا آیا۔

شائستہ بڑے دنوں بعد اماں کے ہاں چند دن رہنے کے لئے آئی تھی، پانچویں بچے کی آمد آمد تھی۔ بہت نڈھال ہو رہی تھی۔ رنگت پیلی پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے چہرہ چھائیوں سے بھرا ہوا تھا پیٹ ہی پیٹ پھولا ہوا تھا۔

باقی جسم کی ہڈیوں پر چمڑی منڈھی ہوئی تھی۔ کمر میں مستقلاً درد رہتا تھا۔ پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ ساس کے فوت ہو جانے کی وجہ سے گھر کا سارا بوجھ اسی کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ شگو اسے ڈاکٹر کے پاس بھی لے گئی تھی۔

شبنم کلینک کی ڈاکٹر سلیمہ بلوچ بڑی اچھی گائناکالوجسٹ تھی شگو کے نرس ہونے کے ناطے اس نے فیس بھی نہیں لی تھی۔ دوائیاں اور ٹانک بھی دیئے تھے۔

اچھی خوراک اور ہر قسم کے تفکرات سے ذہن کو آزاد رکھنے کی تلقین کی تھی۔

معائنے کے بعد شائستہ واپس گھر جانا چاہتی تھی لیکن شگو نے روک لیا۔

"آپا کچھ دن رہ جاؤ یہیں، تمہاری صحت تو بالکل ہی بگڑ گئی ہے۔ چند دن یہاں رہ کر آرام کرو"

شائستہ نے افسردہ سی مسکراہٹ سے کہا۔

"میں اکیلی تو نہیں رہ سکتی —— چاروں بچوں کو بھی ساتھ لاؤں۔ وسیم بھی یہیں رہیں —— تو —— "

"تو کیا ہوا —— " شگو بولی "سب ہی آجائیں —— "

"اتنا خرچہ —— "

"کوئی بات نہیں —— اب تو میں بھی کما رہی ہوں —— ایک تنخواہ تمہاری نذر ہی سہی —— "

شگو نے ہنس کر کہا۔

تو شائستہ کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

"بہت حساس ہو گئی ہو آپا —— " شگو نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

"لیکن جو بھی ہے —— دو ایک ہفتے یہاں رہ جاؤ —— آرام بھی ملے گا اور دیکھ بھال بھی ہو گی —— "

"جی تو بہت چاہتا ہے —— "

"پھر سوچتی کیا ہو —— "

"بار بننا نہیں چاہتی تم لوگوں پر —— "

"اے جانے بھی دو آپا —— بڑی بوڑھیوں والی باتیں تم نے پتہ نہیں کہاں سے سیکھ لی ہیں —— میرا تو جی چاہتا ہے —— تمہاری ڈلیوری بھی یہاں ہی ہو —— "

"نہیں شگو بہت خرچہ اٹھے گا —— "

"اپنے گھر میں ہو گی تو نہیں اٹھے گا —— "

"اٹھے گا وہاں بھی —— "

"وہ خرچہ تم وہاں رہ کر بھی کر سکتی ہو۔ دیکھ بھال تو ہو گی یہاں، ریسٹ کر سکو گی۔ دوسرے اس دفعہ میں نے تمہاری —— "

"کیا —— "

"ٹیوب بند کروانی ہے —— ڈلیوری کے بعد بہت آسانی ہوتی ہے چھوٹا سا آپریشن ہوتا ہے۔ آپا اپنی جان کی خیریت چاہتی ہو تو اس دفعہ آپریشن ضرور کروانا ہو گا۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے —— "

"بچے پیدا کرتے ڈر نہیں لگتا —— "

شگو نے اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا۔

شائستہ آپریشن کروانے پر رضامند ہو گئی۔

"اچھا اب گھر جاؤ۔ آپا اور اپنے بال بچوں کو لے کر چلی آؤ۔ چند دنوں کے لئے ہی سہی۔ وسیم بھائی بھی ادھر ہی آجائیں۔"

اماں بازار سبزی گوشت لینے گئی تھی، وہ پلاسٹک کی ٹوکری میں سودا سلف

بھر کر لے آئیں ——

شائستہ گھر جانے کو تیار کھڑی تھی —— لمبی چوڑی چادر میں اس نے اپنا آپ لپیٹ رکھا تھا۔

"کہاں جارہی ہو —— ڈاکٹر ملی —— کیا کہا اس نے ——" اماں نے ٹوکری ٹوٹی ہوئی کرسی پر رکھ کر اپنی چادر اتاری۔

"یہ گھر جارہی ہیں اماں ——"

شگو نے کہا۔

"کھانا تو کھا کر جانا ——" اماں بولی۔

"کھانے تک آجائیں گی ——"

شگو نے کہا۔

"کیا مطلب ——" اماں نے پوچھا۔

شگو نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اماں —— آپا سے کہا ہے چند دنوں کے لیے یہیں رہ جائیں۔"

اماں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "ہاں —— اچھی بات ہے۔ پھر وہ کہاں رہی ہے ——"

شائستہ نے کہا۔ "کپڑے لینے جارہی ہوں —— بچوں کو بھی لانا ہے، اماں ——"

"ہاں، ہاں لے آ ——" اماں بولی۔ "ڈاکٹر نے کیا کہا ——"

"کیس نارمل ہے اماں ——" شگو بولی۔ "لیکن انہیں آرام کی بھی ضرورت

ہے اور اچھی خوراک کی بھی —— اسی لیے تو میں نے کہا ہے —— یہیں رہ لیں چند روز ——"

"ٹھیک ہے ——" اماں نے کہا۔ "جا لے آ بچوں کو بھی —— لیکن وسیم"

"وہ بھی یہیں آجائیں —— یہیں سے دفتر چلے جایا کریں گے ——"

"ہوں ——"

شائستہ نے کچھ سوچا، پھر بولی۔

"وسیم شام کو آجائیں —— تو پھر ہم لوگ شام ہی کو آجائیں گے۔ دوپہر کا کھانا ہمارے لیے نہ بنانا اماں ——"

"اچھی بات ——" شگو بولی۔ "شام تک بچوں کے کپڑے وپڑے بھی ٹھیک کرلینا۔ دھو دھلا لینا —— اور ہاں مرا ڈھنگ کے کپڑے ہی لے کے آنا ساتھ ——"

"ڈھنگ کے تو وہی ہیں —— جو تم نے لے کر دیئے ہیں۔" شائستہ نے مسکرا کر کہا۔

"اور لے دوں گی ——" شگو شان سے بولی۔

"جیتی رہو ——" شائستہ نے دعا دی۔

"اوں ہوں —— جیتی رہو نہیں —— کھو کماتی رہو ——" شگو نے ہنس کر کہا تو شائستہ بھی مسکرا دی۔

"چلو —— میں رکشے تک چھوڑ آؤں ——" اماں نے پھر سے چادر اٹھائی تو شائستہ بولی۔ "نہیں اماں تم کیوں تکلیف کرتی ہو۔ میں خود لے لوں گی رکشہ ——"

اول تو دیگن ہی مل جائے گی ——"

وہ سلام کر کے باہر نکلی۔ اماں اور شگو اسے گلی کے دروازے تک چھوڑ آئیں ——

"بہت کمزور ہو گئی ہے آپا —— بچے تو ان کے اب ہونے ہی نہیں چاہیے" واپس مڑتے ہوئے شگو نے کہا۔

اماں نے ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ "زندگی کے دن پورے کر رہی ہے میری بچی۔ ساس کے مرنے سے تو سارے گھر کا بوجھ بھی اس کے ناتواں کندھوں پر آن پڑا ہے ——"

"کچھ دیکھ کر —— کچھ سوچ سمجھ کر رشتہ کیا ہوتا نا اماں —— تو آج ..."

"قسمت کی بات ہے ——"

"قسمت انسان خود بھی بناتا ہے اماں ——"

"اماں نے نفی میں سر ہلایا تو شگو کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔ "میں تو بناؤں گی اپنی قسمت —— پھر دیکھنا ——"

"خدا تمہاری قسمت اچھی کرے ——"

"کرے گا ضرور کرے گا ——"

اماں نے اثبات میں سر ہلایا۔

دونوں باتیں کرتیں صحن میں آگئیں۔

اماں نے سبزی کی ٹوکری اٹھائی اور باورچی خانے کی طرف قدم بڑھایا۔

"اماں ——" شگو نے کہا۔

"کیا ہے ——"

"میں ادھر جا رہی ہوں ذرا —— دیکھوں تو صبو اور ربیعہ آپا نے کپڑے کیسے ٹانکے ہیں ——"

"جا —— کچھ ہاتھ بھی بٹایا کر ان کا —— نری گپیں لگا کر اٹھ آتی ہو ——"

"گپیں بھی ضروری ہیں اماں —— دونوں ہی چلی جائیں گی۔ پچیس دن ہی تو رہ گئے ہیں مجھے تو ابھی سے ہول آ رہا ہے۔ ان دونوں کے جانے سے کتنی بے رونقی ہو جائے گی"

"اسی لئے رونق بلالی ہے ——" اماں نے مسکرا کر کہا۔

شگو کچھ نہیں سمجھی۔

ماں کو دیکھ کر بولی۔ "کیا مطلب ——"

"شائستہ کے پورے گھرانے کو بلا لیا ہے نا —— جانتی ہے کتنا خرچہ ہوگا ——"

"کیا ہوا اماں —— آپا بیچاری کی حالت دیکھی ہے"

"اپنی حالت بھی تو دیکھنا ہوتی ہے۔ اس مہینے اور بھی خرچے ہونا ہیں"

"اور بھی ——"

"ہاں تو۔ ربیعہ اور صبیحہ کی شادیوں پر —— اور پھر —— جو انہوں نے منگنی کی رسم بھی کی تو ——"

"اماں ——"

"ہوں ——"

"یہ رسم دسم نہیں کرنا ہمیں ——— میں نے پھپھو اور پھوپھا کو بھی قائل کر لیا ہے —— یہ رسم یونہی تو نہیں ہو جائے گی ——— جانتی ہو —— کتنا پیسہ چاہیے ——"

"ہاں پیسہ تو خرچ ہوگا ہی ——"

"فضول خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں کہیں بھاگی جا رہی ہوں نہ۔ جب تم نے ہاں کہہ دی۔ تو باقی کیا رہ گیا —— زبان بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے اماں ——"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن ہمیں ان کی خوشی بھی تو دیکھنا ہے۔"

"دیکھ لیں گے ——"

شگو نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

پھر کھونٹی پر سے اپنا دوپٹہ اتارا۔ بالوں کو انگلیوں سے سلجھایا اور برآمدہ کی طرف بڑھ گئی۔

شام کو شگفتہ وسیم اور بچے آ گئے۔

بچوں نے بڑے سمارٹ کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ یہ ریڈی میڈ کپڑے شگو نے ہی ان کے لئے خریدے تھے ——— شگو کو یہ سمارٹ بچے بہت پیارے لگے اس نے انہیں خوب پیار کیا۔

وسیم اور شائستہ خوش ہو گئے۔

بچوں کی شکلیں ہی بدل گئیں۔ شگو نے شادر کے گھنے بالوں میں ہاتھ درست کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"یہ سب تمہاری مہربانی سے ہے شگو بی بی ——" وسیم نے مسکرا کر کہا۔

"بچوں کی شکلیں تو وہی ہیں۔ اچھے لباس سج رہے ہیں۔"

"اور اس منو کو دیکھو اماں ——" شگو گول مٹول سے بھانجے کے گال پیار کرتے ہوئے بولی۔ "نیلی شرٹ اور نیکر میں کتنا پیارا لگ رہا ہے اور تو اور جھینگا بھی اس نے ڈیڑھ سالہ بھانجے کو جسے وہ جھینگا کہا کرتی تھی، گود میں اٹھا لیا۔

"میں آنٹی ——" رفی بھی اپنا ڈریس دکھانے لگی۔

"چاروں کے چاروں بہت پیارے لگ رہے ہو ——" شگو نے اعلان کیا۔

بچے خوش ہو گئے۔

"کپڑے میلے نہیں کرنا —— سمجھے ——" شگو نے انہیں نصیحت کی "جاؤ کھیلو اب ——"

بچے صحن میں آ گئے۔

شگو چائے لے آئی۔

اماں نے بنا دی تھی۔ چائے کے ساتھ گرم گرم سموسے بھی تھے۔ بچوں نے خوشبو سونگھی۔ اور کھیل چھوڑ چھاڑ کر اندر دوڑے آئے اور آتے ہی میز پر رکھی طشتری پر ٹوٹ پڑے۔

شگو شور مچاتی رہ گئی۔ لیکن بچوں نے اپنا اپنا سموسہ اٹھایا۔ کچھ کھایا کچھ گرایا۔ اور بھاگ گئے۔

شگو نے بچوں کو ان کی بدتمیزی پر خوب ڈانٹا —— کوسا —— اماں

آنکھیں نکال نکال کر تنبیہ کرتی رہی کہ وسیم بیٹھا ہے برا مان جائے گا۔ لیکن اس نے ماں کی نظروں کے اشارے سمجھ کر بھی نہ سمجھی۔

وسیم نے اس کے کوسنے اور ڈانٹنے پر طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "شگو بی بی یہ سب آپ کی آپا کی تربیت کا نتیجہ ہے۔"

"بچے ایسے ہی ہوتے ہیں یوں نہ کریں تو بچوں اور بڑوں میں فرق ہی کیا ہو۔" اماں نے معاملہ برابر کرنا چاہا۔

"نہیں اماں واقعی بہت بدتمیز اور بے صبرے ہیں یہ بچے ——" شائستہ نے کہا۔

"آپ ہی کا فیض ہے جناب ——" وسیم بولا۔

شائستہ نے جل کر جواب دیا۔

"آپ خود تربیت کر لیتے نا۔ کبھی نصیب ہی نہیں ہوا کہ دو چار گھڑی بچوں کے ساتھ بھی ہنس کھیل کر گزار سکو۔"

"میں کیا بیکار ہوتا ہوں ——"

"نہیں جی آپ تو کمائی کرتے رہتے ہیں دن رات۔"

میاں بیوی میں تو تو میں میں ہونے لگی —— نوشگو نے بیزاری سے کہا۔

"بھئی یہاں آپ لوگ آئے ہیں تو لڑائی نہیں چلے گی —— خوش خوش رہیں —— بس ——"

شائستہ بڑی صابر تھی ——

لیکن

آج دل کے پھپھولے پھوڑنے لگی۔

وسیم کو اماں نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا لیا۔

شگو شائستہ کو لے کر پھپھو کی طرف چلی گئی۔

ماں بیٹی ایسا نہ کرتیں تو آج دونوں میں زبردست ٹکراؤ ہو جانا تھا۔

اس رات شگو بڑی مضطرب رہی۔

بار بار آپا کا خیال آتا

اس کے بچوں کے متعلق سوچتی۔ وسیم بھائی کی قلیل آمدنی پر اتنے بڑے کنبے کا بار تھا۔

جانے اتنے کم پیسوں میں گھر داری کی گاڑی کیسے کھینچ رہے تھے آپا اس تنخواہ میں کیونکر خرچہ چلا رہی تھی۔

زندگی ضرورتوں سے بھری پڑی تھی۔ ان پیسوں سے تو چند ضرورتوں کا منہ بھی بند نہ ہو پاتا تھا۔ جانوروں کی طرح کھا پی لیتے تھے۔ اوڑھنے پہننے کے لئے کہاں کچھ بچتا ہوگا۔

بچوں کو جو دو دو جوڑے کپڑوں کے اس نے لے کر دیئے تھے وہ کتنی مدت چل سکتے تھے۔؟

ان کپڑوں میں کتنے سمارٹ لگتے تھے بچے۔ شکلیں ہی بدل گئی تھیں

ورنہ

جو کپڑے آپا انہیں پہناتی تھی۔ حلیہ ہی بگڑا ہوتا تھا۔

لیکن ——

ایسے کپڑے وہ ہمیشہ ہی نوان کے لئے نہ خرید سکتی تھی۔ اتنے پیسے تو نہیں تھے نا اس کے پاس۔

وہ پیسوں کے متعلق سوچتی رہی۔

کئی ماہ ہو چکے تھے نوکری کرتے ——

لیکن ——

ابھی تک سوائے چند جوڑوں اور جوتوں کے وہ اور کچھ نہ خرید سکی تھی۔ اماں کو مشین کی موٹر لے دی تھی۔

اور ——

دو ایک جوڑے بھی سلوا دیئے تھے۔

شائنہ کے بچوں کو دو دو جوڑے لے دیئے تھے اتنی گنجائش نہ نکل رہی تھی کہ وہ اپنے گھر کی مرمت کروا سکے۔ ڈرائینگ بنا سکے، صوفہ قالین اور پردے خرید سکے۔

ان چیزوں کے لئے تو بہت پیسہ چاہیئے تھا۔

بہت ——

جو ملنے کا امکان نہیں تھا۔

نوکری ضرور کر رہی تھی، لیکن یہ تنخواہ اس کے سنہرے خوابوں کی تعبیر کے لئے ناکافی تھی۔

کاش ——

کاش اس کے پاس کہیں سے ڈھیروں پیسہ آجائے وہ کم از کم آپا کے گھر اور بچوں کا تو حلیہ بدل دے۔

اماں سے مشین چھڑوا دے۔

اور ——

اپنے لئے اک خوبصورت اور حسین سا گھر بنا لے۔

وہ سوچتی رہی۔

اور پیسے کی اہمیت سے مرعوب ہوتی رہی۔

اس کے اندر پیسہ حاصل کرنے کی تمنا زور پکڑتی رہی، لیکن یہ تمنا بار آور کیسے ہو، وہ اس بات کا تعین نہ کر پائی۔

شگو ڈاکٹر شاہد کے ساتھ کمروں اور وارڈ کا راؤنڈ لگا کر واپس ڈیوٹی روم میں آئی، ٹرے میز پر رکھ دی اور خود باتھ روم میں ہاتھ دھونے چلی گئی۔ کمرہ نمبر اٹھارہ کی زچہ کے بیڈ تبدیل کرنے تھے۔ اور بیڈ نمبر چھ کے پاؤں کے زخم دھو کر پٹی کی تھی۔

بحیثیت نرس اسے یہ کام کرنا پڑتے تھے لیکن یہ کام اس کے پسندیدہ نہیں تھے۔ ڈاکٹر سمیع تک کمپلینٹ نہ جا پہنچے اس ڈر سے وہ شعوری کوشش سے اپنے آپ کو خوش طبع بنا کر یہ کام کرتی تھی ورنہ اس کا دل تو چاہتا تھا ایسے کاموں کو ہاتھ نہ لگائے۔

ہاتھ صابن سے مل مل کر دھونے کے بعد وہ ہاتھوں کو سونگھنے لگی۔ جرم کش ادویات کی بو ہاتھوں میں رچ بس جایا کرتی تھی۔ یہ بو کبھی کبھی یونیفارم میں سے بھی آنے لگتی تھی۔ شگو کو اس بو سے متلی ہونے لگتی۔ ہاتھوں کو دوسری بار اس نے صابن ملا۔ اور کتنی ہی دیر نل تلے دھوتی رہی۔ بیزاری

سے وہ سوچتی رہی ـــــ کہ یہ ناپسندیدہ کام اسے کب تک کرنا پڑے گا۔

کاش ـــــ

وہ نرس نہ بنی ہوتی ـــــ

اپنی طبع کے خلاف کوئی پیشہ اختیار کرنا پڑے تو اسے خلوص سے نبھایا نہیں جا سکتا۔

اپنے بیگ سے رومال نکال کر ہاتھ پونچھتے ہوئے وہ باتھ روم سے باہر آگئی۔ ڈیوٹی روم میں بیلا، حنا، نجمہ اور دو تین اور لڑکیاں آچکی تھیں، اونچی آواز میں باتیں کرتے ہوئے سب اپنے اپنے ٹرے اٹھا رہی تھیں۔ کسی کے ہاتھ میں سٹیتھو سکوپ تھی۔ کسی نے بی پی آپریٹس اٹھا رکھا تھا۔ بیلا ڈیوٹی دے کر واپس آئی تھی۔

باقی سب اپنے اپنے بیڈس کو دوائیاں دینے بخار دیکھنے اور بی پی جانچنے جا رہی تھیں۔

"ہیلو شگو ـــــ" بیلا نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اسے دیکھا۔

"ہیلو ـــــ" شگو رومال کرسی کی پشت پر پھیلاتے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھی۔

"آج تمہاری ڈیوٹی ڈاکٹر شاہد کے ساتھ تھی۔ راؤنڈ لینے کی۔"

"ہاں ـــــ"

"میرے ذمہ تو سسٹر نجمہ نے آج بستر بدلنے کی ڈیوٹی لگا دی۔"

"کیوں ـــــ"

"عاصمہ اور نگہت آج دونوں ہی چھٹی پر ہیں ——"

"سارے کمروں کی بیڈ شیٹس تم نے ہی تبدیل کیں ——"

"ہاں —— ساتھ سٹر پنکی اور جمعدارنی بھی تھی ——"

"خاصہ تھکا دینے والا کام ہے ——"

بیلا نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"مجھے کام کر کے خوشی ملتی ہے کوئی کام تھکا دینے والا نہیں لگتا۔ جس کام کے معقول پیسے بھی مل جائیں —— وہ تھکا دینے والا نہیں ہوتا شیگی ——"

شگو چپ رہی ۔

صوفے کی پشت پر گردن ڈال کر آنکھیں بند کر لیں —— جب سے آپا گھر آئی تھی —— شگو کے اعصاب پر سوچوں کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔ بیلا کئی دنوں سے اس کی دھیمی دھیمی چپ محسوس کر رہی تھی بات بے بات ہنسنے مسکرانے والی شیگی کی یہ چپ اسے کھلنے لگی —— آج اس نے پوچھ ہی لیا۔

"شیگی ——"

"ہوں ——"

"چند دنوں سے محسوس ہوتا ہے —— کہ تم ——"

"کیا ——"

"تم کچھ سوچتی رہتی ہو ——"

"سوچنا بری بات ہے کیا ——"

"نہیں تو ——"

"پھر ——"

"بات یہ ہے کہ تم جیسی باتونی لڑکی کو چپ لگ جائے تو ضرور کوئی سیریس بات ہوتی ہے"

"بہت سمجھدار ہو ——"

"ہوں تو —— سمجھ دار نہ ہوتی تو آج ایک بہن کو ڈاکٹر اور بھائی انجینئر نہ بنا رہی ہوتی ——"

"بیلا —— تم یہ سارے خرچے پورے کیسے کرتی ہو ——"

"بس ہو جاتے ہیں، تنگی ترشی سے گزر بسر کر کے اگر بہن اور بھائی کی زندگی بن جائے تو اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی"

"میری تو تنخواہ میں پوری نہیں پڑتی ——"

"کیوں ——"

"پتہ نہیں ——"

"حساب سے خرچ کیا کرو نا ——"

"میرے جو حساب ہیں نا ان کے لیے یہ تنخواہ ناکافی ہی نہیں۔ بہت بہت ہی کم ہے ——"

بیلا نے شگو پر نگاہ ڈالی۔
پھر بٹوے سے نیل کٹر نکال کر ناخن رگڑتے ہوئے اسے دیکھ کر بولی

سے بولی ۔

"شگی ـــــ حساب بڑھانے کا کیا ہے۔ جتنا جی چاہے بڑھالو ـــــ ضرور نہیں جتنی چاہے پھیلا لو ـــــ لیکن یہ عقل مندی تو نہیں ـــــ ہونا تو یہ چاہیے کہ جتنی آمدنی ہو اسی حساب سے خرچ کرو ـــــ بلکہ میں کہوں گی کچھ بچاؤ ـــــ آمدنی سے بڑھ کر اخراجات کرنا یا سوچنا اپنے ذہن پر بے جا بوجھ لا لینے کے سوا کچھ نہیں ـــــ جتنا پیسہ ہو ـــــ اسی ـــــ"

"لیکن مجھے بہت پیسہ چاہیئے بیلا ـــــ بہت ـــــ بہت زیادہ ـــــ" شگو نے سنجیدگی سے کہا۔

تو بیلا نے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔

"کتنا بہت ـــــ"

"کہا نا ـــــ بہت زیادہ ـــــ"

"دس ہزار بیس ہزار ـــــ"

"ہزار نہیں لاکھ ـــــ دس لاکھ بیس لاکھ ـــــ"

"ارے مر گئے ـــــ" بیلا ہنسی۔

لیکن شگو سنجیدہ رہی۔

صوفے پر ٹھیک طرح سے بیٹھتے ہوئے اس نے بیلا سے سوال کیا۔

"اتنا پیسہ آئے گا کہاں سے ـــــ"

"اتنا حساب کتاب بنا رکھا ہے تو یہ بھی پتہ ہوگا ـــــ آئے گا کہاں سے ـــــ"

شگو نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہی تو پتہ نہیں چل پاتا۔ تنخواہ سے تو اتنا بچ بننے سے رہا ـــــ"

بیلا ہنستے ہوئے بولی۔ "ڈاکٹر بن جاؤ ـــــ تجوریاں لوٹنا شروع کر دو ـــــ"

شگو گہری سانس لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "جی تو یہی چاہتا ہے لیکن یہ کام ہو نہیں سکتا۔"

"ہاں ـــــ تو پھر ـــــ" بیلا کنپٹی پر انگلی مارتے ہوئے شوخی سے چھیڑنے کو بولی۔

"تو ایک کام اور بھی ہے ـــــ"

"کونسا ـــــ"

"شادی کر لو ـــــ"

"شادی ـــــ"

"ہاں ـــــ کسی بہت بڑے مالدار آدمی سے ـــــ لاکھوں پانے کی خواہش پوری ہو جائے گی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہے مشکل کام ـــــ لیکن اپنے مطلب کے لیے پھنسا لو کسی کو۔" بیلا نے کہا۔

"تم جانتی ہو بیلا ـــــ کہ میں طاہر کے سوا کسی سے شادی نہیں کر سکتی۔" شگو نے کہا۔

"یہ تو ہے ـــــ ویسے مائی ڈیئر ـــــ میں تو مذاق کر رہی تھی کوئی امیر زادہ بھی کسی غریب لڑکی سے شادی نہیں کرتا۔ کوئی خاص حالات ہی ہوتے ہیں جو ایسا ہو جاتے۔ ورنہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا"

بیلا نے اس موضوع پر اچھی خاصی تقریر جھاڑی جسے سنی ان سنی کرتے ہوئے شگو نے کہا۔

"پاگل کہیں کی ـــــ میں کب کسی امیر زادے سے شادی کا سوچ رہی ہوں"

"بے شمار پیسہ حاصل کرنے کا تو سوچ رہی ہو نا ـــــ"

شگو نے ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہو کہا۔ "بے شک مجھے بے شمار پیسہ چاہیئے ـــــ میرے خواب ـــــ میری خواہش صرف اسی طور پوری ہو سکتی ہیں ـــــ"

"شیگی ـــــ" بیلا سنجیدگی سے بولی۔

"ہوں ـــــ" وہ بولی۔

"تم تو پیسے کے معاملے میں بڑی سنجیدہ ہو رہی ہو ـــــ" بیلا نے کہا۔

"ہاں ـــــ مجھے اعتراف ہے ـــــ مجھے طلب ہے خواہش ہے" شگو نے کہا۔

"اسی طلب اور خواہش کو مسئلہ نہ بناؤ ـــــ پچھتاؤ گی کسی دن ـــــ" بیلا نے اسے سمجھایا۔

"مجھے پیسہ مل جائے ـــــ پچھتانا بھی پڑے تو کوئی بات نہیں ـــــ"

"شیگی ـــــ" بیلا نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔ "کیسی باتیں کر رہی ہو ـــــ"

"بالکل سیدھی سیدھی اور صاف صاف۔ مجھے خوبصورت اور آراستہ پیراستہ گھر چاہیئے۔ گاڑی چاہیئے۔ بنک بیلنس چاہیئے"

"خدا کرے یہ سب کچھ تمہیں حاصل ہو جائے شیگی ـــــ لیکن موجودہ حالات میں یہ ناممکن ہی ہے ـــــ اسی لیئے ناممکن کے متعلق سوچو بھی نہیں ـــــ خواہ مخواہ کی ڈپریشن اور ٹینشن اعصاب پر مسلط ہو جائے گی تم نے شادی بھی طاہر ہی سے کرنا ہے اور طاہر بھی تمہارے ہی طبقے کا عام سا آدمی ہے۔ تمہارے یہ خواب وہ بھی پورے نہیں کر پائے گا۔ زندگی کو تلخ بنا لوگی، ازدواجی زندگی کیسے نبھے گی۔ ؟" بیلا بولی۔

شگو نے بیلا کو دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

"میں اس وقت تک طاہر سے بھی شادی نہیں کروں گی جب تک یہ سب کچھ مجھے میسر نہ آجائے"

"طاہر اس وقت کا انتظار کر لے گا ـــــ"

"بالکل ـــــ یہ ہم دونوں میں طے ہے ـــــ"

"واقعی ـــــ"

"ہاں ـــــ"

"تو پھر یہ سب کچھ پانے کے لیئے دوڑ دھوپ کر رہا ہوگا ـــــ" بیلا نے پوچھا۔

"باہر جانے کا سوچ رہا ہے ــــ"

"پھر تو شاید وہ اس قابل ہو جائے کہ ــــ"

"ہوگا تو شادی ہوگی ــــ"

"پکی بات ــــ"

"بالکل پکی ــــ طاہر بھی میرا ہی ہم خیال ہے۔ زندگی کو وہ بھی خوبصورت رنگ دینا چاہتا ہے میری طرح ــــ"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے ــــ دونوں ہی ہم خیال ہو ــــ تو بڑھ جاؤ ــــ وقت کی قید نہیں ہے۔ جب بھی تم دونوں نے اپنا مقصد پالیا ایک ہو جاؤ گے۔"

شگو نے اثبات میں سر ہلایا۔

تھوڑی دیر دونوں اسی موضوع پر باتیں کرتی رہیں۔

پھر گھڑی دیکھی۔

بیلا نے ڈاکٹر سمیع سے گیارہ بجے ملنا تھا۔ سمیع کے حوالے سے اسے مراد کا خیال آگیا۔

"وہ اٹھتے ہوئے شوخی سے بولی۔

"پھر مراد سے تو کبھی کوئی بات نہیں ہوئی ــــ"

شگو نے سہم کر اسے دیکھا اور ہولے سے بولی۔ "بات تو نہیں ہوئی پر اس سے ڈر لگتا ہے مجھے۔"

"ملرٹ کرتی رہتیں ــــ تمہاری خواہشوں کا تھوڑا سا حصہ تو وہ ــــ"

"بیلا ــــ"

"تمہیں رنگین و حسین دنیا چاہیئے نا۔ بنا پیسے کے تو ملتی نہیں، مراد کچھ کچھ تو دکھا رہا تھا تمہیں ــــ"

"بیلا ــــ تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو۔ میں نے جو بھول کی، اس کے ساتھ جانے کی اس سے پریشان بھی ہوں۔"

شگو نے کہا۔

تو بیلا نے مذاق سے کہا۔

"جبھی میں تو تمہاری خوشیوں کے حوالے سے یہ بات کی ہے ورنہ وہ میں ہی ہوں جس نے تمہیں پھسلنے سے بچایا ــــ اور اب خوشخبری سنو کہ مراد یو کے جا رہا ہے ــــ شاید وہیں سیٹل ہو جائے۔ عنقریب چلا جائے گا۔"

"تمہیں کس نے کہا ــــ"

"ڈاکٹر سمیع نے بتایا تھا اس کے کردار اور عادات سے وہ واقف ہیں اس ادارے میں وہ اسے نہیں رکھ سکتے ــــ"

"وہ واقعی جا رہا ہے ــــ"

"ہاں ــــ"

"تھینک گاڈ ــــ"

"تمہارے ذہن میں اس کی طرف سے جو معمولی سا ڈر خوف بھی ہے نا نکال دو ــــ"

شگو نے اطمینان کی گہری سانس لی۔

بیلا اپنی ٹرے اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے شوخی سے ہنسی۔ "ویسے تمہاری خواہشوں کے حصول کے لیے آدمی وہ بھی اچھا تھا، خوب مالدار تھا۔ کیوں ——"

"چل ہٹ ——" شگو بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ بیلا شوخی سے ہنستے ہوئے باہر نکل گئی۔

"اے شگو ——"

"جی آپا ——"

"تم منگنی کی رسم کی کیوں مخالفت کر رہی ہو۔ طاہر کو بھی ہم خیال بنالیا ہے۔ سنا ہے اس نے پھوپھا سے بھی کہہ دیا ہے۔"

"پھوپھا سے میں نے خود بھی کہا تھا ——"

"لیکن کیوں ——"

"اس لیے کہ اس کی ضرورت نہیں ——"

"پھوپھا یہ خوشی دیکھنا چاہتے ہیں ——"

"دیکھ لیں گے ——"

"یہ کیا بات ہوئی ——"

"آپا ——"

"ہاں ——"

"منگنی کی رسم کیا یونہی ہو جائے گی ——"

"کیا مطلب ——"

"مطلب یہ کہ پیسہ خرچ نہیں ہوگا کیا —— ؟"

"ہوگا ——"

"کہاں سے آئے گا کہاں دینا ہوگا گھر والوں کے کپڑے چاہئیں طاہر کے لئے انگوٹھی اور سوٹ تو کم از کم لینا ہی پڑے گا۔"

"یہ تو ہے ——"

"اتنے خرچے کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں کہہ دی ہے اماں نے بس کافی ہے —— انہوں نے مجھے بہو تسلیم کر لیا —— اماں نے طاہر کو داماد بس بات ختم ——"

شگو نے ہنستے ہوئے بات کو ختم کیا۔

شائستہ اس کا منہ تکنے لگی۔

اسے لگا جیسے عمر میں پہلی بار شگو نے کوئی عقل کی بات کی ہے وہ بھی اس کے وزنی دلائل کی قائل ہو گئی۔

"تو —— تو واقعی سیانی ہو گئی ہے ——" شائستہ نے مسکرا کر کہا۔

"بالکل ——"

شگو کی ان دنوں نائٹ ڈیوٹی چل رہی تھی۔ دن میں کچھ حصہ سو لینے کے بعد وہ خوب تازہ دم ہو جاتی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد اکثر صبیحہ ربیعہ کے پاس جا بیٹھتی، شادی

میں چند دن ہی رہ گئے تھے،

چھوٹے موٹے کام اب بھی باقی تھے۔ وہ ان میں ان کا ہاتھ تو کم ہی بٹاتی ہاں ان سے باتیں کرتی رہتی۔ کبھی انہیں شادی کی باتیں کر کے ہنساتی اور کبھی بچھڑنے کے دکھ کا احساس دلا کر رلاتی۔

آپا جب سے اس کے گھر آئی تھی، شگو نے یہ روٹین کچھ بدل دی تھی۔ کھانے کے بعد وہ کچھ دیر آپا کے پاس جا بیٹھتی۔ اس کے دکھ سکھ کی باتیں سنتی۔

آپا کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا اسے اب موقع ملا تھا۔ مالی پریشانیوں نے آپا کو ادھ موا کر رکھا تھا۔ تنخواہ پہلے ہی کونسی زیادہ تھی۔ اس پر قرضے کا بوجھ۔ وسیم کی شادی پر لیا ہوا قرض ابھی ادا نہ ہوا تھا کہ ساس بیمار پڑ گئی۔ بیماری اور مرنے پر جو قرض لیا گیا۔ تنخواہ کا چوتھائی اس کی نذر ہو رہا تھا یہ باتیں شائستہ نے پہلے کب شگو یا اماں کو بتائی تھیں۔

"تو کپڑے لینے کا کہتی ہے ——" شائستہ نے اس دن شگو سے کہا۔

"ہمارا تو روز مرہ کا گزارہ بھی بمشکل ہو رہا ہے۔ سردیاں تو لنڈے کے کپڑوں میں گزر گئیں۔ اب موسم بدل رہا ہے اتنے پیسے نہیں کہ تیرے بھائی جان یا بچوں کے لئے ٹھنڈے کپڑے بنوا سکوں۔"

شگو نے ہمدردی سے بہن کو دیکھا اور بولی۔ "پھر تو شادی کے لئے بھی کپڑے نہیں ہوں گے سب کے پاس ——"

شائستہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیا پہنو گے تم سب لوگ ——"

شائستہ نے ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ "تم نے بچوں کو دلائے تھے نا دو دو جوڑے ——"

"وہ تو کئی بار دھل چکے ——"

"پھر بھی پہننے کے قابل ہیں ——"

"نہیں آپا —— شادی ہے —— سب لوگ نئے کپڑے پہنتے ہیں نئے چمکیلے —— بھڑکیلے ——"

"ایک ہی صورت ہے ——"

"کیا ——"

"میرے پاس دو انگوٹھیاں اور بُندوں کی جوڑی رہ گئی ہے۔"

"کیا —— ؟"

"ہاں انہیں بیچ کر شادی کے لئے ——"

"آپا ——"

"تو ہی بتا اور کیا کروں ——"

"ہیں ——"

"نہیں شگو —— تم نہیں پہلے ہی تم پر بار بنے بیٹھے ہیں ہم لوگ۔"

شگو چپ ہو گئی۔

"میں تو چاہ رہی تھی واپس گھر چلی جاؤں۔ بہت دن رہ لیا۔ تمہاری اس ماہ

کی تنخواہ تو ہم کھا گئے۔ تو بھی تو اس فراخ دلی سے خرچ کر رہی ہے۔ روز گوشت پکتا ہے۔ دو تین دفعہ مرغی پکائی۔ پھل روزانہ ہی لے آتی ہے۔ دودھ مکھن بھی کھلائے جا رہی ہے۔"

"یہ سب چیزیں تمہارے لئے ضروری ہیں آپا کچھ تو صحت بنی ہے تمہاری رنگت کتنی خراب ہو گئی ہے —— اتنی بڑی بڑی چھائیاں پڑی ہیں گالوں پر ——"

"بچہ ہو جانے پر ٹھیک ہو جائیں گی ——"

"یا اور گہری ہو جائیں گی —— پانچویں بچے کا بوجھ بھی تو پڑے گا تنخواہ پر ——" شگو بولی۔

"ہاں ——"

"آپا ——"

"ہوں ——"

"نہیں دیکھ دیکھ کر تو مجھے ——"

"کیا ——"

"شادی کے نام سے ڈر لگنے لگا ہے ——"

"تمہاری شادی وسیم ایسے لڑکے سے تو نہیں ہو گی نو۔" شائستہ نے بڑے پیار سے شگو کے گال کو تھپتھپایا۔

شگو نے سر جھکا لیا۔

پھر بہن کو دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ "ابھی تو وہ اس جیسا ہی ہے۔"

شائستہ نے جھٹ سے کہا

"نہیں شگو طاہر کے مالی حالات ایسے تو نہیں ـــــ پھوپھا کے پاس کافی پیسہ ہے"

"پیسہ اگر ہے تو پھوپھا کے پاس ہے۔ طاہر کے پاس تو نہیں"

"اسی کا ہوا نا ـــــ"

"اوں ہوں ـــــ اس کی تو صرف وہ تنخواہ ہے جو وہ عارضی نوکری کر کے ـــــ"

"یہ نوکری اس نے سدا تھوڑا ہی کرنی ہے"

"ہاں نہیں کرنی ـــــ لیکن فی الحال تو کر رہا ہے ـــــ مجھ سے بھی کم تنخواہ ہے ـــــ"

شائستہ ہنس پڑی۔ "اچھا ہے دونوں کی تنخواہ مل کر کافی ہو جائے گی۔ پھر یہ تو سب تم دونوں کا جیب خرچ ہوگا۔ گھر کا خرچہ تو پھوپھا ہی چلا رہے ہیں۔ چلاتے رہیں گے"

"پھوپھا کے پاس ان دو شادیوں کے بعد کچھ بچے گا تب نا ـــــ"

"ہاں دو دو شادیاں کر رہے ہیں اور وہ بھی شاندار دس دس تولے تو زیور ہے دونوں کا ـــــ"

"ہاں ـــــ"

"اور بھی بہت کچھ بنا ہے۔ دونوں نے باہر چلے جانا ہے پھر بھی پھپھو ہر چیز بنا رہی ہیں"

"زمین بیچ دی ہے ـــــ دکان سے ـــــ"

"زمین بک گئی ـــــ"

"ہاں ـــــ دکان پر بھی کافی بار پڑا ہے ـــــ"

"دو شادیاں اور وہ بھی بیٹیوں کی کرنا آسان تو نہیں نا۔ ابھی تو کھانے کا خرچہ سر پر پڑا ہے"

"تین چار سو آدمیوں کا کھانا تو ہوگا ہی ـــــ پھوپھا اور پھپھو کے پہلے بچوں کی شادیاں ہیں کنبہ قبیلہ اکٹھا ہوگا۔ بارات کے آدمی ہوں گے"

"بہت خرچہ اٹھے گا ـــــ"

"اور ـــــ"

"اور کیا ـــــ"

"اور اس خرچے کے بعد ان کے پاس کیا بچے گا ـــــ"

"ہوں ـــــ"

"شاید قرضہ ـــــ"

"ہوں ـــــ"

"یہی سب سوچ کر میں نے منگنی کی رسم نہیں ہونے دی"

"منگنی پہ انکا کتنا خرچ ہو جاتا ـــــ اصل خرچ تو ہم نے کرنا تھا ـــــ"

"خرچے کی بات نہیں ـــــ"

"تو ـــــ"

"منگنی کی رسم ہو جاتی تو شادی کے لئے وہ لوگ جلدی مچا سکتے تھے"

"اس طرح ——"

"لیکن میں جلدی شادی کرنے والی نہیں ——"

"کیوں اچھا نہیں کہ اماں آزاد ہو جائے ——"

"اور میں برباد ہو جاؤں ——"

"اللہ نہ کرے ——"

"آپا —— میں اس وقت شادی نہیں کروں گی جس وقت تک یہ خوابوں کی تعبیر ممکن نہ ہو ——" شگو بولی۔

شائستہ نے ہنس کر کہا۔

"تیرے خواب تو اتنے اونچے اور اتنے مہنگے ہیں کہ خوابوں میں بھی ہونے کے نہیں ——"

شگو سنجیدگی سے بولی۔ "پورے ہوتے نظر آئیں گے تو کا بھی سوچوں گی۔"

"ورنہ ——"

"کیا ——"

"ورنہ ایسے ہی بیٹھی رہے گی ——"

"کیا برا ہے ——"

"اور طاہر انتظار کرتا رہے گا ——"

"ہاں —— یہ اس کا وعدہ ہے ——"

"اچھا اسی لئے وہ بھی باہر جانے کی دوڑ دھوپ میں لگا ہے!

باہر جائے یا یہاں رہے وہ اتنا پیسہ ضرور اکٹھا کرے گا کہ مجھے میری مطلوبہ دنیا دے سکے، ہم رات یہی باتیں کر رہے تھے۔

"کون —— تم اور ——"

"ہاں میں اور طاہر ——"

"کیا —— تو —— طاہر سے شادی کی باتیں بھی کر لیتی ہے"

"اس میں کیا حرج ہے ——"

"ہائے ——"

"واہ آپا —— بہت سادہ ہو، اسی سادگی سے تو مار کھا گئیں۔ اور اپنا دنیا بنا لیا۔ شادی کی خوشی میں شادی کر لی، یہ نہ سوچا کہ بنا پیسے یہ خوشیاں مر جائیں گی۔"

شائستہ نے اداس ہو کر گہری سانس لی۔

"تمہاری زندگی سے میں نے یہی تو سبق سیکھا ہے آپا۔"

"پیسے کے بغیر واقعی زندگی کا کوئی مزہ نہیں۔ محبت بھی خالی خولی نہیں کی جا سکتی، میں اور وسیم ایک دوسرے کو چاہتے تو بہت ہیں، لیکن محبت ثانوی درجہ اختیار کر چکی ہے۔ اب دن رات ذہنوں پر یہی فکر مسلط رہتی ہے گزر بسر کیسے ہو، زندگی کی رنگینی اور شادابی سب ختم ہو چکی ہے۔"

"میں نے طاہر کے سامنے تمہاری مثال رکھی ہے وہ بھی نہیں چاہتا کہ میں تمہاری طرح ہو جاؤں۔"

"اچھی سوچ ہے ——"

"ہم دونوں اس خیال کے ہیں کہ زندگی آسائشوں سے بھرپور ہو تا گزارہ چلے پورے ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ یہ نہیں، کہ یہ ہمیں گزارتی چلی جائے تلخیوں اور اذیتوں کے ساتھ۔"

دونوں بہنیں کافی دیر باتیں کرتی رہیں۔ اماں آج بڑی پھپھو کے ہاں گئی ہوئی تھی۔

شادر اور رفی کو بھی ساتھ لے گئی تھی۔ اس لئے گھر میں ہنگامہ کچھ کم ہی تھا۔

رات رسم حنا تھی۔

پہلے لڑکے والوں نے مہندی لے کر آنا تھا۔ پھر لڑکی والوں نے لڑکے کے ہاں جانا تھا۔ دو دو مہندیاں آنا تھیں۔ دو دو جانا تھیں گھر میں خوب ہنگامہ تھا۔

تیاریاں تو بڑے دنوں سے ہو رہی تھیں۔ پورے گھر کی مرمت ہوئی تھی۔ سفیدی کروائی گئی تھی۔ بیٹھک میں نئے پردے لگے تھے۔ صوفے پر نیا کپڑا چڑھوا گیا تھا۔ چار کرسیاں خریدی گئی تھیں۔ چینی کا ٹی سیٹ استعمال کے لئے لایا گیا تھا۔ پلاسٹک کا ایرانی ڈنر سیٹ بھی نیا آیا تھا۔ یہ سب کچھ تو اس لئے تھا۔ کہ نئے نئے دامادوں نے آنا تھا شادی کے بعد۔ شادی کے لئے گھر کو خوب سجایا گیا تھا۔ تار کے دوستوں نے تو لال پیلی، ہری نیلی جھنڈیاں گھر کے ساتھ والی گلیوں میں بھی لگا دی تھیں۔ کیلے کے پتوں کا دروازہ بھی گلی میں بنایا تھا۔

رات مکان کو بجلی کے قمقموں سے سجایا تھا۔ قمقموں کے ہار مکان کے اتنے
پر جھومروں کی طرح لٹکائے تھے۔ لاؤڈ سپیکر پر گانے بجانے کا بھی انتظا
کیا تھا۔

کھانے کا بندوبست ملک صاحب کے کشادہ صحن میں کیا گیا تھا۔ گھر
مہمانوں سے بھر گیا تھا۔ لڑکیاں بالیاں تو دو تین دن سے یہاں ہی تھیں کہ
راتوں سے ڈھولک بج رہی تھی۔ رشتے اور محلے کی لڑکیاں اور عورتیں جمع
کر سہاگ گیت گا رہی تھیں۔

آج ہنگامہ جوبن پر تھا۔ خوب شور شرابا تھا۔ گلی میں مرد بھاگم بھا
کام میں مصروف تھے۔ خاندان کے تجربہ کار مردوں نے کھانا پکوانے کا
ذمہ لے لیا تھا۔

رفیق، اور رشیدہ کے بھائی بہنوئی اور ان کے جواں سال بچے پیش
پیش تھے۔ بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ اس بات کا عملی ثبوت
جا رہا تھا۔

شگو کے ہاں بھی کچھ رشتہ دار ٹھہرے تھے۔ رشیدہ نے بر
والے مکان کا نچلا حصہ بھی مہمانوں کے لئے خالی کروایا تھا۔ جدّی پشتی
تھے انہوں نے بخوشی کمرے مہمانوں کے لئے خالی کر دیئے تھے۔ ا
نے کلینک سے تین دن کی چھٹی لے لی تھی۔ شادی کا ہنگامہ بھی تھا
کئی راتیں گانے اور ڈھولک بجانے کی وجہ سے تکان بھی ہو گئی تھ
باقی لڑکیاں تو رات دو دو تین تین بجے تک گا بجا کر صبح ناشتہ کر کے

تا کر سو جاتی تھیں۔

شگو کو دن بھر کلینک میں ڈیوٹی دینا پڑتی تھی اور ان دنوں جن کمروں
اور وارڈ میں اس کی ڈیوٹی تھی، دو تین ایسے بھی تھے جو پریشان کرتے تھے
چھوٹی چھوٹی بات کے لئے بھی بیل کر دیتے۔ کسی کو پانی پینا ہوتا۔ کسی نے
باتھ روم میں جانا ہوتا۔ کسی نے ڈاکٹر سے کچھ پوچھنا ہوتا۔ کسی نے دوائی
راس نہ آنے کی شکایت کرنا ہوتی۔ معمولی معمولی اور غیر متعلقہ باتوں پر بار بار
بلانے والے یہ مریض ایسا کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ آخر وہ ڈاکٹروں کی بھاری
بھاری فیسیں اور کلینک کا مہنگا خرچہ دیتے تھے۔ شگو کچھ چڑچڑی سی ہو
جاتی۔ لیکن ڈیوٹی ڈیوٹی ہی تھی۔ دینا ہی پڑتی تھی۔ شادی کے لئے اس
نے اسی لئے چھٹیاں لے لی تھیں۔ چھٹی لینا مشکل تو تھا۔
لیکن
اس نے ڈاکٹر سمیع کی بہت منت سماجت کر کے تین چھٹیاں لے لی
تھیں، اور پھر بیلا نے بھی ڈاکٹر کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس کے حصے
کا کام بھی کر لے گی۔ رچنا نجمہ نے بھی بیلا کا ہاتھ بٹانے کی حامی
بھری تھی۔

شگو نے سکون کا سانس لیا تھا۔

آج وہ دو گھنٹے سو کر خوب تازہ دم ہو چکی۔

رات رسم حنا تھی۔

اس نے تیاری دوسرے مہمانوں اور لڑکیوں بالیوں کی طرح اس نے

بھی سرِ شام ہی شروع کر دی تھی۔ گھر میں بڑی ممانی اور رشتے کی خالائیں دو تین بیٹیوں کے ساتھ ٹھہری تھیں۔ ہر طرف کپڑے جوتے بکھرے تھے۔ برابر والے کوٹھڑی نما کمرے میں ان لوگوں کے سوٹ کیس صندوق اور پلنگ رکھے تھے۔

کچھ لڑکیاں وہاں کپڑے بدل رہی تھیں۔ برآمدے میں چارپائیوں پر اور خالہ زیور کی صندوقچیاں گود میں لئے بیٹھی بہو بیٹیوں کے تیار ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔ خوب شور مچا ہوا تھا۔

شگو اپنے کمرے میں تھی۔

شائستہ پلنگ پر نیم دراز تھی۔ اور اس کے چاروں بچے بھی کمرے میں تھے۔ شگو انہیں تیار کر رہی تھی۔ بچے اِدھر اُدھر پھدکتے پھر رہے تھے۔ شگو نے اپنے اماں اور شائستہ کے جو کپڑے دوسری چارپائی پر استری کر کے پھیلا رکھے تھے۔ بچے بار بار اسی چارپائی پر اچھل کود رہے تھے۔ شگو نے دو تین بار ملائمت سے انہیں منع کیا وہ باز نہیں آئے تو اس نے شادو اور رقی کے تھپڑ جڑ دیئے۔

منو اور جھنگے کے کان اس طرح مروڑے کہ وہ بلبلا اٹھے۔

"مرجاؤ اللہ کرے ناک میں دم کر دیا ہے۔ چین سے بیٹھتے ہی نہیں۔"

شگو نے شادو اور رقی کی طرف غصیلی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم تو اتنی بڑی ہو چکی ہو — کوئی تمیز ہی نہیں۔ بھائیوں کو منع کرنے کی بجائے ان سے بڑھ کر اچھل کود رہی ہو — چلو اٹھاؤ اپنے کمرے اور ادھر

پلنگ کے پیچھے کھڑی ہو کر بدل لو۔"

دونوں بچیاں گال سہلاتی کپڑے اٹھا کر پلنگ کے دوسری طرف چلی گئیں شگو منو کے کپڑے بدلنے لگی۔

شائستہ پلنگ پر چپ چاپ لیٹی رہی۔

شام کے وقت بچوں کو کوسنے اور بدعائیں دینے پر اسے شگو پر غصہ بھی آیا۔

رنجش بھی محسوس کی۔

لیکن چپ رہی۔

شگو نے دل سے تھوڑا ہی بدعائیں دی تھیں۔ ہمدرد بھی تو وہی تھی۔ بچوں کے لئے نئے کپڑے بھی تو اس نے بنوا کر دیئے تھے جوتے جرابیں سب وہی لائی تھی۔

وسیم اور اس کے لئے بھی ریڈی میڈ کپڑے خرید لائی تھی شائستہ نے سب کچھ سوچتے ہوئے جی میلا نہیں کیا۔

شگو نے منو کے کپڑے اتارے۔ اسے دوپہر اماں نے نہلا دھلا دیا تھا۔ شگو نے اس کے بدن پر ٹیلکم پاؤڈر چھڑکا اور نئی ٹی شرٹ کے ساتھ سرخ نکر پہنا دی۔ جوتے اور جرابیں دیتے ہوئے بولی۔ "آپا اسے پہنا دو ذرا — میں جھنگے کو تیار کر لوں۔"

"بھئی اب تو جھنگا نہ کہا کرو اسے۔ دیکھو تو کتنا پیارا ہے۔" شائستہ نے ڈیڑھ سالہ بیٹے کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔

"میں تو اسے ہمیشہ ہی اسی نام سے پکاروں گی ——" شگو نے اس کے کپڑے اتارتے ہوئے کہا۔

"اچھا نہیں لگتا یہ نام ——"

"مجھے تو لگتا ہے ——"

چاروں بچے تیار ہو گئے۔ لڑکیوں کے گوٹے کناری والے ہلکے زرد رنگ پہنے۔ نئے اور چمک دمک والے کپڑے پہن کر وہ پھولی نہ سما رہی تھیں چہروں پر بڑا ہی نکھار آگیا تھا۔

شائستہ نے چاروں بچوں کو تنبیہ کی۔

"کپڑے خراب نہیں کرنے۔ پھپھو سکینہ کی بیٹی واحدہ کی شادی پر پہننے ہیں —— سمجھے سب ——"

سب بچوں نے ماں کی بات سنی، ان سنی کی اور کمروں سے نکل بھاگے۔

"جھنگے کا خیال رکھنا ——" شگو نے شاد سے کہا۔

"نانی کو دے دوں گی ——" شاد بھائی کی انگلی پکڑے باہر نکلی۔

"ہاں اماں کے حوالے کر دینا وہ ادھر ہی ہے"

بچے باہر نکل گئے تو شگو نے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا لی۔ اب اس نے اور شائستہ کو تیار ہونا تھا۔

"چلو آپا پہن لو کپڑے ——" اس نے شائستہ سے کہا۔ "منہ ہاتھ دھو لیا تھا نا ——"

"نہا چکی ہوں ——" وہ بولی۔

"میں نے بھی نہا لیا تھا —— غسل خانہ خالی تھا اس وقت —— اب تو لائن لگی ہے"

"بہت مہمان ہیں —— پھپھو کے ہاں بھی سب نے تیار ہونا ہے" شگو بولی۔

"کچھ لڑکیاں تو سامنے ملک صاحب کے ہاں تیار ہونے گئی ہیں" شائستہ نے کہا۔

"چھوٹے گھروں میں شادیوں پر یہی ہوتا ہے۔ سارے محلے میں مہمان بٹ جاتے ہیں"

"شادی کا مزہ تو جہازی سائز کوٹھیوں میں آتا ہے"

"آہا تو ہے ——"

"اور رنگا رنگ قمقموں سے سجتے ہیں نا —— تو واہ —— وا ——"

دونوں بہنیں تیار ہوتے ہوتے باتیں بھی کیے جا رہی تھیں۔

شگو نے ہنس کر کہا۔

"آپا میں شادی اس وقت ہی کروں جس وقت وہ کوٹھی بھی دلہن کی طرح سجی ہو گی، جس میں مجھے دلہن بن کر اترنا ہو گا"

شائستہ نے قمیض اتارتے پہنتے ہوئے اسے مسکرا کر دیکھا اور بولی۔

"خدا کرے۔ ——"

شائستہ کی قمیض پلیٹس کھول لینے کے باوجود گول مٹول باہر نکلے ہوئے پیٹ پر اتر نہ رہی تھی۔

شگو کھلکھلا کر ہنس پڑی

شائستہ قمیض نیچے کرتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔

"توبہ ___ کیا کارٹون بن جاتی ہیں عورتیں اس حالت میں" شگو نے مہندی رنگ کے خوبصورت کپڑے پہنتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"تجھ پہ بھی وقت آجائے گا کرلے مذاق ___" شائستہ نے کہا۔

"یہ میری شادی کے کپڑے ہیں، اندازہ کر لے میں کیسی تھی تب"

"کل تو وہی جوڑا پہننا جو میں لائی ہوں۔ ساتھ جہیز والا دوپٹہ لے لینا بالکل رنگ ملتا ہے اس کام والے دوپٹے کا"

"وہی پہنوں گی۔ ڈھیلے ڈھالے تو ہیں ___" شائستہ نے کہا۔

پھر بولی۔ "تو نے بہت پیسے خرچ کر دیئے ہم سب کے کپڑوں پر ___ اماں سے لئے تھے"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو ___"

"بیلا میری اچھی دوست ہے اس سے لئے تھے"

"قرض لے کر خرچ کیا ہے ___"

"کوئی بات نہیں آپا اتر جائے گا دو تین مہینوں میں۔ اماں سے مانگے تھے وہ کہنے لگیں۔ اس ماہ کچھ بچا ہی نہیں"

"بچتا کیسے ہم پورا کنبہ ___"

"بس بس آپا ___ چلو چہرے پر کچھ لگا لو یہ پڑی ہیں میک اپ کی چیزیں

شکر ہے تمہارے چہرے پر تازگی آئی ہے"

"ہمیشہ خوش رہو شگو ___ یہ سب تمہاری ہی دین ہے۔ میں یہاں نہ آتی تو جانے کیا حال ہو جاتا"

شگو آنکھوں پر کپڑوں کے ہم رنگ آئی شیڈ لگاتے ہوئے چھوٹے سے دستی آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

شائستہ کی بات پر مسکرا کر بولی۔

"تمہارے یہاں آنے سے پیسے تو بے شک بہت خرچ ہو گئے ہیں ___ لیکن بات اچھی ہوئی ہے"

"وہ کیا ___"

"سبق سیکھا ہے میں نے ___"

"سبق ___"

"ہاں آپا ___ یہ سبق سیکھا ہے کہ پیسہ بڑی اہم چیز ہے اس کے بغیر زندگی کا کوئی مزہ نہیں"

"یہ بات تو تو پہلے بھی جانتی ہے۔ شروع سے ایسے ہی خیالات ہیں تیرے ___"

"وہ خالی خولی خیالات تھے۔ اب تو تجربہ ہوا ہے پیسے کے بغیر زندگی کیسے گزرتی ہے شادی کے بعد یہ قریب سے اب دیکھا ہے"

شائستہ چپ ہو گئی۔

وہ اپنے ہونٹوں پر لپ اسٹک جمانے لگی۔ اس نے صرف لپ اسٹک

پر ہی اکتفا کیا۔

شگو میک اپ کرنے لگی۔

پھر بال بنائے اور تیار ہو گئی۔

"ماشاءاللہ ——" شائستہ نے پیار بھری نگاہ اس پر ڈالی۔ "بہت پیاری لگ رہی ہو ——"

"چلیں ——"

"چلو ——"

دونوں باہر نکل آئیں۔ دروازہ بند کر دیا اور صحن میں بیٹھی عورتوں کو سلام کر کے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں۔

شائستہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ شگو دھم دھم کرتی اوپر آ گئی۔

طاہر اوپر ہی تھا۔

مہمانوں کے لیے چھت پر جگہ ٹھیک کروا رہا تھا۔ کئی دنوں سے مصروف ہی تھا۔ شگو سے ڈھنگ سے بات کرنے کی بھی فرصت نہ ملی تھی اب بھی کام میں لگا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ کپڑے میلے ہو رہے تھے۔

شگو کو دیکھا۔

تو ——

دیکھتا ہی رہ گیا۔ بے اختیارانہ اس کی طرف بڑھا اور گرد و پیش کی پرواہ کیے بغیر اسے پرشوق نگاہوں میں جذب کرتے ہوئے بولا۔ "شگو ——

یہ تم ہو ——"

"جی میں ہوں ——" وہ ادائے ناز سے بولی۔

"کیا روپ اور نکھار آیا ہے تم پر ——"

وہ ہنس پڑی۔ اور اس کے سراپا پر نگاہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ "اور تم پر ——"

"میں —— میں ——" طاہر نے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا۔ "میں تو اتنا مصروف ہوں کہ سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں۔"

"اب تیار ہو جاؤ نا ——"

"بس یہ سامان لگوا دوں پھر تیار ہوتا ہوں، تم یہیں ٹھہرو ——"

"کیوں ——"

"بس ——"

"یہ کیا بات ہوئی ——"

"جی چاہتا ہے تمہیں دیکھتا ہی چلا جاؤں شگو۔ کتنی پیاری لگ رہی ہو۔ میری نگاہوں کو سیراب ہونے دو شگو۔ ابھی نیچے نہیں جانا۔"

"اوں ——"

"اردگرد لوگ نہ ہوتے تو دیکھتی میں کیا کرتا۔"

"کیا کرتے ——"

"تم جانتی ہو میں کیا کرتا ——" وہ ہنس پڑا۔

شگو بھی ہنس دی۔

شائستہ آگئی۔

وہ بھی چند لمحے ان کے پاس رکی۔ پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "آؤ شگو نیچے نہیں چلوگی ——"

"نہیں ——" شگو کی جگہ طاہر بولا۔

شائستہ مسکراتے ہوئے دونوں کو دیکھنے لگی۔

"تم جاؤ آپا —— میں بھی آتی ہوں ——" شگو نے بہن سے کہا۔ تو طاہر کی نگاہوں سے ممنونیت چھلکنے لگی۔

پھر ——

جب تک طاہر کام کرتا اور کرواتا رہا —— وہ وہیں کھڑی رہی۔

"طاہر ——" شگو نے جنگلے پر جھکتے ہوئے صحن میں جھانکا سامنے باورچی خانے میں طاہر نظر آگیا۔ ورنہ خاموشی سے تو یوں لگ رہا تھا جیسے گھر پہ کوئی ہے ہی نہیں۔ اس نے اسی کو آواز دی۔

"کیا ہے ——" طاہر نے باورچی خانے کے دروازے میں کھڑے ہوکر اوپر جنگلے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا کر رہے ہو ——"

"چائے بنا رہا ہوں ——"

"تم بنا رہے ہو ——"

"ہاں ——"

"کیوں پھپھو نہیں ہیں گھر پر ——"

"پھپھو ہیں نہ پھوپھا —— صبو آپا اور ربیعہ سے ملنے گئے ہیں۔"

"اوہ —— اچھا ——"

"نیچے آجاؤ ــــــ"

"تم اوپر آجاؤ ــــــ"

"میں نے کہا نا چائے بنا رہا ہوں تم آکر بنا دو نا ــــــ"

"واہ جی میں کیوں بناؤں ــــــ"

"اس لئے کہ میں تمہارا مجازی خدا بننے والا ہوں۔ میرا حکم ماننا تمہارا فرض ہے ــــــ"

"آئے ہائے۔ یہ حکم وکم چلانے کی بات کبھی سوچنا بھی نہیں سمجھے یہ بات ابھی سے ذہن نشین کر لو۔"

"کر لیا جناب۔ اب تو نیچے تشریف لے آیئے ملکہ عالیہ۔ بندہ ایک نہیں دو کپ چائے تیار کر لے گا۔"

"یہ ہوئی نہ بات ــــــ"

"تو آؤ ــــــ"

"آگئی ــــــ"

شگو جنگلے سے ہٹ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

طاہر نے چائے کے پین میں ایک پیالی اور پانی ڈال دیا دودھ بھی ڈالا اور پتی بھی۔

شگو بھی باورچی خانے ہی میں آگئی۔

"ہٹو ــــــ میں بنا دوں ــــــ"

وہ طاہر کو پرے ہٹانے لگی تو طاہر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ا

ٹنے کی بجائے اسے قریب کر لیا۔

کیا کرتے ہو ــــــ پرے ہٹو ــــــ"

اوں ہوں ــــــ" طاہر مچل گیا۔

بری بات ہے چھوڑو مجھے ــــــ"

تمہیں تو مر کر بھی نہیں چھوڑ سکتا میری جان ــــــ"

کیا چھچھورپنے کی باتیں کرتے ہو ــــــ"

پیار کی باتوں کو چھچھورپنے کی باتیں کہتی ہو ــــــ"

بالکل ــــــ کوئی کام کی بات کرو ــــــ" وہ اپنا آپ چھڑا کر الگ کر بولی۔

کام کی بات ــــــ"

ہاں ــــــ"

کام کی بات یہ ہے کہ ــــــ کہ ــــــ"

کہ کیا ــــــ"

کہ ناصر بھائی واپس جا کر میرے لئے ویزا بھیجنے کی پوری کوشش یں گے ــــــ"

واپس جا کر ــــــ"

ہاں ــــــ"

سنا تو یہ تھا کہ وہ ویزا ساتھ لے کر آئے ہیں ــــــ"

لائے تو تھے لیکن اپنے رشتہ داروں کے لئے۔ اب ہم رشتہ دار بن

گئے ہیں۔ تو ہمارے لئے بھیجیں گے ۔"

"وقت لگے گا ابھی ——"

"ہاں وقت تو لگے گا۔ ابھی تو مہینے کی چھٹی باقی ہے ان کی ۔"

"ناصر سعودی عرب میں ہے نا ——"

"ہاں وہی چانس ہے اچھی نوکری ملنے کا۔ رات وہ آئے ہوئے تھے کھل کر بات ہوئی تھی ۔"

"اچھے آدمی لگتے ہیں ——"

"دونوں بھائی بہت اچھے ہیں۔ بڑے مخلص اور ہمدرد قسم کے کہنے لگے پہلے بتایا ہوتا تو ویزا لے کر آتے میرا ۔"

"چلو اب جاکر بلالیں ——"

"وہ تو بلائیں گے ہی۔ وعدہ کیا ہے انہوں نے ۔"

"ربیعہ تو ساتھ ہی جارہی ہے نا ——"

"نہیں تین مہینے بعد جائے گی۔ ابھی باہر جانے کا بھی تو خاصا چکر ہے آسان تو نہیں ہوتا۔ نکاح پہلے کر دیئے ہوتے تو پھر اس کا ویزا بھی مل جاتا خیر چلی ہی جائے گی ۔"

"اور صبیحہ آپا ——"

"وہ اگلے سال جاسکیں گی ——"

"دونوں بہت خوش ہیں ۔"

"خوشی کی بات تو ہے ہی اتنے اچھے گھر میں بیاہی گئی ہیں۔ لوگ اچھے

ہے پیسے کی کمی نہیں ۔"

واقعی —— شادیوں پر انہوں نے بے دریغ خرچ کیا ہے زیور کتنا ن لائے تھے۔ کپڑے بھی بہت اچھے تھے ۔"

ے جی ہم اس سے بھی زیادہ زیور لائیں گے۔ اپنی جانم کے لئے۔ ے ہیرے تک پیلا کردیں گے ۔"

ہر نے شگو کی ٹھوڑی انگلی اور انگوٹھے میں پکڑ کر ہلاتے ہوئے بڑے ر سے کہا۔

شگو خوش ہوکر مسکرا دی ۔

بس باہر جانے کی دیر ہے پھر پیسہ ہی پیسہ سونا ہی سونا ——"

رے —— ارے ——"

کیا ہوا ——"

صافی کہاں ہے ادہو —— چائے ابل گئی ۔"

یہیں تھی ——"

طاہر ادھر ادھر صافی ڈھونڈنے لگا۔

شگو نے اپنے دوپٹے ہی سے سلور کے پین کا دستہ پکڑ کر چائے ہے سے اتار دی۔

طاہر نے دو پیالیاں نکالیں۔ شگو نے چائے ان میں انڈیل دی ہر نے دونوں پیالیوں میں ایک ایک چمچ چینی ڈال دی۔

لو —— "اس نے ایک پیالی شگو کو دی۔ دوسری خود اٹھالی۔

دونوں اپنی اپنی چائے لے کر صحن میں آگئے۔
شگو تخت کے کنارے پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ طاہر کھڑے کھڑے
چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔

"آہا —— دیکھا کتنی مزیدار چائے بنائی ہے ——" وہ مزے لیتے
ہوئے بولا۔

"لگتا ہے اب کھانا بھی بنایا کرو گے ——"
وہ ہنس کر بولی۔

"صبیحہ آپا اور ربیعہ آپا تو چلی گئی ہیں۔ اور پھپھو کو کام کرنے کی عادت
نہیں ——"

"بات تو ٹھیک کہی تم نے۔ کوئی ہرج نہیں سیکھ لوں گا۔ کھانا پکانا بھی
کام آئے گا آیندہ زندگی میں" وہ ہنس کر بولا۔

"آیندہ زندگی میں ——"

"بالکل —— شادی کے بعد تم ہی فائدے میں رہو گی، کھانا پکانا
پڑے گا۔ بندہ پکا دیا کرے گا"

"وہ بیرے خانسامے پھانسی دینے کے لئے ہوں گے" شگو
ہنس کر کہا۔

"اوہ —— میں تو بھول ہی گیا۔ شادی کے بعد ہماری زندگی اس
کی تھوڑا ہی ہوگی۔ کچن تو خانساموں کے حوالے ہوگا"

"اور کیا —— جناب تو صاحب بہادر ہوں گے"

"واقعی، شگو کتنا مزہ آئے گا، جو ایسا ہو۔ میں صاحب بہادر، تم میم
صاحب، شاندار کوٹھی، خوبصورت چیزیں، نوکر چاکر"
شگو نے آنکھیں بند کر لیں۔ اپنی حسین سی تصوراتی دنیا میں کھو گئی۔
طاہر تصوراتی دنیا کا نقشہ زبانی زبانی کھینچ کر محظوظ ہو رہا تھا۔ خیالی گھوڑے دوڑا
رہا تھا۔ شگو کا رنگ اس پر بھی پوری طرح غالب آچکا تھا۔ دونوں کچھ دیر
اسی طرح کھوئے رہے۔

دہ تو باہر دروازے پر کچھ کھٹکا ہوا تو دونوں چونک کر پھر واپس اپنی اسی
دنیا میں آگئے۔

"کوئی آیا ہے شاید ——" شگو بولی۔

"میں دیکھتا ہوں ——" طاہر نے خالی پیالی تخت پر رکھتے ہوئے شگو
کی پیالی دیکھی۔

"تم نے چائے پی ہی نہیں ——"

"پی لی ——" وہ بولی۔

"آدھی پیالی پی ہے ——"

"ساری —— بلکہ دو پیالیاں ——"

"کیا ——"

"میں تو اپنے شاندار اور لہلہاتے لان میں کین کی کرسی پر بیٹھی نازک
سے ٹی سیٹ کو میز پر رکھے چائے پی رہی تھی۔ طاہر ——" وہ ہنستے ہوئے
بولی، "بھی اتنا مزہ آ رہا تھا اس چائے کا"

وہ ہنس پڑا —— بولا۔

"کھو تو میں بھی گیا تھا اس حسین دنیا میں —— لیکن اتنا پاگل نہیں ہوا تھا کہ ——"

"میں پاگل ہوں کیا ——"

"باتیں تو ایسی ہی کر رہی ہو —— چائے وہیں پڑی ہے اور تم دو پیالی چائے بھی پی چکی ہو"

"چائے پینے سے چائے کا مزہ لینا زیادہ اچھا ہے طاہر صاحب میں نے مزہ لے لیا بس"

دروازے پر پھر کھٹکا ہوا۔

"آیا —— " کہتے ہوئے طاہر ڈیوڑھی کی طرف چلا گیا۔

شگو نے اپنی اور طاہر کی پیالی اٹھائی۔

اور باورچی خانے میں رکھ دی۔

ظہیر آیا تھا۔ وہ ان دنوں میٹرک میں تھا سکول سے چھٹی ہونے پر ٹیوشن پڑھنے چلا جایا کرتا تھا۔

طاہر اس سے باتیں کرتا اندر آ گیا۔

شگو باورچی خانے کے دروازے میں کھڑی تھی۔

ظہیر نے اسے سلام کیا۔

"اس وقت چھٹی ہوئی ہے ——"

شگو نے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔

"ٹیوشن پڑھنے جانا ہے"

طاہر نے ظہیر کی جگہ جواب دیا۔

"اچھا ——" شگو بولی "ٹاپ کرنے کا ارادہ تو نہیں"

"ہے تو شگو آپا ——" ظہیر بولا۔

"شاباش ——" شگو نے کہا۔

"خوب محنت کرنا —— یہ اپنے بھائی کی طرح خالی خولی پاس ہو جانے پر ہی اکتفا نہ کرنا"

"خالی خولی پاس ——"

"تو اور کیا ——" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "میٹرک سے ایم اے تک کوئی پوزیشن لی تھی کبھی"

"ہمیشہ فسٹ ڈویژن لی —— صرف ایم اے میں نہ لے سکا اس کی وجہ بھی تم ہو"

"میں ——"

"ہاں ——"

"کیسے ——"

"ڈسٹرب کرتی رہتی تھی —— یاد ہے"

شگو کچھ یاد کر کے ہنس پڑی۔

ظہیر اپنی کتابیں لئے سامنے والے کمرے میں چلا گیا۔

اور ——

طاہر اور شگو اوپر چلے آئے ۔
جہاں وہ دیر تک باتیں کرتے رہے ۔
کبھی ٹھیک ٹھاک
اور
کبھی
بالکل بے تکلف بے تکی ۔

"رشیدہ ——"

"ہاں بھابی ——"

"کیسے ہیں اب رفیق بھائی ——"

"بس کمزور ہی ہوتے جا رہے ہیں ——"

"دکان پر چلے گئے ——"

"منع کیا تھا —— مانے نہیں —— ساری رات ٹھنڈے پسینے آتے رہے ——"

"نہیں جانے دینا تھا نا ——"

"تم تو جانتی ہو مرضی کے مالک ہیں ——"

"ڈاکٹر کو دکھا دیتے ——"

"آج طاہر سے کہہ رہے تھے —— کہ آج دکان پر آجائے ۔ ڈاکٹر کے پاس لے جائے گا۔"

"گیا ہے ——"

"ہاں ابھی گیا ہے ——"

"خدا خیر کرے ——"

"مجھے تو بڑی فکر لگی ہے ——"

"یہ شوگر نامراد ہے ہی ایسی بیماری ایک دم ہی ——"

"لگتا ہے شادی کے دوران پرہیز نہیں کی۔ نہ پرہیزی کھانا کھایا نہ ہی وقت کا خیال رہا۔ الٹ پلٹ وقت پہ کھاتے پیتے رہے ہیں۔"

"اسی سے گڑبڑ ہوئی ہے ——"

"مجھے تو ہول آتا ہے اتنے لاغر ہو گئے ہیں۔"

"شگو کہہ رہی تھی۔ اپنے کلینک کے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلے گی۔"

"ہاں آج بھی دیکھنے آئی تھی۔ پھوپھا کو یہی کہتی تھی۔"

"بہت بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں وہاں ——"

"ان کی فیس بھی بہت بڑی بڑی ہیں نا بھابی۔"

"وہ تو ہے —— پر شگو کی وجہ سے فیس نہیں لیں گے لی بھی تو اتنی زیادہ نہیں ہوگی۔"

"دیکھو آج طاہر کے ساتھ جائیں گے ڈاکٹر کے پاس۔ ضرورت پڑی تو شگو کے ساتھ بھی چلے جائیں گے۔"

"ضرور ——"

رفیق کی صحت تو ایک عرصے سے خراب رہتی تھی۔ لیکن بیٹیوں کی

شادی کے بعد اچانک ہی بہت گر گئی۔ شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کے مریض تو تھے ہی۔

لیکن

پچھلے چند دنوں سے پیٹ میں بھی کوئی تکلیف تھی۔ کھانا ٹھیک سے ہضم نہیں ہوتا تھا۔

بھوک بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔

کبھی کبھی چکر بھی آجاتے تھے۔

سب گھر والے پریشان تھے۔ ڈاکٹر کو دکھانے کا کہتے تھے لیکن حسب عادت سستی کیے جا رہے تھے۔ گھر سے نکلتے تو کہتے سیدھا ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔

لیکن

دکان پر جا بیٹھتے اور بیٹھتے تو شام ہی کو اٹھتے۔ شادیوں کی مصروفیت میں دکان پر ٹھیک سے توجہ نہ دی جا سکتی تھی۔ سیل مین ہی کے حوالے تھا کام۔ پیسہ بہت سا نکلا تھا کام میں سے الٹ پلٹ ہو گئی تھی دکان مال بکتا چلا گیا تھا۔ مل سے تو سیل اسی طور نہ ہو سکی تھی۔ اس لئے آدھی دکان خالی ہو گئی تھی۔

رفیق کو اپنی صحت سے زیادہ دکان کی فکر تھی۔ یہی کمائی کا ذریعہ تھی۔ شادیوں پر خرچ بھی تو بہت اُٹھ گیا تھا۔ دو دوستوں کے مقروض بھی ہو گئے تھے۔

کمانے والے وہی تھے۔ دکان پر توجہ نہ دیتے تو کیا کرتے۔ قرضے بھی اسی دکان کی کمائی سے اتارنا تھے اور گھر کی گاڑی بھی اسی سے کھینچنا تھی بیٹیوں کا بوجھ تو بلاشبہ بڑے احسن طریق سے سر سے اتر گیا تھا۔

لیکن ——

مالی بوجھ سر پر اتنا آن پڑا کہ تفکرات اور پریشانی نے گھیر لیا تھا صحت اسی لئے تو ایک دم سے جواب دے گئی تھی۔

رشیدہ بھی فکر مند تھی۔

وہ یہی کہتی۔ "کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھائیں۔ کچھ دن گھر پہ آرام کریں دکان اسلم سنبھال ہی رہا ہے —— صحت اور بگڑ گئی —— اتنا بوجھ نہ ڈالیں ذہن پر ——"

رفیق اس کی بات پر معنی خیز انداز میں مسکرا دیتا۔

وہ بہت اصرار کرتی تو صرف یہی کہتا "سب ٹھیک ہو جائے گا فکر نہ کرو۔"

"فکر کیسے نہ کروں ——"

"بھلی لوگ فکر کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ شکر کر بیٹیوں کا فرض ادا کر دیا اب بیٹے ہی ہیں۔"

"میں فکر ان کی نہیں کر رہی آپ کی صحت کی کر رہی ہوں۔ کچھ آرام کریں آپ علاج معالجے کی طرف توجہ دیں۔"

"علاج معالجے سے زیادہ ضروری دکان پر توجہ دینا ہے چوپٹ ہو گیا

ہے کام، اسے نہ سنبھالوں تو کام کیسے چلے گا۔ شادیوں پر ضرورت سے زیادہ ہی خرچہ اٹھ گیا ہے۔ سر پہ قرض بھی ہے اور روزمرّہ کا خرچہ بھی چلانا ہے۔ دکان نہ سنبھالوں تو کیا کروں۔"

"سنبھالیں ضرور۔ میں کب کہتی ہوں چھوڑ دیں۔ لیکن کچھ دن آرام کر لیں کتنے لاغر ہو گئے۔ دکان چل ہی رہی ہے۔ طاہر کچھ دن دیکھ لے گا۔" رشیدہ نے کہا

"طاہر اور —— دکان —— آہاہا ——"

"مجبوری ہے ——"

"وہ نوکری کر رہا ہے ——"

"شام کو وقت دے سکتا ہے ——"

"بات کر کے دیکھو اپنے صاحبزادے سے۔ دکان پر بیٹھنے سے ہتک ہوتی ہے صاحب بہادر کی۔"

"میں سمجھاؤں گی ——"

"ہونہہ ——"

رفیق اچھی طرح جانتا تھا کہ طاہر کو دکانداری سے چڑ ہے وہ چند دنوں کے لئے بھی دکان پر بیٹھنا پسند نہیں کرے گا۔ اسی لئے تو وہ خود جاتا تھا

کمزوری محسوس ہوتی تھی۔

طبیعت خراب رہتی تھی۔

لیکن —— کام پر جانا ضروری سمجھتا تھا۔

اب

شاید

ہمت بالکل جواب دے گئی تھی۔ اسی لئے دکان پر جاتے ہوئے طاہر سے کہہ گیا تھا۔

"آج چھٹی کر لینا۔ گیارہ ساڑھے گیارہ تک دکان پر آجانا —— ڈاکٹر کے پاس چلیں گے ——"

"شگفتہ نے بھی کہا تھا اباجی —— اسی کے کلینک نہ چلے جائیں۔" طاہر نے جواب دیا تھا۔

"بھئی کیا بات کرتے ہو۔ اس کلینک کے خرچے ہم برداشت کر سکتے ہیں۔ پیسے ویسے نہیں ہیں میرے پاس اتنے مہنگے کلینک کے۔" رفیق نے کہا۔

"صرف ڈاکٹر کو دکھانا ہے اباجی —— داخل تو نہیں ہونا۔"

"جو وہ داخل ہونے کا کہیں تو بھاگ آئیں گے۔"

"پیسہ صحت سے زیادہ اہم تو نہیں۔"

"پیسہ ہے کہاں برخوردار —— تم اتنے بچے تو نہیں کہ اندازہ نہیں کر سکتے بہنوں کی شادیوں پر جتنا پیسہ خرچ ہوا ہے۔ کبھی سوچا بھی ہے کہ کہاں سے آیا اتنا پیسہ۔ میرے پاس خزانہ تو نہیں تھا —— جانتے ہو کتنا قرض چڑھ گیا ہے سر پر۔"

طاہر تو چپ ہو گیا۔

رشیدہ بیچ میں بول پڑی۔ "اے ہے —— کیا باتیں لے بیٹھتے ہیں آپ بھی، بچے کو پریشان کر دیتے ہیں۔ اللہ مالک ہے ہو جائے گا سب کچھ۔ پہلے آپ اپنا علاج کروائیں۔ ہاں طاہر آج چلے جانا دکان پر لے جانا انہیں ڈاکٹر کے پاس۔"

"اچھا امی ——"

رفیق دکان پر چلا گیا۔

امی نے طاہر کو پیار سے سمجھایا۔

"بہت چڑچڑے ہو گئے ہیں تمہارے ابا —— کیا کریں —— فکر ساری انہیں ہی ہے نا —— دکان بھی چلانا ضروری ہے۔ وہ آرام کریں بھی تو کیونکر ——"

"اسلم سارا کام سنبھال رہا ہے۔" طاہر بولا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن نوکروں پر کام ڈال دیا جائے کوئی کمائی آدھی بھی نہیں رہتی۔ مالک سر پر ہوں تو صحیح کام چلتا ہے۔"

"ضروری تو نہیں —— ابا ویسے ہی اس پر اعتماد کم کرتے ہیں۔ آرام کی عادت ہی نہیں انہیں۔"

"آرام کر سکتے ہیں بشرطیکہ ——"

"بشرطیکہ ——"

"ہاں بشرطیکہ تم تھوڑا وقت دکان پر دیا کرو۔"

"ہیں ——"

"ہاں ——"

"نوکری چھوڑ کر دکان پر جا بیٹھوں ——"

"نوکری کون کہتا ہے چھوڑ دو —— دو تین گھنٹے شام کو تو بیٹھ سکتے ہو"

"امی —— میں دکان داری نہیں کر سکتا —— نہ مجھے عادت ہے

نہ ہی یہ کام پسند ہے"

ماں بیٹے میں کچھ دیر بحث و تکرار ہوئی۔

لیکن بقول رفیق طاہر تو دکانداری کرنے میں اپنی تہک سمجھتا تھا اس

نے ماں کو صاف صاف جواب دے دیا۔

رشیدہ کیا کرتی چپ ہو گئی۔

جوان بیٹے کے منہ بھی نہ لگنا چاہتی تھی۔ اس لئے رویہ بدل کر نر

ملائمت سے بولی۔ "ابا دکان پہ آنے کا کہہ گئے تھے۔ وہاں بھی جا

گا یا نہیں"

"جا رہا ہوں ——"

"ڈاکٹر سے پوری پوچھ پڑتال کر کے آنا —— آرام کرنے کا بھی پو

"آرام ڈاکٹر سے پوچھے بغیر نہیں ہو سکتا"

"تیرے ابا ڈاکٹر کی سنی ان سنی تو نہیں کریں گے نا۔ ہماری تو سنتے

نہیں۔ اور ہاں سن —— ڈاکٹر نے تیرے ابا کو آرام کرنے کی تاکید کی تو

تو اتنا تو کر لیا کرے گا کہ شام کو دکان پر جا کر حساب کتاب چیک ——

کر لیا کر دن کا یہ کام ——"

"تو جا پھر ابا کو لے جا ڈاکٹر کے پاس ——"

"اچھا امی ——"

طاہر تیار ہو کر گھر سے باہر نکل گیا۔ رشیدہ اپنے سہاگ کی سلامتی کی دل

ہی دل میں دعائیں مانگنے لگی۔

ڈاکٹر نے رفیق کا پورا چیک اپ کیا۔ پیٹ کی خرابی کے متعلق اس نے

کچھ اندیشے ظاہر کئے۔

دوسرے دن بلڈ شوگر اور یورین ٹسٹ کروانے کے لئے خالی پیٹ

آنے کو کہا۔ اس کے پاس بلڈ اور یورین ٹسٹ کرنے کے کمپیوٹرائزڈ

آلات موجود تھے۔ سٹول ٹسٹ بھی کرنا ضروری تھا ان ٹسٹوں کے بعد

ہی علاج ہونا تھا۔

دوسرے دن بھی طاہر ابا کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

اسی شام ساری رپورٹیں مل گئیں۔ بلڈ شوگر ساڑھے چار سو سے بھی

اوپر تھی۔

یورین میں بھی تھی۔ یہ تو ڈاکٹر نے کل ہی محسوس کر لیا تھا لیکن سٹول

رپورٹ خاصی تشویش ناک تھی۔

"ہوسپٹل ایڈمٹ کروانا پڑے گا" ڈاکٹر نے طاہر سے کہا۔

"کیوں —— ؟ کیا ——" طاہر پریشان ہو گیا۔

"شوگر بہت زیادہ ہے اسے ہوسپٹل میں ایڈمٹ ہو کر ہی کنٹرول

کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے پیٹ کی خرابی۔ مجھے کچھ شک ہے یہ شک

باقاعدہ ٹسٹ ہوکر ہی دور ہوسکتا ہے۔ ان ٹسٹوں کے لئے ہوسپٹل ایڈمٹ ہونا ضروری ہے۔"

"شک کیسا ڈاکٹر ــــــ"

"فی الحال کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آپ انہیں ہوسپٹل ایڈمٹ کروادیں فزیشن پورے معائنے کے بعد ہی کچھ بتا سکے گا۔"

طاہر بیحد پریشان ہوا۔

ابا دکان سے باہر آچکے تھے۔

وہ ڈاکٹر اور طاہر کی باتیں نہیں سن سکے۔ طاہر نے اپنی پریشانی ان پر ظاہر نہ ہونے دی۔

گھر آکر اس نے مختصراً بتایا۔

ہسپتال کا نام سنتے ہی رشیدہ نے سینے پر دوہتڑ مارا۔

"اوہ امی ــــ ہسپتال ایڈمٹ ہونے میں کیا قیامت ہے وہاں ڈاکٹر نرسیں ہر وقت موجود ہوتی ہیں۔ بار بار ٹسٹ ہوتے ہیں ابا کے جو گھر پر نہیں ہوسکتے۔ پریشانی کی کیا ضرورت ہے۔ جاہلوں کی طرح ہسپتال کے نام سے خوفزدہ ہورہی ہو۔"

رشیدہ کا دل اندر ہی اندر بیٹھا جارہا تھا۔ کوئی سنگین بات ہی تھی ورنہ ڈاکٹر ہسپتال داخل ہونے کو کیوں کہتا۔

شام طاہر نے شگو سے بات کی۔

اس نے رپورٹیں دیکھیں۔

وہ بھی پریشان ہوگئی۔

ڈاکٹر نے شاید کینسر کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ وہ یہ بات جان گئی تھی۔

شبنم کلینک میں داخل ہوکر علاج کروانا تو ممکن نہیں تھا۔ لیکن شگو نے ساری رپورٹیں ڈاکٹر آصف کو دکھا کر ان سے مشورہ لینے کا ارادہ کیا۔

دوسرے دن وہ ساری رپورٹیں لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی اس نے کیس دیکھنے کا وعدہ کیا۔

دوسرے دن اس نے بھی وہی بات کہی جو پہلے ڈاکٹر نے کہی تھی۔

"انہیں یہیں ایڈمٹ کروادو۔ میں ان کا چیک اپ کرلوں گا۔" ڈاکٹر آصف نے کہا۔

"لیکن ڈاکٹر ــــ" شگو پریشانی سے بولی۔

"کیا ــــ"

"یہاں کا خرچہ ہم لوگ برداشت نہیں کرسکتے۔"

"ہوں ــــ"

ڈاکٹر آصف چند لمحے سوچتا رہا۔

پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں ڈاکٹر بیمع سے بات کرتا ہوں اگر وہ تمہارے پیشنٹ کو کچھ رعایت دے سکیں تو ــــ پیشنٹ تمہارے عزیز ہیں نا۔"

"جی ڈاکٹر ــــ وہ میرے باپ کی جگہ ہیں۔" شگو کی آنکھوں میں آنسو بھر

آ سئے۔ " اپنے باپ کا سایہ تو بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا جب سے ہوش سنبھالا انہیں کی شفقت دیکھی "۔

"اوکے ——— میں پوری کوشش کرتا ہوں مس شگی۔ تم انتظار کرو"۔

ڈاکٹر آصف نے شگو کی پوری مدد کی۔ بڑے نام چارجز پر رفیق کو کلینک میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔

وہ ایک ہفتہ وہاں رہے۔ شگو نے ان کی خدمت میں نہ دن دیکھا نہ رات اک فرض شناس نرس کی پوری ڈیوٹی اس نے پہلی بار ہی دی۔ گھر والے خاص کر رشیدہ اور طاہر تو اس کے معتقد اور معترف ہو گئے۔ عزیز وہ انہیں پہلے ہی تھی۔ اب تو وہ ان کے لئے جانے کیا شے بن گئی۔

سارے ٹسٹ ہوئے۔ ڈاکٹر آصف اور ڈاکٹر شاہد نے رپورٹیں مرتب کیں۔ کینسر صرف خدشہ ہی نہیں تھا۔ جب انہوں نے یہ بات شگو کو بتائی تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

ڈاکٹروں نے حسب روایت اسے تسلّی دی۔ علاج پر پوری توجہ دینے کی ضرورت سمجھائی۔

ٹھیک ہونے کا بھی بے یقینی سے یقین دلایا۔ گو رفیق سے یہ بات پوشیدہ رکھی گئی۔ لیکن باقی سب کو علم ہو گیا۔ طاہر تو جو اس باختہ سا ہو گیا بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ رشیدہ کی حالت بھی دیدنی تھی رفیق کے سامنے ظاہر نہ کرتی۔ لیکن اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر روتی رہی۔ دوائیوں کی لمبی چوڑی فہرست اور ہدایات لے کر رفیق کو گھر لایا گیا۔

لیکن

مرض ایسا تھا کہ جوں جوں دوا کی بڑھتا ہی جانے والی بات تھی۔ تین ماہ

ہ رفیق موت کی دہلیز تک آن پہنچا۔ مالی حالات شادیوں کی وجہ سے

ے ہی چوپٹ ہو چکے تھے۔ اس پر اتنی طویل اور مہنگے علاج والی بیماریاں

یہ کتنا بوجھ اٹھاتی۔

ر نے ہی قرضے سر پر چڑھنے لگے۔

اس گھرانے کو خوشیاں راس نہیں آئی تھیں۔

شادیاں جس دھوم دھام سے ہوئی تھیں اور دو بیٹیوں کا بار جس احسن

زی سے اترا تھا۔ اسے لوگوں کی نظر ہی کھا گئی۔ ابھی خوشیوں کا خمار بھی

رہا تھا۔

بیعہ کو سعودی عرب گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ صبیحہ کے باہر جانے

کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ یہ افتاد آن پڑی۔

وہ رات بڑی ڈراؤنی تھی۔ چاندنی بھی تھی۔ لیکن چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا لگ رہا تھا۔ فضا خاموش تھی۔ لیکن لگتا تھا آندھی اور طوفان زورا پر ہیں۔ شائیں شائیں کی آوازیں کانوں میں اتر رہی تھیں۔

رفیق کی حالت شام سے خراب تھی۔ موت کے سائے منڈلا رہے تھے یہ سائے اتنے واضح اور صاف تھے۔ کہ بند آنکھوں کو بھی نظر آ رہے تھے۔ رشیدہ جیتے جی مرچکی تھی۔

صبیحہ رو رو کر بے حال تھی۔ شگو تسلیاں دیتے دیتے خود بھی بے کل تھی ظاہر گھبراہٹ اور پریشانی میں ان رونے دھونے والوں کو کبھی ڈانٹنے لگتا کبھی پیار کرنے لگتا۔ ماں کی گود میں سر رکھ کر بے اختیارانہ رونے بھی لگتا قریبی رشتہ دار خبرگیری کو آئے ہوئے تھے۔ رفیق کی حالت دیکھ کر رات وہیں رک گئے تھے۔

وہ کبھی کسی کو تسلی دیتے کبھی کسی کو دلاسہ۔ تہمینہ تو خود بھی بکھری ہا

تھی۔ رفیق بھائی نے زندگی کے ہر قدم پر اس کو سہارا دیا تھا یہ سہارا ٹوٹ رہا تھا۔

وہ بے سہارا ہو رہی تھی۔

رات لمحہ لمحہ سرک رہی تھی۔

اور

سب دم سادھے موت کے قدموں کی دھمک سن رہے تھے۔ رفیق کبھی غشی طاری ہو جاتی۔ کبھی ہوش میں آجاتے۔ کمزوری اتنی تھی کہ منہ سے بات نہ نکل رہی تھی۔

کبھی ہونٹ ہلتے۔

کبھی دھیمی سی آواز نکلتی۔

ایک دو بار انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔ اور جو لفظ سب کی سمجھ میں اترا اور یہ تھا۔ شاید ان کی نظریں اپنی اس عزیز بیٹی کو تلاش کر رہی تھیں۔ جو یہاں نہیں تھی۔

یہ بات رشیدہ کا دل چیر رہی تھی۔ باپ دور افتادہ بیٹی سے ملنے کی حسرت دل میں لئے بچھڑ رہا تھا۔

ساری رات اہل خانہ نے جیسے کانٹوں پر بسر کی۔

تہمینہ اور شگو نے بھی پلک نہ جھپکی۔

باقی مہمان باری باری نیند نکال رہے تھے۔

وہ سحری کا وقت تھا۔ رفیق کے لب ہل رہے تھے۔ وہ کچھ کہہ رہے

تھے۔ کہنا چاہ رہے تھے۔ صبیحہ طاہر ظہیر زبیر۔ چاروں بچے ان کے پلنگ پر جھکے تھے۔ پلنگ کے سرہانے بیٹھی تھی۔

تہمینہ اور شگو بھی پٹی سے لگے تھے۔

طاہر بار بار انہیں بلا رہا تھا۔

وہ باپ کے منہ سے نکلنے والے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سننے کی کوشش میں بار بار کان ان کے منہ کے قریب کر رہا تھا۔

رفیق کو پتا تھا کہ موت سر پر آن پہنچی ہے۔ اسی لئے وہ شاید طاہر کو اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ سونپنے کی بات کر رہے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے الفاظ سے یہی جملہ بن رہا تھا

کہ

طاہر بیٹے سارے بار تم پر ڈال کر جا رہا ہوں۔

افسوس تو ہے۔

پر کیا کروں۔

مجبوری ہے۔

دل فرطِ غم سے پھٹے جا رہا تھا۔ آنکھیں ساون بھادوں کا نقشہ پیش کر رہی تھیں۔ رشیدہ اجڑ رہی تھی۔ وہ بار بار سینے پر دھموکے مار رہی تھی۔

انسان کتنا بے بس، کتنا مجبور اور کتنا لاچار ہے۔ یہ اس وقت پتہ چلتا ہے جس وقت موت اپنا وار کرتی ہے۔ اور چاہنے والوں پیار کرنے والوں کے جھرمٹ سے اپنا شکار اچک کر لے جاتی ہے۔ قریب بیٹھے جان چھڑکنے

والے اپنے پیارے کچھ نہیں کر سکتے۔

بے بس

مجبور

اور

لاچار ہو جاتے ہیں۔

موت جانے والے اور رہ جانے والوں کے درمیان جدائی کی ایسی دیوار کھینچ دیتی ہے۔ جو ابد تک قائم رہتی ہے۔ موت کی آغوش میں چھپ جانے والے پھر کبھی نظر نہیں آتے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھپ جاتے ہیں۔

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

رفیق کے لب ہلنا بند ہو گئے۔

سانس کی ڈوری اب آس سے بھی ٹوٹ رہی تھی۔ گلے کی خرخراہٹ وقت آخر کی اطلاع دے رہی تھی۔

تہمینہ دوڑ کر اندر گئی اور کلام پاک لے آئی۔ وہ رفیق کے سرہانے بیٹھ کر تلاوت کرنے لگی۔

سورۃ یٰسین کی تلاوت اس المناک ماحول میں دلوں کو گیا ر دحوں تک کو ہلا رہی تھی۔ سب دم سادھے رکھی نظریں رفیق کے چہرے پر جمائے بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔

تلاوت ختم ہوتے ہی رفیق نے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف دیکھا۔

پھر آنکھیں بند کر لیں۔

اور

اک آخری ہچکی آئی ۔

پھر

یہ آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں ۔

اک کہرام مچ گیا۔

چیخ و پکار سے فضا لرز گئی ۔ بچے فرش پر لوٹنیاں لے کر تڑپنے لگے ۔ رشیدہ نے سینہ پیٹ لیا ۔

محلے والے دوڑے آئے ۔

اک مسافر زندگی کی طویل اور کٹھن مسافت طے کرنے کے بعد آرام کی نیند سو گیا تھا ۔

اسے اب نہ بچوں کی تڑپ سے واسطہ تھا نہ بیوی کی آہ و پکار کے شور سے ۔ مطمئن اور پرسکون، ہو چکا تھا وہ ۔

شام چار بجے جنازہ اٹھا ۔ بے شمار لوگ تھے ۔ رفیق نیت کا کھرا اور دل کا صاف آدمی تھا ۔

کسی سے دشمنی نہیں تھی ۔ سب سے علیک سلیک تھی ۔ سارا بازار اُمڈ آیا ۔ یوں بڑی دھوم دھام سے جنازہ اٹھا ۔

گھر والے غم سے نڈھال تھے ۔

رشیدہ بانہیں اٹھا اٹھا کر بین کر رہی تھی ۔ صبیحہ سنبھالے نہ سنبھل رہی تھی ۔

ظہیر اور زبیر غم سے نڈھال ہو رہے تھے ۔ طاہر کی بری حالت تھی ۔ شیو بڑھی ہوئی تھی ۔ آنکھیں متورم تھیں ۔ ماتھا رومال سے بندھا ہوا تھا ۔ غم کا کوہ گراں سر پر آن گرا تھا ۔

گرتا پڑتا جنازے کے ساتھ جا رہا تھا ۔

رفیق کے یوں اٹھ جانے سے سارا گھر ہی درہم برہم ہو گیا تھا ۔ طاہر کے تو جیسے حواس ہی بجا نہ رہے تھے ۔

دن کا پتہ تھا نہ رات کا ۔ کبھی ساری ساری رات جاگتے اور ٹہلتے گزر جاتی ۔ کبھی سارا سارا دن کمرے میں پڑا چھت کی کڑیاں گنتا رہتا ۔ سمجھ نہ پاتا تھا کہ کیا کرے گا ۔

وقت گزرتا جا رہا تھا ۔

اور

یہ وقت ہی تھا ۔ جو سنبھالا دے رہا تھا ۔ زخموں پر مرہم کا کام کر رہا تھا حواس کو لوٹانے میں مدد دے رہا تھا اور سوچنے سمجھنے کی قوتیں واپس لا رہا تھا ۔

چالیسویں کے بعد گو دلوں کے زخم بھرے تو نہ تھے ۔ پھر بھی اہل خانہ اس قابل ہو گئے تھے کہ بیتنے اور بیتنے والے کے متعلق سوچ سکیں ۔ آئندہ کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کر سکیں ۔ اور زندگی کی گاڑی کو دھکیلنے کا ذریعہ تلاش کر سکیں ۔

دکھ اور درد کے پل پل میں شگو اور تہمینہ نے اس خاندان کا پورا پورا

ساتھ دیا تھا۔

طاہر کو تو سہارا ہی شگو نے دیا تھا۔ اس کا حوصلہ بندھایا تھا پھر اس
اس کے پاس بیٹھ کر دلجوئی کی تھی۔

ہمت دلائی تھی۔

حالات سے مردانہ وار نپٹنے کا حوصلہ دیا۔

طاہر نے دفتر سے چھٹی لے لی تھی۔ اور دکان پر جانے لگا۔ دکان چلانے یا سنبھالنے کا اس کا قطعاً ارادہ نہیں تھا۔

لیکن

حساب کتاب دیکھنا ضروری تھا۔ کاروبار لینا دینا چلتا ہی رہتا تھا اسے تو کچھ خبر نہ تھی۔ کہ ابا نے کس سے لینا ہے کس کا دینا ہے۔ اتنا پتہ تھا کہ ربیعہ صبیحہ کی شادیوں پر ابا نے کچھ قرض لیا تھا۔ اور وہ یقیناً ابھی سر پر تھا۔ اسلم سیل مین تھا۔ وہی تفاصیل جانتا تھا سبھی کھاتے اس کے پاس تھے۔

اسلم سے جو معلومات حاصل ہوئیں۔ مایوس کن تھیں۔ دکان میں جتنا مال تھا اس سے زیادہ قرضے کا بار تھا۔

طاہر تو بوکھلا ہی گیا۔ وہ تو اچھی بات کہ اسلم ایماندار آدمی تھا۔ ہیرا پھیری کرنے والا آدمی ہوتا۔ تو دکان میں جو تھوڑا بہت مال تھا وہ بھی ختم ہو گیا ہوتا۔

طاہر نے ساری صورتِ حال رشیدہ کے سامنے بیان کی۔ صبیحہ کو بھی بتایا۔

"اب کیا ہو گا ـــــ" رشیدہ کا تو دل ہی بیٹھ گیا۔

"حوصلہ رکھو امی ـــــ" صبیحہ بولی۔

"اللہ مالک ہے وہ بہتری کی صورت خود ہی نکالے گا۔"

"بہتری کی صورت نظر تو نہیں آتی۔ اتنا قرضہ کیسے اترے گا۔ گھر کا خرچہ کیسے پورا ہو گا۔" طاہر نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔

"طاہر ـــــ تم حوصلہ ہار گئے تو امی کا کیا بنے گا۔" صبیحہ بولی۔ "جیسے تیسے ان حالات سے نپٹنا ہی ہے۔ تم نوکری کر رہے ہو اس سے دال دلیہ تو چلے گا ہی۔ باقی رہی دکان تو اس پر اپنا کنٹرول رکھو۔ اسلم چلا ہی رہا ہے کچھ نہ کچھ تو نکالے ہی گی دکان۔ سوچ سمجھ کر پلان بناؤ۔"

کئی دن سوچتے گزر گئے۔

لیکن حل کوئی نظر نہ آیا۔

حالات بد سے بدتر ہونے لگے۔ تو صبیحہ نے اپنے شوہر کو سب تفصیل سے لکھا۔ وہ کچھ مدد کر دے تو دکان کو نئے سرے اٹھایا جا سکتا تھا۔

اشرف اچھا آدمی تھا۔ پیسہ بھی پاس تھا۔ اس نے صبیحہ کی خاطر پیسہ بھیج دیا جو دکان میں لگا دیا گیا۔ طے یہ ہوا کہ اسلم کے ساتھ دکان پر ظہیر بیٹھا کرے۔ اور طاہر اپنی نوکری جاری رکھے۔ ظہیر کو سکول چھوڑنے کا دکھ تو تھا۔ لیکن صبیحہ نے اسے سمجھایا کہ وہ امتحان پرائیویٹ طور پر بھی دے سکتا ہے۔ طاہر کے لیے بھی سوچا گیا تھا۔ کہ وہ ویزا ملنے پر باہر چلا جائے وہاں

سے کمائی کر کے روپیہ بھیجے اور سارے قرضے یوں بے باک کر دے۔ لیکن قسمت طاہر پر نامہربان تھی تین ماہ کے بعد ربیعہ اور اس کا شوہر ابا کی فوتیدگی کے افسوس کے لئے آئے تو ویزا بھی لائے تھے۔ لیکن رشیدہ اس بیمار پڑ گئی کہ طاہر کا باہر جانا ممکن نہ رہا۔ دو چھوٹے بھائیوں پر سارے جنجال ڈال کر وہ باہر نہیں جا سکتا تھا۔

پھر امی بھی بیمار پڑ گئی تھی۔ اس حالت میں اسے بھی نہ چھوڑ سکتا تھا گو سب نے کہا کہ موقع ضائع نہ کرو۔ باہر چلے جاؤ۔ خاص طور پر شگو نے بہت زور دیا۔

"طاہر ـــ پھپھو کی دیکھ بھال کے لئے ہم جو ہیں۔ تم یہ موقع ضائع نہ کرو۔ باہر چلے جاؤ۔ تمہارے حالات ضرور اسی طور سدھر سکتے ہیں۔ تمہیں پیسے کی ضرورت ہے۔ تمہارے گھر والوں کو پیسے کی ضرورت ہے۔"

طاہر شاید اس کی بات مان بھی لیتا۔ لیکن صبیحہ اس حق میں نہیں تھی اسے تو شگو پر بھی بے طرح غصہ آتا تھا۔ جو اسے باہر جانے پر اکساتی تھی بیمار ماں اور دو ناسمجھ بھائیوں کو چھوڑ کر باہر جانے کی پٹی پڑھاتی تھی، شگو کو ہمیشہ ہی اس نے خود غرض اور پیسے کی دیوانی سمجھا تھا۔ اب تو وہ اسے کھل کر کہنے لگی تھی۔ دو ایک دفعہ تو اس سے اُلجھ بھی پڑی تھی۔

"ضروری تو نہیں ابھی چلا جائے طاہر۔ عمر پڑی ہے۔ گھر کے حالات ٹھیک ہونے پر بھی جا سکتا ہے امی صحتیاب ہو جائیں۔ تب بھی بات بنتی ہے۔ ظہیر ہی کچھ سمجھدار ہو لے۔ کن پر چھوڑ کر جائے سب کو۔ صرف

پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ درد اور پیار کے رشتے بھی کچھ چاہتے ہیں۔"

رشیدہ نے دبی زبان سے صبیحہ کو ٹوکا بھی تھا۔ "صبیحہ شگو سے اس لہجے میں بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بیچاری بھی تو ہمارے بھلے کی بات کرتی ہے۔"

"ہمارے بھلے کی نہیں اپنے بھلے کی۔" صبیحہ نے جل کر کہا۔ "اسے تو پیسے کے سوا اور کسی بات کی اہمیت کا احساس ہی نہیں۔"

"نہیں بیٹی ایسا نہ کہو۔ دیکھتی نہیں ہو اس نے کس طرح تمہارے ابا کی خدمت کی ہے۔ ہمارے ساتھ کتنی ہمدردی ہے اسے۔ طاہر کو اس نے سنبھالا ہے ورنہ مجھے تو ڈر لگتا تھا کہیں حواس ہی نہ کھو بیٹھے۔"

صبیحہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے چپ رہی لیکن دل ہی دل میں شگو کے لئے ناخوشگوار احساسات کو پالتی رہی۔

طاہر باہر نہیں جا سکا۔ حالات ہی کچھ ایسے تھے۔

شگو کو اس بات سے واقعی دکھ ہوا۔ اسے طاہر کی حماقت پر غصہ بھی آیا۔ جو اس نے یہ موقعہ کھو دیا تھا۔

طاہر نے خفگی محسوس کی تو صفائی پیش کرنے لگا۔ وہ سرد لہجے میں بولی۔ "نہیں کیا تم اپنی زندگی کے مالک و مختار ہو۔"

طاہر نے اسے منانے کے لئے کہا۔ "میری زندگی کی مالک و مختار تو تم ہو۔"

"میں ہوتی تو میری بات مان لیتے۔"

"میرے حالات کو سمجھو شگو ——"

"یہاں رہو گے تو حالات اور بگڑیں گے"

"تم نہ بگڑنا شگو —— بس —— پھر میں قسمت سے لڑ لوں گا۔ا کرو شگو —— ان حالات میں میرا ساتھ تو نہ چھوڑو گی" طاہر نے اپنا ہاتھ ا کی طرف بڑھایا۔

شگو بے چین ہو گئی۔

بڑی بیقراری سے اس نے طاہر کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر سی سے لگا لیا۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی طاہر —— نہیں چھوڑوں گی"

"اوہ میری زندگی ——" طاہر نے بے اختیارانہ اپنا بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیا۔ شگو کا سر آگے کی طرف جھک آیا اور طاہر نے اس کے گھنیرے سیاہ بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

بیحہ اس دفعہ دو ہفتے بعد میکے آئی۔ جب سے ابو فوت ہوئے تھے باقاعدہ ہر ہفتے آتی تھی۔ کبھی کبھی تو ہفتے میں دو چکر بھی لگا لیتی۔ دو ایک دن ما اور بھائیوں کے پاس رہ جاتی۔ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ ظاہر کوئی بیماری نہیں تھی۔ بلڈ پریشر ہی تھا جو کبھی خاصہ بڑھ جاتا۔ لیکن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

بستر سے اٹھا ہی نہیں جاتا تھا۔ گھر کی دیکھ بھال تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ تو حمیدہ ترکھانی آ جاتی تھی جو اوپر اوپر کا کام کر جاتی تھی۔ کھانا کبھی بازار سے آ جاتا۔ کبھی مامی پکا کر دے جاتی اور کبھی طاہر ظہیر اور زبیر مل کر پکا لیتے۔

گھر کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ سارا نظام چوپٹ ہو گیا تھا۔ رشیدہ کو تو ویسے بھی گھر بار سنبھالنے کی عادت ہی نہیں تھی۔ جب سے صبیحہ نے ہانڈی روٹی سنبھالی تھی اور ربیعہ نے صفائی ستھرائی کا کام ہاتھ میں لیا

تھا۔ وہ تو بالکل بے غم ہو بیٹھی تھی۔

دونوں بیٹیوں کی اکٹھا شادی کر کے وہ اب پچھتا بھی رہی تھی۔ رفیق زندہ رہتے تو شاید کوئی مستقل نوکر ہی رکھ لیتے، جو سارے کام کر دیتا۔

لیکن

اب تو

ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔ جانے کیسے کھینچا تانی سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ دکان کی ساری کمائی جو ابھی بالکل ہی معمولی تھی، قرضے کے کھاتے میں چلی جاتی۔ لے دے کے طاہر کی تنخواہ ہی تھی۔

اور

وہ

تنخواہ تھی بھی کتنی۔

ابا کی زندگی میں تو یہ طاہر کا جیب خرچ ہی ہوا کرتی تھی۔ کچھ بہنوں کے جیب خرچے کے کھاتے میں ڈال دیا کرتا تھا اور سو پچاس امی کو خوش کرنے کے لئے ان کے ہاتھ میں تھما دیا کرتا تھا۔

اب

اس تنخواہ سے سارے خرچے پورا کرنا ہوتے تھے جو ہو نہیں پاتے تھے۔ نوکر رکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔ حمیدہ اُن کو دینے کے لئے بھی پیسے نہ بچتے تھے۔ صبیحہ ہر ہفتے آتی تو الٹ پلٹ گھر کو ٹھیک کرتی۔ ڈھیر سارے کپڑے میلے پڑے ہوتے۔ بستروں کی چادریں میلی چکٹ ہوتیں۔ کوئی چیز ٹھکانے پر نہ

ہوتی۔

وہی گھر جو وہ ہر وقت صاف ستھرا اور چمکا کے رکھتی تھی۔ اب ویران سا نظر آتا تھا۔ حالات یوں بھی پلٹ سکتے تھے۔ یہ کب کسی نے سوچا تھا

لیکن

سر پڑی سہنا تھی قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا تھا۔ انسان ہی کو اس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ مصائب و آلام سہنے کو تو ہوتے ہیں، یہ بھی قدرت کا ہی عطیہ ہے کہ انسان کو بردبار بنا دیا۔ اس کے جھک جانے کے باوجود سہہ جانے کی قوت رکھ دی۔ یہ بات نہ ہوتی تو ہر چھوٹے بڑے الم اور مصیبت پر بندہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا۔ اور اس طرح بکھر جاتا۔ کہ پھر کبھی جڑ نہ پاتا۔

لیکن

یہ بات نہیں۔

بندہ بے بس تو ہے۔ لیکن مضبوط بھی بہت ہے۔ اتنا کچھ سہہ گزرتا ہے کہ جتنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔

حالات بنتے ہیں بگڑنے کے لئے اور بگڑتے ہیں بننے کے لئے یہ عمل کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ جاری و ساری رہنا ہے۔ رفیق کی موت بھی اس خاندان پر کوہ گراں بن کر ٹوٹی تھی۔

لیکن

رفتہ رفتہ سب سنبھل رہے تھے۔

وہ تو رشیدہ ہی تھی جس نے غم کا بار اپنے اندر اتار لیا تھا بچے اب زندگی سے بنرد آزما ہونے کے لیے ہمتیں مجتمع کر رہے تھے، ظہیر نے پڑھائی کا ارادہ چھوڑ دیا تھا۔

اور

اب

وہ دکان میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

طاہر بھی سوچتا رہتا کہ کوئی بہتر نوکری تلاش کر لے۔ امی ٹھیک ہوتی تو وہ کب کا باہر چلا گیا ہوتا۔ پھر بھی مالی حالات کو سنبھالا دینا ہی تھا۔ وہ یہی سوچتا رہتا۔

صبیحہ بھی اس گھر کی بہتری کے لئے ہر وقت سوچتی رہتی تھی گھر کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔

طریقہ سلیقہ رہا ہی نہیں تھا۔

جانوروں کی سی زندگی گزار رہے تھے سب۔ بھوک لگی تو پیٹ بھر لیا، بس — بیٹی تھی دل بہت دکھتا تھا، ہر وقت کڑھتی رہتی تھی ربیعہ اس لحاظ اچھی تھی کہ دور دیس بیٹھی تھی، دل تو اس کا بھی دکھتا تھا۔

لیکن

یہ سب کچھ آنکھوں سے تو نہ دیکھتی تھی، گھر کی ویرانی کا اسے اتنا احساس صبیحہ نہ تھا۔ جتنا صبیحہ کو تھا۔ صبیحہ اس دفعہ دو ہفتے بعد آئی تھی گھر میں کچھ اتنی بڑے تھی کہ وقت ہی نہ مل سکا، اس کے سسر کی طبیعت اچھی نہیں

...ری بھابی میکے گئی ہوئی تھی۔ اور اس مصروفیت کی سب سے بڑی
...یہ کہ اشرف نے اسے بلا بھیجا تھا۔ اس کا ویزا آگیا تھا اس سلسلے
...دوڑ دھوپ ہو رہی تھی۔

...وہ گھر آئی۔

امی نے آبدیدہ نظروں سے اسے دیکھا اور بولی۔

...ہمیں بھلا ہی دیا۔ تو نہیں جانتی کہ تیرے آنے سے مجھے کتنی تسکین ملتی ہے —"

"جانتی ہوں امی —"

"تو پھر —"

"بہت سے کام تھے —"

"ہوں — کام تو ہوتے ہی ہیں —"

"ابا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی امی۔ اور مومنہ بھابی بھی میکے گئی ہوئی تھی، میرے ویزے کا تو آپ کو پتہ ہی ہے۔"

رشیدہ نے دکھ سے سانس کھینچی۔ "تو بھی چلی جائے گی۔"

"نہ جاؤں امی —"

"جاؤ — کیوں نہیں — بس یونہی — دل —"

"امی —"

"جی —"

"امی ایک بات کہوں —"

"کہو ——"

"میں چلی گئی تو آپ لوگوں کا کیا بنے گا۔ یہ گھر بار کیسے چلے گا۔ دو ہفتے بعد آئی ہوں تو گھر کی حالت دیکھنے کی نہیں۔ پورا دن بھی لگا کر پوری طرح ٹھیک نہیں کر پائی۔ ہول آتا ہے امی۔ ایسے کیسے چلے گا۔"

رشیدہ نے گہری سانس لی۔ آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔

صبیحہ نے دوپٹے کے آنچل سے ماں کے آنسو پونچھتے اور قدرے سخت لہجے میں بولی۔

"امی ان آہوں آنسوؤں سے کام نہیں چلے گا۔ آپ کو کوئی طریق سوچنا چاہیے گھر سنبھالنے کے لئے عورت کی ضرورت ہے۔"

"مجھ سے نہیں سنبھالا جا سکتا۔ ہمت ہی نہیں پڑتی۔"

"تو پھر اور بندوبست کریں ——"

"حمیداں ہی ہے ——"

"میں اس کی بات نہیں کر رہی ——"

"تو پھر ——"

"طاہر کی شادی کر کے بہو گھر میں لے آئیں۔"

"یہ کیا —— کہہ رہی ہو بیٹی ——"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں ——"

"لیکن ——"

"لیکن ویکن کچھ نہیں امی۔ آپ ماموں سے بات کریں۔ ہمارے حالات

ان سے پوشیدہ نہیں۔ وہ بھی تو گھر کی ویرانی دیکھ رہی ہیں۔ آپ کی حالت بھی ان سے مخفی نہیں۔"

"لیکن —— لیکن شادی کیسے کریں۔"

"ضروری نہیں شادی دھوم دھام سے ہو —— نکاح کر کے بہو گھر لے آئیں ——"

"نہیں صبو —— ابھی —— شادی نہیں ہو سکتی۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی ——"

"ہمارے مالی حالات ——"

"گزر تو ہو ہی رہی ہے ——"

"لیکن اس گزر میں شگو ——"

"ساری بات یہی ہے امی۔ لیکن اب جو حالات ہیں شگو اگر آپ کی ہمدرد ہے اور طاہر سے اسے واقعی پیار ہے، تو اسے ——"

"نہیں بیٹی —— ایسا نہیں ہو سکتا۔ شگو تو شاید چاہے گی بھی نہیں۔ میں لا بھی ان حالات میں اسے ——"

"تو پھر طاہر کی کہیں اور شادی کر دیں۔ کسی غریب گھر کی سادہ سی لڑکی لے آئیں ——" صبیحہ بولی۔

رشیدہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی۔ "تجھے بیچاری شگو سے تو خدا واسطے کا بیر ہے۔"

"امی —— امی —— مت سوچیے ایسا۔ مجھے اس سے کوئی بیر ویر نہیں

میں تو صرف حالات کے دھارے پر نظر رکھ کر بات کرتی ہوں۔ شگو کی نظر میں پیسہ ہی اہم ہے اور روز بروز اس کی پیسے کی تمنا بڑھتی جا رہی ہے۔ اتنی بڑھتی جا رہی ہے۔ کہ اب اسے بلاشبہ ہوس کا نام دیا جا سکتا ہے۔"

"تو ——— پھر ———"

"پھر یہ کہ طاہر کے پاس نہ اتنا پیسہ ہوگا اور نہ وہ اسے اپنائے گی۔"

"لیکن تم بھی تو جانتی ہو کہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں ہیں نا صبو ———"

"ہاں ——— لیکن وہ پیسے کو اس محبت پر بھی ترجیح دے سکتی ہے امی ———"

"نہیں ——— ایسا نہیں ہو سکتا ———"

"تو پھر بات کیجیئے! ——— طاہر سے اسے محبت ہے پیار ہے تو اس کے دکھ سکھ بھی اسے بانٹنے چاہیئے۔ وہ نہیں دیکھتی کہ اس گھر کی حالت کیا ہو رہی ہے۔ اسے سنبھالنے کے لئے کسی خاتون کی ضرورت ہے۔ آپ کی خدمت کے لئے فرماں بردار بہو کی ضرورت ہے۔"

"اسے جب بھی وقت ملتا ہے میرے پاس آ جاتی ہے۔ دیکھ دیکھ کر لیتی ہے۔"

"اسے اس دیکھ دیکھ کی پوری ذمہ داری سنبھالنا چاہیئے۔ آپ ماموں سے بات تو کریں۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔ ان حالات میں تو طاہر ہی نہیں چاہے گا۔"

"میں طاہر سے خود بات کروں گی۔ امی میں نے بھی اب چلے جانا ہے یہاں کوئی ہونا چاہیئے آپ کے پاس۔ گھر بالکل ہی تباہ ہو جائے گا۔ اسے سنبھالنا چاہیئے۔"

رشیدہ چپ ہو گئی۔

صبیحہ کسی حد تک ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ گھر میں بہو آ جائے تو ساری ذمہ داری سنبھال لے۔

"لیکن

بہو ——— اور شگو ———"

اس نے ہولے ہولے نفی میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے ———" صبیحہ بولی "میں خود ہی بات کروں گی طاہر اور ماموں سے ———"

رشیدہ نے بے یقینی اور بے دلی سے کہا۔ "کر دیکھو ———"

صبیحہ نے اسی شام طاہر سے واقعی شادی کی بات کی۔ وہ پہلے تو مذاق سمجھا۔ اس کی بات پر مسکرا کر بولا۔

"تم نے میرے دل کی بات کی ہے آپا ———"

"تو پھر تیار ہو جاؤ ———"

"کیوں مذاق کر رہی ہو ———"

"میں سنجیدہ ہوں طاہر ———"

"واقعی ———"

"ہاں ——"

"لیکن ——"

"لیکن کی گنجائش نہیں طاہر ——"

اور پھر اس نے گھر کے حالات اور اپنے چلے جانے کے بعد اس گھر کا جو حال ہوا تھا بڑے مفصّل انداز میں طاہر کو سمجھایا۔

وہ بھی سنجیدہ ہوگیا۔

صبیحہ جذبات سے بھری دکھ سے بھرپور تقریر کر چکی۔ تو اس نے ہولے ہولے سر نفی میں ہلاتے ہوئے اسے دیکھا۔

"آپا —— میں ان حالات میں شگو سے شادی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"کیوں —— اس لئے کہ شگو کو ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی چاہیئے اور اس وقت تم ——"

"ہوں —— بالکل یہی بات ہے۔"

"تو شگو اور تمہارے جذبات پیسے کی ڈور سے بندھے ہیں۔ پیار ہمدردی اور دکھ سکھ بانٹنے کی کوئی سچائی نہیں ان میں۔"

"پتہ نہیں کیا ہے آپا ——" طاہر نے بے چینی سے مٹھیاں کھولتے بند کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن جو بھی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان حالات میں شادی کرنا نہ ہی میں پسند کروں گا اور نہ ہی وہ۔"

"ہونہہ ——"

صبیحہ نے ہمت نہیں ہاری۔ بیچاری بابل کے گھر کو یوں اجڑتے بکھرتے

دیکھ نہ سکتی تھی۔

اس نے مامی سے بھی بات کی۔ اتفاق سے شائستہ بھی آئی ہوئی تھی شگو کلینک گئی ہوئی تھی۔ شائستہ نے گیارہ بجے کلینک جانا تھا۔ گائناکالوجسٹ مسز رحمان سے شگو نے اس کے چیک اپ کے لئے وقت لے رکھا تھا۔ جب سے ڈیلوری ہوئی تھی۔ اس کی کمر میں درد رہتا تھا بچی آٹھ نو ماہ کی ہوگئی تھی۔ لیکن شائستہ کی کمزوری ابھی تک نہیں گئی تھی اور بھی چھوٹی موٹی اندرونی تکلیفیں تھیں۔ مسز رحمان سے شگو کے اچھے مراسم تھے شائستہ کا معائنہ مفت کرنا تھا اس نے۔

صبیحہ مامی کے پاس آئی۔ شائستہ کی کمزوری ابھی تک نہیں گئی تھی شائستہ کی احوال پرسی کی۔ اس کی بچی کو گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ بچوں اور وسیم کا حال احوال پوچھا۔ صبیحہ نے اس کی احوال پرسی کی۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

"اب تو یہ بھی جانے کو پر تول رہی ہے۔" تہمینہ نے صبیحہ کے جانے کے بارے میں شائستہ کو بتایا۔

"سچی ——" شائستہ نے خوشی کا اظہار کیا۔

"ہاں ——" صبیحہ بولی۔

"بہت خوش ہو۔ میاں کے پاس جا رہی ہو ——"

صبیحہ نے اک گہری سانس لی۔ شائستہ کو دکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہم لوگوں کو خوشیاں راس نہیں ——۔"

"کیوں —" شائستہ نے بے تابی سے کہا۔

"خیریت —" تہمینہ بولی۔

"ہاں مامی —" وہ دکھ سے بولی۔ "جانے کی کیا نحوست، اس گھر کا گھر ہی کھائے جا رہا ہے۔ امی کی طبیعت سنبھلتی ہی نہیں۔ وہ اس دکھ سے نپٹ نہیں پا رہیں۔"

"پالیں گی بیٹی —" تہمینہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "ابھی وقت ہی کتنا گزرا ہے۔ کفن بھی میلا نہیں ہوا رفیق بھائی کا۔"

"لیکن امی تو دن بدن نڈھال ہی ہوتی جا رہی ہیں۔ گھر تو بالکل ہی ویران ہو گیا ہے۔ لڑکے بیچارے کیا کریں۔"

"ہاں گھر تو گھر کی عورت ہی سے سنبھلتا ہے۔" شائستہ بولی۔

"میں بھی تو یہی کہتی ہوں۔ امی تو کام کاج سے گئیں۔ کوئی تو ہو جو گھر کو سنبھالے۔ میں بھی چلی گئی تو کیا ہوگا ان سب کا۔"

تہمینہ اور شائستہ دونوں ہی چپ ہو گئیں۔ تہمینہ ایک ہلتی ہوئی ٹانگ والی کرسی کو دیوار کے سہارے ٹیک دے کر اس پر بیٹھ گئی۔

صبیحہ بڑے دلگداز انداز میں اپنے میکے کے ہنستے بستے گھر کے اچانک اجڑ جانے کی باتیں کرنے لگی۔ روتی بھی رہی اور باتیں بھی کرتی رہی۔

تہمینہ اور شائستہ اس کی دلجوئی کو کبھی کبھی کوئی جملہ کہہ دیتیں۔

پھر —

یونہی روتے روتے صبیحہ اپنی بات زبان پر لے آئی۔ جسے سن کر تہمینہ

اور شائستہ دونوں ہی کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

"مامی دکھ کے اس سمے میں آپ ہمارا ساتھ دیں تو عمر آپ کے احسان مند رہیں گے ہم۔ خدا کرے گا گھر کے حالات پلٹ ہی جائیں گے امی کی دیکھ بھال پوری ذمہ داری سے کرنے والا کوئی ہوگا۔ تو طاہر کو ہم لوگ باہر بلا لیں گے۔ اس نے باہر جانے کا سوائے امی اور چھوٹے بھائیوں کے کوئی مسئلہ نہیں۔ ایک دفعہ وہ باہر چلا گیا۔ تو انشاءاللہ سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔"

وہ کہتی رہی۔

اور —

ماں بیٹی چپ چاپ سنتی رہیں۔ اس کی باتوں کے جواب میں انکار بھی ممکن نہ تھا۔

اور —

اقرار — ؟؟؟

شگو پلنگ کے چوبی تکئے کے ساتھ ٹیک لگائے بستر میں پڑی تھی۔ نگاہیں چھت کی کڑیوں پر لگی تھیں اور بے تابی کے عالم میں پیر پر رکھا پیر مسلسل ہلائے جا رہی تھی۔ وہ بے حد مضطرب و بے چین تھی۔ شائستہ نے جانے جاتے جو بات کہی تھی اس نے اسے منتشر سا کر دیا تھا۔

وہ کلینک سے خوش خوش آئی تھی گھر۔ آج ایک مریض جو ڈسچارج ہو کر گھر جا رہا تھا بڑی فراخدلی سے سسٹرز کو بخششیں دی تھی۔ کلینک سے گھر آتے یہ سارے پیسے خرچ کر دیئے تھے۔ شائستہ کے لئے کچھ ٹانک جو ڈاکٹر نے بتائے تھے لئے تھے۔ اور اس کی گود بچی کے لئے ایک بہت خوبصورت سا اونی سیٹ بھی لیا تھا۔

شائستہ نے گھر دبا لا تھا۔ وہ تیار بیٹھی تھی۔ اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ آئی۔ شائستہ کو ڈاکٹر کی دی ہوئی ہدایات دوبارہ ذہن نشین کرائیں۔ ٹانک دیئے اور بچی کا سوٹ اسے پہنا دیا۔

"دیکھو تو کتنی پیاری لگ رہی ہے ——" شگو بولی۔

"شگو اب پیسے خواہ مخواہ نہ خرچ کرتی پھرا کر ——" شائستہ نے کہا۔

"کیوں —— ؟ تنخواہ میں سے تو خرچ نہیں کئے۔ وہ تو آج ایک مہربان نے عنایت کی۔ ہماری عیاشی ہو گئی۔"

"پیسے سنبھال کر رکھا کر ——"

وہ بچی کو بغل میں دابے اس کے قریب چار پائی پر بیٹھ گئی۔ "آپا خیر تو ہے آج بڑی نصیحتیں کرنے کے موڈ میں ہو۔"

"بڑی بات ہے کیا —— پیسے سنبھال کر رکھا کر۔ کیا خبر تیری شادی جلد اور اچانک ہی کرنا پڑ جائے۔"

"کیا —— کیا —— کیا —— ؟"

شگو نے مسخرے پن سے کہا۔ تو شائستہ نے سنجیدگی سے صبیحہ کی باتیں اسے بتا دیں۔

شگو سن کر گنگ سی ہو گئی۔

چند لمحے بالکل خاموش رہی۔

اماں باورچی خانے میں تھی۔ صحن میں بیٹھی دونوں بہنوں کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ شگو کبھی اتفاق نہیں کرے گی اس بات سے اس نے مصلحتاً چپ رہی۔

"تو آپ نے کیا جواب دیا صبیحہ آپا کو ——" شگو بولی۔

"ویسے وہ بھی ٹھیک سوچتی ہے۔" شائستہ نے اس کے سوال

کے جواب کی بجائے اور بات کی۔

"پھپھو تو چارپائی سے لگ کر رہ گئی ہیں بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کی ہوگئیں

لڑکوں سے تو گھر نہیں سنبھالا جا سکتا نا ـــــ گھر میں کسی عورت کا ہونا ضروری

ہے ـــــ"

"اور وہ عورت ضروری ہے، کہ شادی کی زنجیروں میں جکڑ کر ہی لایا جائے

بے تنخواہ ملازمہ چاہیئے انہیں"

"یہ بات نہیں شگو ـــــ"

"تو اور کیا بات ہے ـــــ بڑا ارمان ہے بھائی کے سہرے کے

پھول دیکھنے کا صبیحہ آپا کو"

"تو تُو ـــــ"

"میں کیا ـــــ یہ صبیحہ آپا جو ہیں نا۔ ہمیشہ نیا شوشہ ہی چھوڑتی ہیں میں

جانتی ہوں۔ وہ مجھے پسند نہیں کرتیں"

"آئے ہائے۔ یہ تو نے کیسے کہدیا"

"مجھے ان کی طرف سے ہمیشہ یہی احساس ہوا ہے"

"پگلی ـــــ وہ سب تو تیرے دیوانے ہیں۔ گھر کی حالت بگڑ

رہی تھی۔ خود جو اس نے باہر چلے جانا ہے۔ اب تو ہفتے عشرے بعد

لگا جاتی تھی۔ گھر کی نوک پلک سنوار جایا کرتی تھی۔ اس کے بعد کون کرے

گا یہ سب۔ یہی سوچ کر اس نے یہ بات کی تھی"

شگو چپ ہوگئی۔

گھر کی حالت وہ بھی جانتی تھی۔ اور پھپھو بھی جتنی لاغر اور کمزور ہوگئی تھی

دیکھ بھال پوری طرح کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ بے شک اک

رکھ رکھاؤ والی سلیقہ مند عورت کی اس گھر میں ضرورت تھی۔

لیکن

ضروری تو نہیں تھا۔ کہ یہ عورت وہ ہی ہو؟

تو

پھر

کون ہو؟

شگو یہی باتیں اس وقت بستر میں پڑی سوچ رہی تھی۔ معاملہ سنجیدہ

تھا اور پیچیدہ بھی۔

وہ ان حالات میں اس خاندان کا ساتھ کیونکر دے سکتی تھی۔

شادی؟

توبہ توبہ

ایسا تو خیال بھی لرزا کے رکھ دیتا تھا۔

لیکن

گھر والوں کی بے بسی اور ویرانی بھی نہ دیکھی جاتی تھی۔ طاہر بے چارہ کس

طرح چل رہا تھا کیا حال ہوگیا تھا اس کا۔ پریشانی اور تفکرات نے نچوڑ کے جھنجھوڑ

کے رکھ دیا تھا اسے۔ گراں ذمہ داریاں ناتواں کندھوں پر آن پڑی تھیں۔ ان

کے بوجھ تلے وہ روز بروز دبتا ہی جا رہا تھا۔

اسے طاہر کے ساتھ پوری پوری ہمدردی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ دیکھ کر اس کا دل دکھتا تھا۔ وہ جب بھی اپنے سنہری خوابوں کے متعلق سوچتی تو طاہر کے حالات سے اسے ذہنی کوفت ہوتی۔ سنبھال سنبھال کر رکھے اور پھونک پھونک کر پالے خوابوں میں تو اس کی جان تھی۔ لیکن یہ جان طاہر کے ساتھ بھی اسی مضبوطی سے وابستہ تھی۔

وہ ——

طاہر کو چھوڑ بھی نہیں سکتی تھی۔

ایسا کر سکتی

تو —— !

اس کے ذہن میں مراد کی شبیہہ لہرا گئی۔

اندر ہی اندر افسوس کی غیر محسوس سی لہر بھی اٹھی۔

اتنا ہینڈسم اتنا امیر کبیر آدمی اس کی زندگی میں آیا تھا۔ اگر وہ چاہتی تو شاید وہ بھی سنجیدہ ہو جاتا۔ سارے خواب تعبیر پا لیتے سپنے پورے ہو جاتے زندگی کتنی حسین ہو جاتی۔

گھبرا کر وہ پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سوچوں کی لہر میں اسے کہاں بہا لے گئی تھیں۔ اس نے ادھر ادھر سر کو جھٹکا۔ آنکھیں بھینچ لیں۔ دونوں ہاتھوں سے الجھا لیے۔

وہ جھنجھلا گئی۔

ایسی سوچ بھی اس کے ذہن میں کیوں آئی۔

طاہر کی جگہ پر اس نے کسی دوسرے آدمی کو سوچوں میں بھی کیوں لا بٹھایا تھا —— ؟

کیا طاہر سے محبت نہیں۔ ؟

اس نے سر کو پھر زور زور سے ادھر ادھر جھٹکے دیئے۔

طاہر اس کی زندگی تھا۔ پیار تھا۔

وہ اس کے سوا کسی کو اپنا نہیں کہہ سکتی تھی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اس کا وہ اس کے وجود کے ساتھ ساتھ پلا بڑھا تھا۔ وہ اس سے الگ نہیں وہ اس کے اندر خوش رنگ موسموں کی طرح پھیلا تھا۔ بھرپور طاقتوں ساتھ جی رہا تھا۔

لیکن ——

لیکن ——

ان ساری زندہ حقیقتوں کے باوجود —— وہ ابھی سے شادی نہیں تی تھی۔

شادی

شادی کا تو اس کا اپنا ہی اک تصور تھا۔ اک معیار تھا اک حد تھی۔

——

——

طاہر سے بھی چھپی نہ تھی۔ بلکہ وہ تو خود بھی اس کا حامی تھا۔ اس کا ساتھ تیار تھا۔ انتظار کر سکتا تھا۔

مہینوں برسوں ــــ صدیوں پر بھی انتظار پھیل جائے تو بھی کرنے کو تیار تھا۔

پھر ــــ؟؟

پھر ــــ

گھریلو حالات کو کیونکر سنبھالا دیا جائے۔ پھپھو اور چھوٹے بھائیوں کی ذمہ داریوں سے اسے کیسے سبکدوش کیا جائے کہ وہ اک سنہرے روپہلے مستقبل کی تلاش کے لئے بیرون ملک جا سکے۔

کہ ــــ

طاہر آ گیا ــــ!

"بھئی کہاں ہو ــــ" اس نے صحن سے آواز دی۔ "مامی ــــ کدھر ہیں آپ ــــ"

وہ اندر چلا آیا ــــ

شگو اسے دیکھ کر سمٹ گئی۔ تکئے کے سہارے بیٹھ گئی۔

"ہو ــــ" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے شگو سے کہا۔

شگو نے جواب نہیں دیا۔ صرف اس پر اک بھرپور نگاہ ڈالی،

طاہر نے اشارے سے پوچھا۔ "کیا بات ہے ــــ؟"

وہ اسے تکتی رہی۔

طاہر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "مامی کہاں ہے مس صاحبہ ــــ"

شگو نے اک گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ "شائستہ آپا کو گھر چھوڑنے گئی ہیں۔"

"شائستہ آپا آئی تھیں ــــ"

"ہاں ــــ انہیں چیک اپ کے لئے لے گئی تھی ہیں۔"

"ٹھیک تو ہیں ــــ"

"ہاں ــــ ٹھیک ہی نہیں کمزوری بہت ہے۔"

"کمزوری تو ہوگی بیچاری آپا پر بار بھی تو بہت ہے۔"

شگو نے پھر بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ اب پلنگ کی پائنتی والے چوبی تکئے پر جھکا کھڑا تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو ــــ" وہ ہولے سے مسکرایا۔

"کچھ نہیں ــــ"

"یار کیا بات ہے۔ کچھ پریشان ہو۔ آپا کی وجہ سے؟"

"نہیں ــــ"

"تو پھر ــــ"

"پریشان ہوں ــــ"

طاہر نے گھبرا کر اسے دیکھا اور کچھ ادر جھجکتے ہوئے بولا۔ "کس بات کی پریشانی ہے۔ کلینک میں کچھ"

"نہیں ــــ" شگو نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تو پھر ــــ"

"طاہر ——"

"ہوں ——"

وہ چند لمحے چپ رہی۔

پھر ہمت کر کے بولی۔ "صبیحہ آپا چلی گئیں ؟"

"ہاں ابھی انہیں ہی چھوڑ کر آ رہا ہوں ——"

"انہوں نے تم سے کوئی بات کی —— ؟"

طاہر نے اب گہری نگاہ ڈالی۔

کچھ سوچا اور پھر ہنس کر بولا۔ "ہاں ——"

شگو نے اسے دیکھا۔ اس کی ہنسی پر اس کو تاؤ آ گیا۔ لیکن خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"شادی کی بات ——"

"ہاں ——"

"تو ——"

"تو کیا —— تجویز بری نہیں۔ اس سے بڑھ کر میرے لئے تو خوشی کی کوئی بات ہے ہی نہیں ؟"

"طاہر ——"

"کیوں تمہیں خوشی نہیں ہوئی اس بات سے ؟"

"تم —— تم بھی یہی چاہتے ہو ——"

"برسوں سے یہی چاہتا آیا ہوں" وہ ہنس کر بولا۔

"طاہر میں سنجیدہ ہوں ——"

"میں تم سے بھی زیادہ سنجیدہ ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم بھی انکار نہیں کرد
ا، ہمارے گھر کے جو حالات ہیں۔ ان سے سمجھوتہ کرو گی ؟"

"یعنی شادی کے لئے تیار ہو جاؤں گی" وہ چمک کر بولی۔

"ہونا چاہیئے ——"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ؟"

وہ چند لمحے چپ رہا۔

پھر اسے دیکھتے ہوئے بالکل سنجیدہ ہو کر بولا۔

"شاید ہو ہی گیا ہے ——"

اس کے انداز سے شگو نے اپنا دل سینے میں بیٹھتا محسوس کیا۔

"طاہر ——" اس نے تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد ہولے سے کہا

"نہیں ان حالات میں شادی کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہیئے ؟"

"بالکل ——"

شگو پلنگ سے اتر کر اس کے قریب آ کھڑی ہوئی غور سے اسے دیکھا اور بولی۔ "طاہر —— مانا کہ اس وقت تمہارے گھر میں ایک عورت کی ضرورت ہے جو تم سب کو سنبھال سکے۔ گھر کی دیکھ بھال کرے۔ پھپھو کی خدمت کرے ؟"

"تو پھر ——"

"پھر ——"

"ہاں کہو ——"

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا —— لیکن شادی ——"

"نہیں ہوسکتی ——"

"ہاں ——"

"تو میں کب چاہتا ہوں کہ ہو ——"

"ابھی ابھی تم ——"

"مذاق کر رہا تھا ——"

طاہر بڑے دلدوز لہجے میں بول رہا تھا۔ شگو نادم نادم سی سر جھکائے کھڑی تھی۔

دل کٹا جا رہا تھا۔

لیکن ——

وہ ——

شائستہ آپا بننے کو قطعاً تیار نہ تھی۔

"شگو ——"

شگو نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ آنکھیں دھواں دھواں

نہیں ——

"شگو —— تم پریشان کیوں ہو رہی ہو —— پگلی —— میں تو اب ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے حالات اتنے برے ہو چکے ہیں کہ میری آنکھوں کے خواب بھی انہوں نے چھین لئے ہیں۔"

"طاہر ——" وہ بیقرار ہوگئی۔

"ہاں شگو ——" طاہر نے اس کی طرف کمر موڑتے ہوئے کہا "میں جانتا ہوں تمہارے خیالات کیا ہیں۔ تم کیا چاہتی ہو۔ لیکن اب تو میری رسائی اور پہنچ سے بھی دور ہوگئی ہیں یہ سب باتیں۔ بہنوں کی شادی اور ابا کے مرنے سے پہلے بات اور تھی —— مجھے اپنا چمکتا دمکتا مستقبل نظر آ رہا تھا۔ لیکن اب ——"

وہ چپ ہوگیا۔

پھر ——

ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔

"اب تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں کہ چکاچوند روشنیوں کی دلدادہ لڑکی کو اپنے مفاد اور غرض کی خاطر اندھیروں میں گھسیٹ لاؤں ——"

اس نے جلدی سے جانے کو قدم اٹھایا۔

شگو نے لپک کر اس کے کندھے سے پکڑ لیا۔ اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے روہانسی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"طاہر —— طاہر ہم اندھیرے چھٹنے کا انتظار کر سکتے ہیں، ان سے نکلنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔"

طاہر دل گرفتہ آواز میں بولا۔ "میں اپنی بلائیں تمہارے سر نہیں ڈالوں گا شگو ——"

"مجھے ––– مجھے اپنے سے الگ سمجھتے ہو –––" وہ پھٹ پڑی۔

"نہیں شگو ––– ایسا سمجھنا میرے بس سے باہر ہے –––" طاہر نے کہا۔

"تو وعدہ کرو طاہر ––– انتظار کا ––– ہم اس وقت تک انتظار کریں گے جب وقت ہمارے لئے سہل ہو جائے گا۔"

"ہاں شگو ہاں –––" بے آنسو روتے ہوئے طاہر نے شگو کو بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لیا۔

شگو کے ذہن سے جیسے بوجھ اتر گیا وہ اس کے سینے سے لگ کر پُرسکون ہو گئی۔

لیکن –––

طاہر کے دل و دماغ پر بوجھ کچھ اور بڑھ گیا۔

صبیحہ آج پھر آئی تھی۔ حسب سابق سارا گھر چوپٹ پڑا تھا۔ باورچی خانے میں تو کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ میلے برتن ڈھیروں پڑے تھے برتنوں کی ڈولی سے ہر برتن باہر نکالا ہوا تھا۔ جھوٹے اور صاف سارے برتن گڈمڈ پڑے تھے۔ چولہے کے اردگرد ان دھلی دیگچیاں منہ کھولے پڑی تھیں کسی میں جلا سالن تھا کسی میں اُبلے چاول۔ کسی کے کنارے دودھ جلنے سے سیاہ ہو رہے تھے۔

کچی پکی گلی سڑی سبزیاں بھی پڑی تھیں۔ گھی کا ڈبہ کھلا پڑا تھا چائے کا ڈبہ چینی گڈمڈ تھے۔ یہی حال دوسرے کمروں کا بھی تھا۔ میلے چکٹ بستر جا بجا گندے کپڑے بکھری کتابیں۔ چارپائیوں کے نیچے جھوٹے گلاس اور پلیٹیں۔ دو صافیاں۔ تو لئے کوئی چیز بھی تو اپنی جگہ پہ نہیں تھی۔ ہر چیز پر دھول اٹی پڑی تھی۔ چھت کے ساتھ کونوں میں جالے لٹک رہے تھے۔

"تین چار دن سے حمیداں بھی نہیں آرہی تھی۔ اس کے پاؤں میں موچ آگئی تھی۔ ورنہ تھوڑی بہت صفائی تو وہ کرہی جاتی تھی۔ برتن بھانڈے بھی دھو کر ٹھکانے پر رکھ جاتی تھی۔

صبیحہ کو رونا آگیا۔

آنسو آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے جا رہے تھے اور کام کرتی جارہی تھی۔ آتے ہی کام میں جت گئی تھی۔ امی کے پاس بھی زیادہ دیر نہیں بیٹھی تھی۔ امی نے ربیعہ کا خط دیا تھا وہ بھی پڑھے بغیر ہی رکھ دیا تھا صبیحہ نے۔

" دکھ جھیلنے کے لئے میں ہی رہ گئی تھی " اس نے آنسو پونچھتے ہوئے ربیعہ کے متعلق سوچا۔ " وہ تو چلی گئی۔ یہ حال تو نہ دیکھا بابل کے گھر کا۔ جو گھر ہر وقت نگینے کی طرح چمکتا رہتا تھا۔ وہ اس حال کو پہنچ گیا ہے "۔

آنسو تھمے تو اسے غصہ آنے لگا۔ امی پر غصہ آرہا تھا ٹھیک ہے بہت صدمہ سہنا پڑا انہیں۔

لیکن

جیتے جی بھی کوئی مرجاتا ہے۔ انہیں کوئی بیماری نہیں۔ بس ہمت ہار بیٹھی ہیں۔ ایسا نہیں کرنا چاہیئے انہیں۔ اپنا گھر یوں اجڑتے دیکھ رہی ہیں اور کچھ نہیں کرتیں۔ کہتے ہیں جواں بیٹوں کی ماں سہاگن ہی رہتی ہے امی نے تواں بیٹوں کو بھی بھلا دیا ہے۔ جن کو بھلانا چاہیئے انہیں یاد کرکے کم گھلی

ہوئی جارہی ہیں۔

وہ انہیں سوچوں میں غلطاں سر منہ دوپٹے سے لپیٹے لمبے بانس پر کپڑا باندھے سارے کمروں کی دیواریں جھاڑ رہی تھی۔ جالے اتار رہی تھی پائنچے اڑسے ہوئے تھے۔ قمیض کے بازو الٹائے ہوئے تھے۔

"صبیحہ ــــ بیٹی ــــ" امی کی کمزور سی آواز نے اسے سوچوں سے نکالا۔

"جی امی ــــ"

"ادھر تو آؤ ــــ"

"کیا بات ہے ــــ"

"میرے پاس بیٹھو۔ ربیعہ نے تمہیں کیا لکھا ہے۔ مجھے بھی سناؤ"۔

"میں نے ابھی اس کا خط نہیں پڑھا"۔

وہ بانس ہاتھ میں پکڑے امی کے پلنگ کے قریب آگئی۔

"خط تو پڑھ لے ــــ"

"پڑھ لیتی ہوں پہلے یہ سب کام تو کرلوں"۔

"حمیداں نہیں آرہی۔ گند زیادہ ہی پڑا ہے"۔

"امی ــــ"

"ہاں ــــ"

"آپ نے سارا گھر حمیداں پر ہی چھوڑ رکھا ہے"۔

"تو کیا کروں بیٹی۔ مجھ سے تو کچھ ہوتا ہی نہیں"۔

"کیوں نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ہمت ہار بیٹھی ہیں۔ گھر گھر رہا ہی نہیں جانوروں کا ڈبہ بن گیا ہے۔ کیا یہ سب اسی طرح چلے گا۔ میں کب تک اکر صفائی ستھرائی کروں گی —— اگلے ماہ چلے جانا ہے مجھے۔ میرے جانے کے بعد کیا ہوگا؟"

رشیدہ چپکے چپکے رونے لگی۔

"امی رونا دھونا چھوڑ دیں۔ صدمے جھیلنے ہی کے لئے ہوتے ہیں۔ ٹھیک ہے ابو کی کمی ہمیشہ محسوس ہوگی۔ لیکن آپ ان بیچارے بچوں پر رحم کریں۔ انہوں نے کبھی گھر کا کام کیا تھا —— گلاس پانی کا بھی خود نہیں لیتے تھے —— اب ——"

وہ خود بھی رو دی۔

پھر ——

آنسو پونچھ کر بالس پرے رکھ کر امی کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ سر منہ سے دوپٹہ کھولا۔ اور اسے دوپٹے سے منہ پونچھتے ہوئے بولی۔

"امی خدا کے واسطے ہمت نہ ہاریں۔ گھر بار کا خیال کریں۔ بچوں کی دیکھ بھال کریں۔"

"مجھ میں طاقت ہے یہ سب کچھ کرنے کی؟"

"تو پھر میری تجویز پر عمل کرلیں۔"

"یعنی ——"

"یعنی ہو لے آئیں گھر میں۔"

"طاہر نہیں مانتا —— نہ ہی بھابی نے کوئی جواب دیا ہے۔"

"شگو کہاں مان سکتی ہے۔"

"ٹھیک بھی ہے۔ خود تو جنجال میں پڑے ہیں۔ اسے خواہ مخواہ پھنسا لیں۔" امی نے کہا۔

"وہ کبھی پھنسے گی بھی نہیں۔"

"کوئی اور بات کر صبیحہ ——"

"آپ اپنا بھلا نہیں سوچتیں تو نہ سہی۔ ہمارا کیا ہے ربیعہ کی طرح میں بھی دور بیٹھ کر کڑھ لیا کروں گی —— اچھا ہی ہوگا چلی جاؤں گی یہ سب کچھ دیکھوں گی تو نہیں۔"

"حمیداں آجائے گی تو ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ۔ تو فکر نہ کر۔ اپنی باتیں کر۔ سنا ہے اشرف کا خط آیا ہے۔"

"ہاں آتا رہتا ہے ——"

"شکر ہے میرا کلیجہ تم دونوں بہنوں کی طرف سے تو ٹھنڈا ہے۔"

"آپ کا ٹھنڈا ہے۔ ہمارا جو جلتا رہتا ہے آپ لوگوں کی وجہ سے۔"

"کیا جلتا رہتا ہے ——" طاہر اندر آتے ہوئے بولا۔ صبیحہ نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

"اوہ آپا ——" اس نے آگے بڑھ کر تپاک سے کہا۔

اور پھر سلام کرتے ہوئے بولا۔

"کب آئیں ——"

"صبح آئی تھی ——" امی بولی۔ "تمہارے جانے کے بعد۔"

"سب ٹھیک ٹھاک ہیں ناں ——" طاہر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ہم تو ٹھیک ٹھاک ہیں —— تم ٹھیک ٹھاک ہو تو تسلی ہونا۔"

"کیوں ہمیں کیا ہے۔ ٹھیک ہی تو ہیں۔" وہ ماں کے قریب صبیحہ کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"طاہر ——" صبیحہ بولی۔

"کیوں آپا کیا ہوا —— اور یہ آپ نے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے۔"

"تمہارے دلدر دور کر رہی تھی۔"

وہ پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

"وہ حمیداں نہیں آ رہی نا —— اس لئے گھر کچھ زیادہ ہی الٹ پلٹ ہے۔"

"کب تک چلے گا ——"

"جب تک حمیداں نہیں آجاتی۔"

صبیحہ چند لمحے چپ رہی۔

پھر ——

ایکدم سے بولی۔

"شگو نے جواب دے دیا۔"

"کس بات کا ——"

"اس گھر میں آنے کا ——"

وہ بے جان سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ "کیوں۔ ہر روز ہی آتی ہے —— کیوں امی ——"

"ہاں بیٹے روز ہی آتی ہے۔"

"امی کی دیکھ بھال کرتی ہے قصے کہانیاں سنا سنا کر انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ دوائی کھلاتی ہے اور ....."

"اور تیرا دل بہلاتی ہے ——" صبیحہ نے خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھا وہ بڑبڑا سا گیا۔

"آپا ——"

"اس نے شادی سے انکار کر دیا نا ——"

"انکار کرنا بھی نہیں چاہیئے تھا۔"

"کیوں؟ اس لئے کہ ان حالات میں وہ تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی —— اسے دولت چاہیئے صرف دولت۔"

"آپا ——"

"ہوں ——"

"آپا آپ اسے جانتی تو ہیں۔"

"طاہر —— وہ کب تمہیں اپنائے گی۔"

"جب میں کسی قابل ہو جاؤں گا۔ آپا یہ کوئی عقلمندی ہے کہ ان حالات میں جبکہ ہم لوگ اپنا بار بھی نہیں گھسیٹ پا رہے اسنے۔"

"مجبوری بھی کسی شے کا نام ہے۔ ان حالات میں تو اسے تمہارا ساتھ دینا چاہیئے تھا۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ اسے اپنا سکو۔ تو پھر اس قابل کب ہو گے۔ امکان نظر آتا ہے کوئی چھپا خزانہ ہاتھ لگنے کی اُمید ہے؟ کیا کر رہے ہو مالی حالات کی بہتری کے لئے"

"آپا ——"

"طاہر —— شگو کی اڑانیں دن بدن اونچی ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کی خواہش اب لالچ کا روپ دھار رہی ہیں۔ پیسے کی لگن ہوس بن رہی ہے"

"آپا ——"

"میرا تجزیہ غلط نہیں ہے طاہر ——"

"صبیحہ بیٹی ——" امی نے اسے ٹوکا۔

"آپ لوگ جو من چاہے کہیں۔ جو جی چاہے سمجھیں، لیکن میں آپ کو بتا دوں۔ شگو اس گھر سے ناطہ نہیں جوڑے گی۔ کہاں سے بے تحاشہ روپیہ۔ کوٹھی کار بنک بیلنس۔ کہاں سے اکٹھا کر دگے اس کے لئے اور میرے بھائی ان چیزوں کے بنا وہ کبھی تمہیں اپنائے گی نہیں، رکھ لو میری بات ——" صبیحہ بولی۔

طاہر سر جھکائے آپا کی یہی تلخ لیکن حقیقت سے بھرپور باتیں سن رہا تھا۔ یہ باتیں وہ سن ضرور رہا تھا لیکن ان پر یقین نہیں کر رہا تھا ——

شگو اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی، حواس پر قابض تھی وہ ... جانتا تھا پہچانتا تھا۔ یہ ساری باتیں اسے معلوم تھیں۔ آپا کوئی نئی ... بات تو نہیں اس کے بارے میں کہہ رہی تھی۔ ان ساری باتوں کے ساتھ ... تو اس نے اسے اپنے دل میں بٹھایا تھا۔

... آپا کہہ رہی تھی۔

... یہ سب کچھ کہاں سے آئے گا۔ کب آئے گا"

... اور ——

... وہ ——

... شگو ہی کی زبان بول رہا تھا۔

... انتظار —— انتظار کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت تک کہ وقت ... ہمارے لئے سہل ہو جائے"

... صبیحہ الجھ الجھ کر تھک ہار گئی۔

... لیکن ——

... طاہر کو شگو سے بے یقینی نہ کر سکی۔ جھنجھلا کر اس نے ذہن سے ... اس گھر کے سارے بار جھٹک ڈالے۔

"... جو جی میں آئے کریں۔ مجھے کیا ——"

... اس کا اپنا گھر تھا اب ——

... اپنی خوشیاں تھیں ——

... میکے کے بار اٹھا اٹھا کر اس نے اپنی ان خوشیوں کو مرجھا ڈالا تھا۔

کچھ زیادہ ہی حساس تھی نا۔

لیکن ——

اب ——

اسے باہر جانا تھا۔

تیاری کرنا تھی۔

اپنی نئی دنیا آباد کرنا تھی۔

صبیحہ نے واقعی ذہن سے بہت سے بار جھٹک ڈالے، خواہ مخواہ کے بار بھی تو دماغ پر لادے پھر رہی تھی۔

مہینے بعد صبیحہ چلی گئی۔

ماں سے مل کر خوب روئی دھوئی۔

مامی اور شگو سے امی کا خیال رکھنے کی روتے ہوئے منت کی دونوں نے یقین دلایا کہ ہر طرح سے ان کا خیال رکھیں گے۔

وہ چلی گئی۔

شگو کو اس کے جانے کے بعد اس گھر کی ابتری کا واقعی خیال آیا۔ لیکن وہ زیادہ وقت بھی تو نہ دے سکتی تھی۔ کلینک ہی کی معروفیت سے نکل نہ پاتی تھی۔

ہاں اس نے حمیداں سے گھر کا بار سنبھالنے کی پکی بات کی۔ اسے کبھی پانچ دس روپے تھما دیتی۔ کبھی اترے کپڑے دے دیتی۔ اس کی بیمار بچی کو کلینک کے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی اور مفت دوائیاں لا دیتی۔

یوں

پھپھو کے گھر کا نظام کچھ کچھ ٹھیک ہونے لگا۔ رشیدہ خود بھی اب ہمت دلاسے سے کام لینے لگی تھی۔ صبیحہ کا سہارا بھی ختم ہو گیا تھا خود سہارا لینا ہی تھا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔

ماہ و سال بیت گئے۔

شگو اور طاہر کی چاہتوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور شادی بیاہ اور ازدواجی زندگی کے متعلق ان کے خیالات بھی نہیں بدلے۔ بلکہ حالات کی ابتری نے پیسے کی تمنا کو واقعی لالچ اور ہوس بنا دیا۔

یوں انتظار مہینوں اور برسوں پر پھیلتا ہی چلا گیا۔

۱

لگتا تھا پورے کلینک میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر تیز تیز قدموں سے
اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ سسٹرز کو بھی دوڑ لگی تھی۔

"کیا بات ہے سسٹرز ـــــ" شگو نے سٹاف نرس نجمہ سے پوچھا
"کیوں ـــــ" وہ ایک لمحہ کو برآمدے میں رکی۔

"یہ بڑی دوڑ دھوپ ـــــ"

"نیا پشینٹ آیا ہے ـــــ"

"ایمرجنسی میں ـــــ"

"نہیں ـــــ"

"کوئی سیریس کیس ہے ـــــ"

"ایسا سیریس بھی نہیں ـــــ"

"تو پھر ـــــ"

سسٹر نجمہ مسکرائی اور شگو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"ایک بہت بڑی شخصیت کے والد محترم ایڈمٹ ہوئے ہیں۔"

"بہت بڑی شخصیت ـــــ؟"

"ہاں ہوم سیکرٹری خان محمد خان کے والد ـــــ ہائی آفیشلز کی خاطر دیکھ بھال ـــــ"

"ہوں تو یہ بات ہے۔ میں بھی حیران ہو رہی ہوں۔ کہ زلزلہ سا کیوں آیا ہوا ہے۔ ویسے سسٹر۔ اس کلینک میں تو ہر مریض کی دیکھ بھال بہت اچھی کی جاتی ہے۔"

"یہ خاص پشینٹ ہیں مس شگی ـــــ" وہ اس کا کندھا ہلاتے ہوئے پھر مسکرائی۔ "ادھر ڈیوٹی دو گی تو پتہ چل جائے گا۔"

"کس کمرے میں ہیں ـــــ"

"اس میں ـــــ"

"پانچ میں ـــــ"

"ہاں فائیو ڈیلکس میں ـــــ"

"ہوں ـــــ"

"میں جا رہی ہوں۔ بہت کام ہے۔"

"جایئے ـــــ" شگو نے مسکرا کر کہا۔ "یہ کام ہی کا تو وقت ہے۔"

سسٹر نجمہ چکنے فرش پر ٹک ٹک کرتی چلی گئی۔ شگو اپنے وارڈ کی طرف گھوم گئی۔ جہاں اس نے تین مریضوں کو دوائی دینا تھی ایک کے ڈرپ کی تبدیلی کرنا تھا۔ دو کو بیڈ بدلنا تھے۔ اس وقت خاصی مصروفیت کا

وقت تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد شگو سارے مریضوں سے نپٹ کر واپس ڈیوٹی روم میں آئی۔ تو حسب عادت سیدھی باتھ روم کی طرف بڑھی۔

کمرے میں بیلا آصفہ، نصرت اور مس ڈوروتھی، باتوں میں لگی تھیں۔ وہ ایڈمٹ ہونے والے نئے پشینٹ آغا جان ہی کی باتیں کر رہی تھیں جن کے لیے ڈاکٹر سیمع نے خاص ہدایات جاری کی تھیں۔ نرسوں کی ڈیوٹیاں بدلی تھیں۔

صفائی ستھرائی کے لیے سپیشل آدمی مقرر کئے تھے وہ سب یہی باتیں کر رہی تھیں۔

شگو ہاتھ دھو کر واپس آئی۔ ڈوروتھی سے ہاتھ ملایا۔ نصرت کی خیر و عافیت پوچھی۔

بیلا اور آصفہ سے وہ صبح ہی صبح مل چکی تھی۔

"کس کی باتیں ہو رہی ہیں ——" شگو نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا ——

"کمرہ نمبر پانچ کے پشینٹ کی" کرسی کی پشت پر کھڑی آصفہ بولی ——

"کوئی خاص اور اہم شخصیت ہے۔ ہوم سیکرٹری کے والد ——" شگو نے پوچھا۔

"وہ خود بھی ریٹائرڈ جنرل ہے ——" بیلا بولی۔

"ہماری کیا ہے ——"

"اگر امن ہوں گے تو پتہ چلے گا ——" ڈوروتھی بولی۔

شگو نے کندھے اچکائے۔ ہونٹوں کو جنبش دی اور میز پر پڑا فلمی رسالہ اٹھایا۔ آصفہ اور ڈوروتھی باہر چلی گئی۔

بیلا اس وقت فری تھی۔ شگو سے گپ شپ لڑانے کا موڈ تھا ے رسالہ میں نہمک دیکھا تو رسالہ جھپٹ کر بولی۔

"یہ کیا بیہودگی ہے ——"

"کیوں ——"

"کچھ بات کرو ——"

"ذرا تصویریں ہی دیکھ لینے دو"

"کوئی خاص نہیں ہیں ——"

"دیکھوں تو ——"

بیلا رسالہ اسے دینے کی بجائے خود تصویریں دیکھنے لگی۔ شگو کھسک کر اس کے قریب آ گئی۔ دونوں ایکٹریسوں کی تصویریں دیکھتے ہوئے ساتھ ساتھ بے لاگ تبصرے بھی کرنے لگیں۔

تصویر دیکھ چکنے کے بعد بیلا بولی۔ "آج تو میرا پکچر دیکھنے کا موڈ بن رہا ہے۔ چلے گی تو"

"اوں ہوں ——" شگو نے نفی میں سر ہلایا۔

"بڑی اچھی پکچر ہے"

"ہوگی ۔۔۔"

"کبھی کبھی تو بہت بور ہو جاتی ہے یار ۔۔۔"

شگو ہنس کر بولی ۔ "شاید ۔۔۔ لیکن پکچر کا موڈ نہیں ہے میرا ۔

مزہ آئے گا ۔ ڈورتھی اور نجمہ بھی جانے کا کہہ رہی تھیں ۔"

"تو ٹھیک ہے ۔ تمہیں کمپنی مل گئی ۔"

"ہاں جی ۔۔۔ ہماری کمپنی کے لئے تو یہی رہ گئیں ۔ تیری کمپنی تو اپنے اس مجنوں سے ہوتی ہے نا ۔"

شگو کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔

"بڑا صابر شاکر آدمی ہے ۔" بیلا بولی ۔ "حکم کا بندہ بھی ۔"

"یہ تو ہے ۔۔۔"

"جیسے تو چاہتی ہے ویسے کئے جاتا ہے ۔ ہاں ۔"

"بالکل ۔۔۔"

"شادی کے بعد کہیں پر پرزے نکال لئے تو کیا کرے گی ۔"

"ایسا نہیں ہوگا ۔ طاہر میرے سامنے کبھی دم مارنے کی جرأت کی ہے نا کرے گا ۔"

"اتنا زعم ۔۔۔"

"بالکل ۔۔۔"

"آج کل کے دور میں ایسے لڑکے ۔۔۔"

"قسمت والوں کو ملتے ہیں ۔"

بیلا نے گردن ہلائی ۔ اسے شگو پر رشک آیا ۔ "بڑی بھاگوان ہے تو ۔۔۔"

"واقعی ۔۔۔"

"شادی کب کر رہی ہو ۔۔۔"

"ابھی کوئی پروگرام نہیں ۔"

"اور وہ بیچارہ ۔"

"انتظار کرے گا ۔"

"کب تک ۔۔۔"

"جب تک حالات ٹھیک نہ ہو جائیں ۔"

"شگی تیرے حالات یا اس کے ۔"

"ہم دونوں کے ۔ نہ وہ چاہتا ہے کہ شادی کے بعد زندگی کو گھسیٹے چلے جائیں نہ میں ۔"

"یہ تو میں جانتی ہوں ۔ لیکن وہ بھی اس بات پر اسی سختی سے قائم ہے ۔۔۔"

"قائم نہ ہوتا تو سال سوا سال پہلے اس کی آپا ہمیں ۔۔۔"

"ہاں تم نے بتایا تھا ۔ بھئی بڑا ثابت قدم ہے وہ ۔۔۔"

شگو مسکرا دی ۔

"شگی ۔۔۔" بیلا بولی ۔

"ہوں ۔۔۔"

"تم لوگوں نے جو شادی کو التوا میں ڈالا ہے ___ تو ___"

"تو کیا ___"

"تو حالات کو بہتر بنانے کے لئے کیا صورت نکالی ہے۔ طاہر تو ابھی اسی جگہ نوکری کر رہا ہے نا۔ اس سے تو گھر کے اخراجات بھی بمشکل چل پاتے ہوں گے۔"

شگو نے اک گہری سانس لے کر کہا۔ "یہی تو مسئلہ ہے۔ طاہر کو ابھی کوئی ایسی جاب مل ہی نہیں رہی۔ جہاں تنخواہ زیادہ ہو۔ یا ___"

"یا اوپر سے روپیہ بنانے کے امکان ہوں۔"

"ہاں ___ پیسہ ہونا چاہیئے بیلا۔ چاہے جیسے بھی ملے۔"

"شگی ___"

"ہوں ___"

"بھئی تم تو حد سے گزر رہی ہو۔ رشوت کا پیسہ۔"

"رشوت کا ہو یا کالے دھندے کا۔ بس پیسہ ہونا چاہیئے۔"

بیلا نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

شگو ہنس پڑی۔

"مذاق کر رہی تھیں ___" بیلا بولی۔

"نہیں بالکل نہیں ___ مجھے پیسہ چاہیے بیلا ___ بہت سا ___ ڈھیروں۔" وہ بیحد سنجیدہ تھی۔

"لیکن نوکریوں میں اتنے پیسے کی توقع۔"

"میں سوچتی رہتی ہوں ___"

"کیا ___؟"

"پیسہ حاصل کرنے کی ترکیبیں ___"

"اوہ خدایا ___" بیلا نے کانوں کی لووں کو چھوا۔ "تم تو واقعی جنونی ہوتی جا رہی ہو ___ میرا تمہارا تقریباً سوا دو سال کا ساتھ ہے۔ سچی پہلے تم اتنی گریڈی نہیں تھیں۔"

"ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے خیالات ایسے ہی تھے۔"

"حالات ہی تھے نا۔ اب تو لگتا ہے۔ تم انہیں عملی جامہ پہنانے کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہو۔"

شگو ہنس پڑی۔

پھر ہنستے ہوئے بولی۔

"سچ کہتی ہو بیلا۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے۔ ڈاکو بن جاؤں۔"

"اوئی ___ کتنے خطرناک خیالات ہیں تمہارے ___" بیلا حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"اور کبھی جی چاہتا ہے۔" شگو اپنی رو میں کہے گی۔

"کیا ___"

"کہ مہذب ڈاکو بنوں ___"

"مہذب ڈاکو ___"

"وہ کیسے ___؟ ڈاکو بھی اور مہذب بھی۔"

"وہ ایسے کہ سمگلروں کا گروہ جوائن کر لوں۔ یا دہشت پسندوں کے گینگ میں شامل ہو جاؤں۔ یوں بہت پیسہ مل سکتا ہے۔"

بیلا نے برا سا منہ بنایا۔ اس پر اک تلخ نگاہ ڈالی اور سرد مہری سے بولی۔ "پھر کرتی کیوں نہیں۔ کیوں اس مقدس پیشے کو اپنا رکھا ہے۔"

"بس یہی تو پرابلم ہے۔ چاہتی تو ہوں لیکن کرتی نہیں۔"

وہ جل کر بولی۔ "نہیں کرے گی تو تیرے اونچے اونچے خیالی محل کیسے بنیں گے۔ سنہری روپہلی سپنے حقیقت میں کیسے سامنے آئیں گے۔"

"یہی تو سوچتی رہتی ہوں۔ لیکن دیکھ لینا۔ ایک نہ ایک دن میں کچھ کر ہی گزروں گی۔"

"ڈاکو بن جائے گی۔ سمگلروں اور دہشت پسندوں کے گروہ میں شامل ہو جائے گی۔"

"یہ تو میں نہیں جانتی۔ لیکن میں پیسہ ضرور حاصل کروں گی۔"

"دماغ خراب ہے تیرا تو۔"

"یہ بھی شاید ٹھیک ہو ——" وہ ہنس پڑی۔

بیلا نے اسے پرے دھکیلا۔ یہ لڑکی اسے کبھی کبھی اپنی عجیب و غریب باتوں سے پریشان کر دیا کرتی تھی۔ حیرت کی بات بھی تھی کہ جب سے شگو کلینک میں آئی تھی، اس کی دوستی بھی اسی سے رہی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ دوستی بھی پختہ ہو گئی تھی۔ ایک دوسرے پر وہ روز روشن کی طرح عیاں تھیں۔ بیلا کی سادہ سی زندگی میں رنگین داستان تھی ہی نہیں۔

پھر بھی وہ اپنے ہر خیال اور ہر احساس سے شگو کو خبردار رکھتی تھی یہی حال شگو کا بھی تھا۔ اپنے دل کی ساری باتیں اپنے ذہن کی ساری خرافات اور دماغ کے سارے منصوبے اسے سنا دیا کرتی تھی۔ بیلا اس کی باتیں سن کر پریشان ہوتی اور ہر ممکن کوشش کرتی کہ شگو کو راستی کے راستے سے بھٹکنے نہ دے۔ اس کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتی رہتی طبقاتی فرق سے بھی آگاہ کرتی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شگو اور طاہر میں بہت محبت ہے۔ اس لئے وہ اسے اونچی کمندیں پھینکنے سے ہمیشہ باز رکھنے کی کوشش کرتی۔ کیونکہ وہ طاہر کے مالی حالات بھی جانتی تھی

وہ بڑی پرخلوص اور بے لوث جذبات رکھنے والی بے حد اچھی دوست تھی۔ بیلا شگو کی باتوں سے کچھ پریشان ہو گئی تھی۔ اسی لئے وہ اچھا خاصہ لیکچر اسے پلانے کا موڈ بنا رہی تھی۔

لیکن ——

پند و نصائح کا باب کھلنے سے پہلے ہی ڈور تھی اندر آ گئی۔

"شگی ——" وہ جلدی سے بولی۔

"کیا ہے ——"

"تو یہاں بیٹھی ہے ——"

"تو کہاں جاؤں ——"

"ڈیوٹی لسٹ نہیں دیکھی نوٹس بورڈ پر ——"

"نہیں ——"

"تیری ڈیوٹی تو روم نمبر فائیو ——"

"کیا ——"

"ہاں ان لوگوں نے ڈاکٹر سیمع سے ریکوسٹ کی تھی کہ ایک نرس اس کے کمرے میں مستقلاً ڈیوٹی پر رہے۔"

"ہائے ہائے ——" شگو نے برا سا منہ بنایا، "میری ہی ڈیوٹی لگانا تھی وہاں ——"

"اچھی بات ہے کوئی ایسا سیریس پیشنٹ بھی نہیں۔ ستر بہتر سال کا بوڑھا آدمی ہے، وہاں کام ہوگا نہ کاج۔ سارا دن بیٹھی فلمی رسالے پڑھتی رہنا۔"

"تو اس بوڑھے کھوسٹ کو مستقلاً نرس رکھنے کی ضرورت کیوں آن پڑی۔"

"بھئی امیر لوگ ہیں پیسے کے بل بوتے پر ایک کیا دس نرسوں کا بھی بندوبست کر سکتے ہیں۔"

"امیر لوگ تو بہت سے آتے ہیں یہاں۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا کیس ہے۔"

شگو اور ڈور تھی کی باتیں بیلا سن رہی تھی، شگو کی بات کا اسی نے جواب دیا۔ "تمہارے ہوتے پہلا کیس ہے شیگی۔"

"تو کیا پہلے بھی کسی مریض نے الگ سے نرس رکھی۔؟"

"ہاں کئی بار ایسا ہوا ہے۔ ویسے تیری عیش ہی ہوگی۔"

"کیسے ——؟"

"تیرا کھانا پینا ان کے ذمے ہوگا۔ ہر آنے جانے والا سو سو دو دو سو

ہی پکڑا جائے گا۔ مزے میں رہے گی۔"

"سچی ——"

"بالکل۔ اور یہ آغا جان تو سنا ہے کوئی رئیس ہیں سرحد کے۔"

"پٹھان ہیں ——"

"بالکل، کٹر پٹھان۔ ان کے بیٹے اور بہوئیں جو ساتھ آئی ہیں، ایڈمٹ کرانے سب اردو پٹھانی انداز میں بولتے ہیں۔" لڑکا کہتی ہے اور لڑکی کہتا ہے۔" بیلا نے ان کے لہجے میں نقل اتاری۔ تو شگو اور ڈور تھی بے اختیارانہ ہنس پڑیں۔

آغا جان کی عمر بہتر برس کے لگ بھگ تھی۔ جوانی میں بڑے وجیہ اور بڑے شکیل قسم کے آدمی ہوں گے۔ سرخ و سپید رنگت جواب قدرے پیلی پڑ رہی تھی۔ دراز قد چوڑا چکلا جسم خوبصورت نقش و نگار اور روئی کے گالے ایسے سفید بال جواب بھی ان کے چہرے کو دیدہ زیب اور پروقار بنائے ہوئے تھے۔ عمر کے لحاظ سے وہ کافی چاق و چوبند لگتے تھے۔ لیکن چھاتی میں تکلیف تھی۔ کسی وقت سانس لینے میں بھی دشواری ہوتی۔ کھانسی اٹھتی تو دم گھٹنے لگتا۔ اس بیماری نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ پھر بھی بڑے بلند حوصلہ آدمی تھے۔ باغ و بہار شخصیت کے مالک۔ تکلیف بھی مسکرا مسکرا کر جھیلنے کے عادی لگتے تھے۔ بیماری سے باقاعدہ لڑ رہے تھے۔ شکست کھانا ان کی سرشت میں شاید تھا ہی نہیں۔ بہت امیر کبیر آدمی تھے۔ زرعی اراضی باغات اور شہری جائیداد بے حد و حساب ہی تھی۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ تینوں بیٹے اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ بیٹی کے شوہر آرمی میں

بریگیڈیر تھے۔

پوتے پوتیاں جوان تھے۔ کوئی انجینیر بن چکا تھا۔ کوئی ڈاکٹری کے آخری سال میں تھا۔ کوئی ایم بی اے کر رہا تھا دو نواسیوں کی شادیاں بھی ہو چکی ہیں۔

بھرے پرے خاندان کی بزرگ ہستی تھے وہ۔ بڑا بیٹا راولپنڈی میں تھا امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ بیورو کا ڈائریکٹر تھا۔

دوسرا بیٹا انجنیر تھا ان دنوں یو کے میں تھا۔ تیسرا بیٹا ہوم سیکریٹری تھا۔

آغا جان لنڈی کوتل کے قریب اپنے آبائی گاؤں ہی میں رہتے تھے اونچی اونچی کچی دیواروں والی مورچہ بند حویلی ہر قسم کے جدید سامان سے آراستہ تھی۔ ان کی بیوی کو فوت ہوئے سولہ سال ہو چکے تھے۔ بیٹوں نے چاہا کہ آغا جان ان کے ساتھ رہیں۔ لیکن وہ نہیں مانے اپنے گھر میں ہی ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے چلے آ رہے تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنا مسکن نہیں چھوڑا تھا وہ وہاں اپنے نوکروں چاکروں کی فوج ظفر موج اور مزارعوں زمینداروں کی سنگت میں خوش تھے۔

دوست احباب رشتے دار بھی تھے۔ اس لیے تنہائی کا احساس نہ ہوا تھا۔ کبھی کبھی دو ایک دن کے لئے بیٹوں کے پاس بھی آ جاتے تھے لیکن مستقلاً قیام نہیں کرتے تھے۔

وہ سب سے خوش تھے۔ سب ان سے خوش تھے۔

کافی دیر سے انہیں پیٹ میں تکلیف تھی۔ کھانا ٹھیک سے ہضم نہیں ہوتا تھا۔

کبھی کبھی درد کی شکایت بھی ہو جاتی۔ پہلے تو گھریلو ٹوٹکے ہی کیے تھے پھر پشاور میں ڈاکٹر کو دکھایا۔ تکلیف رفع نہ ہوئی کمزوری محسوس ہونے لگی۔ رنگت پیلی پڑ گئی۔ اور اتنی عمر میں بھی چاک و چوبند رہنے والے آغا جان ست ست رہنے لگے۔

محمد خان پچھلے ہفتے گاؤں گئے تو آغا جان کی گرتی صحت سے متفکر ہو گئے۔ زبردستی انہیں ساتھ لاہور لے آئے۔ اور یہاں ایڈمٹ کروا کے باقاعدہ علاج شروع کیا۔ یہاں وہ بڑے سے بڑے اور ماہر ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کر سکتے تھے۔

آغا جان کے لیے ڈیلکس کمرہ بک ہوا تھا۔ اور دن اور رات کی ڈیوٹی پر دو نرسیں بطور خاص مقرر کی گئی تھیں۔

آغا جان کے ساتھ ان کے دو ذاتی ملازم بھی آئے ہوئے تھے جو دن رات انہیں کے پاس رہتے تھے۔ دلاور خان اور خوشدل خان ان کے وفادار اور جانثار قسم کے نوکر تھے۔

ان کے علاوہ سارا دن ان کے بہو بیٹے پوتے پوتیاں نواسے اور نواسیاں آتے جاتے رہتے۔ کوئی پشاور سے آ رہا تھا کوئی پنڈی سے تو کوئی کراچی سے۔ ایک فلائیٹ سے آتے اور انہیں دیکھ کر ان کے

ساتھ چند گھنٹے گزار کر دوسری فلائیٹ سے چلے جاتے۔ آغا جان کی اری کی ساری فیملی بے حد دولت مند ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت خوش خلق بھی تھی۔

شگو کی دن کی ڈیوٹی تھی۔ ان کے ذمہ ٹمپریچر لینا بی پی چیک کرنا وقت دوائی دینا اور کھانا چاہیے دینا تھا۔ یہ کام بھی ان کے لواحقین اور ذاتی ملازم رتے تھے۔

پہلے دو ایک دن تو وہ بور ہی ہوتی رہی۔ لیکن پھر وہ ان لوگوں سے انوس ہونے لگی۔ ایسے لوگوں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا س کو پہلا موقع ملا تھا۔

رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ تھے ان کے۔

آغا جان بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ اس عمر میں بھی ش ذوقی اور خوش مزاجی قائم تھی۔ بیمار ہونے کے باوجود ہنسی اق کا عنصر مزاج میں موجود تھا۔ بڑے رعب داب والے بھی تھے۔ ے اہل خانہ سے بے تکلف ہونے کے باوجود صاف محسوس ہوتا تھا کہ سب ان سے مرعوب ہیں۔ اور ان کے کسی حکم سے سرتابی کی کسی کی مجال نہیں۔

شگو کی دلچسپی اس خاندان میں بڑھتی جا رہی تھی۔ امیر کبیر لوگ اس گزاری تو سدا سے تھے ہی۔ اب تو اسے ان لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے موقع ملا تھا۔ قریب سے دیکھنے کی خواہش پوری ہو رہی تھی —

تو دو بیٹے تو وہ کافی دیکھ چکی تھی۔ یہ پشتینی امیر لوگ جن کا اپنا الگ اور منفرد مقام تھا۔ اپنے اصول اور ضوابط تھے۔ اس کی دلچسپی ان میں بہت بڑھ گئی تھی۔

کل کراچی سے ان کے دونوں پوتے انہیں دیکھنے آئے تھے۔ اتنے ہینڈسم اور اتنے اچھے اخلاق والے نوجوان اس نے پہلی بار دیکھے تھے۔ اپنے بوڑھے دادا کی بیماری سے بیحد پریشان نظر آ رہے تھے۔

آج پنڈی سے ان کے منجھلے بیٹے بہو اور پوتی آئے تھے۔ آغا جان کے لئے وہ بھی دوسرے لواحقین کی طرح پریشان نظر آ رہے تھے۔

ان کی جوان اور بیحد خوبصورت پوتی زرینہ تو جتنی دیر ٹھہری ان کے بیڈ کے سرہانے ہی بیٹھی رہی۔

"آغا جان آپ جلدی سے اچھے ہو جائیں نا ——" وہ معصوم بچوں کی طرح ان سے بار بار کہتی تھی۔

"بالکل اچھا ہوں زرینہ ——" آغا جان کہہ رہے تھے۔ "یہ تمہارے بابا اور تایا جو ہیں نا، بہت وہمی ہیں۔ خواہ مخواہ مجھے اپنے گھر سے اٹھا کر یہاں لا ڈالا۔"

"اچھا ہی کیا گل لالہ نے ——" اسد خان نے کہا تھا۔

اور ان کی بیوی شرمینہ نے بھی ان کی تائید کرتے ہوئے کہا تھا۔

"آغا جان —— اچھا ہی ہوا۔ آپ کو گل لالہ یہاں لے آئے باقاعدہ علاج تو ہو گا نا۔ گھر پہ تو آپ لاپرواہی کر رہے تھے۔"

"یہاں قید کر کے مجھے تم لوگوں نے واقعی بیمار بنا دیا ہے۔" آغا جان نے ہنس کر کہا تھا۔

"نہیں آغا جان ——" اسد بولے تھے۔ "گل لالہ نے ڈاکٹر سے بات کی ہے۔ آپ سیر کے لئے باہر جا سکتے ہیں۔ گاڑی چوبیس گھنٹے رہتی ہے۔ جب طبیعت گھبرائے دلاور خان سے کہیں آپ کو گھما پھرا لائے آپ پر یہاں ہی پڑے رہنے کی پابندی نہیں۔"

شام کو گل لالہ بھی آ گئے۔

وہ خود آغا جان کو ساتھ لے گئے، اور دو گھنٹے کی تفریح کے بعد واپس لے آئے۔

آغا جان کو ابھی ابتدائی طبی امداد مل رہی تھی۔ ڈاکٹر آصف کے ساتھ میو ہسپتال کے ڈاکٹر ابراہیم ہرل بھی انہیں دیکھ رہے تھے۔ دونوں ان کے مختلف ٹسٹ کروا رہے تھے۔ ان ٹسٹوں کی رپورٹوں پر ہی اصل علاج ہونا تھا۔

اور ——

جب تک بیماری کی صحیح اور پوری تشخیص نہ ہو پاتی۔ آغا جان کو چلنے پھرنے اور سیر و تفریح کی پوری آزادی تھی۔ کیونکہ بظاہر وہ ٹھیک ٹھاک تھے۔ کمزوری یا سستی بھی نہیں تھی اتنی۔ کہ بس بستر پر ہی پڑے رہتے۔

آغا جان شگو سے بھی بڑے شفقانہ انداز میں پیش آتے ——

کبھی کبھی مذاق بھی کرتے۔ رشتہ داروں عزیزوں میں سے جب کوئی بھی پاس نہ ہوتا تو شگو کو ان کے متعلق بھی بتاتے رہتے۔

اپنی بڑی بہو گل پری انکی سگی بھانجی تھی، وہ شگو کو اس کے متعلق بتلاتے۔

"بہت اچھی بڑی خدمت گزار ہے میری بہو ——"

شیریں ان کی دوسری بہو تھی۔ اس کے متعلق بھی شگو کو بتایا۔

"شیریں اور میری بیٹی ماہوش کا بدلے کا رشتہ ہے، میری یہ بہو تعلیمیافتہ ہے اس نے اپنے بچوں کو بہترین تربیت دی ہے۔"

تیسری بہو آج کل یوکے میں تھی، اس کے دو ذہین ہونہار دن آ چکے تھے آغا جان ان کی بھی بڑی تعریفیں کرتے تھے۔ بیٹے ہیں تو جیسے ان کی جان تھی پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں کے متعلق بھی انہوں نے شگو کو بہت کچھ بتایا تھا۔

انہوں کی باتیں کر کر کے وہ خوش ہوتے رہتے۔ ورنہ شگو کو ان سے متعارف کروانے کی کیا ضرورت تھی۔

یوں ——

شگو اس فیملی کے متعلق کافی کچھ جان گئی تھی۔ اسے خاندان کی روایتی دوستیاں اور دشمنیاں بھی اسے پتہ چل گئی تھیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ آغا جان کو سب بچوں میں سے اپنی بیٹی اور چھوٹے بیٹے سے بہت محبت ہے۔

اور نواسیوں میں مہرینہ اور پوتیوں میں زرینہ سب سے پیاری ہیں پوتوں میں کمال خان اور شمروز گل سے انہیں والہانہ پیار تھا۔ عزیز اور پیارے بھی تھے۔ لیکن ان چیدہ چیدہ لوگوں سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا۔

"آغا جان ——"

ایک دن شگو نے ان کا بی پی چیک کرنے کے بعد آپریٹس اٹھا کر ریک پر رکھتے ہوئے بولی۔

"یس سسٹر ——" وہ خوشگوار موڈ میں تھے۔

"آپ نے مجھے اپنی ساری فیملی کے متعلق بتایا۔"

"ہاں ——"

"لیکن آپ نے اپنی بیگم صاحبہ کے متعلق کبھی کچھ نہیں بتایا۔"

"جو گیا سو گیا ——" وہ مسکرا کر بولے۔

"وہ فوت ہو گئی ہیں نا ——"

"سولہ سال دو مہینے اور نو دن ہو گئے۔"

شگو نے حیرانگی سے انہیں دیکھا اور بولی۔ "کمال ہے آپ نے سالوں کے ساتھ مہینوں اور دنوں تک کا حساب رکھا ہے۔ اور ابھی کہہ رہے تھے جو گیا سو گیا۔ جیسے آپ کو ان کے چلے جانے کی پرواہ ہی نہیں ہے۔"

"ہاں سسٹر ——" وہ بولے۔ "آغا بی بی سے بچھڑنے کا ہمیں بہت دکھ ہے۔ لیکن کیا کریں جینا تو ہے۔ ہنس ہنس کر جئیں تو کیا بری بات ہے کیوں —— ؟ مس ——"

انہوں نے شگو کو دیکھا۔

اور ہنس کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

پھر ——

خود ہی بولے۔ "بھئی تمہیں سسٹر کہتے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ تم تو ہماری ہربیہ اور زرینہ جیسی ہو"

شگو خوشدلی سے مسکرائی پھر بولی۔

"آغا جان آپ ان کو ان کے ناموں سے پکارتے ہیں۔ میرا بھی نام پکار لیا کریں"

"ٹھیک —— آج سے ہم تمہیں —— کیا نام ہے تمہارا"

"شیگی ——"

"شیگی —— ؟ انگریزی نام ہے تمہارا"

"بس نام تو شگفتہ ہے۔ سب پیار سے شیگی کہتے ہیں مجھے"

"اچھا —— اچھا ——"

آغا جان اسے شیگی ہی پکارنے لگے۔

شگو بڑی خوش تھی۔

آغا جان جیسی بزرگ مدبر اور عظیم شخصیت اس سے اتنی مانوس ہوگئی تھی۔ وہ اس سے بالکل اسی طرح پیش آنے لگے جس طرح اپنے اہل خانہ سے پیش آتے تھے۔ بڑے شفیق اور بڑے خوش خلق تھے وہ۔ شگو جو پہلے اس کمرے میں پورے دن کی ڈیوٹی لگنے پر بور ہوتی

رہتی تھی۔

اب بڑی خوشی اور دلچسپی سے ڈیوٹی دے رہی تھی۔ فالتو وقت بھی وہ ڈیوٹی روم میں گزارنے کی بجائے آغا جان کے پاس ہی رہتی ان کا ہر طرح سے خیال رکھتی۔

جب ان کے رشتے دار عزیز آئے ہوتے تب بھی وہ وہیں ہوتی ان سے بھی اب وہ بے تکلف ہوگئی تھی۔ وہ لوگ اس کی بہت عزت اور قدر کرتے۔ اس کی تعریف کرتے۔ اس کی خدمت کا اعتراف کرتے۔

"آپ کی وجہ سے ہم بے فکر ہوگئے ہیں" اس دن صمد خان نے شگو سے کہا۔

"آپ اس طرح آغا جان کی دیکھ بھال نہ کرتیں۔ تو ہم میں سے کسی نہ کسی کو چوبیس گھنٹے یہاں رہنا پڑتا" ان کی بیگم نے مسکرا کر شگو کو دیکھا۔

"اب تو میں مطمئن ہوں"

"دلاور خان اور خوش دل خان تو دن رات یہیں ہوتے ہیں لیکن وہ اس طرح دیکھ بھال تو نہیں کرتے۔ جس طرح یہ کر رہی ہے" آغا جان کی بیٹی ماہوش نے کہا۔

"یہ لوگ تو یہاں دن رات رہ بھی نہیں سکتے۔ میں تو اتنی دور بیٹھی ہوں چند دنوں کے لئے آغا جان کو دیکھنے آئی ہوں۔ بھابی بھی گھر میں مصروف ہیں۔ آئے گئے کو وہی سنبھال رہی ہیں"

"خدا کرے آغا جان جلد صحت یاب ہوں تو انہیں گھر لے جائیں
صمد خان بولے۔

"گھر پہ بھی ان کی دیکھ بھال کے لئے ایسی ہی کسی نرس کی خدمات حاصل کر لی جائے تو اچھا رہے گا۔" ان کی بیگم نے کہا۔

"ہاں ـــــ کیا مشکل ہے۔" ماہ وش بولی۔ "ہم لوگوں کو تو اپنے بال بچوں سے فرصت نہیں ملتی۔ آغا جان کے لئے مستقلاً اک نرس رکھ لی جائے تو کوئی ہرج بھی نہیں۔"

شگو کے کام کی تعریفیں کرتے کرتے نند بھابی آپس ہی میں باتیں کرنے لگیں۔ اک مستقلاً نرس رکھنے کی تجویز پہ دونوں ہی متفق تھیں شاید وہ یہ بات شگو کے گوش گزار کر رہی تھیں تاکہ مستقل نرس کا معاملہ درپیش ہو تو اسی سے بات کی جائے۔

اس دن گھر جا کر شگو نے ساری باتیں اماں کو بتا دیں، ہو سکتا تھا مستقل طور پر اسے ہی آغا جان کے ساتھ رہنا پڑے، اس لئے اماں کو بتانا لازمی تھا۔

بتایا تو اس نے طاہر کو بھی۔ کلینک میں پورا دن گزار کر جب وہ گھر جاتی۔ یا رات کی ڈیوٹی دے کر صبح گھر لوٹتی، تو چھوٹی بڑی ساری باتیں طاہر کے گوش گزار ضرور کرتی۔ آغا جان اور اس کی پوری فیملی کا غائبانہ تعارف اس نے طاہر سے کروا رکھا تھا۔

مستقل نرس رکھنے والی بات اس نے طاہر کو بتائی، تو اس نے

رانگی سے شگو کو دیکھا۔

"کیوں ـــــ"

"تم مستقل طور پر اس بوڑھے کے ساتھ رہو گی۔"

"جب تک وہ اپنے بیٹے کے ہاں رہے گا۔"

"تم ان کے گھر میں رہو گی۔"

"کیا ہرج ہے ـــــ"

"کوئی ہرج ہی نہیں ـــــ"

شگو نے سر ادھر اُدھر ہلاتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "کوئی مفت تھوڑا ہی رہوں گی۔ ڈبل تنخواہ لوں گی۔"

طاہر نے حیران حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"میاں تمہارا کام تو کہیں بن نہیں رہا۔ اب لگتا ہے۔ پیسہ اکٹھا کرنے چکر مجھے ہی چلانا پڑے گا۔"

طاہر افسردگی سے بولا۔ "اپنی تو قسمت ہی خراب ہے۔ لگتا ہے خواب ادھورے ہی رہیں گے۔"

"نہیں طاہر ـــــ" شگو اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولی۔ "تمہارے میرے خواب جدا نہیں۔ میں نا امید ہوں نہ مایوس۔ میرے خوابوں کو تعبیر ملی تو تمہارے خواب آپوں آپ پورے ہو جائیں گے۔ ہیں نا۔"

طاہر نے سر ہلا دیا۔

شگو اسے مزید تسلی دینے کو بولی۔

"ہم تم جدا تو نہیں ہیں نا۔ ہم نے اکٹھے ہی زندگی گزارنی ہے۔ پیسہ میرے پاس ہو یا تمہارے پاس۔ بات تو ایک ہی ہے۔ اصل بات تو صرف یہ ہے کہ جب ہم نئے بندھن میں بندھیں ہمارے پاس پیسے کی کمی نہ ہو۔ ہوں"

وہ مسکرائی۔

طاہر بھی پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پہ لے آیا۔ شگو کی محبت اور وقعت اس کے دل میں اور بڑھ گئی۔

"بیلا ـــــ"

"ہوں ـــــ"

"تجھے پتہ چلا ـــــ"

"کس بات کا ـــــ"

"آغا جان کی بائیوآپسی کی رپورٹ آگئی ہے"

"ہاں کینسر ہے انہیں۔ ڈاکٹر آصف اور ڈاکٹر شاید اس دن ان کی رپورٹیں دیکھ رہے تھے۔ میری ڈیوٹی ان دنوں ڈاکٹر آصف کے ساتھ ہے نا۔ وہ تو کہہ رہے تھے"

"کیا ـــــ؟"

"بیماری بہت پھیل چکی ہے۔ بون پتھر کی طرح سخت اور انتڑیاں متاثر ہیں۔ بیماری ـــــ"

"لاعلاج ہے ـــــ"

"ہاں ـــــ زیادہ سے زیادہ پانچ چھ ماہ اور جی سکیں گے۔" آغا جان؛

"لیکن ان کے گھر والے تو ان رپورٹوں سے مطمئن نہیں، وہ ڈاکٹروں کا بورڈ بٹھانے کا کہہ رہے ہیں۔"

"محض تسلی کے لئے۔ پیسہ بھی ہے۔ دس بارہ ڈاکٹروں کے بورڈ بٹھانے کے اخراجات برداشت کرنا ان کے لئے کیا مشکل ہے۔"

"صمد خان کو کہہ رہے ہیں۔ انہیں امریکہ لے جائیں گے علاج کے لئے ـــــ"

"وہی بات ـــــ پیسہ ہے دل کی تسلی کے لئے لے جائیں گے امریکہ بھی۔ لیکن ـــــ"

"ہائے بیلا مجھے تو بہت افسوس ہوا ہے۔"

"ہاں، تو اپنے کو ان کی اٹینڈنٹ سے زیادہ ان کی پوتی سمجھنے لگی ہے شاید ـــــ"

شگو پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"آغا جان کو پتہ نہیں چلا نا ـــــ"

"نہیں ان سے کہنے کی کیا ضرورت ہے، ان کے گھر والے بہت محتاط ہیں۔ بھئی ان سے سب کو اتنا پیار ہے۔"

"ہاں بہت اچھی فیملی ہے ان کی ـــــ"

کل یہ بات پتہ چلی نا۔ تو صمد خان کی رنگت پیلی پڑ گئی، ان کی بیگم تو رونے لگیں۔

"اور ان کا پوتا جو کل ہی کراچی سے آیا ہے۔ اس کی حالت دیکھنے والی تھی۔ ایک دم سے ہی گھبرا گیا۔ اتنے سگریٹ پھونک ڈالے اس نے کہ کیا بتاؤں۔"

بیلا نے ہنس کر شگو کو دیکھا اور شوخی سے بولی۔ "بہت سمارٹ اور ہینڈسم ہے وہ لڑکا۔ کتنے دن ٹھہرے گا یہاں۔"

"آنکھیں نچانے کی کیا ضرورت ہے بیلا صاحبہ۔"

"ایسے ہی ـــــ"

"ہینڈسم اور سمارٹ تو وہ ہے، لیکن ـــــ"

"لیکن تمہاری ڈور طاہر سے بندھی ہے۔ اس لئے اس کے متعلق سوچنے کا سوال ہی نہیں ہوں۔"

شگو مسکرا کر بولی۔ "ہوں ـــــ"

دونوں ہنس پڑیں۔

بیلا اس وقت فری تھی۔

شگو کسی کام سے اس طرف آئی تھی۔

بیلا نے چائے منگوائی تھی۔

"بیٹھو نا ـــــ ایک کپ چائے ہو جائے۔" بیلا نے اسے اٹھتے دیکھا تو بولی۔

"نہیں بیلا ـــــ چائے پیں اِدھر ہی ہوں گی۔"

"اوہ ـــــ مجھے تو خیال ہی نہ رہا۔ تمہارا تو کھانا پینا ادھر ہی ہوتا ہے۔

خوب شاندار چائے ہوتی ہوگی۔ کیک۔ پیسٹری۔ سموسے اور ——"

" سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ لوگ تو احوال پرسی کو آنے والے لوگوں کی طرح خاطر مدارت کرتے ہیں۔ جیسے ہوسٹل میں نہیں اپنے گھر میں بیٹھے ہوں "

" پیسہ —— میری جان پیسہ ——"

" پیسے کے ساتھ ساتھ بااخلاق لوگ ہیں۔ پٹھانوں کی خاصیت ہے یہ ——"

" ہوں —— تو تو اتنی بااخلاق نہیں ——" بیلا نے ہنس کر چھیڑا۔

" پٹھانوں کی رگ تجھ میں بھی ہے۔ تیری امی پٹھان ہیں نا "

شگو نے مسکرا کر سر ہلایا پھر بولی۔

" پنجابی پٹھان ہیں وہ ——"

" پنجابی پٹھان ——"

" ہاں —— میرے نانا کے ابا سرحد سے آئے تھے۔ برس برس سے یہاں رہتے ہو گئے۔ اب پنجابی پٹھان ہی ہوئے نا۔ اور پھر میرے ابا پنجابی تھے۔ یوں ——"

بیلا مسکرانے لگیں۔

چپڑاسی چائے لے آیا تھا۔ بیلا نے شگو کو چائے پینے پر مجبور کیا تو وہ بیٹھ گئی۔

چائے پیتے ہوئے دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔

پھر شگو اٹھی۔

مجھے اتنی دیر یہاں نہیں بیٹھنا چاہیئے تھا۔ وہاں وہ لوگ مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ آج تو آغا جان کے کافی رشتہ دار آئے ہوئے ہیں "

جاؤ بھئی جاؤ —— خوب خدمت کرو آغا جان کی۔ ہو سکتا ہے ان علاج کے لئے امریکہ جانا پڑے۔ اور تمہارے جانے کا بھی چیک ہائے "

کیا ——"

ہاں شگو ——"

یں —— یں یعنی میرے امریکہ جانے کا ——"

ہوں —— کیسے رہے جو وہ لوگ آغا جان کے ساتھ تمہیں امریکہ جارہیں "

مجھے —— مجھے کیوں ——"

اٹینڈنٹ کے طور پر ——"

مجھے ہی کیوں۔ ان کی آل اولاد تھوڑی ہے "

بہت ہے ——"

پھر ——"

پھر یہ کہ وہ لوگ افورڈ کر سکتے ہیں کہ آغا جان کے لئے مستقلاً ایک اٹینڈنٹ رکھیں "

بات تو اس دن انکی بہو اور بیٹی کر رہی تھیں "

"بس پھر ٹھیک ہی ہوگا"

"کیا ـــــ"

"اڑتی اڑتی سنی تھی۔ میں نے سسٹر نجمہ سے یہ بات"

"کیا ـــــ"

"یعنی تم بھی تو کہہ رہی ہونا کہ وہ لوگ آغا جان کو علاج کے لئے امریکہ لے جانا چاہتے ہیں"

"ہاں ـــــ صلاح مشورے تو ایسے ہی کر رہے ہیں۔ ڈاکٹرز کے بورڈ بیٹھنے کے بعد ـــ اگر سب کا متفقہ فیصلہ یہی ہوا کہ انہیں کینسر ہے"

"وہ تو سو فیصد ہے۔ گھر والے اپنی تسلی کے لئے ڈاکٹرز اکٹھے کر رہے ہیں"

"ہاں تو پھر ـــــ"

"پھر ہر کینسر کے دولت مند مریض کی طرح آغا جان کو بھی امریکہ علاج کے لئے بھیجا جائے گا"

"وہ بھی ٹھیک۔ لیکن ساتھ نرس بھیجنے کا تو نے کیسے کہا"

"سسٹر نجمہ ہی بتا رہی تھی کہ آغا جان کے ساتھ وہ لوگ یہیں سے کوئی نرس بھیجیں گے۔ جو ان کی پوری طرح دیکھ بھال کر سکے۔ ان کے گھر والوں میں سے کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ ان کے ساتھ امریکہ جا کر مہینوں رہ سکیں۔ ویسے بھی وہ کسی عورت کو ساتھ بھیجیں گے اور

ان کے خاندان کی کوئی عورت صرف تیمار داری کے لئے وہاں نہیں رہ سکے گی"

"تو ـــــ"

"ظاہر ہے اگر کسی کو ساتھ بھیجنے کا ارادہ ہوا۔ تو قرعۂ فال تمہارے نام نکلے گا"

"یہ کیسے کہہ سکتی ہو ـــــ"

"کہہ تو نہیں سکتی۔ اندازہ لگا رہی ہوں"

"ہائے بیلا ـــــ ایسا ہو جائے تو ـــــ"

شگو نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں فرط مسرت سے سینے میں دبانے کی کوشش کرتے ہوئے آنکھیں میچ کر ہونٹ بھینچ لئے۔

"مزہ آئے گا ـــــ" بیلا بولی۔

"ہائے مزے جیسا مزہ ـــــ بیلا سوچ تو ـــــ میں امریکہ دیکھ آؤں گی ـــــ"

اس نے بیلا کے گلے میں بانہیں ڈال کر فرط جذبات سے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"پاگل مجھے تو چھوڑو۔ گردن مروڑ ڈالی میری" بیلا نے ہنس کر اس کی بانہیں گلے سے نکالیں۔

شگو خوشی سے مٹھیاں کھولتے اور بند کرتے ہوئے اٹھی۔

"ارے ـــــ" بیلا نے کہا۔

"ہوں ——"

"اتنی جذباتی نہ ہوا ابھی سے"

وہ ہنس پڑی۔

"کسی سے ابھی کچھ کہنا نہیں"

"اچھا ——"

"میں اپنے طور سے بھی پتہ کروں گی۔ صمد خان ڈاکٹر سیمع سے صلاح مشورہ کر رہتے ہیں۔ اور میں ڈاکٹر سیمع کے ساتھ ہوتی ہوں۔ پتہ چل جائے گا۔ بہت جلد"

شگو پھر جوش جذبات میں بہک کر جھکی اور جھٹ سے بیلا کے گال پر بوسہ دیا۔

پھر

کمرے سے نکل گئی۔

اس کا پاؤں واقعی زمین پر نہیں پڑ رہا تھا۔

اس دن گھر پہنچتے ہی وہ اماں کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول گئی۔

"کیا ہوا —— اتنی خوش کیوں ہے ——" اماں نے ہنستے ہوئے اسے دیکھا۔

"اماں —" وہ دھم سے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے جوتے اور موزے اتارتے ہوئے بولی۔

"کیا ہے ——"

"اماں اگر میں امریکہ جاؤں تو ....."

"امریکہ —— ؟"

"ہاں اماں ——"

"امریکہ —— امریکہ کیا کرنے"

"سیر کرنے ——"

اماں ہنس پڑی۔

پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

"کوئی کورس دورس کرنے جانا ہے"

"اوں ہوں ——"

"تو پھر ——"

"پھر —— ابھی تو کچھ بھی نہیں —— لیکن دعا کرنا ماں۔ میں امریکہ جاؤں —— کتنا مزہ آئے اماں —— سوچو تو مفت میں امریکہ کی سیر ہو جائے"

"مجھے تو تیری باتیں سمجھ نہیں آرہی۔ چل کپڑے بدل لے"

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "بدل لیتی ہوں۔ پہلے دعا کر اماں میں امریکہ جا سکوں"

"سرپھری لڑکی ہے تو تو —— اتنی بڑی ہو گئی۔ اب تو عقل کی بات کیا کر"

"کتنی بڑی ہو گئی ہوں"

"پورے بائیس کی ہوگئی ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

وہ کچھ کہنے ہی کو تھی کہ ظہیر آگیا۔ وہ امی کو بلانے آیا تھا۔ امی کو اس سے کچھ کام تھا۔

ظہیر نے شگو کو بھی سلام کیا۔

"کیسی جا رہی ہے تیری دکان" شگو نے پوچھا۔

"بس کچھ تیا پاچا ہو ہی رہا ہے"

"پڑھائی ختم کر دی"

"دو دو کام نہیں ہو سکتے باجی۔ اس دفعہ بھی ارادہ کیا تھا امتحان دونگا لیکن تیاری نہیں ہو سکتی"

"تیسری بار بھی معاملہ ٹھپ"

"ٹھپ ہی ہے اب تو۔ دکان ہی چل نکلے تو غنیمت ہے"

تہمینہ رشیدہ کی طرف چلی گئی۔

ظہیر تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا۔

دونوں باتیں کرتے رہے۔

رات اس نے طاہر کو امریکہ جانے کی مفروضہ خبر سنائی۔

"کیا ——"

"جناب مابدولت امریکہ جا رہے ہیں"

"کس سلسلے میں"

"سلسلہ کوئی بھی ہو بات تو امریکہ دیکھنے کی ہے۔ اُف طاہر کبھی ایسا ہو جائے تو کتنا مزہ آئے۔ میں تو خوشی سے پاگل ہو جاؤں"

"اچھا ——" طاہر اس کی وارفتگی پر مسکراتے ہوئے بولا۔ "تو امریکہ کسی پاگل خانے میں رہنے جا رہی ہو"

"اوہ نہیں" اس نے طاہر کے سینے پر ہولے ہولے اپنی مٹھیاں ماریں۔ "آغا جان کو کینسر ہے"

"اس بوڑھے مریض کو"

"ہاں ——"

"تو ——"

"ان کے بیٹے خان صمد خان انہیں امریکہ علاج کے لئے بھیجنے کا سوچ رہے ہیں۔ سارے رشتہ دار متفق ہیں۔ اگر وہ گئے نا — تو —"

"تو ——"

"ان کے ساتھ یہاں سے ایک نرس کی خدمات بھی ان کے لئے اہل خانہ حاصل کریں گے"

"یہاں سے نرس ساتھ بھیجیں گے"

"ہاں طاہر —— تمہیں بتایا تو ہے کہ وہ لوگ کتنے امیر ہیں — دولت کا کوئی حساب ہی نہیں۔ پھر ان کے لئے ایک اٹینڈنٹ کا یہاں سے ساتھ بھیجنا کیا مشکل ہے"

"ان کے گھر والوں میں سے کوئی نہیں جا سکتا"

"یہ ان کا اپنا معاملہ ہے۔ شاید کئی لوگ جائیں۔ لیکن مستقلاً وہاں ساتھ نہیں رہ سکتے نا۔ اور نہ ہی دن رات ان کی دیکھ بھال۔"

"دیکھ بھال وہاں نہیں ہوگی کیا۔"

"پھر بھی —— چلو ہمیں کیا اس سے —— ہمیں تو غرض اس سے ہے کہ امریکہ دیکھ لیں۔"

"تم جاؤ گی ——"

"کیوں نہیں ——"

"اکیلی ——"

وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"ساتھ نہیں بھی لے جا سکتی تو ——"

پھر ——

وہ ——

خود ہی ہنس پڑی۔

"ابھی تو میرا ابھی کچھ پتہ نہیں —— میں نے تو اڑتی اڑتی سنی ہے افواہ ہی کہہ لو۔"

اسے بیلا نے جو کچھ بتایا تھا، وہ طاہر سے کہہ دیا۔

طاہر چپ رہا۔

شگو نے اس کی ٹھوڑی ہلاتے ہوئے کہا۔ "ابھی سے اداس ہو گئے۔ پہلے میرے جانے کی دعا تو کرو۔ اسے طاہر صاحب۔"

طاہر نے اسے گھور کر دیکھا۔ "میں یہ بات مذاق میں بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ۔"

شگو ہنس کر بولی۔ "ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر تھوڑا ہی جاؤں گی۔ گنے چنے تو بیچارے بڈھے کی زندگی کے دن ہیں۔ تین چار یا پانچ ماہ جی لے گا۔"

"شگو ——"

"ہاں طاہر اس سے زیادہ دن وہ نہیں جی پائے گا۔ اور تقریباً اتنے ہی دن بلکہ اس سے بھی کم دن امریکہ میں لگیں گے۔ ظاہر ہے حالت مایوس کن ہو گئی تو اسے واپس لایا جائے گا۔ ہم لوگ اپنی زمین پر آخری سانس لینے کے متمنی تو ہوتے ہی ہیں نا۔"

طاہر نے اک بھرپور نگاہ شگو پر ڈالی۔ وہ امریکہ جانے کی خوشی میں اس طرح بہک رہی تھی۔ کہ موت وحیات کی کشمکش بھی اسے اک کھیل لگ رہی تھی۔

شگو نے کھڑکی کے سفید پردے ایک طرف سرکاتے ہوئے بٹن دبا کر آغا جان کا بیڈ سرہانے سے اونچا کیا۔

"بس شگی ــــ" آغا جان نے نیم دراز ہوتے ہوئے بیڈ اونچا کرنے کو کہا تھا۔

"اچھا ــــ"

شگو نے بٹن بند کر دیا۔

"پھر ــــ"

سائیڈ ٹیبل پر رکھا پھولدان ایک طرف کر کے تازہ پھولوں کی ترتیب ٹھیک کی۔

"شگی ــــ" آغا جان بولے۔

"جی ــــ"

"وہ میری گھڑی تو پکڑانا ذرا۔"

"کہاں ہے ــــ"

"اس طرف میز پر رکھی تھی۔"

شگو بیڈ کی طرف گھوم کر آئی۔ میز پر سے گھڑی اٹھائی اور آغا جان کو دیتے ہوئے بولی۔

"یہ لیجئے ــــ"

"تھینک یو ــــ"

آغا جان نے گھڑی کلائی پر باندھنا چاہی۔ شگو نے ہاتھ بڑھا کر گھڑی پکڑلی۔ اور ان کی کلائی پر باندھتے ہوئے بولی۔

"آج کون کون آرہا ہے آپ کو دیکھنے۔ سنا ہے آپ کے یوکے والا بیٹا اور بہو بھی آرہے ہیں۔"

"ہاں۔ شاید اس ہفتے آجائیں۔"

"بہت پیار کرتے ہیں آپ کے سب بچے آپ سے۔"

آغا جان مسکرا کر بولے۔ "وہ تو میرے بچے ہیں۔ مجھے تو غیر بھی پیار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ میں بھی ان سے پیار کرتا ہوں۔ مجھے ہر انسان پیارا لگتا ہے۔"

"میں بھی آغا جان ــــ"

"ہاں تم بھی ــــ"

"آغا جان ــــ"

"ہوں ــــ"

"سنا ہے آپ علاج کے لئے امریکہ جا رہے ہیں "

"بچوں کی ضد ہے ۔ ورنہ میں تو جانے کے لئے رضامند نہیں "

آغا جان بولے ۔

"وہاں آپ کا علاج اور بھی اچھے طریق سے ہو سکے گا ـــ " شگو نے کہا ۔

"جس بیماری کا علاج ہی نہیں ۔ اس میں اچھے برے " آغا جان نے کہا ۔

"آغا جان ـــ " شگو نے حیرانگی سے انہیں دیکھا ۔ کیا وہ اپنی بیماری سے آگاہ ہو چکے تھے ۔ ؟

شگو کے ذہن میں دھماکہ سا ہوا ۔ بیماری سے ان کو پوشیدہ رکھنے کا ہر فرد نے تہیہ کر لیا تھا ۔ لیکن ـــ !

آغا جان اسے دیکھ کر مسکرائے ۔

ان کی مسکراہٹ بہت پھیکی تھی ۔

آج وہ کچھ مضمحل بھی تھے اور رنگت بھی سپید پڑ گئی تھی ۔ نقاہت ان کے چہرے سے عیاں تھی ۔

"آپ کو کس نے بتایا "

"کیا ـــ "

"کہ آپ کی بیماری کا علاج ـــ "

آغا جان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "کسی نے نہیں ۔

"تو پھر آپ کیسے کہہ رہے ہیں "

آغا جان مسکرائے ۔

سفید چادر سینے تک پھیلاتے ہوئے بولے ۔

"شگی ـــ مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا ۔ نہ ڈاکٹرز نے اور نہ ہی گھر والوں نے ۔ تم نے بھی کچھ نہیں کہا اور رات کی ڈیوٹی دینے والی نرس نے بھی کچھ نہیں بتایا "

"تو پھر "

وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولے ۔ "شگی ـــ میری عمر بہتر برس ہو چکی ہے "

"ہوں ـــ "

"بہتر برس میں کیا مجھے چہروں کی پہچان کرنا بھی نہیں آیا ۔ ڈاکٹرز لاکھ بھی ہوشیار ہوں ۔ مجھ سے رپورٹ چھپانے کی کوشش کریں ۔ لیکن ان کے چہروں سے ہر بات عیاں ہوتی ہیں ۔ ان کی تسلیاں کتنی پھیکی ہوتی ہیں ۔ پھر میرے گھر والے میرے بچے ۔ ان کے چہروں پر منڈلاتی پریشانی ۔ ان کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا درد ۔ مجھے تسلی دیتے وقت ٹوٹتی بکھرتی آوازیں ۔ کیا ان سب سے میں اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اب میرا وقت ختم ہونے کو آ رہا ہے "

"اوہ تو ـــ آغا جان ـــ آپ ـــ !"

"شگی ـــ "

"آغاجان آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ ابھی آپ نے صحت مند ہو کر زندگی گزارنا ہے۔ ایسی باتیں مت سوچیں۔ ڈپریشن سے۔"

وہ ہنس پڑے۔

پھر بولے۔ "بیماری اتنی سنجیدہ نوعیت کی ہے نا۔ اسی لئے علاج کے لئے مجھے باہر بھیجنے کی بات ہو رہی ہے۔"

"وہاں زیادہ اچھی طرح دیکھ بھال ہو سکے گی۔ وہاں کے ماہر معالج آپ کا علاج کریں گے۔"

"تم بھی اسی حق میں ہو۔"

"بالکل، جتنی جلدی ہو سکے آپ کو امریکہ چلے جانا چاہیئے۔"

"لیکن ــــ"

"لیکن کیا آغاجان ــــ"

"میں جانا نہیں چاہوں گا۔"

"کیوں ــــ"

"میں اپنوں میں رہ کر مرنے کو اپنوں سے دور رہ کر جینے سے زیادہ اچھا سمجھتا ہوں۔"

"اوہو ــ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ آغاجان۔"

"امریکہ میرے ساتھ میری پوری فیملی تو نہیں جائے گی نا۔"

"خان صاحب کہہ رہے تھے وہ آپ کو ایڈمٹ کروانے جائیں گے۔ اور ــ اور آپ کا ذاتی ملازم دلاور وہاں ہی رہے گا۔ اور ــ اور ــ

شاید ایک نرس کو بھی یہاں سے آپ کے ساتھ بھیجیں گے نیویارک وہاں آپ کے دو ایک عزیز بھی ہیں۔"

آغاجان نے سر پیچھے ڈال کر آنکھیں بند کر لیں۔

"کیوں آغاجان۔" شگو نے انہیں پکارا۔ "کوئی تکلیف تو نہیں۔ درد تو نہیں ہو رہا پیٹ میں۔"

"نہیں ــــ"

"پھر ــــ"

"سوچ رہا ہوں اگر سب نے مجبور کر کے مجھے باہر بھیج دیا ــــ تو وہاں اکیلا ــــ"

"اکیلے کیوں ہوں گے۔ دلاور خان ہو گا۔ ایک نرس ہو گی۔"

"وہ نرس تم ہو سکو گی۔"

آغاجان نے ایک دم سے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا شگو تو ان کی بات پر ہی دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ آغاجان نے خود ہی وہ بات کہہ دی تھی۔ جو وہ کہنا چاہتی تھی۔ ان دونوں وہ آغاجان کی پورے دل و جان سے خدمت کر رہی تھی۔ امریکہ جانے کا خواب کچھ اسی طرح شرمندہ تعبیر ہو سکتا تھا نا۔

آغاجان بھی اس سے بہت مانوس ہو چکے تھے۔ وہ باتونی بھی تھی، ہنس مکھ بھی۔ انکا دل خوب لگا رہتا تھا۔ جب گھر والے پاس نہ ہوتے وہ اسی سے باتیں کرتے رہتے۔

"میں نے تم سے کچھ کہا ہے شیگی"

"جی — ہاں آغا جان —"

"اگر بالفرض مجھے امریکہ جانا ہی پڑا تو میرے ساتھ چلو گی"

"چلوں گی آغا جان —" وہ اپنی خوشی دباتے ہوئے سرسری سا

لہجے میں بولی۔

وہ —

اپنا شوق اور تجسس ان پر عیاں نہ کرنا چاہتی تھی۔

آغا جان اسے غور سے دیکھ رہے ہوتے تو یہ بات جان لینا

کے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔

لیکن —

وہ تو اپنے ہی خیالوں میں کھوئے تھے۔

"ایسے ہی چلوں گی نہ کہہ دینا"

"تو پھر کیسے کہوں"

"پہلے اپنے گھر والوں سے اجازت لے لو۔ بات کر لو ان سے"

"اس کی —"

"وہ ضرورت نہیں" کہتے کہتے رک گئی۔

"تمہارے گھر میں کون کون ہے"

"صرف میری ماں ہے"

"باپ —"

انو میں چھوٹی سی تھی۔ جب فوت ہو گئے تھے"

ذ بھی —"

یا آغا جان"

ھر تو تم میرے ساتھ نہیں جا سکو گی"

کیوں — ؟"

ہاری ان تمہارے بغیر کیسے رہ لیں گی"

ہ —"

ار پھر — شاید — وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو باہر بھیجنا پسند بھی نہ کریں"

نگو چند لمحے چپ رہی۔

ھر سوچتے ہوئے بولی۔ "اگر آپ مجھے ساتھ لے جانے میں سنجیدہ

یں تو میں اماں سے بات کر دوں"

غا جان نے اک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میرے بچے بغد

ے تو پھر شاید جانا ہی پڑے"

ضرور جائیے گا آغا جان۔ آپ وہاں جا کر بالکل ٹھیک ہو جائیں گے"

سنجیدگی سے بولی۔

ہوں —" وہ پھر گردن پیچھے کر کے آنکھیں بند کر کے سوچنے

ے

شگو ان کا چارٹ دیکھنے لگی۔ پندرہ منٹ بعد ان کا ٹمپریچر لینا تھا

ڈال دینا تھی۔

وہ پرلی طرف پڑی گدے دار کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں ہلچل سی ہو رہی تھی۔

"آغا جان کو ضرور امریکہ جانا چاہیئے" وہ اسی بات کو سوچ رہی تھی، ان کے جانے ہی سے تو اس کی قسمت اتنی شاندار انگڑائی لے سکتی تھی۔

اس نے سوچ لیا کہ آغا جان کو ہر ممکن طریق سے آمادہ کرے گی۔ ان کے گھر والوں کو پکا پکا راغب کرے گی۔

اس کی رپورٹیں شگو نے بھی دیکھی تھیں۔ ڈاکٹر آصف اور شاہد کو بھی بیماری کی نوعیت پر باتیں کرتے بھی سنا تھا۔ کینسر جس سٹیج پر تھا، وہ بھی جان گئی تھی۔ آغا جان کی زندگی چند ماہ سے زیادہ نہیں تھی۔

"چند ماہ —!"

اور اگر یہ چند ماہ امریکہ میں بسر ہو جائیں تو —

اماں —"

ہاں —"

پھر بتاؤں —"

کیا بتاؤں —"

مجھے جانے دوگی؟"

امریکہ —"

اور کہاں —"

پتہ نہیں سر پھری ہے تو تو — جو بات دماغ میں سما جائے

تھوڑا ہی سکتی ہے۔"

اس میں ہرج ہے کوئی؟"

اور نہیں تو کیا — جوان جہان بیٹی کو پرائے مرد کے ساتھ

بھیج دوں؟"

" پرایا مرد ــــ اماں ــــ کسی دن چل کر دیکھو نا اسے میرے ابا برابر ہے "

" بے شک ہو ــــ "

" یہ کیا بات ہوئی ــــ "

" لوگ باتیں نہ بنائیں گے "

" لوگوں سے کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے "

" اچھا ۔ تو اتنے مہینے گھر سے غائب رہے گی تو لوگ پوچھیں گے نہیں "

" اُف اماں ۔ تجھے تو لوگوں کی فکر کھائے جائے گی مجھے کسی کی پروا نہیں ۔ کہہ دینا سب سے کہ میں کورس کرنے کے لئے امریکہ گئی ہوں ۔ حکومت نے بھیجا ہے ۔ زبانیں بند ہو جائیں گی لوگوں کی "

" تیرے ہوتے سوتوں کو کیا کہوں گی "

" طاہر کو میں نے بتایا ہوا ہے "

" وہ کچھ نہیں کہتا "

" وہ بیوقوف نہیں ہے "

" اس کی ماں بہنیں "

" پھپھو کو بھی میں خود ہی بتا لوں گی ــــ اور بہنیں ــــ وہ دور بیٹھی ہیں ۔ انہیں کیا "

" مجھے پتہ نہیں ۔ تو تو میری اماں ہے ۔ بات مانے گی تھوڑا ہی "

" اماں چند ماہ کی بات ہے صرف ۔ سوچ تو ذرا ۔ امریکہ گھوم پھر آئے گی تیری بیٹی ۔ مفت میں ۔ اپنے خرچے پر تو میں کراچی جانے کا نہیں سوچ سکتی ۔ اتنا نادر موقعہ ہے ۔ اتفاق ہی سے مل رہا ہے ۔ اسے ہاں کہہ دے نا "

اماں چپ ہو گئی ۔

شگو نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا ۔ " اماں کہہ دے نا ــــ کہہ دے نا اماں "

" شگو میرا دماغ نہ چاٹ ۔ تجھے تو امریکہ جانے کی خوشی میں کوئی اور بات سوجھ ہی نہیں رہی ۔ غیر مرد کے ساتھ وہاں اتنے مہینے رہے گی " اماں نے پھر ڈانٹا ۔

" اماں ــــ اماں ــــ تجھے کیسے سمجھاؤں ۔ غیر مرد بہتر سال کا بوڑھا ہے ۔ اماں اس عمر میں جانتی ہو ماہ و سال نہیں گنے جاتے ۔ اس کے درجات شمار ہوتے ہیں اور پھر وہ کینسر کا مریض ہے ۔ شاید ان جی بھی نہیں پائے گا ۔ وہ تو مالدار لوگ ہیں اپنی تسلی کے لئے اسے امریکہ بھیج رہے ہیں ۔ علاج سے ٹھیک تھوڑا ہی ہو جائے گا ۔ اس کے نرسیں جانے کو تیار ہیں ۔ وہ تو خوش قسمتی سے میں ہی آغا جی کے ساتھ ہوں شروع سے اور وہ مجھ سے اتنے مانوس ہو گئے ہیں کہ مجھے ہی ساتھ لے جانا چاہتے ہیں "

اماں نے یونہی سر ہلاتے ہوئے اسے دیکھا ۔

"اماں، نرسیں تو کیا ڈاکٹرز تک خواہشمند ہیں کہ آغا جان انہیں ساتھ لے جائیں۔ کل ہی ڈاکٹر نرگس کہہ رہی تھیں۔ کیا ہی اچھا ہو جو آغا جان نرس کی بجائے ڈاکٹر کو ساتھ لے جانا پسند کریں۔ اماں، جانے کی بات ہے۔ امریکہ ——"

"وہاں رہے گی کہاں؟"

وہ ہنس پڑی۔

"یہ مسئلہ نہیں ہے خان صمد خان صاحب سارا بندوبست کریں گے ——"

اماں چپ ہو گئی۔

"تو راضی ہو گئی ہے نا اماں ——" شگو نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

"پتہ نہیں ——" اماں اب بھی ناراض تھی۔

"اچھا ——"

وہ کچھ کہنے ہی کو تھی، کہ طاہر آ گیا۔ اس نے سلام کرنے کے بعد مسکرا کر ماں بیٹی کو دیکھا۔

"کیا ہو رہا ہے؟"

اماں اس کا بازو گلے سے نکالتے ہوئے بولی۔ "تو ہی پوچھ اس سے۔"

طاہر نے ماں بیٹی کو دیکھا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شگو بولی۔

"آؤ طاہر —— بیٹھو نا ——"

طاہر نے دیوار کے ساتھ لگی کرسی قدرے قریب گھسیٹ لی۔

اماں چارپائی سے اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

شگو وہیں بیٹھی رہی۔

"امی کچھ ناراض ناراض لگتی ہیں ——" طاہر نے آگے کو جھکتے ہوئے کہا۔

شگو نے پیار بھری نگاہ طاہر پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "بات سنو گے تو شاید تم بھی ناراض ہو گے۔"

"کیا بات ——" طاہر بولا۔

اماں باورچی خانے ہی سے بولیں۔ "امریکہ جانا چاہتی ہے۔ اجازت مانگ رہی ہے مجھ سے۔"

طاہر مامی کی بات سن کر بولا۔

"اسی پیشنٹ کے ساتھ؟"

"ہاں طاہر ——" شگو جلدی سے بولی۔ "آغا جان مجھے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔"

طاہر پھیکے لہجے میں بولا۔ "اور تم پہلے ہی سے جانے کے لئے تیار بیٹھی ہو۔"

"طاہر —— اتنا اچھا موقعہ مل رہا ہے۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ امریکہ جاؤں گی۔ اب موقعہ مل رہا ہے تو کیسے چھوڑوں۔ میں نے

اماں سے کہا بھی ہے کہ نرسیں چھوڑ ڈاکٹر اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے کا سوچ رہی ہیں۔ آغا جان مصر ہیں کہ میں ہی ان کے ساتھ جاؤں مجھے تو وہ اب اپنے گھر ہی کا فرض سمجھنے لگے ہیں۔"

"کب جا رہے ہیں وہ"

"بس تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ہفتے عشرے تک چلے جائیں گے۔ اماں ہاں کہہ دیں تو کل ہی میرا پاسپورٹ بن جائے گا۔ سارا بندوبست خان صاحب ہی کریں گے۔"

طاہر نے سر جھکا لیا۔ اپنے ہاتھوں کو الجھا الجھا کر کچھ سوچنے لگا۔

شگو بولی۔ "اماں کہتی ہیں، پرائے مرد کے ساتھ اپنی جوان بیٹی کو کیسے بھیج دوں۔"

"ہوں —"

شگو ہنسی۔ "اماں نے اس بیچارے بوڑھے آدمی کو دیکھا نہیں۔"

"بوڑھا آدمی ہے تو مرد ا — مامی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔"

"مجھے پتہ تھا تم بھی یہی کہو گے۔ لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو طاہر — امریکہ کا مفت میں ٹور ہے۔ ٹھاٹھ سے ہوائی جہاز میں جانا ہے۔ وہاں ہوٹل میں ٹھہرنا ہے۔ گھومنا پھرنا ہے۔ اس کے علاوہ ڈھیروں سارا پیسہ تنخواہ کے طور پر بھی ملنا ہے۔ بتاؤ نا برائی کیا ہے اس میں۔"

طاہر چپ رہا۔

شگو اسے بھی سمجھانے لگی۔

طاہر خاموشی سے سنتا رہا۔

اماں ہی باورچی خانے سے اس کی کسی کسی بات کا اعتراضاً جواب دے رہی تھیں۔

اعتراض یہی تھا کہ اکیلی جوان لڑکی کو اک پرائے مرد کے ساتھ اتنی دور بھیجنا مناسب نہیں تھا۔

لیکن

شگو نے بھی جانے کی ٹھان لی تھی۔ اسے امریکہ جانے کے سوا کچھ سوجھ بوجھ ہی نہیں رہا تھا۔

طاہر نے بڑی بے تابی سے کہا۔ "مامی۔ شگو کی خواہش ہے تو جانے دیں۔ تین چار ماہ کی تو بات ہے۔"

"تین چار ماہ کی بات نہیں طاہر بیٹے۔ اس کے اکیلے جانے کی بات ہے۔ کچھ بھی ہو ہے تو پرایا مرد۔ بوڑھا ہے۔ بیمار ہے۔ لیکن —!"

"اماں میں نرس ہوں نرس۔ میرا پیشہ مریضوں کی خدمت گزاری ہے۔ گھر میں بیٹھی عام لڑکی نہیں ہوں۔ یہاں کلینک میں میں مرد مریضوں کے ساتھ نہیں رہتی۔ رات رات بھر ڈیوٹی نہیں دیتی۔ پورا پورا دن ان کی دیکھ بھال نہیں کرتی۔ حد ہو گئی۔ اماں، یہ کام تیری جوان جہان بیٹی اڑھائی سال سے نہیں کر رہی —"

اماں اور طاہر دونوں چپ رہے۔

شگو کو غصہ آرہا تھا۔

اس لئے بلا رُکے بولے گئی۔ "میں بچی نہیں ہوں۔ اپنا بُرا بھلا سوچ سکتی ہوں۔ یا تو چھڑوا لے یہ نوکری اور گھر بٹھا لے مجھے۔ یا اجازت دے دے جانے کی۔"

طاہر نے ہولے سے کہا۔

"شگو غصے میں کیوں آرہی ہو۔ مامی نے اب تک تیری کوئی بات ٹالی بھی ہے۔ جب تو نے جانے کا عزم کر ہی لیا ہے تو وہ روکیں گی تجھے بالکل نہیں۔"

"اور تم ——"

"میں —— میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"تم بخوشی مجھے جانے کے لئے نہیں کہو گے۔"

"ضرور جاؤ ——"

شگو اس کا لٹکا ہوا چہرہ دیکھ کر ہنس پڑی۔

پھر اس کی نقل اتارتے ہوئے بولی۔ "ضرور جاؤ۔"

طاہر بھی مسکرانے لگا۔

اگلے دن وہ آغا جان کے کمرے میں گئی تو سلام کا جواب دیئے بغیر ہی آغا جان نے پوچھا۔

"مل گئی اجازت۔"

شگو نے ان کی بات کا جواب دینے کی بجائے کہا۔ "آغا جان

بیعت ہے رات آرام سے سوئے ہے تھے؟ پیٹ میں کلیف تو محسوس نہیں ہوئی۔ اور درد ——"

ں نے تم سے ساتھ جانے کے متعلق تمہاری امی کی رائے کا ہے۔"

جی —— بس راضی ہو ہی جائیں گی۔"

ہو ہی جائیں گی۔"

آغا جان۔ میں نے اماں سے بات کی ہے۔ طاہر سے بھی۔"

کون طاہر ——"

شگو نے سر قدرے جھکا کر کہا۔ "میرا کزن ہے۔ پھپھو کا بیٹا ہم ب ساتھ ہی رہتے ہیں۔"

کوئی بھی رضا مند نہیں ہوگا۔"

ہو جائیں گے۔"

کب ——"

بس آج کل میں۔"

آغا جان خاموش ہو گئے۔

وہ ان کا کمرہ ٹھیک کرنے لگی۔

اس دن صمد خان نے بھی اس سے اجازت ملنے کا پوچھا تو وہ ولی ——

"خان صاحب۔ اماں ذرا پرانے خیالات کی عورت ہے۔ اپنی بیٹی

کو اکیلے سات سمندر پار بھیجنے سے ڈرتی ہے۔"

"مس شگی ——— " صمد خان سنجیدگی سے بولے۔ "براہ مہربانی جو کچھ کرنا ہے کہہ دیں۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔ آغا جان آپ ہی کے لئے اصرار کر رہے ہیں۔ ورنہ ساتھ جانے کے لئے کسی بھی نرس کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ہم سارے اخراجات برداشت کریں گے۔ اچھی تنخواہ دیں گے اور ——"

"میں جانتی ہوں خان صاحب۔"

"اگر آپ نے انکار کیا تو آغا جان بضد ہوں گے کہ ان کی پوتیوں یا نواسیوں میں سے کوئی ساتھ جائے۔ کل بھی کہہ رہے تھے شگی نہ جا سکی تو وہ زرینہ یا مہرینہ کو ساتھ لے جانا چاہیں گے۔"

"ہوں ——"

"لیکن مس شگی ان لڑکیوں کو ساتھ بھیجا نہیں جا سکتا۔ زرینہ کے امتحان ہیں اور مہرینہ کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ پھر ان لوگوں کو نرسنگ کا کیا پتہ؟ جانے کو تو میری بیگم بھی چلی جائیں۔ لیکن ہمیں وہاں اسے بھیجنا ہے۔ جو گھر کے فرد کی طرح آغا جان کی دیکھ بھال بھی کرے اور نرس کی طرح ان کے علاج معالجے سے بھی باخبر رہے۔" صمد خان بولے۔

"جی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"پھر ——"

میں کل آپ کو جواب دوں گی۔"

براہ مہربانی جواب انکار کی صورت میں نہ ہو۔ ہمارے لئے بڑا ...ن جائے گا۔ مس شگی آپ نے آغا جان کی جتنی خدمت اور ...لگن سے دیکھ بھال کی ہے وہ آپ کو ساتھ لے جانے کا اصرار ...نے میں حق بجانب ہیں۔ پلیز —— ہمارے لئے نہ سہی آغا جان ...ے مریض کے لئے ہی سہی۔

صمد خان کچھ ملول سے ہو گئے۔

ڈاکٹرز کا خیال ہے آغا جان زیادہ دیر جی نہیں پائیں گے۔ ...وارث تو اس حق میں ہی نہیں، کہ انہیں باہر بھیجا جائے۔ لیکن ...آصف اور شاہد باہر بھیجنے پر رضامند ہیں۔ اور کچھ نہیں تو ...تسلی ہو گی۔ کوئی ارمان نہیں رہے گا کہ ہم اپنے معزز اور بزرگ باپ ...علاج نہیں کروا سکے۔"

...صمد خان شگو سے بڑی منت سے التجا کرنے لگے۔

...کو کچھ خفت سی بھی محسوس ہوئی۔

آپ جتنی تنخواہ کہیں گی ہم دیں گے۔ پلیز انکار نہ کیجئے گا آپ ...ہیں۔ مریضوں کی خدمت لگن سے کرتی ہیں۔ آپ ان کے ساتھ ...گی، تو ہمیں بھی تسلی رہے گی۔ یقین مانئے مس شگی ہمیں تو یوں ...ہے آپ ہمارے ہی گھر کی فرد ہیں۔ آپ پر ہم اعتماد کر سکتے ہیں ...ہم میں سے کوئی نہ کوئی وہاں آتا جاتا رہے گا —— آپ ——

پلیز —"

"اتنا بڑا اور معزز آدمی اس سے جس طرح استدعا کر رہا تھا مناسب نہیں تھا۔

کہ

شگو انکار کرتی۔

ویسے بھی اس نے امریکہ جانے کا موقعہ کھونا تھوڑا ہی تھا اس لئے مستحکم لہجے میں بولی۔

"خاں صاحب میں تیار ہوں، اماں کو نیم راضی کر ہی لیا ہے۔ راضی بھی کر لوں گی۔ آپ میرے جانے کی تیاری بھی کرلیں۔"

خاں صاحب نے سر ہلایا۔

"آپ سے میں نے کہدیا ہے نا خاں صاحب، میں آغا جان کے ساتھ جاؤں گی۔ میں خود بھی اس شفیق ہستی سے مانوس ہو گئی ہوں مجھے جانے سے کوئی نہیں روکے گا۔"

اس نے یہ بات آغا جان سے بھی کہدی۔ وہ خوش تو ہوئے لیکن اس کی اں کی اجازت کو ضروری جانا۔

"تم اپنی اں کو رضامند کر لو پہلے۔"

"بس سمجھیں کر لیا۔ آغا جان۔ میری اماں میری ہر بات مان لیتی ہیں مان تو اب بھی تقریباً گئی ہیں۔ اعتراض صرف ایک ہی ہے۔"

"کہ جوان بیٹی کو اتنی دور پرائے لوگوں کے ساتھ نہیں بھیجیں گی۔"

شگو نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

آغا جان سنجیدگی سے بولے۔ "تم اپنی اں سے کیوں نہیں کہتیں کہ ہم نہیں اپنے گھر ہی کا فرد سمجھنے لگے ہیں۔"

شگو نے تفاخر سے آغا جان کو دیکھا۔

اور شوخ لہجے میں بولی۔ "اپنی پوتیوں اور نواسیوں میں مجھے بھی شامل کر لیں۔"

کر لیا —" آغا جان نے بھی خوشدلی سے کہا۔

اور جذبات سے مغلوب ہو کر شگو نے آغا جان کے کندھے پر سر ٹکا رکھ دیا۔

طاہر پلنگ کے چوبی تکیے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا اور تہمینہ اس کی پٹی
پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ وہ شگو سے سخت ناراض تھی اور برہمی کا اظہار
طاہر کے سامنے بھی کر رہی تھی۔

شگو نے آج صاف طور سے کہدیا تھا کہ وہ امریکہ جا رہی ہے وہ
یہ نادر موقعہ کسی قیمت پر نہیں کھو سکتی اس نے اپنی رضامندی دے
دی ہے۔ اب چند دنوں میں اسے جانے کی تیاری کرنا ہے۔

اور بس ____

وہ طاہر کے سامنے دل کا غبار نکال رہی تھی۔

طاہر بالکل چپ رہا۔

سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ بھی شگو کو اس وقت برا بھلا کہے۔
یا اس کی طرفداری کرے۔ مامی کا اعتراض اپنی جگہ درست تھا وہ خود
بھی کب چاہتا تھا۔ کہ شگو تین چار مہینوں کے لئے نگاہوں سے

ہو جائے اور اک غیر مرد کے ساتھ اکیلی چلی جائے۔ غیر آدمی مریض
بڑھا سہی ہے تو غیر۔

لیکن ____

وہ ____

شگو کو بھی جانتا تھا۔ اس کی ہٹ دھرمی اور ضد سے بھی
تھی۔ پھر پیسے کے لئے اس کی خواہش جو ہوس بنتی جا رہی
وہ بھی ڈھکی چھپی نہ تھی۔ اس کی اس خواہش کے سامنے تو وہ سدا
سے جھکتا آیا تھا۔ کب نہیں مانی تھی اس کی بات کب ٹالی تھی

ہاں دلیل ____

اور ____

اب ____

تو امریکہ جانے کا سوال تھا۔

امریکہ جانا کوئی معمولی بات نہ تھی ان کے جو حالات تھے امریکہ جانے
کا کبھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ موقعہ شگو کبھی کھونے
والی نہیں ہوگی۔

اس لئے اس نے اسے روکنا مناسب ہی نہیں سمجھا تھا گو اس
کا دل نہیں مان رہا تھا اور مامی کی باتیں اسے ٹھیک لگ رہی تھیں۔

وہ چپ تھا۔

مامی نے ایک دم ہی اٹھ کر اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا اور بولی۔

"کب سے میں بول رہی ہوں۔ تو چپ کھڑا ہے۔ تو نہیں منع کر
اسے ——"

طاہر نے سر جھکاتے ہوئے بڑی افسردگی سے کہا۔ "مامی، یہ
کہوں تو کیا وہ مانے گی۔"

"تو منوانا چاہے تو مان بھی لے گی —— تو تو بولتا ہی نہیں اس
کے سامنے ——"

"میں جانتا ہوں۔ بولوں گا تب بھی شنوائی نہیں ہوگی۔"

"اس کی ہر بات کے سامنے جھک کر تو نے اس کی عادتیں بگا
دی ہیں تبھی تو من مانی کرتی ہے۔"

وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مامی کو دیکھ کر بولا۔ "مامی۔ آ
نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ اسے من مانی کرتے ہی پا
ہے —"

"مجھے کیا —— جا رہی ہے تو جائے۔ کل کلاں کو تو نے یا تیری ما
بہنوں نے کچھ . . ."

"سب اسے جانتے ہیں مامی۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ نہ کہو۔ تمہاری مرضی۔"

"مامی اس کے اپنے ہی فیصلے ہوتے ہیں اور جب وہ فیصلہ
کر لیتی ہے تو ان سے کبھی نہیں ہٹتی۔ یہ بات آپ بھی جانتی ہیں اور
میں بھی۔"

تہمینہ چپ رہی۔

طاہر ہولے سے افسردہ لہجے میں بولا۔ "ابا کو ہماری منگنی کرنے کی
ی خواہش تھی یاد ہے نا مامی۔ انگوٹھی بھی خرید لائے تھے اور کپڑے
بھی۔ لیکن شگو نے جو فیصلہ کر لیا تھا ——"

"ہاں وہ بیچارہ حسرت ہی دل میں لے گیا تھا۔"

"اب آپ کیسے ——"

طاہر کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

شگو آ گئی تھی۔

وہ بیحد خوش نظر آ رہی تھی۔ خوشی سے پاؤں ٹھیک سے
زمین پر پڑ ہی نہیں رہا تھا جیسے۔ صحن ہی سے چلائی۔

"اماں —— اماں کہاں ہو ——"

شاید اس نے باورچی خانے میں بھی جھانکا۔ پھر لپک کر کمرے
میں چلی آئی۔

"اماں —— " وہ دوڑ کر ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول گئی۔

"سب ہو گیا۔ سارا بندوبست ہو گیا۔"

اماں کچھ نہیں بولی۔

شگو نے طاہر کو دیکھا۔

"ہیلو طاہر —— تم بھی کھڑے تھے۔ میں خوشی سے دیوانی ہو
رہی تھی۔ اماں کو خبر سنانے کے لئے تمہیں دیکھا ہی نہیں۔"

طاہر تلخی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہاں بھئی اب تم ہمیں کہاں دیکھو گی۔"

"طاہر ——" شگو نے ناراضگی سے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

طاہر نے اداس نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کا پھولا پھولا چہرہ دیکھ کر ہنس پڑی۔

جلدی سے اس کے قریب گئی اور کندھے پر لٹکائے بیگ کو اتارتے ہوئے اس کی زپ کھول کر طاہر کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔ "دیکھو طاہر —— یہ —— یہ ——"

طاہر نے لال لال نوٹوں کی گڈی دیکھ کر سوالیہ نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ جواب دینے کی بجائے بیگ اسی انداز میں پکڑے ماں کی طرف گھوم گئی ——

"دیکھو اماں —— یہ دیکھو ——" اس نے نوٹوں کی گڈی باہر نکال کر بیگ پلنگ پر پھینک دیا۔

"دیکھو —— کتنے نوٹ ہیں۔ پورے دس ہزار۔ اتنے پیسے دیکھے ہیں کبھی۔" وہ ہنس پڑی۔

طاہر کو یوں لگا جیسے وہ پاگل ہو رہی ہے۔ اماں بھی حیرانگی سے اسے تکنے لگی۔

"یہ پیسے ——" اماں نے پوچھا۔

"یہ پیسے مجھے خان صاحب نے تیاری کے لئے دیئے ہیں —

ہزار تمہارے لئے۔ باقی میرے کپڑوں جوتوں اور دوسری چیزوں کے لئے۔ امریکہ جانا ہے امریکہ۔ نئے کپڑے نئے جوتے۔ نئی چیزیں لوں ان پیسوں سے۔ اور ہاں اماں تمہیں ہر مہینے دو ہزار روپیہ یہاں میری تنخواہ ملتا رہے گا۔ ٹھیک ؟ یا زیادہ پیسے چاہئیں۔ وہاں مجھے خرچہ الگ دیں گے وہ لوگ۔ اماں بہت ہی امیر لوگ ہیں۔ اتنا پیسہ ہے ان کے پاس —— کہ ——"

طاہر نے چپکے سے وہاں سے چلے جانے کے لئے قدم اٹھایا۔ وہ جلدی سے اس کے سامنے آگئی۔

"طاہر ——"

"ہاں ——"

"کہاں چلے ——"

"گھر ——"

"ناراض ہو ——"

"نہیں ——"

"تو پھر منہ کیوں پھلا رکھا ہوا ہے۔ حد ہو گئی۔ مجھے تو تم سب پر غصہ ہے۔ ذرا دور اندیش نہیں ہو۔"

اماں کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس نے طاہر کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"طاہر ــــ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ تم اتنے تنگ نظر ہو سکتے ہو ــــ"

"شگو تنگ نظری کی بات نہیں"

"تو اور کیا ہے"

"بس پتہ نہیں کیوں۔ طبیعت بجھ گئی ہے۔ شاید اس لئے کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوئے ــــ اور اب چار پانچ ماہ .....؟"

"اماں کی طرح تم بھی تو اسی بات سے پریشان نہیں ہو کہ میں غیر مرد کے ساتھ باہر جا رہی ہوں"

طاہر نے بے دلی سے سر ہلایا: "یہ بات نہیں۔ بوڑھے مریض سے مجھے کوئی خطرہ نہیں"

وہ ہنس پڑی۔

"بوڑھا مریض بہت مالدار ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے اس کی ساری دولت سمیٹ لوں"

طاہر نے ہلکے سے طنز سے کہا۔ "کوشش شروع کر دی ہے شاید؟"

"دیکھو طاہر ــــ" وہ پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "طنز کی ضرورت نہیں، حقیقت کو نظر انداز نہیں کرو۔ میں نے اس دن کہا تھا نا کہ اب مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا"

"ہاں۔ میرے حالات تو سازگار ہونے سے رہے۔ تمہاری خواہشوں

کل میرے مالی حالات میں تو ــــ بن نہیں پائیں گے"

یں سب جانتی ہوں۔ تم بھی جانتے ہو۔ اس لئے اماں کو سمجھاؤ

ان لوگوں نے صرف تیاری کے لئے مجھے یہ دس ہزار دیئے

چار پانچ مہینے میں کتنا پیسہ اکٹھا کر لوں گی۔ جانتے ہو۔ وہ مجھے

بھیجنے پر مجبور ہیں۔ اور میں ان کی مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں

ا سمجھے"

وہ ہنس پڑی۔

طاہر نے غور سے اسے دیکھا۔ اسے اندازہ تھا کہ پیسہ حاصل کرنے لئے یہ مادہ پرست لڑکی کچھ بھی کر سکتی ہے۔ وہ چپ رہا۔ شگو سمجھانے کے انداز میں باتیں کرتی رہی۔

رات اماں نے پھر برہمی کا اظہار کیا۔ اسے صرف ایک ہی اعتراض پرائے مرد کے ساتھ اکیلے جانا مناسب نہیں۔

اماں ــ صرف یہی اعتراض ہے" شگو نے اچانک ہی اماں پوچھا۔

ہاں ــــ" اماں مضبوط لہجے میں بولی۔

تو پھر ــ شگو کے ذہن میں اک انوکھا اچھوتا اور ناقابل یقین سا کوندے کی طرح لپکا۔

اس سے وہ آپ بھی گھبرا گئی۔

بے چین ہوئی۔ مضطربانہ ماں کو دیکھا۔

اور اٹھ کر بستر میں پڑ گئی۔

لیکن اس انوکھے اچھوتے اور ناقابل یقین خیال نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

وہ سوچنے لگی۔ سوچے گئی۔ اور سوچتی رہی۔

ساری رات وہ کروٹیں بدل بدل کر اٹھ اٹھ کر ٹہل ٹہل کر سوچتی رہی۔ اس کا دل و دماغ اسے قبول نہیں کر رہا تھا۔ لیکن اس کے اندر کی مادہ پرست لڑکی اس خیال کو عملی جامہ پہنانے پر مصر تھی۔ بضد تھی اور کوئی ہرج نہیں سمجھ رہی تھی۔

ساری رات کشمکش میں گزری۔ اضطراب میں بسر ہوئی۔ ضمیر و ذہن بر سر پیکار رہے۔

لیکن

صبح وہ اک خاص فیصلہ کر کے بالکل مطمئن تھی۔ اس کی آنکھوں میں امید کی روشنی اور چمک تھی۔ اسے اپنے خوابوں کی تعبیر کا سراغ مل گیا تھا۔ اک چمکتی دمکتی آسائشوں اور سہولتوں سے بھرپور زندگی بسر کرنے کا سراغ پا لیا تھا۔ صرف اور صرف یہی ذریعہ تھا۔ جس سے وہ اپنے بچپن سے پالے سنہرے روپہلے خوابوں کو عملی صورت دے سکتی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا اور فیصلے پر چٹان کی طرح مضبوطی سے کاربند ہونے کو تیار تھی۔ وہ کلینک جانے کے لئے تیار ہو کر کچن میں آ گئی۔ اماں نے چوکی پر اس کا ناشتہ لگا رکھا تھا۔ اور خود منہ بنائے روٹھی روٹھی بیٹھی تھی۔ شگو

لی پر چوکی کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ چوکی کو تکنے لگی اور اس کی نظروں
ستقبل کا شاندار ڈرائینگ روم گھوم گیا۔ بیحد شاندار۔ جس میں چکنی سطح
لی ڈائننگ ٹیبل تھی۔ خوبصورت میٹس پر نفیس اور نازک برتن رکھے
چاک و چوبند ملازم ناشتے کی چیزیں سامنے رکھ رہا تھا اور وہ طاہر
ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے ناشتہ کر رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو ـــ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے" اماں نے اسے
بات سے چونکا دیا۔

"اماں ـــ" وہ بولی۔

اماں نے اس کی طرف دیکھا۔

"اماں ـــ"

"ہاں ـــ"

"اماں ـــ" اس نے دو ایک بار ماں کو گہری گہری نظروں سے دیکھا۔

"کچھ کہے گی بھی ـــ" اماں جھلا کر بولی۔

"کہوں گی ـــ"

"تو کہو ـــ"

"اماں تمہیں مجھے اک غیر مرد کے ساتھ بھیجنے پر اعتراض ہے"

شگو نے پوچھا۔

اماں نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"ہے نا ـــ" وہ پھر اسی طرح بولی۔

"ہے ——" اماں نے جل کر کہا۔

"یہ اعتراض دور ہو سکتا ہے" شگو نے ہولے سے کہا لیکن لہجے کا استحکام محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"کیسے ——"

"میں اس سے شادی کر لوں"

شگو نے ایک دم سے یہ بات کہی تو اماں کچھ سمجھ ہی نہ پائی۔

"کیا —— کیا کیا ؟؟؟"

ان گنت سوال اماں کے چہرے پر پھیل گئے۔ اسے یوں لگا جیسے دماغ پر ہتھوڑے سے کسی نے کاری ضرب لگائی ہو۔ شگو نے اتنے مشکل مسئلے کو اتنے سہل انداز میں پیش کیا تھا کہ اماں اس کا ٹکر ٹکر منہ تکنے لگی۔

"اماں تمہیں یہی اعتراض ہے نا۔ تو یہ اعتراض دور ہو سکتا ہے میں آغا جان سے شادی کر لیتی ہوں۔ کروڑوں پتی آدمی ہے اماں" شگو نے رات بھر کی کشمکش کے بعد کیا ہوا فیصلہ سنا دیا۔

"شگو ——" اماں نے چیخ کر ڈانٹا۔

لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ صرف اس لئے نہیں کہ اماں کے اعتراض کو رد کرنا تھا۔

نہیں ——

اس کے علاوہ بھی اس کے ذہن میں بہت کچھ تھا۔

اس کو تو جیسے غزالوں کی راہوں کا سرا مل گیا تھا۔ اس امیر کبیر آدمی سے شادی کر کے وہ دولت کے انبار اکٹھے کر سکتی تھی۔ جائیداد پیسہ زیور گاڑی ہر چیز بٹور سکتی تھی۔

پھر ——

کل چار پانچ ماہ کی تو بات تھی۔

وہ ——

نہ بھی بٹورے تو آغا جان کے مرنے کے بعد اس کی بیوی کی حیثیت سے لاکھوں روپیہ اس کے حصے میں آ سکتا تھا۔

"اماں ——" اس نے ماں کی حالت نظر انداز کرتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔

"حیرانگی کی بات ہے کہ یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں سوجھی"

"تیرا مغز خراب ہو گیا ہے ——" ماں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

اماں نے اسے بے نقط سنا ڈالیں۔

وہ ہولے سے ہنسی۔

اور سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں نے آغا جان سے نکاح کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور میں ان کے ساتھ امریکہ جا رہی ہوں میرا دماغ خراب نہیں ہوا"

اماں بت بنی اس کا منہ تک رہی تھی۔

شگو پھر کہہ رہی تھی۔

"میں نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ اب پیچھے نہیں ہٹوں گی۔"

وہ ناشتہ کر کے اُٹھ گئی۔

اماں کے دل و دماغ کے جیسے پرخچے اڑنے لگے تھے۔ کبھی کبھی آنکھوں میں اندھیرا پھیلتا۔ کبھی تیز روشن بھر جاتی۔

شگو کلینک چلی گئی۔

اماں سر تھام کر بیٹھ گئی۔ اس خود سر اور سرپھری لڑکی نے انہیں دہلا دیا تھا۔

اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ اور کمرے میں آگئی۔

آغا جان کرسی پر بیٹھے تھے۔ اخبار بیڈ پر پڑا تھا۔ رات کی ڈیوٹی نرس کمرے سے جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ دیوار پر لگے چارٹ پر کچھ لکھ رہی تھی۔

شگو نے آغا جان کو سلام کیا۔

آغا جان نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"لیٹ آئی ہو——"

وہ آنکھوں میں شوخ سی چمک لاتے ہوئے بولی۔ "آپ میرا انتظار رہے تھے۔"

"بہت——" سسٹر رچنا نے ہنس کر کہا۔ "آغا جان تم سے کچھ زیادہ ہی مانوس ہو گئے ہیں۔"

"ہونا چاہیئے——" وہ اٹھلا کر بولی۔ اور چارٹ دیکھنے لگی۔

رچنا نے مسکراتے ہوئے اپنی چیزیں اٹھائیں ۔ اور آغا جان کو سلام کر کے کمرے سے نکل گئی ۔

"شیگی ـــــ" آغا جان نے چند لمحوں بعد اسے پکارا ۔

"جی ـــــ"

"صمد خان نے مجھے بتایا ہے"

"کیا ـــــ"

"کہ تم میرے ساتھ جا رہی ہو"

"جی ہاں ـــــ"

"تمہاری امی نے اجازت دے دی"

"نہیں ـــــ" وہ مستحکم آواز میں بولی ۔

آغا جان غیر شعوری طور پر کرسی میں آگے کو جھک گئے ۔

وہ ہنس پڑی ۔

اور ادا کے دلفریبی سے بولی ۔ "لیکن میں آپ کے ساتھ جا رہی ہوں"

انہوں نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا ۔

وہ ان کی کرسی کی پشت پر آ کر کھڑی ہو گئی ۔

"کیوں آغا جان"

"بھئی نہیں اپنی امی کی بات ـــــ"

"امی کو صرف ایک اعتراض ہے"

"پرائے لوگوں کے ساتھ نہیں بھیجنا چاہتیں"

"ہاں ـــــ"

"وہ اپنے طور سے شاید ٹھیک بھی سوچتی ہیں"

"اس سوچ کا حل سوچ لیا ہے میں نے"

"کیا ـــــ؟"

"کہ میں آپ سے شادی کر لوں" اس نے مضبوط لہجے میں کہا ۔

آغا جان پہلے تو جیسے بات سمجھ ہی نہ پائے ۔ لیکن جب سمجھے تو ایکدم سے کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے گھوم کر شگو کے سامنے آتے ہوئے بولے ۔

"کیا کہا تم نے ـــــ"

"جو سنا آپ نے ـــــ" وہ مسکراتے ہوئے کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی ۔

"تم سمجھ بھی رہی ہو کہ کیا کہا ہے تم نے" آغا جان کے دماغ میں دھماکے ہونے لگے ۔

"بہت سوچ سمجھ کر کہا ہے آغا جان ۔ میری ماں یوں آپ کے ساتھ جانے نہیں دے گی اور میں آپ کے ساتھ ضرور جاؤں گی ۔ میں آپ کو اکیلے نہیں جانے دوں گی ۔ آپ کے ـــــ بغیر ـــــ یہاں ـــــ اکیلی ـــــ نہیں رہوں گی"

"لڑکی ـــــ تم ـــــ تم ...." وہ بوکھلا گئے ۔

"میں نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ اب اس فیصلے سے مجھے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"لیکن ——"

آغا جان کی آنکھیں حیرت سے پھٹ جانے کو تھیں وہ اسے پوری آنکھیں کھولے تکے جا رہے تھے۔

"آغا جان میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ آپ کے ساتھ رہوں گی آپ کی خدمت کروں گی۔ دیکھ بھال کروں گی۔ ایک عورت جس طرح تیمارداری کر سکتی ہے۔ کوئی نہیں کر سکتا۔ آپ کو میری ضرورت ہے آغا جان" اس نے ایک ایک بات پر زور دے کر کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن ——" وہ سٹپٹا گئے۔

"لیکن میری ماں نہیں مان رہی۔ اسے منانے کے لئے صرف یہی کیا جا سکتا ہے۔"

"یہ بچگانہ فیصلہ ہے تمہارا —— تم ——" انہوں نے تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے اپنے گھر کا فرد سمجھتے ہیں نا۔" شگو کن انکھیوں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

"وہ تو دوسری بات ہے۔ نہیں — ایسا نہیں ہو سکتا — میری حالت۔ یہ عمر ——"

وہ بیڈ پر بیٹھ گئے۔ وہ بار بار نفی میں سر ہلا رہے تھے۔

شگو ان کے قریب آتے ہوئے بولی۔

"آغا جان —— آپ کی حالت اور عمر کے پیش نظر ہی تو میں آپ ے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔"

"اس کا انجام جانتی ہو۔ میں مر گیا تو ——" وہ بنا سوچے سمجھے لے ——

شگو نے جلدی سے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔ "میں ے فیصلہ کر لیا ہے۔ اپنے فیصلے سے آپ کو بھی آگاہ کر دیا ہے۔ ں کو راضی کرنے اور آپ کے ساتھ جانے کی صرف یہی صورت ہے پ سوچ لیں۔"

وہ کھڑکی کا پردہ ایک طرف سرکا کر کمرے کی چیزیں درست کرنے ل ——

آغا جان بیڈ پر گرنے کے انداز میں لیٹ گئے۔

شگو کن انکھیوں سے بار بار ان کو دیکھ رہی تھی۔

انہیں شادی کے لئے آمادہ کرنا سہل نہیں تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا۔

لیکن ——

اس نے بھی تہیہ کر لیا تھا۔ وہ بہت جذباتی انداز میں سوچنے گی تھی۔ ہاتھ آنے والی دولت کے سحر میں ڈوبی جا رہی تھی۔

چند لمحوں بعد آغا جان بیڈ میں اٹھ بیٹھے۔

"شیگی ——"

"جی ——"

"اِدھر آؤ ——"

"فرمائیے ——"

"اگر تو تو نے مذاق میں یہ بات کی ہے تو ——"

وہ ان کی بات کاٹتے ہوئے پوری سنجیدگی سے بولی۔

"یہ مذاق نہیں ہے آغا جان۔ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ میں نے کہا نا اماں کا اعتراض دور کرنے اور آپ کے ساتھ جانے کی صرف یہی صورت ہے ——"

آغا جان نے شاید پہلی بار غور سے اسے دیکھا۔ وہ بیڈ کے ساتھ ٹیک لگائے ان کے قریب کھڑی رہی۔

"ہوش کی بات کرو لڑکی۔ میں نے اس طرح کبھی سوچا بھی نہیں بی بی آغا کو فوت ہوئے سولہ سال ہو چکے ہیں۔ ان سولہ سالوں میں مجھے شادی کا کبھی خیال تک نہیں آیا۔ میری عمر کا تقاضا ——"

"آغا جان ——" وہ اداس چہرہ لئے ان کے سامنے کھڑی ہوگئی، پھر روہانسی آواز میں بولی۔

"اس وقت عمر کے تقاضے کو نہیں دیکھنا حالات کے تقاضے کو دیکھنا ہے۔ ٹھیک ہے آپ نہیں چاہتے —— تو ——"

وہ بات پوری کئے بغیر جلدی سے مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔

ں اقت اسے خود بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے کیا کر رہی ے، ایک ہی دھن تھی کہ اس آسان ذریعے سے لاکھوں روپیہ پالے۔

ا جان پھر نڈھال ہو کر گر گئے۔ وہ عجب کرب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ہی تو یقین ہی نہ آتا کہ شگو نے اتنی بڑی بات کہدی ہے۔ کبھی محض ان لگتا۔

لیکن

شگو کی صورت بھی آنکھوں میں گھوم جاتی۔ انہیں لگتا جیسے چھوٹی بچی کھلونے کے لئے ضد کر رہی ہو۔

اس دن آغا جان کے تینوں بیٹے بڑی بہو یو کے والی بہو اور کراچی کوئٹہ سے ان کے دو کزن انہیں دیکھنے آئے تھے خان صمد خان نے سے امریکہ جانے کی بات کرنا تھی۔ صلاح و مشورہ کے بعد سب کی ین ہفتے کی ڈیوٹی لگا دی گئی تھی۔ کہ وہ آغا جان کے ساتھ رہیں انہیں ف ملازم اور نرس کے ساتھ ہی تو نہیں رکھا جا سکتا تھا گھر کے اد کی بھی ضرورت تھی۔

چونکہ سب مصروف تھے۔ کوئی نوکری میں کوئی بزنس میں اور کوئی ھائی میں۔ اس لئے سب نے سوچا تھا کہ یوں باری باری اس کے اس رہیں گے۔

یو کے والا بیٹا خان اسد خان مع اپنی بیوی کے چند دن ہوئے آیا ا تھا اس نے امریکہ میں ہسپتالوں اور ماہرین معالج کے نام و پتے

اکٹھے کئے تھے۔

دیگر معلومات بھی حاصل کرلی تھیں۔ چونکہ وہ یوکے میں رہتے تھے اور امریکہ بھی جاتے آتے رہتے تھے۔ اس لئے یہ بھی طے پایا تھا کہ صمد خان کے ساتھ وہ بھی آغا جان کو امریکہ سب سے بہترین ہوسپٹل میں ایڈمٹ کروانے جائیں گے۔

نیویارک میں آغا جان کے دو کزن اور ایک بھتیجا رہتے تھے انہیں کے پاس جاکر پہلے ٹھہرنے کی صلاح ہوئی تھی۔ وہ لوگ چونکہ برسوں سے وہاں رہ رہے تھے۔ اس لئے مزید معلومات ان سے حاصل کرنا تھیں۔

وہی گائیڈ کر سکتے تھے کہ آغا جان کو کس ہوسپٹل میں ایڈمٹ کروایا جائے۔ ہوسپٹلز کے نام و پتے تو ان کے پاس تھے ہی۔ یہ ساری باتیں رات طے ہوگئی تھیں۔

صمد خان نے سب کو شیگی کے متعلق بھی بتا دیا تھا کہ وہ بہت اچھی خوش خلق اور دل و جان سے خدمت کرنے والی نرس ہے آغا جان سے گھل مل گئی ہے۔

آغا جان بھی اس سے بہت مانوس ہیں۔ اس لئے اس طرف سے اطمینان ہے۔

یہ سب لوگ اب آغا جان کو دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ آغا جان کچھ نڈھال نڈھال لگ رہے تھے۔

صمد خان نے یہ بات محسوس کی تو سب سے چھوٹے بھائی سعد
کہا۔

سعد خان ـــــ آغا جان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی "

ہاں ـــــ شاید پھر تکلیف ہوئی ہے "

سعد نے آغا جان کے قریب بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آغا جان
میں تکلیف ہے "

انہوں نے سر ہلایا۔ " لیکن گھبراؤ نہیں۔ تکلیف "قابل برداشت
س وقت "

ہاں درد ہے " اس نے لور پہ ہاتھ رکھا۔

معمولی ـــــ " وہ بولے۔

ات کچھ تکلیف ہوئی ـــــ " صمد خان نے تشویش سے
کہا۔

نہیں بھئی ـ کوئی خاص نہیں " وہ بولے۔ "یہ تو روزانہ کا معمول ہے
ایف بڑھ گئی کبھی کم ہوگئی "

پ بالکل ٹھیک ـــــ ہو جائیں گے آغا جان " خان بہروز نے ... دُھ
اتھاتے کہا۔

پھر بولا۔ " امریکہ میں بہت ماہر ڈاکٹر ہیں "

آغا جان نے سر ہلایا۔ پھر سب کو دیکھتے ہوئے بولے۔ "شاید
علم نہیں جاؤں "

"کیا ——" سب نے جلدی سے کہا۔

"آغا جان آپ کیا کہہ رہے ہیں" صمد بولے۔

"وہاں کے ذہین ڈاکٹروں سے تو بات بھی ہو رہی ہے" سعد نے کہا۔

"آپ نے علاج کے لئے جانا ہے بھائی" بہروز نے کہا "سیر سپاٹے کے لئے نہیں جو موڈ نہ بنے تو پروگرام کینسل"

"ہاں تو ——" صمد خان بولے۔

سب باتیں کرنے لگے۔

اور باتوں ہی باتوں میں آغا جان نے شیگی کی بات بھی سب کو بتا دی۔

سب گنگ اور دنگ سے ہوئے۔

آغا جان نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

اور بولے۔ "پگلی لڑکی۔ میری تیمارداری کا جنون ہو گیا ہے اسے۔ اتنا بڑا قدم اٹھانے کو تیار ہے"

"آپ بھی تو اس سے بہت مانوس ہیں" کسی نے کہا۔

"ہاں تو — اسی لئے شاید امریکہ نہیں جاؤں۔ یہیں علاج ہو رہا ہے بس ٹھیک ہے"

"نہیں آغا جان۔ ڈاکٹر آصف اور شاہد تو کہہ رہے ہیں کہ جتنی جلدی ہو سکے ہم آپ کو وہاں لے جائیں"

آغا جان نے سر ہلایا۔

"مس شیگی کی بجائے کسی اور نرس کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں" اسد نے کہا۔ تو آغا جان نے نفی میں سر ہلایا۔

تھوڑی دیر آپس میں ہولے ہولے سرگوشیوں کے انداز میں سب باتیں کرنے لگے۔

بہروز جان آغا جان کے قریب ہی بیٹھے تھے۔

وہ ان کے کان کے قریب منہ لے جاتے ہوئے شوخی سے بولے۔ "آغا جان، حرج کیا ہے۔ کر لیں شادی"

"بہروز ——" آغا جان نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

بہروز پھر اسی شوخی سے بولا۔

"امریکہ آپ کو ضرور بھجوانا ہے آغا جان، اور آپ نے اس لڑکی کے بغیر جانا نہیں اور اس لڑکی نے اس وقت تک نہیں جانا جس وقت تک اس کی ماں کا اعتراض دور نہ ہو جائے"

"ہاں ——"

"تو پھر نتیجہ کیا نکلا ——"

وہ ہنسے تو سب نے ان کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے خان کاکا ——" خان صمد خان نے بہروز خان کی طرف دیکھا۔

"انہیں کہہ رہا ہوں —— کہ ——" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"چپ رہو بہروز ——" آغا جان بولے۔

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔

پھر کھسر پھسر ہونے لگی۔

"آغا جان ——" صمد خان بولے۔

"کیا ہے ——"

"آغا جان مس شیگی نے مجھے کہا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ جا رہی ہیں
ہیں نے تو ان کا پاسپورٹ بھی بنوا لیا ہے۔ اور دوسری تیاریوں کے
لئے انہیں روپیہ بھی دے دیا ہے۔ ان کی والدہ کو یہاں باقاعدگی سے
ہر ماہ تنخواہ دینے کا بھی کہہ دیا ہے۔"

"ہاں لیکن یہ سب باتیں تم نے شیگی سے کہی ہیں۔ اس کی ماں سے
نہیں۔ وہ اپنی بیٹی کو غیر لوگوں کے ساتھ بھیجنے پر آمادہ نہیں۔ شیگی تو جانا
چاہتی ہے۔"

"بڑی ذہین لڑکی ہے ——" بہروز بولے۔ "کتنا اچھا حل ڈھونڈا
ہے اس نے ——"

وہ مسکرا رہے تھے ——

لیکن آغا جان اور ان کے بیٹے ناخوش تھے۔

بڑی گھمبیر سی خاموشی فضا میں چھا گئی۔

تو بہروز خان نے مسکراتے ہوئے سب کو دیکھا

پھر بولے۔ "یار اس میں حرج کیا ہے۔ شادی کوئی گناہ نہیں۔

ں عمر میں بھی کی جا سکے۔ جب لڑکی رضامند ہے اور وہ ایک نیک ارادے
سے ایسا کر رہی ہے، تو تم لوگ پریشان کیوں ہو۔"

بہروز کی بات کا کسی نے جواب نہ دیا۔

سب سر جھکا کر بیٹھے رہے۔

عورتیں دوسرے کمرے میں تھیں۔

صمد خان کی بیگم تھوڑی دیر بعد ادھر آئیں تو اس گھمبیر خاموشی کو محسوس
کرتے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے سب بڑے چپ چپ ہیں۔"

"کچھ نہیں بھابی" اسد خاں بولے۔

"کوئی بات تو ہے"

"بات یہ ہے بہو بیگم ——" بہروز خان نے اسے مختصراً ساری بات
بتا دی۔

اور ——

پھر یہ بات ان کے سارے خاندان تک پہنچ گئی۔

بات حیرانی کی تھی۔

لیکن قابل بحث تھی ضرور۔

بہروز خان نہ ہوتے تو شاید بات حیرانی ہی تک محدود رہتی۔ بحث
تمحیص کا جواز نہ ہوتا۔

لیکن اس بات کو عملی جامہ پہنانے میں برائی نہ تھی۔ اس لئے انکی

انہیں سن کر کچھ ان کے حق میں ہو گئے۔

کچھ نے ان کی مخالفت کی۔

"باپ کی خوشی مطلوب ہے اور انہیں آخری چند مہینے سکون دینا چاہتے ہو تو اس لڑکی کی بات مان لو۔"

"لیکن خوشی اور سکون کے لیے اس جوان لڑکی کی زندگی داؤ پر لگا دیں ۔۔۔"

"یہ تم نہیں کر رہے۔ وہ بخوشی یہ قدم اٹھانے کو تیار ہے۔"

"وہ نہیں جانتی کہ آغا جان چند ماہ . . . . ."

"وہ نرس ہے سب کچھ جانتی ہو گی۔"

"پھر بھی ۔۔۔"

"تمہیں اس سے کیا، وہ خود کہہ رہی ہے۔ اسے کوئی مجبور نہیں کر رہا ۔۔۔"

"یہ بچپنے کی جذباتیت ہے"

"بچپنا نہیں ۔۔۔ وہ جوان لڑکی ہے۔ اپنا برا بھلا سوچ کر ہی کیا ہے۔"

باتیں ہوتی رہیں۔

پھر وہ ایک پہلو یہ بھی سامنے لائے، کہ غریب لڑکی ہے امارت کا تجربہ کرنا چاہتی ہو گی۔

کر لینے دو۔ امریکہ جانا اس کے لیے بہت بڑی بات ہے۔

اور ۔۔۔

ویسے بھی اس طبقے میں رشتوں کا مسئلہ بڑا سلگتا ہوا مسئلہ ہے۔ کسی غریب نوجوان سے کہیں اچھا سمجھا ہو گا۔ کہ امیر بوڑھے سے شادی کر لے۔

"اوہو خان کاکا" صمد خان نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "صرف دولتمند بزرگ کی بات نہیں، آغا جان کو کینسر ہے، اور ڈاکٹروں کی متفقہ رائے ہے کہ وہ چند ماہ اور جی سکتے ہیں"

"یہ چند ماہ انہیں کسی خدمت گزار عورت کے ساتھ گزار لینے دو ۔۔۔"

"چند ماہ بعد ایک نوجوان لڑکی بیوہ ہو جائے"

"یہ اس نے بھی سوچا ہو گا"

"ہمارا فرض ہے ۔۔۔ کہ اسے سمجھائیں ۔۔۔ یہ ہماری خودغرضی ہو گی ۔۔۔"

"تمہاری کیوں ۔۔۔ تم اسے مجبور نہیں کر رہے۔ سمجھانا چاہتے ہو تو سمجھا دیکھو"

صمد خان نے اسی شام شگو سے بات کی۔ اسے سمجھایا۔

بہت سمجھایا ۔۔۔ بہت ۔۔۔ سمجھایا۔

لیکن ۔۔۔

وہ اپنے ارادے پر قائم تھی۔

"مس شیگی ——" صمد خان تشویش ناک نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔ "آغا جان کو کینسر ہے۔ اور یہ کینسر ——"

"میں شاید آپ سے زیادہ جانتی ہوں"

"پھر بھی آپ ——"

"ہاں خان صاحب۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے اور جب فیصلہ کر لوں تو مجھے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔"

"پلیز —— اپنی عمر اور آغا جان ——"

"خان صاحب۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ میں یہ شادی صرف اس لئے کرنا چاہتی ہوں کہ میری ماں کو اعتراض نہ ہو۔ گلی محلے والوں کو باتیں کرنے کا موقع نہ ملے۔ اور میں آغا جان کے ساتھ رہ کر پوری لگن اور خلوص سے تیمارداری کر سکوں۔"

وہ آغا جان کی شفقت اور محبت پر اپنے آپ کو قربان کر دینے کی باتیں کرنے لگی۔

صمد خان اس کی باتوں سے بیحد مرعوب ہوئے۔ وہ سر جھکائے بیٹھے سنتے رہے۔ اور شیگی بولتی گئی۔

"جوان لڑکی کی شادی کسی بوڑھے سے کوئی اچھوتی انوکھی بات نہیں۔ آئے دن سننے میں آتا ہے۔ اور پھر —— میں یہ شادی کچھ پانے کے لئے تو نہیں کر رہی۔ ایک نیک مقصد ہے میرے سامنے۔ اک لگن۔ ہے۔ جذبہ ہے آغا جان کی چند ماہ کی زندگی کو میں اگر کچھ پر سکون

سکوں۔ تو آپ کو کیا اعتراض ہے۔ میں نرس ہوں اور یہ میرے پیشے کا تقاضا ہے۔ تقدس ہے۔"

خان چپ ہو گئے۔

شگو بڑی چالاکی اور عیاری سے انہیں مرعوب و متاثر کرتی رہی نشانے پہ بیٹھ رہا تھا۔ اس لئے وہ بہت خوش ہو رہی تھی۔

"میں نے اپنی ماں کو رضامند کر لیا ہے۔ وہ تیار ہیں۔ آپ چاہیں تو بندھن کسی وقت بھی بندھ سکتا ہے۔"

شگو نے مستحکم لہجے میں کہا۔

خان صمد خان اس کا منہ تکنے لگے۔

شگو گھر آئی تو اماں صحن ہی میں چارپائی پر بیٹھی تھی۔

اس نے سلام کیا۔ اماں نے جواب نہیں دیا۔

وہ ناراضگی جانتی تھی۔ اس لئے کچھ کہے بغیر اندر چلی گئی۔ اماں نے اسے کپڑے بدل کر چائے وائے پینے کو بھی نہیں کہا۔

شگو نے کپڑے بدلے اور پلنگ پر آڑی لیٹ کر چھت کی کالی دھواں کھائی کڑیوں پر نگاہ جما دی۔

اماں صبح ہی سے ناراض تھی۔ اسے پتہ تھا۔ لیکن اس ناراضگی کے باوجود اس نے صمد خان سے بات کر لی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ سب لوگ تیار ہو جائیں گے۔

وہ تیار ہو گئے

تو اس کی سکیم کامیاب ہو جائے گی۔

لاکھوں روپے بیٹھے بٹھائے مل جائیں گے۔

لاکھوں روپے

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

اس کا من سرشار ہو گیا۔

وہ من ہی من پلان بنانے لگی۔

کم از کم ایک لاکھ حق مہر لکھواؤں گی۔ یہ مہر کیش لوں گی۔ دے دیں گے۔ کیا کمی ہے ان کے پاس پیسے کی۔ نہیں کیش نہیں۔ حق مہر کوٹھی لکھواؤں گی۔

آغا جان کی کئی کوٹھیاں پشاور میں ہیں۔ کیش تو میں ان سے بٹور لوں گی۔ — —

اور زیور —

آغا جان کے پاس آغا بی بی کا ڈھیروں سونا پڑا ہے۔ ایک دفعہ بتایا تھا انہوں نے۔ وہ سارا سونا میرا ہو گا۔ میرا — گاڑیاں بھی تو تین ہیں ان کے پاس۔ ایک تو مجھے دے ہی دیں گے۔ یہ سب چیزیں ان کے امریکہ جانے سے پہلے ہی ان سے لینا ہوں گی۔ کیا خبر امریکہ سے ان کی لاش ہی واپس آئے۔ پھر صرف چار پانچ ماہ کی تو بات ہے۔ پھر —

وہ چشم تصور میں اپنے آپ کو پانچ چھ ماہ بعد کی پوزیشن میں دیکھنے لگی۔ اپنے ساتھ طاہر کو بھی دیکھ رہی تھی۔ دولت کی ریل پیل اور خوبصورت سی زندگی۔ ٹھاٹھ باٹھ بہت کچھ —

وہ کافی دیر وہیں پڑی رہی ۔

اماں اندر نہیں آئی ۔

باورچی خانے میں کھٹ پٹ ہونے سے اسے اندازہ ہوا کہ اماں شاید رات کو زہر مار کرنے کے لئے کچھ بنا رہی ہے ۔

وہ بستر سے اٹھی ۔

بالوں میں برش کیا ۔

ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک لگائی اور کمرے سے باہر نکل گئی ۔ اس کا ارادہ طاہر کی طرف جانے کا تھا ۔

وہ اماں سے کچھ کہے بنا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی ۔ سیڑھیوں کی مرمت ہونے کے باوجود ان کا پرانا پن دور نہیں ہوا تھا ۔

وہ چھت پر آگئی ۔

درمیانی دروازے سے دیکھا ۔ طاہر کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا ۔ اور ریڈیو پر کسی نغمے کی دھن ہولے ہولے بج رہی تھی ۔ یہ دھن بہت ہی سوگوار تھی ۔

شگو کو اس دھن سے طاہر کے موڈ کا اندازہ ہو گیا ۔

وہ سیدھی اس کے کمرے کی طرف آئی ۔ دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے آواز دی ۔ " طاہر ——"

طاہر سامنے ہی پلنگ پر اوندھا پڑا تھا ۔ تکیے پر بازوؤں کا حلقہ بنا کر سرہان میں رکھا تھا ۔ آنکھیں بند تھیں ۔ لیکن پاؤں سوگوار دھن

...ہولے ہولے ہل رہے تھے ۔

طاہر —— " وہ اندر آگئی ۔

...سے طاہر کا سوگوار انداز بالکل نہیں بھایا ۔ اس کی آنکھوں میں تو ...ں اور جگمگاتے مستقبل کی پرچھائیاں تھیں ۔ وہ طاہر کی آنکھوں میں ...ہر تو دیکھنا چاہتی تھی ۔

طاہر نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا ۔

لیکن ——

...ہی تو اٹھا نہ جواب دیا —— ویسے ہی پڑا رہا ۔ شگو نے ہاتھ ...ائیز پر رکھا چھوٹا سا ریڈیو بند کر دیا ۔

طاہر —— " وہ پلنگ کے قریب آگئی ۔ " بولتے کیوں نہیں ——"

وہ چپ رہا ——

شگو نے پلنگ کے تکیے پر جھکتے ہوئے اس کے بالوں میں ...لیاں پھیرتے ہوئے کہا ۔ " اٹھو نا طاہر ——"

طاہر نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ۔ دونوں ہاتھوں کی ...لیوں سے بال سلجھانے لگا ۔

شگو نے غصہ منانے کی بجائے مسکرا کر اسے دیکھا اور گھوم ...س کے سامنے آتے ہوئے بولی ۔

کیا ہوا ہے ——"

"کچھ نہیں ـــــ"

"ناراض ہو ـــــ"

وہ کچھ نہیں بولا۔

گود میں رکھے ہاتھ بیقراری سے مسلتا رہا۔

وہ اس کے قریب ہی پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔

"لگتا ہے اماں نے تمہیں بھی میری سکیم سے آگاہ کر دیا ہے"

وہ بولی۔

"سکیم ـــــ ہونہہ ـــــ"

"سکیم ہی ہے طاہر ـــــ سمجھو تو ـــــ"

"مجھے ضرورت نہیں سمجھنے کی"

"اس طرح ناراض رہ کر سمجھ بھی نہیں سکو گے"

وہ ہونٹ کاٹنے لگا۔

شگو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "طا
میں جو کچھ بھی کر رہی ہوں، اس میں ہم دونوں کی بھلائی ہے"

"بس کرو ـــــ" وہ چیخا۔

شگو جلدی سے بولی۔ "جذباتی نہیں ہو۔ میری بات سنو پہلے
قائل ہو جاؤ گے"

"ساری عمر ہو گئی تمہاری باتیں سنتے اور قائل ہوتے۔ یہی غلطی کی
میں نے"

"طاہر ـــــ یہ تم ہو"

"ہاں ـــــ میں ہی ہوں ـــــ تمہارے اشاروں پر بدھو کی طرح
چلنے والا"

"اب کیا ہو گیا ہے"

"یہ مجھ سے پوچھتی ہو ـــــ"

"کس سے پوچھوں"

"اپنے دل سے اپنے ہوس پسند من سے اپنے لالچی ـــــ"

"طاہر ـــــ"

"میں یہ سب برداشت نہیں کروں گا شگو"

"ہوں ـــــ یہی ہے تمہاری محبت۔ یہی ہے پیار"

"ہاں ہاں محبت تو تمہاری ہے پیار بھی تمہارا ہے۔ تم ـــــ تم ـــــ"

طاہر بولا۔

"ہاں طاہر یہ میری محبت اور پیار ہی ہے جو میں اتنا بڑا قدم تمہاری اور
اپنی کامیاب زندگی کی خاطر اٹھا رہی ہوں"

"میری اور اپنی"

"ہاں طاہر ذرا غصہ کم کرو۔ تو کہوں بھی، کہ میرا پلان کیا ہے"

"جو تم کرنا چاہتی ہو کرو۔ کسی صفائی یا دلیل کی ضرورت ہے کیا"

طاہر نے کہا۔

"ہے طاہر ـــــ اس لیے کہ اس پلان میں تم بھی ایک کردار ہو"

"مجھے معاف ہی رکھو"

شگو نے طاہر کی طرف غور سے دیکھا

اس کی آنکھوں سے کرب مترشح تھا اس کا چہرہ سوگوار تھا بہت لٹا پٹا لگ رہا تھا۔

شگو کو اس پر ٹوٹ کر پیار آگیا۔ اس نے بے اختیارانہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔

"طاہر۔ تم میری زندگی ہو۔ میری جان ہو —— یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو"

طاہر نے اپنے ہاتھوں میں اس کے ہاتھ پکڑ کر نیچے کئے غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

ان آنکھوں میں پیار کا بحر ذخار تھا۔

طاہر نے اس کے ہاتھ سختی سے پکڑتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ "تم نے ایسا کیوں کیا۔ اتنا خوفناک فیصلہ"

شگو نے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں میں ہی رہنے دیئے۔

ہولے سے مسکرائی اور بولی۔

"تم سنو تو بتاؤں بھی"

"شگو میرا صبر نہیں آزماؤ۔ مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ تمہارا مقصد کچھ بھی ہو۔ لیکن یہ ہے تو حقیقت کہ تم شادی کر رہی ہو" وہ گھٹی گھٹی آنسوؤں بھری آواز میں بولا۔

شگو پر اس کی دکھ بھری فریاد کا ذرہ بھر اثر نہیں ہوا۔ بلکہ اسے س پر غصہ آنے لگا۔ جسے وہ بمشکل کنٹرول کر رہی تھی۔

"شگو ایسا نہیں کرنا۔ نہیں کرنا شگو ——" طاہر کی آنکھوں میں تیر گئی۔

"میں جی نہیں سکوں گا۔ مرجاؤں گا۔ میں نے بچپن سے تمہیں چاہا ہے یں اپنا اور صرف اپنا سمجھا ہے۔ اب تم کسی اور کی ہو جاؤ یہ مجھ سے داشت نہیں ہوگا"

وہ چپ ہو گیا۔

شگو سختی سے بولی۔ "اور بھی کہہ لو جو کچھ کہنا ہے"

"تم ایسا کیوں کرنا چاہتی ہو"

"اس سوال کا جواب میں دیتی ہوں۔ تم سنبھلو بھی۔ سن کر سمجھنے کی کوشش بھی کرو نا"

وہ اک اداس اور سوگوار نگاہ اس پر ڈال کر چپ ہی رہا۔

شگو اس کے قریب کھسک کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "میں یہ سب کچھ اپنی اور تمہاری بھلائی کے لئے کر رہی ہوں"

طاہر نے جھلا کر کچھ کہنا چاہا۔ تو شگو نے جلدی سے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور بولی۔

"پہلے میری سن لو"

طاہر نے سر جھکا لیا۔

شگو بولی "طاہر تم مجھے جانتے ہو۔ جانتے ہو نا"

وہ چپ رہا۔

"جانتے ہو نا" شگو نے اس کا کندھا ہلایا۔

طاہر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں نے ہمیشہ ایک سنہری روپہلی خوشگوار اور خوبصورت زندگی کا خواب دیکھا ہے۔ اس خواب کی تعبیر مجھے پانا ہے۔ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ہمیشہ فخر سے سچ کہا ہے۔ کہ مجھے دولت چاہیئے روپیہ پیسہ۔ جس سے زندگی کا لمحہ لمحہ روشن ہو سکے۔ میں تم سے ہمیشہ کہتی آئی ہوں کہ مجھے آپا نہیں بننا"

وہ رکی ———

طاہر کو غور سے دیکھا جو سر جھکائے دونوں ہاتھوں کو الجھا الجھا کر مروڑے جا رہا تھا۔

"لیکن ——" اس نے سلسلہ گفتگو جاری رکھا۔ "میرے خوابوں کی تعبیر مجھے ملتی نظر نہیں آئی تمہارے حالات......"

"بد سے بدتر ہوتے گئے" طاہر تلخی سے بولا۔

"یہ حقیقت ہے طاہر — تم نہ تو سی ایس ایس کر سکے نہ ہی باہر جا سکے۔ حالات اچھے ہونے کی بجائے بگڑ گئے۔ تم اب تم اسی معمولی سی نوکری پر ہو جو رفیق پھوپھا کے مرنے سے پہلے تمہارے

جیب خرچ ہی کو پورا کرتی تھی۔ اور اب اس کا زیادہ حصّہ تمہیں گھر یو اخراجات پورا کرنے کے لئے خرچ کرنا پڑتا ہے"

وہ چپ رہا۔

شگو پھر بولی "مجھے بھی نوکری تو ملی۔ لیکن اس سے اتنا کچھ نہیں بن سکا۔ جس کی مجھے برسوں سے خواہش ہے۔ ضرورت ہے اس تنخواہ سے تو گھر کی پوری طرح دیکھ بھال بھی نہیں ہو پاتی۔ مکان کی مرمّت پوری طرح نہیں ہو سکی۔ بیٹھک ڈرائینگ روم نہیں بن سکا۔ وہی پرانا اماں کے جہیز کا فرنیچر ہے۔ وہی ہاکر سے لینا پڑ گیا۔ اتنے پیسوں سے صرف یہی ہوا ہے کہ اماں نے گرتی سیڑھیاں مرمت کروالی ہیں اور کچھ ڈھنگ کے کپڑے ہم ماں بیٹی پہننے لگی ہیں"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو" طاہر تپ کر بولا۔ "ہمارا جس طبقے سے تعلق ہے اس کی یہی حالت ——"

وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی۔

"طاہر تم تو خود میرے ساتھ رنگیلے اور خوبصورت پلان بنایا کرتے تھے۔ اس طبقے سے نکل جانے کی تمہاری بھی تمنّا تھی۔ حسین ازدواجی زندگی کے خواب صرف میری نہیں تمہاری آنکھوں میں بھی لہراتے تھے"

"لیکن یہ سب کچھ مجھے نہیں ملا۔ نہیں مل سکتا"

"ہتھیار ڈال دیئے"

"تو کیا کروں، قسمت سے کیسے لڑوں"

"میں لڑ رہی ہوں۔ میں یہ سب کچھ پاؤں گی۔ اسی لئے تو میں اس بوڑھے مالدار مریض سے شادی کرنا چاہتی ہوں"

طاہر نے بیقراری سے اسے دیکھا۔

"سوچ کے زاویے بدلو طاہر — ہم دونوں ہی دولت پانا چاہتے ہیں۔ یہ دولت نہ تو تمہیں مل سکی نہ مجھے۔ لیکن اب موقعہ مل رہا ہے۔ لاکھوں روپے پانے کا"

"شگو ——"

"ہاں طاہر — اس بڈھے سے میں شادی صرف اسی لئے کرنا چاہتی ہوں، وہ اتنا دولت مند ہے کہ اس کے مرنے کے بعد جو قانونی طور پر حصہ مجھے مل سکتا ہے، وہ کئی لاکھوں کا ہو سکتا ہے۔ شادی پر حق مہر اور زیورات کی صورت میں بھی مجھے لاکھوں کا فائدہ ہے۔ یہ سب ——"

"شگو ——" طاہر نے شگو کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ آج — آج زندگی میں پہلی بار اسے شگو کا چہرہ انتہائی مکروہ نظر آیا۔ گھبرا کر اس نے نگاہ جھکالی۔

وہ دولت پانے کے لئے کتنا گھناؤنا سوانگ بھر رہی تھی۔ طاہر کو اس سے نفرت سی محسوس ہوئی۔

"تم کس قدر خود غرض لالچی اور ہوس زدہ لڑکی ہو" وہ تنفر سے اسے

دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں —— ہوں ——" شگو مضبوط لہجے میں بولی۔ "میں نے ہمیشہ دولت پانا چاہی ہے۔ یہ بات تم جانتے ہو۔ بلکہ سب جانتے ہیں، مجھے پیسہ چاہیئے۔ یہ سچائی ہے۔ اور میں نے کبھی جھوٹ بول کر اس ننگی سچائی کو نہیں چھپایا۔ تم نے بھی تو اس حقیقت کو کبھی نہیں جھٹلایا۔ شروع سے میرا ساتھ دیتے آئے ہو۔ میرے ساتھ شریک رہے ہو۔ کبھی برا نہیں کہا —— آج —— آج —— کیا ہو گیا ہے"

وہ چند لمحے رُکی۔

اور پھر بولی۔

"مجھے یہ آسان ترین ذریعہ نظر آیا ہے۔ وہ بڈھا چار پانچ ماہ سے زیادہ نہیں جی سکے گا۔ اور ان چار پانچ ماہ میں مجھے وہ سب کچھ مل سکتا ہے، جو میں نے ہمیشہ سے چاہا ہے"

طاہر چپ رہا۔

شگو کوئی نئی بات نہیں کہہ رہی تھی یہ سب کچھ تو وہ برسوں سے سن رہا تھا۔ صرف موقعہ اب ہاتھ لگا تھا۔

وہ بولے گئی۔

طاہر خاموشی سے سنتا رہا۔

اسے شگو پر ترس آنے لگا۔

"وہ مر جائے گا ـــــ تو ـــــ" شگو نے لمبی چوڑی موثر تقریر کرنے کے بعد کہا۔

طاہر جو اس کی تقریر سے قدرے مرعوب ہو گیا تھا، جلدی سے بولا۔ "جو نہ مرا ـــــ تو ـــــ"

شگو ہنس پڑی۔

"غصہ اسی بات پہ ہے تمہیں ـــــ میرے مجنوں ـــــ وہ اس سے پہلے بھی مر سکتا ہے۔ اس کی بیماری آخری سٹیج پہ ہے۔ یہ تو دولت کے تقاضے ہیں۔ جو اسے اتنی کثیر رقم خرچ کر کے باہر علاج کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔ وہ واپس مر کر ہی آئے گا۔ ہو سکتا ہے اپنے آبائی گاؤں میں مرنا چاہے تو چند دن پہلے لوٹ آئے گا۔"

طاہر نے پھر سر جھکا لیا۔

"طاہر پانے کے لئے کچھ دینا بھی پڑتا ہے۔ یہ اتنا بڑا قدم جو میں اٹھا رہی ہوں نا۔ پانچ سات لاکھ تو پا لینا معمولی بات ہے دس بیس لاکھ بھی ہو سکتا ہے حصے آ جائے۔ ذرا سوچو تو ہم لوگ ہزاروں بھی نہیں بنا پائے۔ لاکھوں کی بات ہے۔"

"ہوں ـــــ"

"اس کے بعد ـــــ ہم دونوں ـــــ طاہر ذرا سوچو نا۔ خوبصورت سجا ہوا بنگلہ، چمکتی ہوئی گاڑی اور بھاری بنک بیلنس، ہم لوگ کس ٹھاٹھ سے اور کس شان سے رہا کریں گے۔"

طاہر کچھ نہیں بولا۔

تو شگو نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر استفہامیہ انداز میں چہرہ ہلایا۔

طاہر نے اپنا چہرہ اس کے ہاتھ سے چھڑا کر سر جھکا لیا۔

"اب کیا سوچنے لگے"

"کچھ نہیں"

"غلط باتیں تو نہیں کیں نا میں نے"

"شاید نہیں"

"تو پھر ٹھیک سے بولتے کیوں نہیں۔ کیا مسئلہ ہے"

"کچھ نہیں"

وہ چند لمحے اسے تکتی رہی۔

پھر ـــــ

کوئی خیال ذہن میں رینگنے لگا۔

وہ چند لمحے مضطرب ہوئی پھر طاہر کو کندھے سے پکڑ کر تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔

"کیا سوچ رہے ہو۔ یہی نا کہ اس بڈھے کے مرنے کے بعد میں بیوہ ہو گئی، تو پھر تم مجھ سے شادی کرنا پسند نہیں کرو گے۔"

طاہر نے ہولے ہولے سر اٹھایا۔ کندھے پہ رکھا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پیار سے دباتے ہوئے سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں – یہ بات نہیں شگو. تم میرے لئے وہی رہوگی. جو ہمیشہ سے ہو. میری جان. میری زندگی. میری روح. ہو تم۔"

اس نے جھٹکے سے شگو کا ہاتھ کھینچا اور وہ پوری کی پوری اس کی جھولی میں آن گری۔

وہ اس کے بالوں پر اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے بڑے جذباتی لہجے میں بولا۔ "شگو مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ وہ چاہے بڈھا ہے چاہے بیمار۔ بنے گا تو تیرا شوہر — میں کیسے برداشت کر پاؤں گا۔ کیسے ——"

چند لمحے شگو ویسے ہی اس کی بانہوں میں سمٹی رہی۔ پھر الگ ہوتے ہوئے بولی۔ "شادی اک سوانگ ہوگی طاہر — میں تمہاری امانت ہوں۔ اور اس میں خیانت نہیں ہوگی۔ یقین رکھو۔ وہ برلب گور بوڑھا میرے قریب بھی نہیں پھٹکے گا سمجھے۔"

"شگو ——" طاہر نے والہانہ انداز میں پھر بازو پھیلا دیئے۔

اور ——

شگو ان بازوؤں میں سما کر اس کے سینے سے لگ گئی۔

دونوں میں اتفاق رائے سے سمجھوتہ ہوگیا تھا۔

ا نے سنا حیرت سے انگلی دانتوں تلے داب لی۔ اک بہتر سالہ ے بائیس تیئیس سالہ نوجوان لڑکی سے شادی تو شاید اتنی حیران ی۔ حیرانی تو اس بات سے تھی کہ وہ بوڑھا کینسر کا مریض تھا اور بعد اس کی موت یقینی تھی۔

گو کو قریب سے جاننے والے جان گئے تھے کہ دولت ری اس لڑکی نے یہ قدم کیوں اٹھایا ہے۔ لیکن سب لوگ ے جانتے نہیں تھے نا — اسی لئے حیران ہو رہے تھے۔ اور گوشیاں کر رہے تھے۔

گو کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ اپنے فیصلے سے مطمئن تھی۔ ے اماں طاہر اور پھپھو کو راضی کر ہی دیا تھا۔ یہی لوگ اس سے متعلق باقی سب کو اس نے صفر سے ضرب دے ڈالی تھی۔

آغا جان کے خاندان میں بھی جو کچھ ہوا تھا۔ اگر بہروز خان اتفاق ہی

سے خبر گیری کو نہ آئے ہوتے تو بات نہیں بننا تھی۔

بہر حال

طوفان تو دونوں طرف اٹھے۔ لیکن طوفان سمٹ جانے ہی کو تو اٹھتے ہیں۔ بے شک کتنی ہی تباہی پھیلا دیں۔ کتنا ہی نقصان کر ڈالیں۔ بالآخر سمٹ ہی جاتے ہیں۔

نکاح سادگی سے ہونا قرار پایا۔

لیکن

امیر لوگوں کی سادگی میں بھی پرکاری ہوتی ہے۔

آغا جان کی بڑی بہو گل پری نے کہا۔

"جوان لڑکی ہے۔ اس کی تو پہلی بار شادی ہوگی۔ شادی کا جوڑا ضرور بننا چاہیئے۔ اور زیورات بھی۔ وہ آغا بی بی کی جگہ لے رہی ہے۔ ہمیں ذہنی طور پر اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے آغا بی بی کے شایان شان اس کا استقبال کرنا چاہیئے۔"

"آغا بی بی ــــ جو ہماری بچیوں کے برابر ہے۔" دوسری بہو شہزینے نے مسکرا کر کہا۔

"قسمت کے کھیل ہیں سب۔" تیسری پروشے بولی۔ "ویسے آغا جان خوش نظر آتے ہیں۔"

"مرد جو ٹھہرے"

"عجیب ہی لگتا ہے"

"عجیب تو لگتا ہے۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ خان نجیب اللہ خان نے اسی برس کی عمر میں تیرہ سالہ لڑکی سے نکاح نہیں کیا تھا۔ یہ تو ہمارے عزیزوں میں ہوا ہے۔"

"شیگی تو بیس بائیس برس کی ہوگی۔"

"ہاں ــــ اتنی تو ہے ــــ"

"شادی ایک نیک مقصد کے لئے کر رہی ہے۔ نرس جو ہوئی۔"

"نیک مقصد تو جو ہے سو ہے۔ دولت کی خاطر کر رہی ہے۔"

"چلو یہی سہی ــــ"

"اسی لئے تو کہہ رہی ہوں۔ دھوم دھام بے شک نہ ہو۔ لیکن شیگی کے قیمتی ملبوسات اور زیورات ضرور ہونے چاہئیں۔"

"زیورات تو آغا جان کے پاس اتنے ہیں کہ ــــ"

"لیکن وہ سب گاؤں میں ہیں"

"خان کہہ رہے تھے ایک جوڑا اور زیور کا ایک سیٹ یہیں سے بنوا لیا جائے۔ باقی زیورات اسے گاؤں جا کر ــــ"

"گاؤں بھی جانا ہے"

"ہاں ــــ آغا جان نکاح کے بعد شیگی کو گاؤں لے جانا چاہتے ہیں ــــ"

"لیکن امریکہ ــــ"

"وہیں سے چلے جائیں گے۔"

"کتنے دن لگیں گے اور ——"

"بس یہی ہفتہ دس دن ——"

"تو آغا جان یہ دن اپنے گاؤں میں گزارنا چاہتے ہیں"

"ہاں ——"

"علاج یہاں ہو رہا ہے —— دوا ——"

"شیگی ساتھ ہوگی —— دوائیاں اور ہدایات ڈاکٹر سے لے لے گی"

"ہم سب لوگ بھی جائیں گے وہاں"

"اور نہیں تو کیا۔ ساس کا استقبال نہیں کرنا؟"

"دونوں بہوئیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں، طنز بھی تھا، تمسخر بھی، سنجیدہ بھی ہو رہی تھیں۔

گل پری بڑی بہو تھی۔ اس شادی کا اہتمام اس نے کرنا تھا وہ چاہتی تھی شیگی کو اپنے خاندانی دستور اور روایات کے مطابق بیاہ کر لائے۔

"میرے خیال میں تو کسی کو گاؤں بھیجا جائے"

"کس لئے"

"بھئی کچھ زیورات لے آئے"

"ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔ دلہن کو سجانا ضرور ہے"

"یہی تو میں کہتی ہوں۔ اس لڑکی کی تو پہلی شادی ہے۔ جوان ہے وہ اس کے دل میں تو امنگیں ہوں گی"

ریلنے نے ہنس کر شوخی سے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا "امنگیں ہے آغا جان کی بھی جاگ اٹھی ہیں"

اے ہٹ" گل پری بھی زیر لب مسکرائی۔

ناجان کا چہرہ ویسے دمکنے لگا ہے ——" شرینے نے بھی

——

بھئی تم یہ باتیں چھوڑو مجھے صلاح دو۔ کہ کیا کرنا ہے۔ کپڑے تو یہیں سے ہ لگ کیا زیور بھی یہیں سے خریدا جائے"

ہیں بھئی کیا ضرورت ہے۔ ڈھیروں سونا پڑا ہے آغا جان کے دیں۔ کوئی جا کر لے آئے"

ہی چلی جاؤ —— شرینے ——"

ے اتنا سفر کرو ،"

نا کیا لے ایبر جاؤ۔ اور زیورات لے آؤ"

ٹھیک ہے چلی جاتی ہوں۔ یہ خبر تو گاؤں میں بھی تو پہنچ گئی ہوگی —— دیکھ لوں گی"

دل کی ہمیں پرواہ نہیں ہے اور پھر آغا جان گاؤں کے ایک ہیں انگلی اٹھا سکتا ہے۔ کسی کی ہمت دبال نہیں ہے اس ہرزہ گیری کرنے کی"

ہاں ہے"

اور یہ سب کچھ آغا جان کی زندگی کے آخری دنوں کو مسرور و مطمئن

کرنے کے لیے ہی کیا جا رہا ہے"

"ہاں گل پری ۔۔۔ یہ بات نہ ہوتی تو شاید ہم میں سے کوئی بھی راضی نہ ہوتا۔ ہمارے بچے جوان ہو گئے ہیں ۔۔۔ ماہ وش باجی کی تو بیٹیاں بھی بیاہی ہوئی ہیں"

"نئی نسل تو بُرا مان رہی ہے ۔۔۔ کل ہی گل خان کا فون آیا تھا ۔۔۔" وہ بولی۔

"اور وہ زرینہ ۔۔۔ اسے تو اتنی شرم آ رہی ہے ۔۔۔ کہ ۔۔۔"

اس نے کہا۔

"میں نے اسے سمجھایا ہے"

"خان خوانین ایسا کرتے ہی آئے ہیں ۔۔۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ۔۔۔"

"چلو کوئی بات نہیں ۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہاں تو بولو شربینے جاؤ گی گاؤں؟"

"چلی جاتی ہوں ۔۔۔ آغا جان سے اجازت لے لیں ۔۔۔"

شربینے نے کہا۔

"تھوڑے سے زیور لوٹے آئیں۔ باقی جو کچھ آغا جان نے اسے دینا ہو گا خود ہی گاؤں جا کر دے دیں گے"

"میرے خیال میں تو آغا جان کا گاؤں جانا ٹھیک نہیں ۔۔۔

شربینے بولی۔

"کیوں ۔۔۔"

اتنے بیمار ہیں ۔۔۔ اتنا سفر کریں گے۔ وہاں تکلیف زیادہ بڑھ گئی ۔۔۔" شربینے بولی۔

"وہ جانے پر بضد ہیں ۔۔۔ شیگی کو شاید اپنا گھر دکھانا چاہتے ہیں"

بعد میں دیکھ سکتی تھی ۔۔۔ اس نے بالآخر رہنا تو وہیں ہے"

بینے نے کہا۔

"لاہور کی پروردہ لڑکی وہاں رہ لے گی"

"یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ پردنشے۔ خان نے اسے سمجھایا ہے۔ نے بھی اسے اس بات سے باز رکھنے کی کافی کوشش کی۔ سب تے بوجھتے وہ ایسا کر رہی ہے تو اس کی مرضی"

سنا ہے اس کی ماں بھی پٹھان ہے"

"ہاں ۔۔۔ ہیں تو پٹھان ۔۔۔ لیکن مدتوں سے اِدھر آباد ہیں"

بینے نے کہا۔

"خون تو وہی ہے ۔۔۔ اور پٹھانوں کی روایات سے بھی آگاہ گی وہ ۔۔۔"

ہم کیا جانیں ۔۔۔ ہاں بھئی ۔۔۔ میری بات بیچ ہی میں رہ جاتی صلاح دو نا"

فیصلہ تو ہو گیا۔ کپڑے یہاں سے خرید لیں۔ زیور کا آغا جان سے

بلوچھ   تے ہیں. کہیں گے تو میں جاکر لے آؤں گی "
مر آج شیگی کو لے چلیں بازار. کپڑے تو خرید لیں "
" لے چلتے ہیں ــــــ دن تو بہت کم ہیں. ویسے امریکہ جانے کی تیاری تقریباً مکمل ہے "
" دس بارہ دن ہی ہیں "
" نکاح کب ہے ؟"
" شاید پرسوں شام "
" نکاح کے بعد آغا جان کلینک ہی میں رہیں گے "
" نہیں یہاں گھر آئیں گے "
صلاح و مشورے ہوئے۔
شام گل پری نے صمد خان سے پیسے لئے اور دونوں دیورانیوں کے ساتھ شیگی کو لے کر شاپنگ کے لئے چلدیں۔
بھاری بھاری کام والے دوپٹے ــــ سوٹ ــــ اور سائید خریدی گئیں۔
شگو نے ایسے کپڑے دیکھے ضرور تھے. لیکن کبھی سوچا بھی تھا کہ یہ اس کا مقدر ہو سکتے ہیں۔
گل پری پروشے اور شرینے بڑے لاڈ اور پیار سے اس سے کپڑوں کے متعلق پوچھ رہی تھیں. اس کی پسند جاننا چاہ رہی تھیں۔
" پیسوں کی فکر نہ کرو. جو کچھ تمہیں لینا ہے لے لو " گل پری بولی۔

" آپ خود ہی سب چیزیں خرید رہی ہیں. بہت بڑھیا اور بہت اچھی ں " شگو بولی۔
" عروسی جوڑا تو بھئی تم اپنی پسند کا ہی خریدو " پروشے نے کہا۔
شگو کا دل دھک سے ہوا. لیکن جلد ہی اپنے پر قابو پاکر آہستگی سے بولی۔
" آپ خود ہی خرید لیں نا "
" غرارہ پہنا پسند کرو گی. لہنگا یا شلوار قمیض " شرینے نے پوچھا۔
" ہاں بتاؤ نا " گل پری شفقت بھرے لہجے میں یوں بولی جیسے ہی بہو سے اس کی پسند پوچھ رہی ہو۔
چاروں دری ہاؤس میں بیٹھی تھیں۔
ہزاروں کے ملبوسات خرید چکی تھیں۔
اب عروسی جوڑے کا انتخاب کرنا تھا. دکان دار مالدار آسامیوں کو پہلی ظر ہی میں پہچان جاتے ہیں. اس لئے دکاندار اور اس کے سیل مین ڑی مستعدی کا مظاہرہ کر رہے تھے. بیش قیمت جگمگ کرتے ملبوسات کے ڈبے نکال نکال کر ان کے سامنے رکھ رہے تھے ڑی روشنیوں میں یہ ملبوسات چمک رہے تھے۔
سرخ گلابی. آف وہائٹ سبز اور آتشی گلابی رنگ کے عروسی وڑے سامنے پڑے تھے. بہت نفیس کمخواب اور ٹیشو کے تھے ــ امدانی کام بھی جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔

"یہ جوڑے اچھے ہیں" پروشے نے کہا۔

"رنگ کونسا پسند ہے تمہیں شیگی"

شگو کی نظریں آتشی گلابی جگمگ کرتے جوڑے پر ٹھہر گئیں۔ یہ رنگ طاہر کو بہت پسند تھا۔

"یہ ——" گل پری نے ہلکے گلابی رنگ کے سوٹ پر ہاتھ رکھا۔

"نہیں ——" شگو نے آتشی گلابی جوڑے والا ڈبہ قریب کرتے ہوئے کہا۔

پھر اس جوڑے کو دیکھ کر بولی "یہ رنگ اچھا ہے"

"چلو ٹھیک ہے ——" گل پری نے دکاندار سے یہ جوڑا بھی پیک کرنے کو کہا۔

"بہت خوبصورت ہے" شیرینہ بولی۔ "مجھے بھی یہ رنگ بہت پسند ہے"

کپڑوں کے علاوہ جوتے پرس بھی خریدے گئے۔ میک اپ کا سامان بھی لیا گیا۔

سوٹ کیس اور وینٹی باکس بھی خرید اگیا۔

رات دس بجے کے قریب سارا سامان گاڑی میں لاد کر واپس ہوئیں۔ شگو کو اس کے گھر ڈراپ کیا۔ دلاور خان اسے گھر کے دروازے تک چھوڑنے آیا۔

شگو گھر آئی تو اماں جاگ رہی تھی اور طاہر بھی اس کے پاس بیٹھا تھا

اہر کو دیکھ کر شگو کا دل بھر آیا۔

ج پہلی بار اسے اپنے پلان پر دکھ ہوا۔

یکن

وہ کچھ بولے بنا غسلخانے میں گھس گئی۔

ہاں وہ پانی کا نل کھلا چھوڑ کر چیخیں مار مار کر روئی۔ پتہ نہیں کیوں۔ اتنا

رابھی بہت کچھ کھو دینے کا احساس دل میں ٹیسیں مار رہا تھا۔

رو کر دل کی بھڑاس نکل گئی۔ تو وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر آگئی۔ طاہر جا

ما۔

وہ اماں کے گلے لگ کر ایک بار پھر ہچکیاں لے لے کر رونے

—

———

"رشیدہ ——"

"جی بھابی ——"

"وہ ——"

"کیا ہے بھابی ——"

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا۔ آسکو گی ہماری طرف"

"کیوں کیا بات ہے بھابی"

"شگو ——"

"کیا ہوا شگو کو۔ میری بچی ٹھیک تو ہے نا"

"ٹھیک ہے"

"کیا بات ہے بھابی۔ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو۔ مجھے بھی تو کچھ

میرا جی تو پہلے ہی ——"

"طاہر نے کچھ نہیں بتایا تمہیں"

س کے متعلق"

شگو کے نکاح کے متعلق"

کیا ——؟"

شگو کا نکاح ہے آج شام"

بھابی ——"

ہاں رشیدہ"

رشیدہ نے سینے پر ہاتھ مارا۔ آنکھیں جھپکا جھپکا کر بھابی کو دیکھا۔
بھی تو نہ سمجھ پائی۔

میرا خیال تھا طاہر نے تم سے بات کی ہوگی۔ دکھ اور شرمندگی کے
س سے تہمینہ آنکھ رشیدہ سے نہ ملا سکی۔

رشیدہ اپنے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر ٹکر ٹکر تہمینہ کا منہ تکنے لگی۔

اس لڑکی نے عاجز کر کے رکھ دیا ہے مجھے" تہمینہ دوپٹے کی
سے اپنی گیلی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔

طاہر کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا ہے۔ مجھے تو اب تک کچھ سوجھ بوجھ
رہا۔ شائستہ اور وسیم بھی پریشان ہو گئے ہیں۔ لیکن کوئی اسے روک
سکتا۔ اتنی خودسر اور سرپھری ہے وہ"

طاہر جانتا ہے۔ رشیدہ نے کانپتی آواز میں کہا۔

مجھے کچھ نہیں بتایا اس نے۔ میرے پاس تو بیٹھتا ہی نہیں خدا خبر کن
وں میں پڑا ہے وہ"

"میں نے تو طاہر کے ذریعے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ بھی اس کا ہم خیال بن گیا۔"

"نہیں — ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ طاہر کو میں جانتی نہیں بھلا — کتنا ٹوٹ کر چاہتا ہے وہ شگو کو۔ وہ کیسے رضامند ہو سکتا ہے۔ کہ شگو اس کی بجائے کسی اور کی ہو جائے۔"

"اور کی — ہونھ —" تہمینہ نے رندھی آواز میں کہا۔ "رشیدہ اس کی تو ہوش مت ہی ماری گئی ہے۔ بہتر سال کا بوڑھا آدمی ہے کینسر کا مریض بھی۔"

"ہائے — میں — مرگئی —" رشیدہ نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "بھابی اس کی تو ہوش مت ماری گئی تھی۔ کیا تیرے بھی حواس ٹھکانے نہیں تھے۔"

"کہا نا عاجز کر دیا اس ناشدنی نے۔ میں حامی نہ بھرتی تو وہ خود کر لیتی اس سے نکاح۔"

رشیدہ نے گردن اِدھر اُدھر ہلائی۔

نڈھال اور کمزور تو وہ پہلے ہی تھی۔ اس خبر نے تو جیسے رہی سہی ہمت بھی سلب کر لی۔

"بہت دولت مند آدمی ہے۔ اس کی دولت پر ریجھ گئی کم بخت۔" تہمینہ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

"ہوں — اب سمجھی —" رشیدہ تلخی سے بولی۔ "صبیحہ

[…]ج ہی کہا کرتی تھی۔ بھائی سے بھی ہمیشہ کہتی تھی کہ تجھ کنگلے کو گھاس [..]نہ ڈالے گی شگو — پیسے کی پیر ہے وہ — تجھ سے کبھی شادی [..]ا کرے گی"

تہمینہ چپ رہی۔

رشیدہ صدمے اور دکھ سے بے حال ہوتے ہوئے بولی۔

[..]یں ہمیشہ ہی صبیحہ کو ڈانٹا کرتی تھی۔ لیکن میری بچی سچ ہی کہتی تھی۔ طاہر [..]اب کے پاس ہے ہی کیا۔ ہائے ہائے۔"

وہ ٹھنڈی آہیں بھرنے لگی۔

"کتنا ارمان تھا اسے بہو بنانے کا۔" رشیدہ رونے لگی۔ "مرنے [..]ے کی تو دلی خواہش تھی۔ منگنی اس لئے کرنا چاہتا تھا۔ ہائے [..]ے چاؤ سے سچی کمخواب کا جوڑا لایا تھا طاہر کا ابا — انگوٹھی سات [..]نوں والی خریدی تھی اس کے لئے — حسرت ہی دل میں [..]ے گیا۔"

تہمینہ بھی آنسو بہا رہی تھی۔

رشیدہ بے حال ہو گئی تو اس نے اسے کندھے سے تھام [..]ر حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"رشیدہ بس کرو — تم پہلے ہی اتنی لاغر اور نڈھال ہو رہی ہو — [..]نبھالو اپنے آپ کو"

"میرا بچہ — طاہر ہائے کیا بیت رہی ہو گی اس پر۔"

"کچھ نہیں بیت رہی — وہ بھی اس نکاح پر رضامند ہے، آ کے تو پوچھ لینا۔"

"شگو کی خوشی کی خاطر دل پر پتھر رکھ لیا ہوگا — اس کی کوئی بات وہ ٹال ہی نہیں سکتا — دن کو رات کہتی ہے اور رات کو دن — تو وہ مان لیتا ہے۔"

رشیدہ کچھ دیر واویلا کرتی رہی۔

تہمینہ نے کچھ نہیں کہا۔

اسے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقعہ دیا۔

پھر

اٹھتے ہوئے دلگرفتہ انداز میں بولی۔ "شام ادھر آجانا۔ میں نے شائستہ اور تمہارے سوا کسی کو نہیں بلایا۔"

"میں نہیں آؤں گی بھابی۔ میں نہیں آسکتی۔ مجھ میں تو اس خبر نے قدم اٹھانے کی ہمت بھی نہیں چھوڑی۔"

تہمینہ نے دکھے لہجے میں کہا۔ "تھوڑی دیر کے لئے آجانا۔"

رشیدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

تہمینہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

طاہر چھت پہ ہی تھا۔ کرسی کی پشت پر گردن ڈالے ٹانگیں پھیلائے آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔

قدموں کی آہٹ پر اس نے آنکھیں کھولیں۔

"امی —" وہ اسے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں —"

"امی کے پاس گئی تھیں"

"تم نے رشیدہ کو نہیں بتایا تھا"

"کیا بتاتا امی"

"بتا دینا تھا۔ اسے اچانک سن کر صدمہ تو نہ ہوتا"

"بس حوصلہ نہیں ہوا"

"شگو کی بات مان لینے کا حوصلہ ہو گیا تھا"

"وہ — وہ — امی — دراصل —"

"تم ہی اپنی بات پر اڑ جاتے تو وہ اپنی من مانی کبھی نہ کرسکتی" تہمینہ نے کہا۔

"امی — وہ یہ سب سنجیدگی سے تھوڑا ہی کر رہی۔ چار پانچ ماہ کی تو بات ہے"

"تو تم بھی دل و جان سے شریک ہو اس کے منصوبے میں"

تہمینہ بولی۔

طاہر نے سر جھکا لیا۔

پھر سر اٹھایا اس کی آنکھوں میں ویرانی کی دھول تھی۔ ہولے سے بولا۔ "سچ پوچھیں نا امی — تو — میں شگو کے اصرار سے مجبور ہو گیا تھا۔ وہ دولت حاصل کرنا چاہتی ہے اور میرے پاس دولت ہے

نہیں۔ میں اس کا حامی بن کر خوش تھوڑا ہی ہوں۔ اس کا یہ قدم اخلاقی طور پر بھی ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن آپ کو پتہ تو ہے وہ دولت پانا چاہتی ہے بس۔ اخلاق و خلاق کی اسے قطعاً پرواہ نہیں۔ اس کی طلب ہوس بن چکی ہے مامی۔ آپ بتائیں میں کیا کرتا۔"

تہمینہ خاموش رہی۔

اس کا چہرہ اداس تھا۔

"مامی جانے کیوں رضامندی دے کر بھی میرا دل سینے میں بیٹھا جا رہا ہے۔ لگتا ہے شگو مجھ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ رہی ہے اس سے جدا رہ کر میں کیسے جیوں گا مامی۔"

اس نے بے اختیار ہو کر سر مامی کے کندھے پر رکھ دیا۔

تہمینہ اسے پیار کرنے لگی۔

لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ شگو نے جو پلان بنایا تھا اس سے وہ بھی آگاہ تھی۔

"اب جو کچھ کر چکے ہو اس کے انجام کا انتظار کرو بیٹے۔" تہمینہ نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"اس انتظار ہی میں جیوں گا مامی۔" وہ بڑے دکھ سے بولا۔ "خدا کرے شگو اپنے منصوبے میں کامیاب ہو۔"

تہمینہ نے سر اثبات میں ہلایا اور درمیانی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

اس کا دل بیقرار تھا۔

بنا آنسوؤں کے رو رہی تھی۔

اداس شگو بھی بہت تھی۔ رنگت پھیکی پڑ گئی تھی اور تیزی و طراری کم ہو گئی تھی۔ بار بار رونا آتا تھا۔

شائستہ اور اماں کے گلے لگ لگ کر کئی بار رو چکی تھی۔ جانے اتنے آنسو کیسے جمع ہو گئے تھے۔ جو ساون بھادوں کی برسات بن کر بھی ختم نہ ہو پا رہے تھے۔

رات وہ طاہر کے کندھے پر بھی سر رکھ کر بے اختیار ہو ہو کر روتی رہی تھی۔

طاہر نے اس کے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں سے کئی بار پونچھے تھے۔ حوصلہ اور دلاسا دیا تھا۔

"جو کچھ کیا ہے یا کر رہی ہو اس میں تمہاری اپنی مرضی خوشی اور رضامندی ہے۔ پھر رونے دھونے کی کیا ضرورت"

"طاہر پتہ نہیں کیوں۔ جی چاہتا ہے روتی چلی جاؤں"

طاہر نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے یہ خوشی کے آنسو ہوں۔"

"نہیں طاہر یہ خوشی کے آنسو نہیں ہیں تم سے بچھڑ جانے کا دکھ ہے جو آنسو بن بن کر بہہ رہا ہے۔"

"دکھ مجھے بھی کم نہیں۔ کاش میرے پاس پیسے کی فراوانی

ہوتی۔ یہ دن دیکھنا ہی نہ پڑتا۔"

"طاہر ——"

"ہاں ——"

"مجھے بھول تو نہ جاؤ گے۔"

"پگلی —— طاہر اپنے آپ کو بھی بھول سکتا ہے کبھی۔ تم۔ تم تو نہیں میرا اپنا آپ ہو۔"

"طاہر ——"

"شگو ایسا خیال بھی دل میں نہیں لانا۔"

"مجھے قبول کر لو گے نا"

"اوہ شگو —— بس کرو ——"

"ڈر لگتا ہے طاہر —— جب میں بیوہ ہو کر آؤں گی۔ تو کہیں تم....." شگو بولی۔

"ایسا نہیں سوچو۔ کبھی سوچنا نہیں، تم کل بھی میری تھیں آج بھی میری ہو اور آنے والے میں بھی میری رہو گی۔"

"اس وعدے سے پھرو گے تو نہیں۔"

"کبھی نہیں"

شگو نے اس کے کندھے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

لیکن ——

ان بند آنکھوں سے بھی آنسو آپوں آپ بہتے رہے۔

وہ اپنی اُداسی اور رونے دھونے سے خود بھی حیران تھی۔ یہ فیصلہ اس نے کسی مجبوری کے تحت نہیں کیا تھا۔

ایک سوچا سمجھا پلان تھا۔

اس سے وہ خوش بھی تھی۔

لیکن

جوں جوں نکاح کا دن قریب آ رہا تھا اس کی بےچینی اور دکھ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس ساری خوشیوں اور منصوبوں کو نگلے جا رہی تھی۔

اسی لئے اسے گھٹن کا احساس ہوتا تھا اور روتے چلے جانے کو من مچل مچل جاتا تھا۔

نکاح کی تقریب سادہ سی ہوئی۔ تہمینہ نے تو رشیدہ اور طاہر کے سوا کسی کو بلایا ہی نہیں تھا شائستہ اور وسیم نے تو آنا ہی تھا۔ رشیدہ نہیں آئی تھی۔ طاہر البتہ موجود تھا۔

آغا جان کے ساتھ بہروز خان اور ان کے تینوں بیٹے آئے تھے پوتا کمال بھی تھا۔ تینوں بہوئیں تھیں۔ بیٹی ماہ وش نہیں آئی تھی۔ اس کا بڑا داماد کل ہی آغا جان کی خبرگیری کو آیا تھا وہ بھی اس مختصر اور سادہ تقریب میں شریک ہوا۔

شام کی اذان ہو رہی تھی۔ نماز کے بعد نکاح خواں نے آنا تھا سب لوگ اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ آغا جان کرسی میں نیم دراز تھے۔ رعب و جلال تو انکا تھا۔ لیکن اس وقت بیٹوں اور پوتے سے نظریں چرا رہے تھے۔ شاید سوچ رہے تھے۔ مجبوری لاکھ سہی کیا یہ قدم انہیں اٹھانا چاہیئے تھا؟ شیگی کے بغیر کوئی اور اٹینڈنٹ

ا ساتھ جا سکتی تھی۔ لیکن وہ مصر تھے بضد تھے۔ کہ ساتھ شیگی
ئے گی تو وہ علاج کے لئے جائیں گے۔

تو

کیا

وہ شیگی سے پیار کرنے لگے تھے۔ اپنے سے کوچالیس سال
لڑکی سے محبت کی شادی رچا رہے تھے۔ صحت ٹھیک ٹھاک
تو بات بھی تھی۔ دو ماہ سے کلینک کے بیڈ پر پڑے تھے۔
ب شادی؟ عجیب ہی لگ رہا تھا۔

عجیب تو سب ہی کو لگ رہا تھا۔ اس شادی کی خبر محلے میں
چکی تھی۔ لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ عورتیں ناک پر انگلی رکھ کر
وں کو نچاتے گھماتے ہوئے باتیں کر رہی تھیں۔ کھڑکیوں سے آدھے
کا لٹکا کر شگو کے گھر کی بیٹھک کے کھلے دروازے کے اندر
ھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

مرد بلاوجہ اس گھر کے سامنے سے بار بار گزر رہے تھے۔ بڑا گرما
موضوع گلی محلے والوں کو اچانک ہی ہاتھ آ گیا تھا۔

نکاح پڑھا گیا۔

آغا جان نے حق مہر میں پشاور کی بڑی کوٹھی۔ چھ دکانیں۔ ایک لاکھ
اور تقریباً سو تولہ سونا لکھا۔ یہ سب کچھ شگو کو دستی ملنا تھا۔ کوٹھی
دکانیں اس کے نام پر رجسٹر ہو چکی تھیں۔

شگو کے لئے بری کی صورت میں جو کچھ آیا تھا۔ سب کی آنکھیں
کھل گئی تھیں۔ اتنے خوبصورت ملبوسات اور اتنا بھاری بھاری زیور۔
ڈائمنڈ کا نفیس سیٹ بھی تھا۔

لیکن

ان چیزوں کی سوائے شگو کے کسی کو خوشی نہ تھی۔ شائستہ نے تو
آغا جان کو ایک بار دیکھ کر پھر دیکھنے کی ہمت ہی نہ کی تھی۔ اگر شگو سے
شادی کا خیال ذہن میں نہ ہوتا۔ تو آغا جان کی شخصیت سے وہ یقیناً مرعوب
ہوتی۔ لیکن روئی کے گالے کی طرح سفید بالوں زردی مائل سپید
رنگت اور مضبوط جسم پر ناتوانی کا غلبہ۔ انکا پوتا کمال سہارا دے کر انہیں
گاڑی سے اتار کر گھر تک لایا تھا۔

شائستہ کا دل ڈوب ہی گیا تھا۔

اس نے تو اپنا غصہ اور رنج طاہر پر بھی اتارا تھا۔

"تم بھی اسے باز نہ رکھ سکے"

وہ دکھی سی مسکراہٹ سے بولا۔ "میں آج تک اسے اس کے کسی
ارادے سے باز رکھ سکا ہوں"

"جان بوجھ کر ڈبویا ہے اس نے اپنے آپ کو — یہ بوڑھا مریض"

طاہر نے پھیکی سی ہنسی سے کہا۔ "آپا یہ بوڑھا مریض کینسر کا مریض
ہے اور اس کی زندگی کے صرف چند ماہ باقی ہیں"

"میں جانتی ہوں"

پھر تو اب آپکو واویلا نہیں کرنا چاہیئے۔ چار پانچ ماہ تو کسی نہ کسی طور
ا ہی ہیں آپا"

تو — تو — تم بھی اس کے ساتھ سازش میں شریک ہو"
بولی۔

وہ چپ رہا۔

شائستہ اسے برا بھلا کہتی رہی۔ وہ سنتا رہا۔ جب وہ چپ
تو بولا۔

آپا — یہ منصوبہ اس کے ذہن میں آیا تھا مجھے مجبور کر دیا اس
ویسے اسے اس کے خیالوں سے بڑھ کر ہی ملا ہے۔ کوٹھی
ے پراٹھی چھ دکانیں اور دو تین لاکھ کے زیور کے علاوہ ایک
ٹس —"

شائستہ نے اسے گھورا۔

تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

سودا برا نہیں آپا — اتنا کچھ تو میں ساری عمر میں بھی اسے نہ دے
اسے دولت چاہیئے تھی سو مل گئی"

لیکن شوہر"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "کچھ پانے کے لئے کچھ دینا
تا ہے آپا۔ چار چھ ماہ کی تکلیف ہے۔ شگو کو بھی اور ہم سب کو
گی۔ اس کے بعد —"

"اس کے بعد کیا ہوگا"

وہ ہنس کر بولا "کچھ تو ہوگا"

شائستہ نے اسے گھورا۔

اسے تو اس کی ذہنی صحت پر بھی شک ہونے لگا تھا۔

شگو کو بھاری عروسی جوڑا پہنایا گیا۔

پروشے نے اسے میک اپ کیا بال بنائے اور سارا زیور پہنا دیا۔ یہ زیور پرانا تھا۔

بہت بھاری بھاری چیزیں تھیں۔ لیکن بڑی نایاب اور بے انتہا خوبصورت بھی۔ نکاح نامے میں تو سو تولہ سونا لکھا گیا تھا لیکن یہ وزنی زیور سو تولے سے کہیں زیادہ تھا۔

شگو تو بار بار آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے کی بجائے اس زیور کو دیکھ رہی تھی۔

باہیں چوڑیوں کنگنوں کے بوجھ سے اٹھائی نہ جا رہی تھی گردن گلے میں ڈالے وزنی ہاروں سے جھکی جا رہی تھی۔ کانوں میں لمبے لمبے کندنی گھمر تھے اور سر پر سات ٹیکوں والی داڑنی تھی۔ لباس کی چمک دمک اور زیورات کی جگمگاہٹ سے وہ سنہری روپہلی گٹھڑی سی لگ رہی تھی۔

طاہر مہمانوں کو کھانا کھلانے میں مصروف تھا۔ خوش بھی تھا اور دلگیر بھی۔ کوئی چیز اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔ شگو لگتا تھا۔

یشہ کے لیے بچھڑ رہی ہے۔

لیکن ——

وہ شعوری کوشش سے اس اذیت دہ خیال کو ذہن سے جھٹک ہا تھا آغا جان کو دیکھ کر اسے بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ اگر یہ شخص واقعی کینسر امریض ہے تو زیادہ دیر جی نہیں پائے گا۔

وہ پانی کا گلاس کمال کی طرف بڑھا رہا تھا کہ شائستہ کی بچی رقی نے آ اس کے کان میں ہولے سے کچھ کہا۔

"کیوں ——" ایک دم سے اس کے منہ سے نکلا۔

"آنٹی نے بلایا ہے"

"اچھا تم چلو میں آتا ہوں"

وہ گلاس کمال کو دیتے ہوئے پلٹا۔

بیٹھک سے نکل کر صحن میں آیا۔

وہاں آغا جان کی تینوں بہنیں کرسیوں پر بیٹھی تھیں ان کے سامنے میز تھی جس پر شائستہ کھانا لگا رہی تھی۔ اماں تو باورچی خانے ہی میں گھبرائی سی بیٹھی تھی۔

طاہر ان کو سلام کر کے برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔ شائستہ کے بچے وہیں کھیل رہے تھے۔

سامنے کمرے میں شگو تھی۔

"ماموں جان" رقی نے کہا۔

"کیا ہے"——

"آنٹی نے کہا ہے کہ اندر آپ اکیلے ہی آئیں"

طاہر کا دل دھڑکا——

"جائیں نا——"

"جاتا ہوں——"

اس نے بند دروازے پر ہولے سے دستک دی۔

"شگو——" اس نے آہستگی سے پکارا۔

شگو نے دروازے کی کنڈی کھول دی۔

طاہر اندر داخل ہوا۔

شگو نے دروازہ بند کر دیا۔

طاہر نے مڑ کر اسے دیکھا۔

وہ دلہن بنی تھی سرتاپا سجی تھی، جھلملاتا ہوا عروسی جوڑا اور لش لش کرتے خوبصورت زیورات——

خوبصورت میک اپ——

معطر معطر پھول——

وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی۔

طاہر آنکھیں جھپکے بنا اسے تکے گیا۔

"طاہر——" شگو نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں بلایا ہے"

"کس لئے——"

وہ ادائے دلفریبی سے یوں مسکرائی کہ مسکراہٹ آنسوؤں میں بھیگی بھیگی لگی۔

"شگو——"

"مجھے دیکھو تو طاہر——" شگو کی آواز روہانسی تھی۔ وہ اس کے سامنے ایستادہ بت کی طرح کھڑی تھی۔

"شگو" طاہر کا دل بھر آیا۔ بھرائی ہوئی آواز میں صرف یہی کہا۔

چند لمحے دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔

پھر——

شگو بولی۔

"یہاں تک تو سارا پلان کامیاب رہا ہے طاہر۔ ایک ہی ریلے میں ہوں میں مل گئے۔ اور بھی بہت کچھ ملے گا"

طاہر نے ٹھنڈی گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں—— بہت کچھ ملا ہے۔ لیکن پتہ نہیں شگو۔ تمہاری ہاں میں ہاں ملانے اور تمہاری مرضی میں اپنی رضامندی شامل کرنے کے باوجود میرا دل خالی خالی کیوں ہو رہا ہے"

"کچھ ایسا ہی احساس مجھے بھی ہو رہا ہے"

"شاید—— شاید ہم جذباتی ہو رہے ہیں"

"ہاں—— شاید——"

"کاش آج تم۔ اسی طرح سج دھج کر آغا جان کی جگہ میرے آنگن میں اترتیں۔ مجھے تو لگتا ہے میں بازی ہار گیا ہوں"

"ایسا نہ کہو طاہر"

طاہر نے غور سے شگو کو دیکھا۔ بے شک وہ خوبصورتی سے سجائی گئی مورتی لگ رہی تھی۔

لیکن ——

اس کے چہرے پر طاہر کو خوشگوار آسودہ اور مطمئن لہریں ہلکورے لیتی نظر نہیں آئیں۔ وہ بکھری بکھری ٹوٹی ٹوٹی لگ رہی تھی۔

"شگو" طاہر نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

شگو نے بے آنسو روتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"کیا بات ہے اتنی پژمردہ اور نڈھال تمہیں نہیں ہونا چاہیئے اور پھر جب جانتی ہو کہ تم نے یہ سب سوانگ بھرا ہے۔ شادی کے نام پر ڈھونگ ہے یہ۔ اپنے بڈھے اور بیمار شوہر سے تمہیں کوئی خطرہ بھی نہیں۔ پھر ایسے کیوں شگو۔ ایسے کیوں۔ کسی نے تم پر ظلم نہیں کیا۔ کسی نے تمہیں مجبور نہیں کیا۔ کسی ——"

"کیا ہے" شگو دکھ سے چیخی۔

"کس نے ——"

"غریبی نے۔ طاہر غریبی نے۔ تم غریب نہ ہوتے میں غریب نہ ہوتی تو یہ سب کچھ کرنے کی نوبت نہ آتی۔ تباہ آتی یہ نوبت۔"

"یہ باتیں کیوں کر رہی ہو شگو —— ثابت قدمی سے اپنے ہب پر ڈٹی رہو۔ کوئی بات نہیں۔ چار چھ ماہ گزر ہی جائیں گے۔ تم یہ گزار آؤ گی اور میں ——"

"ہاں —— تم —— تم ——"

"میں شاید سعودی عرب چلا جاؤں۔ تمہیں بتایا نہیں۔ آج ہی اشرف ائی کا خط آیا ہے۔ انہوں نے میرا ویزا بھجوایا ہے۔ دو تین دن تک جائے گا۔ پھر میں چلا جاؤں شگو۔ چلا جاؤں گا۔ کیونکہ تمہارے چلے جانے کے بعد میں یہاں نہیں رہوں گا۔ نہیں رہ سکوں گا۔ مامی ر امی مل کر رہ لیں گی۔ ایک دوسرے کو سہارا دے لیں گی۔ کتنے اچھے ت پہ بلایا ہے اشرف بھائی نے مجھے"

شگو خالی خالی نگاہوں سے اسے تکنے لگی۔

"جانا ہی تھا تو کچھ عرصہ پہلے چلے جاتے۔ اچھے وقت کا انتظار حمت نہیں رہتا"

"اب بھی زحمت نہیں رہے گا۔ میری جان"

وہ فرطِ جذبات سے بے قابو ہو کر شگو کو بازوؤں میں بھر لینے کے لئے بڑھا۔

لیکن ——

شگو غیر شعوری طور پر پیچھے ہٹ گئی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور نظریں جھکا لیں۔

دونوں کے درمیان نکاح کی دیوار آن کھڑی ہوئی تھی۔
اب طاہر کا شگو کو چھونا یا شگو کا اس کی باہوں میں اتر جانا منا
نہیں تھا۔

طاہر دکھ سے ہنسا۔
شگو کی آنکھیں بھر آئیں۔

"میں جاؤں اب ——"

طاہر نے مڑتے ہوئے کہا

"طاہر ——" شگو سسکیاں بھرنے لگی۔

طاہر کے قدم رک گئے۔

دل گھٹنے لگا۔ بازو بے تاب ہوئے لیکن وہ وہیں کھڑا آنسو بہاتی پتھر کی مورتی کو تکنے لگا۔

"پونچھ ڈالو آنسو — سارا میک اپ خراب ہو جائے گا۔" طاہر نے اسے ہنسانا چاہا۔

لیکن ——

وہ روئے گئی ——

"شگو بھئی رونا دھونا بند کرو — نہیں تو میرا یارائے صبر بھی جواب دے جائے گا۔ چند ماہ گزارنے تو ہیں جیسے بھی گزریں۔ ذہنی اذیتیں بھی سہنی ہیں اس کے لئے ہمیں تیار رہنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے بعد ہماری زندگی خوشگوار کروٹ لے گی۔ شگو اتنی

ی خوشگوار کہ ہم خود بھی یقین نہ کر پائیں گے۔ انتظار ہمیں کرنا ہے
ک سچائی ہے۔ جو شکر ہے کہ وقت کی طوالتوں پر محیط نہیں۔ یہ دن
پر لگا کر اڑ جائیں گے۔ اب تو میں بھی فکرمند نہیں۔ یہاں رہنا ہوتا تو
ایداذیت ناقابل برداشت ہوتی۔"

شگو نے آنکھیں پونچھتے ہوئے طاہر کو دیکھا۔

"میری واپسی کا انتظار کرنا ہے تمہیں۔"

"پوری شدت سے کروں گا۔"

"وعدہ ——"

"وعدہ ——"

"ٹھیک ہے ——" اس نے سر جھکا لیا۔

"میں پانچ چھ ماہ تک لوٹ آؤں گی طاہر —— وہ سب کچھ پا کر جس
ے لئے میں نے اتنا مشکل قدم اتنے سہل طریق سے اٹھایا ہے —
ر —— پھر —— میں —— ہاں طاہر میں ——"

وہ رکی ——

اور ——

اپنے سراپا پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔ "اس سے بھی حسین روپ
ار کر تمہارے پہلو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آجاؤں گی۔"

"اس وقت کا میں جی کر مر کر جیسے بھی ہوگا انتظار کروں گا۔ خدا حافظ
گو۔ باہر مہمان بیٹھے ہیں۔ مجھے جانا چاہیئے۔ جاؤں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

طاہر کے قدم نہیں ہلے۔

وہ اسے نگاہوں میں جذب کرتے ہوئے بولا۔

"یوں نہیں —— ہنس کر خدا حافظ کہو —— ہنس کر آنے والی خوشیوں کی نوید دو۔"

شگو کے لبوں پر بے جان سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے طاہر کو خدا حافظ کہا ——

طاہر جواب دیئے بنا جلدی سے کمرے سے نکل گیا۔

اور ——

شگو کو اپنا وجود لگا بھربھری مٹی کا بنا ہوا۔ وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں پر گرا لیا۔

خان صمد خان کے شاندار بنگلے میں شگو کو پورے اعزاز کے ساتھ ارا گیا۔ روایتی دلہنوں کی طرح وہ بھی رخصتی کے وقت ماں بہن سے لپٹ روئی تھی۔ بہنوئی نے بھی سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا تھا تو اس ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ طاہر کو اپنی امی کو سہارا دیئے اپنے دروازے ں کھڑے دیکھ کر تو وہ بے اختیار ہو گئی تھی۔ گاڑی میں بیٹھنے کی بجائے پھو سے لپٹ کر خوب روئی تھی۔

لیکن ——

یہاں جس آن بان اور عزت سے اس کی پذیرائی ہوئی تھی۔ وہ رونا ھونا بھول گئی تھی اسے تفاخر کا احساس ہونے لگا تھا۔ اپنے کچھ ونے کی آگہی ہوئی تھی۔ وہ اب اک بیوہ ماں کی غریب نرس بیٹی تھی ——

بلکہ انتہائی دولت مند گھرانے کے سربراہ کی بیگم تھی۔

گھر میں زیادہ لوگ تو نہیں تھے۔ آغا جان کے بیٹے بہوئیں ایک پوتا دو کزن اور نواسی کا شوہر ہی تھا۔ زرینہ بھی اور گل پری کی بیٹی شاہ رخ بھی آگئی تھی۔

یہ سب اس کی یوں نازبرداریاں کر رہے تھے۔ جیسے وہ ان سب سے اہم اور معتبر ہستی ہو۔

گل پری نے ایک کمرہ سیٹ کروا دیا تھا۔ پھول اور خوشبوئیں۔ قالین اور مسہری پر بکھرے ہوئے تھے۔

اسے بیڈ میں تکیوں کے سہارے بٹھا دیا گیا تھا۔ اس نے گھونگھٹ نہیں نکالا ہوا تھا۔ پھر بھی جھجک رہی تھی۔ آنکھیں ملا کر بات نہیں کر سکتی تھی۔ جھکی جھکی نظروں سے اردگرد پھیلے لوگوں کو دیکھ رہی تھی کمرے کی سجاوٹ کا جائزہ لے رہی تھی۔

اپنے چھوٹے سے اونچی نیچی اینٹوں کے فرش والے کوٹھڑی نما کمرے سے جس میں اک پرانا سا پلنگ تھا۔ دو تین دیوار کے ساتھ لگی کھونٹیاں تھیں۔

اماں کی مشین تھی اور دو کرسیاں تھیں۔ پرانی بے رنگ اور فرسودہ سی چیزوں والے کمرے سے وہ اس شاندار کمرے میں اٹھ آئی تھی۔ اسے حیرانی بھی ہو رہی تھی اچھا بھی لگ رہا تھا۔

طاہر کے لئے جو وہ کئی دنوں سے بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ رو دھو رہی تھی۔ پریشان ہو رہی تھی۔ اب وہ ان سب چیزوں سے کسی

ک گلو خلاصی کرا چکی تھی۔

اب وہ ہر لمحے کی خوشگواری کو سمیٹ رہی تھی اسے اپنے پلان
رش اسلوبی سے انجام تک پہنچانے کے لئے ایسا کرنا ضروری

———

شگو کو سب نے سلامی دی۔ کسی نے دس ہزار کے نوٹوں کی
اس کی جھولی میں ڈالی۔ کسی نے زیورات کا سیٹ پیش کیا۔
نے بازوؤں میں کنگن ڈال دیئے۔

تو ———

کسی نے گلے میں موٹی موٹی طلائی زنجیریں، دو ایک نے انگوٹھیاں

یں ———

ڈائمنڈ کی بیش قیمت انگوٹھیاں ———

شگو سر جھکائے دبے دبے الفاظ میں انکی محبت اور عقیدت کا
کریہ ادا کرتی رہی ———

اور ———

ل ہی دل میں ان بیش قیمت چیزوں کا تخمینہ لگاتی رہی اسے تو
ی امید کہاں تھی۔ ضرورت سے بھی زیادہ مل رہا تھا۔

وہ سب نے اکٹھے اسی کمرے میں گپ شپ لگاتے ہوئے
غا جان بھی ایک آرام دہ کرسی پر کشنوں کے سہارے نیم دراز تھے
وں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اپنے بچوں کی سعادتمندی

سے بھی بہت خوش تھے۔
کسی نے بھی تو اعتراض نہیں کیا تھا۔
بہروز خان بھی تھے۔ وہ کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھ رہے
تھے۔ اور ــــــ

یہ تھی بھی حقیقت ــــــ
رات کافی اتر آئی تھی اس لئے سب اٹھنے کا سوچ رہے تھے
خان صمد خان نے پہلے آغا جان سے اجازت چاہی۔

پھر ــــــ
شگو کے قریب آکر مؤدبانہ کھڑے ہو کر کہا۔ "آغابی بی"
پروشے شگو کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھی تھی صمد خان کے طرز
مخاطب سے مسکرا کر شگو سے کہا۔

"خان آپ سے کہہ رہے ہیں"
"جی ــــ" شگو نے جلدی سے کہا۔
"آپ آغا جان کی بیوی ہیں اس لئے آغابی بی آپ کا لقب ہو گا
یہ ہمارے خاندان کا دستور ہے"
خان صمد خان بولے۔
شگو نے ہولے سے سر ہلایا۔
"چھوٹے بڑے سبھی آپ کو اسی لقب سے پکاریں گے۔ یہ
بہت بڑا اعزاز اور عزت ہے جو آپ کے حصے میں آئی ہے"

"جی ــــ شکریہ ــــ"
"آغا جان ہمارے ہی نہیں پورے گاؤں کے عزیزوں رشتہ داروں
ے معزز اور مکرم بزرگ ہیں" جان نے کہا۔ "وہ ہمارے باپ ہیں
ب کے باپ ہیں"
شگو سر جھکائے بیٹھی رہی۔
"آپ آغابی بی ہیں ــــ سارے گاؤں ــــ سارے رشتہ داروں
ارے بچوں کی ماں"
شگو کانپ گئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر
رگئی ــــ
"ہم پٹھان لوگ ہیں" وہ قدرے رک کر مؤدبانہ لہجے میں بولے۔
"ہمارے اپنے رواج اپنی ریتیں ہیں۔ اور ان ریتوں رواجوں پر ہم
بعض اوقات جانیں بھی قربان کر دیتے ہیں آپ بے شک عمر میں بہت
چھوٹی ہیں۔ لیکن درجے میں اتنی محترم اتنی مکرم اور اتنی عظیم ہیں کہ
ہم سب آپ کے سامنے سر اٹھا کر بات کرنے کی جرأت نہیں
ریں گے ــــ ماں ــــ ماں ہوتی ہے۔ اس کے درجے کو ہم
سب جانتے ہیں۔ اس کے تقدس کو پہچانتے ہیں۔ ہم سب
آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ عمر میں بہت چھوٹی سہی لیکن ہم آپ
کی عزت اور احترام اسی طرح کریں گے جس طرح اپنی مرحومہ ماں کا کرتے
تھے۔ آج سے آپ ہمارے لئے وہی آغابی بی ہیں"

سب نے ان کی تقریر نما باتوں پر تائیدی مہر لگائی۔

اسداللہ خان اور سعد خان نے بھی اپنی فرمانبرداری کا احساس دلایا۔

ان کی بیویوں نے بھی اثبات میں سر ہلائے۔

آغا جان نے ان سب کی باتیں سن کر شفقتوں سے نوازا۔ ان کی فرمانبرداری کی تعریف کی۔

پھر ——

وہیں کرسی پر نیم دراز رہے اور بولے۔

"شگی۔ تمہیں جو حیثیت مرتبہ اور مقام میرے بچوں نے دیا ہے۔ تم اپنے آپ کو ہمیشہ اسی پر پاؤ گی۔ تم نے بھی انہیں اپنی اولاد ہی سمجھنا ہو گا۔ اپنے پیار شفقت اور محبت کا سایہ ان پر ہمیشہ رکھو گی۔"

شگو نے سر جھکا لیا۔

اسے تو یہ ساری باتیں مضحکہ خیز لگ رہی تھیں۔ اس کی باپ کی عمر کے مرد اس کے بچے تھے۔ اس کی ماں سے بھی بڑی عمر کی عورتیں اس کی بہوئیں تھیں۔ بچے اور بہوئیں سعادت مندی کا خلوص سے اظہار کر رہے تھے۔

اور ——

جواباً ——

اس سے بھی ایسے ہی جذبات کی توقع کر رہے تھے۔

عجیب ہی سا تجربہ تھا شگو کا ——

لیکن ——

تجربے کر کر ہی تو ہم کچھ سیکھتے ہیں۔ کچھ پاتے ہیں۔ یہ زندگی تجربوں کی تو بھٹی ہے۔ ہم ہر لمحہ کوئی نہ کوئی تجربہ کرتے ہیں۔ بعض اوقات تجربے ہی ہوتے ہیں۔ ماضی اور حال میں کئے ہوئے۔ جن کے سہارے۔ جن کا پل بنا کر ہم حال سے مستقبل کی طرف جا پہنچتے ہیں۔

کافی رات گئے تک سب وہاں بیٹھے سنجیدہ سنجیدہ سی باتیں کرتے رہے ——

پھر

ایک ایک کر کے اٹھنے لگے۔ سب نے جاتے سمے شگو سے سعادتمندی سے شب بخیر کہا۔

"آغا بی بی ——" ہر وشے نے اٹھنے سے پہلے کہا۔

"جی ——"

"آپ کا شب خوابی کا لباس ڈریسنگ روم میں ہے۔"

"جی اچھا ——"

"صبح کے لئے بھی میں نے کپڑے نکال کر الماری میں ٹانگ دیئے ہیں۔ آپ کا وینٹی باکس بھی وہیں ہے۔"

"جی اچھا ——"

"شب بخیر ——"

ہیروشے آخری خاتون تھی جو شگو کے پاس سے اٹھ کر کمرے سے نکلنے والی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے آغا جان کی طرف دیکھا۔

"شب بخیر آغا جان" وہ بولی۔

"اوہ ـــــ اُف ـــــ" آغا جان کے منہ سے جواب کی بجائے یہ اوہ آواز نکلی۔ تو وہ لپک کر ان کے قریب آئی۔

"کیا ہوا آغا جان۔ طبیعت تو ٹھیک ہے"

انہوں نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے ہونٹ دانتوں تلے دبالئے۔

"آغا بی بی ـــــ" وہ جلدی سے شگو کی طرف پلٹی۔

"جی ـــــ"

"ادھر آئیں۔ آغا جان کو کچھ تکلیف ہو رہی ہے"

وہ بیڈ سے اتر کر آغا جان کی طرف آئی۔ انہیں درد ہو رہا تھا رنگت پیلی پڑ گئی اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھیں۔

"آپ ادھر۔ بیڈ پر لیٹ جائیے" شگو نے جلدی سے کہا۔ اسے ان سے بڑی جھجک بھی آ رہی تھی۔

آغا جان نے ہاتھ اٹھایا۔

پھر ـــــ

ہیروشے اور شگو نے سہارا دے کر انہیں بیڈ پر لٹا دیا۔

ہیروشے نے جلدی سے صمد خان، اسد اور سعد کو خبر دی۔ سب

ڑے آئے۔

ان کی دوائی اور انجکشن وغیرہ ڈاکٹر آصف نے دیئے ہوئے تھے رکھے جانے تک یہی دوائیاں اور انجکشن فوری آسودہ ہونے کے لئے یئے جانے تھے۔ یہ گھر پہ بھی دیئے جا سکتے تھے۔ کلینک میں ی ـــــ

آج وہ نکاح کر کے نئی نویلی دلہن لائے تھے۔ اس لئے انکا ارادہ رات گھر پہ ہی رہنے کا تھا۔ دوائیاں بھی تھیں اور ٹیکے بھی تھے۔ لیکن ـــــ

ان کی تکلیف دیکھتے ہوئے سب نے یہی رائے دی۔ کہ ہیں کلینک لے جایا جائے۔ کیا خبر رات کو تکلیف زیادہ ہو جائے۔ شگو نے تو دل ہی دل میں اطمینان کی لہر محسوس کی۔ گھر والوں کی رائے کی اس نے بھی تائید کی۔ "ہاں۔ انہیں ابھی لے چلتے ہیں۔ یسا نہ ہو رات کو تکلیف بڑھ جائے"

آغا جان تکلیف کے باوجود یہ رات گھر پہ ہی گزارنا چاہتے تھے ـــــ

"بھئی ایسا تو تقریباً ہر روز ہوتا ہے۔ ٹیکہ لگ جائے اور کیپسول کھالوں تو افاقہ ہو جاتا ہے"

"نہیں آغا جان ـــــ وہاں ڈاکٹر تو موجود ہوتے ہیں نا" خان صمد خان نے کہا۔

"آغاجان آج آپ تھک بھی تو بہت گئے ہیں" صمد خان نے کہا۔ "بہتر یہی ہے رات کلینک ہی میں چلے جائیں"

سب نے یہی کہا تو آغاجان چپ ہو گئے۔

"میں ساتھ چلی جاؤں" شگو نے اوپری دل سے کہا۔

"نہیں ــــ نائٹ ڈیوٹی پہ نرس ہوتی ہے" آغاجان بولے "تم گھر پہ ہی آرام کرو۔ تم بھی تو آج تھک گئی ہو گی"

شگو نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔ ورنہ اسے تو کمرے میں ایک ہی بیڈ دیکھ کر ہول آ رہا تھا۔

دلاور خان نے گاڑی نکالی

اور آغاجان کو صمد خان، اسد خان، سعد خان کلینک چھوڑنے چلے گئے۔

رسمی اور جھوٹ موٹ سے شگو نے ایک بار پھر ساتھ چلنے کو کہا۔ تو گل پری اور شیرینے نے بڑے ادب سے کہا۔

"نہیں آغا بی بی۔ کم از کم آج تو آپ گھر پہ رہیں۔ اچھا نہیں لگتا۔ نئی دلہن تیمارداری کے لئے کلینک میں رات گزارے۔ وہاں نرس ہے اور ضرورت پڑی تو مردوں میں سے کوئی ان کے پاس رہ جائیگا۔ آپ کپڑے بدل کر آرام کریں"

شگو ڈریسنگ روم میں گئی۔ شاندار مہین لیسوں والا ہلکا گلابی نائٹ ڈریس وہاں پڑا تھا۔ اس نے باتھ روم میں جاکر منہ

ہاتھ دھویا۔

واپس آکر زیورات اتارے۔ پھر بال کھولے برش کیا اور خوبصورت نائٹ ڈریس پہن کر بیڈ پر آگئی۔ نرم نرم بیڈ پر لچکیلے مخمل کے تکیوں میں وہ دھنس گئی۔

اسے یہ سب کچھ خواب لگ رہا تھا۔

خوبصورت ــــ

سہانا ــــ

اور دلکش خواب ــــ

اسے ان خوابوں کا حصہ دار یاد آگیا۔ طاہر۔ اس کا محبوب طاہر۔

کاش ــــ

کاش ــــ

طاہر اسے اتنے شاندار بیڈ پر اس نفیس خوبصورت اور جذبات انگیز ڈریس میں دیکھ سکتا۔

وہ طاہر کے خیالوں میں کھو گئی۔

صبح شگو دیر تک پڑی سوتی رہی۔ رات بڑی دیر تک جاگتی رہی تھی نیند ہی نہ آ رہی تھی۔ خیالوں منصوبوں اور پلانوں کے ذہن کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ کچھ بے چینی تھی۔ کچھ پریشانی۔ کبھی خوشی سے بہک بہک جاتی۔

کبھی دل دکھ جاتا ——

کبھی خوف دامنگیر ہو جاتا ——

آغا جان کی طرف سے خدشہ تو تھا۔ آج وہ اسے کیسی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ تو خیر ہوئی جو درد اٹھا اور گھر والے انہیں کلینک چھوڑ آئے۔

ورنہ آج ——

اس سوچ سے وہ بے حد گھبرائی تھی۔

آغا جان لاکھ بوڑھے سہی بیمار سہی۔ لیکن تھے تو مرد — اس سے

انہوں نے شادی کی تھی۔

اور شادی —— !!

وہ گھبرا گئی تھی۔ کہیں آغا جان نے شادی کے تقاضے پورے کرنا چاہے تو

تو وہ کیا کرے گی

وہ تو طاہر کی امانت تھی اور اس نے طاہر سے وعدہ بھی کیا تھا کہ اس امانت میں خیانت نہیں ہوگی۔

لیکن

یہ تو اس کی سوچ تھی نا۔ آغا جان کے متعلق کیسے کچھ کہہ سکتی تھی وہ تو صرف یہی کر سکتی تھی کہ ان کے بیمار رہنے کی دعائیں کرتی رہے

اور

رات کتنی ہی دیر اس نے یہ دعائیں بھی کیں۔

"یا اللہ —— میری لاج رکھنا۔ اس بڈھے کو روز ہی اسی طرح تکلیف رہے اس کی ہمت سلب کر لینا۔ اسے اپنی پڑی رہے میرا خیال بھی نہ آئے۔ میں محفوظ رہوں۔ اس کی بیماری شدت اختیار کرتی جائے"

ایسی ایسی کئی باتیں وہ بڑبڑاتے ہوئے آپوں آپ کرتی رہی ——

سحری کے وقت اس کی آنکھ لگی تھی۔ اسی لئے دن چڑھے تک سوتی رہی۔

شمرینے دو دفعہ چائے لے کر آئی تھی۔ لیکن دروازہ بند تھا۔

دوسری دفعہ تو اس نے دستک بھی دی تھی۔

لیکن

شگو بے خبر پڑی رہی۔

دن کافی نکل آیا تھا۔

تازہ دم دھوپ کھڑکیوں کے پردوں میں سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

موسم خاصہ ٹھنڈا تھا۔ خنکی بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

شگو کی آنکھ کھلی۔

چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ پہلے تو سمجھ نہ پائی کہ کہاں ہے۔ یوں لگا خوابوں کی دنیا ہی میں ہے۔

لیکن

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون" وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ کمبل ہٹایا اور کرسی کی پشت پر پڑا ہاؤس کوٹ پہنتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔

"آغا بی بی" یہ شریمنے کی آواز تھی۔

شگو کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس تخاطب پر۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا۔

شگو کے سلام کرنے سے پہلے شریمنے نے سلام کیا اور صبح بخیر کہا۔

"صبح بخیر" شگو بولی۔

"کافی دیر سوتی رہیں"

"رات نیند ہی نہیں آتی تھی۔"

شریمنے شوخ انداز میں ہنس دی۔

پھر بولی۔ "نیند آتی کیسے۔ یہ رات تو —"

شگو نے جلدی سے قدم اٹھایا۔

اور ڈرائنگ روم کی طرف جانے لگی شریمنے کو احساس ہوا کہ اسے ایسا مذاق نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

"آغا بی بی"

"جی"

"ناراض تو نہیں ہوگئیں"

"ہیں؟ کس بات پر"

"آپ سے میں نے مذاق کیا کہ یہ رات تو"

"نہیں"

"اچھا آپ چائے پی لیں۔ میں دو دفعہ پہلے بھی لے کر آچکی ہوں۔"

"آپ نے کیوں تکلیف کی — نوکر سے —"

"ہاں آغا بی بی۔ آج پہلا دن ہے آپ کا ہمارے ہاں۔ ہم خود آپ کے لئے چائے لائیں گے۔ میں لے کر آتی ہوں۔ چائے تو صبح پی لینا لی، خیر اب بھی ایک پیالی تو میں گی ہی۔"

"میں عادی نہیں ہوں۔ چائے رہنے ہی دیں۔"

شگو غسل خانے میں چلی گئی۔

شرمینے کھڑکی کے پردے ہٹاکر باہر لان میں خوبصورت پھولوں کو دیکھنے لگی۔

شگو نے الماری میں ٹنگے کپڑے پہنے۔ سارا زیور وینٹی بکس میں رکھا تھا۔ اس نے زیور شرمینے کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"آپ بڑی بھابی سے کہدیں اسے سنبھال لیں۔"

"بڑی بھابی" شرمینے ہنسی۔

شگو نے بالوں کو برش کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے بلایا اور بولی۔

"ہم آپ کی بھابیاں نہیں بہوئیں ہیں۔"

شگو بھی پھیکی سی ہنسی ہنسی۔

"میں آپ کو کیا کہا کروں"

"بہو" شرمینے ہنسی۔ "بڑی، درمیانی اور چھوٹی۔"

"اور آپ کے شوہروں کو بیٹا۔ بڑا، درمیانہ اور منجھلا"

دونوں ہنس پڑیں۔

پھر

شرمینے اسے پشتو کے القاب سمجھانے لگی۔

شرمینے شگو کو تیار کرکے باہر لے آئی۔ میک اپ بھی کردایا

ہلکا ہلکا زیور بھی پہننے کو کہا۔

شگو نے کہا بھی۔ "کلینک جانا ہے۔ سادگی ہی سے جاؤنگی۔"

لیکن

شرمینے نے ہنس کر کہا تھا۔ "کلینک آپ ڈیوٹی دینے نہیں جا ی آغابی بی۔ بلکہ آغا جان کو دیکھنے جارہی ہیں۔"

ناشتے کے بعد شگو کلینک جانے کے لئے تیار تھی۔ گل پری ھر بار ٹھیک ٹھاک کروانے میں لگی تھی۔ ہروشے اور شرمینے اس ے ساتھ گئیں۔

خان صمد خان تو آغا جان کو صبح صبح دیکھ آئے تھے۔ اب آفس اچکے تھے۔

سعد اور اسد خان وہیں تھے۔

آغا جان کی حالت اب کافی بہتر تھی۔ رات انجکشن لگ جانے ے آرام سے سوئے رہے تھے۔ اب ناشتہ کرنے کے بعد آرام دہ رسی پر بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔

شگو معمول کی طرح ایک دم ہی کمرے میں نہ جاسکی۔ برآمدے ی میں کھڑی رہی۔

بیلا اور رچنا نے اسے دیکھ لیا تھا۔

وہ بھاگی آئیں۔

رچنا نے تو خوب مبارکبادیں دیں۔

لیکن

بیلا اسے تکتی رہی۔

"اس لڑکی نے دولت کی خاطر اپنے آپ کو داؤ پر لگا ہی دیا!"

بیلا نے دل ہی دل میں سوچا۔

اسے افسوس ہو رہا تھا۔

اور

وہ طاہر کے متعلق جاننے کو بے تاب تھی۔

لیکن

شگو کے ساتھ آغا جان کی بہوئیں تھیں۔ اس لئے وہ کچھ کہنے کی جسارت نہ کر سکی۔

"چلئے نا آغابی بی" ہرو شے نے کہا۔ "آغا جان آپ کے انتظار میں ہوں گے۔"

بیلا نے اک گہری نگاہ شگو پر ڈالی۔ اس نگاہ میں غصہ تھا۔ شکوہ تھا۔ گلہ تھا۔

شگو نے جلدی سے منہ پھیرتے ہوئے بیلا سے کہا۔ "میں تم سے ملوں گی۔"

شرمینے اور ہرو شے شگو کو اندر لے گئیں۔

دونوں نے آغا جان کو سلام کیا۔

آغا جان نے گردن گھما کر ادھر دیکھا۔ شگو بھی ساتھ تھی۔ وہ

ہ شوق شگو پر ڈالتے ہوئے بولے۔ "آپ سب نے آنے کی زحمت یں تو گھر ہی آ رہا تھا۔"

"آغابی بی — یہاں بیٹھ جایئے" ہرو شے نے شگو کو بیڈ پر بیٹھنے کہا۔

لیکن وہ آغا جان کی کرسی کی پشت پر آن کھڑی ہوئی۔

"کیسی ہے آپ کی طبیعت"

"ٹھیک ہوں"

"رات انجکشن لیا تھا"

"ہاں۔ کیپسول بھی۔ ڈاکٹر آصف رات دیکھنے آئے تھے۔"

"ہوں ——"

دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر شرمینے اور ہرو شے دوسرے ے میں چلی گئیں۔

"شیگی" آغا جان بولے۔

"جی ——"

"کل مجھے تکلیف ہو گئی۔ میں تمہیں ٹھیک سے دیکھ بھی نہ سکا ہیں عروسی جوڑے میں دلہن بنی تم کیسی لگ رہی تھیں"

وہ چپ رہی ——

اس موضوع پر گفتگو اسے اچھی نہ لگ رہی تھی۔ لیکن جائے ر بھی تو نہ تھی۔ آغا جان نے کرسی کی پشت پر رکھے شگو کے ہاتھ

کو مضبوطی سے پکڑ کر گھما کر اسے اپنے سامنے کر لیا۔ شگو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ وہ جلدی سے بیڈ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔

آغا جان نے کرسی کا رخ بھی اسی طرف پھیر لیا۔

"ہم آج پشاور جا رہے ہیں" آغا جان بولے۔

"جی ——"

"ہاں امریکہ جانے میں جو دو چار دن ہیں۔ وہ میں اپنے گاؤں میں اپنی حویلی میں اپنے لوگوں کے درمیان گزارنا چاہتا ہوں"

"لیکن ——"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ ہاں۔ تم اپنا گھر دیکھنا پسند نہیں کرو گی۔"

وہ چپ ہو گئی ——

"اپنے نئے رشتہ داروں سے نہیں ملنا؟"

"لیکن آغا جان آپ بیمار ہیں۔ رات بھی اچانک ہی زیادہ تکلیف ہو گئی تھی نا۔ جو وہاں ——"

"دوائیاں انجکشن ساتھ ہوں گے۔ تم انجکشن دے سکتی ہو۔ دوائیاں کھلا سکتی ہو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن سفر ——"

"پشاور تک بائی ایئر اور وہاں سے گاڑی میں گھر۔ سات آٹھ میل تو ہے سارا راستہ۔"

"آپ نے جانا ضرور ہے۔"

"بالکل۔ شام ساڑھے تین کی فلائیٹ سے جانا ہے۔ تم تیار ہونا۔"

اس نے سر ہلایا۔

"تم اپنی حویلی دیکھ کر خوش ہو جاؤ گی"

وہ چپ رہی۔

"کیا بات ہے شیگی"

"جی ——"

"چپ چپ ہو"

"نہیں تو ——"

"افسوس تو نہیں ہو رہا"

"کس بات کا ——"

"عجلت میں اتنا بڑا قدم اٹھانے کا۔"

اس نے جلدی سے سر نفی میں ہلایا۔

"تو پھر ہنسو بولو پہلے کی طرح چہکو"

شگو بولی۔ "رات آپ نے ڈرا ہی دیا۔"

"اوہ —— اس سے پریشان ہو"

"ہاں ——"

"یہ تکلیف تو مجھے اب تقریباً روز ہی ہوتی ہے۔ تمہارے سامنے ئی دفعہ ہو چکی ہے۔"

"پہلے بات اور تھی آغا جان۔ آپ مریض تھے اور میں نرس۔ لیکن اب۔"
اس نے ادائے دلفریبی سے آغا جان کو دیکھا۔ وہ تو دل تھام کر رہ گئے۔ جلدی سے ہاتھ بڑھایا اور شگو کے دونوں ہاتھ ہاتھوں میں پکڑ کر بولے۔ " اب ـــــ اب کیا ـــــ"

شگو مسکرانے لگی۔ آغا جان کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ اپنی نئی نویلی دلہن کو بازوؤں میں لے کر پیار کر لینا چاہتے تھے کہ اسی وقت سٹاف نجمہ کمرے میں آگئی۔ وہ پرے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ شگو نے سکون کا سانس لیا۔

تھوڑی دیر بعد خان اسد خان آگئے۔ پشاور کے لئے ٹکٹ آ گئے تھے اور گاؤں بھی اطلاع ہو گئی تھی۔ ساڑھے تین کی فلائیٹ سے سب نے جانا تھا۔

"میں اماں سے مل آؤں" شگو بولی۔

"ہاں ضرور جاؤ ـــــ" آغا جان بولے۔

"میں لے جاؤں گا" سعد خان بولے۔

"جیسے جانا چاہیں" وہ بولے " اکیلی جانا چاہیں تو دلاور خان چھوڑ آئے گا۔"

"گھنٹہ دو ہی رک سکیں گی۔ فلائیٹ کا وقت ہو جائے گا" شرمینے بولی۔ "دلاور ہی کے ساتھ چلی جائیں۔ جتنی دیر وہاں ٹھہریں وہ وہیں رکے گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے نا" اسد خان بولے۔

"جی ـــــ" شگو بولی۔

شگو تھوڑی دیر بعد دلاور خان کے ساتھ اماں سے ملنے چلی گئی
ور گاڑی دروازے تک لے گیا۔

شگو بڑی شان سے پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اہل محلہ نے اسے
ڑی سے اترتے دیکھا۔ ڈرائیور نے بڑے ادب سے دروازہ
ولا تھا۔

اور وہ نکل کر اپنے گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اس
ے پیچھے پیچھے ڈرائیور اس کا وینٹی کیس اور کپڑوں کا بیگ اٹھائے
رگیا تھا۔

عورتیں آپس میں اشاروں کنایوں میں اس کی شان دیکھ کر باتیں کرنے
تھیں۔ کوئی حسد محسوس کر رہی تھی تو کوئی ناک منہ چڑھا رہی تھی۔

شائستہ اماں اور طاہر صحن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اماں تو اس صدمے سے ابھی تک نہ نکل پائی تھی جو شگو کی من مانی کرنے سے اس پر گزرا تھا۔ شائستہ کو بھی خوشی تو نہ ہوئی تھی۔ لیکن حق مہر جو کچھ لکھا تھا اور بری میں اس کے لئے جو کچھ آیا تھا اس سے اطمینان ضرور ہوا تھا۔ دولت بھی بہت بڑا سہارا ہوتی ہے۔ طاہر کے بھی کچھ ایسے ہی تاثرات تھے۔

خوش بھی تھا دکھا ہوا بھی۔ اگر تو شگو اپنے پلان میں سچی ہے تو پھر کوئی خدشہ نہیں تھا۔

چند ماہ بعد وہ اس کی ہو جانے والی تھی۔ یہ مشکل وقت گزارنا ہی تھا۔ یہ خیال بھی ہمت دلاتا تھا کہ وہ یہ چند ماہ سعودی عرب میں بڑے مصروف گزارے گا۔

لیکن

پھر بھی وہ فی الحال شگو کو کھو چکا تھا۔ وہ اس کی نہیں آغا جان
یوی بن چکی تھی۔

اور آغا جان

جن سے بظاہر اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

پھر بھی

کسی کسی وقت دل ہول جاتا تھا۔

آغا جان اک مرد بھی تو تھے جن کے پاس دھن دولت تھی اور اس کی شگو کو اس سے چھین کرلے گئے تھے۔ اس وقت اماں چارپائی پر نڈھال سی پڑی تھی۔

شائستہ اور طاہر ہولے ہولے یہی باتیں کر رہے تھے۔ باتوں
ندازہ مثبت تھا۔

"بالآخر شگو کر ہی گزری" شائستہ بولی۔ "دولت کی ہوس پوری
گئی۔ بہت کچھ ملا ہے اسے۔"

"ہاں آپا" طاہر بولا۔ "کوٹھی، دکانیں، کیش اور بے شمار زیور۔
ب ہی ملے ہیں میرے خیال میں بارہ پندرہ لاکھ ——"

شائستہ نے جلدی سے بات کاٹی۔ "بارہ پندرہ؟ کم از کم بیس لاکھ
لہ اس سے بھی زیادہ۔"

طاہر نے سر ہلایا۔ "واقعی کوٹھی اور چھ دکانیں ہی پندرہ بیس
کھ کی ہوں گی۔"

"ہاں اور کیش الگ"

"زیور بھی دو تین لاکھ کا تو ہوگا"

"ہاں اور اب امریکہ جائے گی"

"شاید کل جا رہی ہے"

"نہیں — ہفتے کو — آج شام تو پشاور جائیں گے وہ سب لوگ —"

"ہاں یہی بتا رہی تھی — شد بینے —" شائستہ بولی۔ "آغا جان امریکہ جانے سے پہلے اپنے گاؤں جانا چاہتے ہیں"

"ہوں"

"بیچارے سمجھتے تو ہوں گے کہ خدا خبر واپس زندہ آنا نصیب بھی ہوتا ہے کہ نہیں"

"انہیں بتایا تو نہیں گیا کہ وہ کینسر کے مریض ہیں"

"ہائے ہائے نہ بتایا ہو — پھر بھی اپنی حالت سے سمجھ تو سکتے ہیں شگو تو کہہ رہی تھی ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ ہے"

"ہاں ڈاکٹروں کے بورڈ نے فیصلہ دیا تھا"

"بیچارہ —"

"تو ہفتے کو جا رہی ہے شگو"

"ہاں یہاں سے تو آج ہی چلی جائے گی، پھر وہیں سے امریکہ جائیں گے"

"یہاں ملنے نہیں آئے گی"

"پتہ نہیں"

"آپ لوگ بھی نہیں جائیں گے اسے ملنے"

"اماں سے تو کہا ہے۔ وہ مانتی نہیں، روگ لگائے بیٹھی ہیں"

"مامی —" طاہر نے اسے پکارا۔

"ہاں"

"مامی اتنے سوگ کی کیا ضرورت ہے۔ شگو نے جس منصوبے کے تحت شادی کی ہے، آپ اس کی کامیابی کی دعا کریں"

"تیری شہ ملی تھی اسے" مامی اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ "تو بھی ایسا ہی ہے۔ تم دونوں کو دولت سے پیار ہے۔ صرف دولت سے —"

شائستہ جلدی سے بولی۔

"اماں اس کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔ اپنی بیٹی کو جانتی نہیں ہو۔ جس بات پر اڑ جائے کر کے ہی رہتی ہے"

"یہ اسے باز رکھ سکتا تھا۔ لیکن یہ خود بھی اسے"

"مامی" طاہر مسکرایا۔ "میں نے اسے ترغیب کبھی نہیں دی آپ یہ کہہ سکتی ہیں کہ اس کی ہاں میں ہمیشہ ہاں ملائی ہے"

"تو یہ کیا اچھی بات کی ہے"

"بس — میں اس کی کوئی بات رد نہیں کر سکتا"

"اچھا کیا ہے۔ اب اس کے بیوہ ہونے کا انتظار کر۔"

"مامی —" طاہر بے چینی سے بولا۔ "انتظار تو میں کروں گا ہی —"

"چاہے وہ شریف آدمی دس سال اور جیئے۔"

طاہر نے گھبرا کر کہا۔ "نہیں مامی — وہ صرف چند ماہ کا مہمان ہے —"

"ہاں اماں کینسر کا مریض ہے۔" شائستہ بولی "شگو اتنی بھی بے وقوف نہیں۔"

"یہ اقدام اس نے دولت حاصل کرنے کے لئے کیا ہے۔"

"خود غرض۔ لالچی۔ ہوس زدہ لڑکی۔ اس طرح ہتھیائی ہوئی دولت اسے راس آئے گی۔"

اماں کی باتوں سے ڈر کر شائستہ جلدی سے بولی۔ "اماں دعا کرو راس آ جائے۔ اب جو ہو چکا ہو چکا آئندہ کی سوچو۔ اس کے لئے دعا کرو اس نے جس لئے یہ سب کچھ کیا ہے اس میں کامیاب ہو۔"

"یہ واردات رہزنی اور ڈاکے کے مترادف ہے اور طاہر تم بھی اس میں برابر کے شریک ہو۔"

طاہر نے سر جھکا لیا۔

آہستگی سے بولا۔

"مجبوراً شریک ہوا مامی۔"

"چلو چھوڑو یہ باتیں" شائستہ نے خوشدلی سے کہا۔ "ہمیں اس کا اچھا پہلو دیکھنا چاہیئے۔ دولت پاس ہوگی تو عیش و آرام کرے گی۔ کم از کم بیس لاکھ کی تو اب ہی مالک بن گئی ہے بیس لاکھ — اماں سوچو تو ذرا۔"

"سر کا سائیں نہ رہا تو یہ بیس لاکھ اسے چین نہیں دیں گے" طاہر نے ہنس کر کہا۔

"مامی سر کا سائیں سلامت رہے گا آپ کیوں فکر کرتی ہیں"

اماں نے ناگواری سے کہا۔ "تیری اماں تو اسے جی بھر بھر کر کوسنے دے رہی ہے، کیا قبول کرلے گی اسے۔"

"قبول میں نے کرنا ہے مامی۔ کسی اور نے نہیں۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک کی آواز ڈیوڑھی سے آئی۔

رفی منو نے شگو کو آتے دیکھ لیا تھا۔ بھاگے بھاگے آئے۔

"آنٹی آگئی آنٹی آگئی۔"

طاہر ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا۔

شائستہ بھی ڈیوڑھی کی طرف لپکی۔

اماں نے بھی آدھا دھڑ چارپائی سے اٹھایا۔

"شگو — میری بہن" شائستہ اس سے یوں لپٹ گئی جیسے برسوں بعد اسے دیکھا ہو۔

شگو بھی بڑے پیار سے بغلگیر ہوئی خوشی کے آنسو دونوں کی آنکھوں میں آ گئے تھے۔

"شگو" شائستہ اس سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔

"کیا ٹھاٹھ ہیں"

شگو نے بڑے نفیس اور خوبصورت کپڑے پہن رکھے تھے۔ میک اپ اور ہلکا سا زیور بھی پہن رکھا تھا۔

بچے اس کی ٹانگوں سے چمٹ گئے۔ جن سے بمشکل چھٹکارا پاکر وہ صحن میں آئی۔

طاہر کو دیکھا پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پہ آئی۔ نگاہوں سے سلام کیا اور پھر چارپائی پر بیٹھی اماں سے لپٹ گئی۔

اماں رونے لگی۔

رونا شگو کو بھی آیا ___

لیکن ___

اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"واہ اماں ___ میں ملنے آئی ہوں اور تم رو رہی ہو۔ کل رو لیا تھا نا ___ بس اب ___"

دلاور شگو کا بیگ اور وینٹی کیس لے آیا۔ اس نے سب کو سلام کیا اور مؤدبانہ بولا۔

"آغا بی بی۔ میں گاڑی ہی میں بیٹھ کر انتظار کروں"

"نہیں دلاور خان۔ ادھر بیٹھک میں بیٹھو ___ میں نے دو تین گھنٹے رہنا ہے"

"بہت اچھا صاحب"

وہ سر جھکا کر ادب سے بولا۔

شائستہ نے رقی سے کہا کہ وہ دلاور کو بیٹھک میں بٹھا دے۔

رقی کی جگہ طاہر گیا۔

ڈرائیور کو بیٹھک میں بٹھا کر چند لمحے اس سے باتیں کرتا رہا۔

شگو آپا کے ساتھ کمرے میں آ گئی۔ اماں بھی اٹھ کر ان کے پیچھے اندر آ گئی۔

شائستہ اس سے باتیں کرنے لگی۔

"اکیلی آئی ہو" اماں بولی۔

"کیسے ساتھ لاتی"

"آغا جان کو ___"

طاہر دروازے میں آن کھڑا ہوا

شگو نے گھور کر اسے دیکھا۔

پھر بولی۔ "وہ ہوسپٹل میں ہیں ___"

"لیکن کل تو ___" شائستہ بولی۔

"رات انہیں تکلیف ہو گئی تھی پیٹ میں ___ واپس چلے گئے تھے کلینک ___"

"عورتوں میں سے کوئی ساتھ آجاتی" اماں بولی۔

"بس کرو اماں ———" شگو بیزاری سے بولی۔

"انہیں ساتھ اٹھا لاتی تو ڈھنگ سے کوئی بات بھی نہ کر سکتے ہم سب میں خود اکیلی آئی ہوں"

"اچھا چھوڑ ——— یہ بتا کل وہاں پہنچی تو کیسے استقبال ہوا ———" شائستہ نے ہنس کر کہا۔

"جیسے کسی رانی کا ہوتا ہے ———"

"ہوں ———"

"یہ دیکھو ———" شگو نے وینٹی باکس زمین سے اٹھا کر پلنگ پر رکھا۔

شائستہ بڑے اشتیاق سے دیکھنے لگی۔

طاہر بھی پلنگ کے چوبی تکئے پر آن کھڑا ہوا ——— اور اماں بھی سامنے کھڑی ہو گئی۔

شگو نے وینٹی کیس کھولا۔ جو لال لال نوٹوں اور چھوٹے بڑے زیوروں سے بھرا تھا۔

"یہ سب ———" شائستہ بولی۔

"سلامی میں ملا ہے ———" شگو بولی۔

طاہر کچھ نہیں بولا ———

وہ ان چیزوں کی بجائے شگو کو تکے جا رہا تھا ———

شگو ایک ایک چیز نکال کر پلنگ پر رکھ رہی تھی۔ شائستہ ایک
ے زیور اٹھا اٹھا کر تکنے لگی۔ اماں کے چہرے پر بھی بشاشت
ے آثار نظر آئے۔

"ہائے ———" شگو نے ایک دم سے کہا۔

"بھئی ڈرائیور کو چائے وائے تو پلاؤ آپا ———"

اماں جلدی سے باہر نکل گئی۔ بیٹی کے سسرال سے ڈرائیور آیا تھا
الـر تواضع کرنا تھی۔

"شائستہ ———" اماں نے باہر نکلتے ہی پکارا۔

"پھر دیکھ لینا چیزیں ——— ذرا ادھر آ ——— چائے پانی کا بندوبست
کرنا ہے ———"

"آئی اماں ———" شائستہ نے نوٹوں کی گڈی واپس رکھتے ہوئے
ہا۔ پھر اٹھ کر باہر چلی گئی۔

شگو نے طاہر کی طرف گردن گھمائی۔

پھر مسکرا کر بولی "کافی مال ملا ہے ———"

طاہر چند لمحے چپ رہا ———

پھر اسے غور سے دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ "اسکی
ت کیا چکائی ———"

شگو اس کی بات سمجھتے ہوئے ہنس کر بولی۔

"کچھ بھی نہیں ———"

"جھوٹ ____"

"سچی آغا جان رات ہوسپٹل واپس چلے گئے۔ ان کو ایک دم ہی پیٹ میں تکلیف شروع ہو گئی۔"

"اور تم ____"

"میں گھر پہ ہی رہی" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "نئی دلہن تھی نا کسی نے ساتھ جانے ہی نہیں دیا۔ میں نے خدا کا شکر کیا اور خوب شاندار بیڈ روم میں بڑے ٹھاٹھ سے اکیلی سوئی۔"

"پیٹ میں تکلیف روز ہی تو نہ ہو گی۔ جو کلینک پہ چلے جایا کریں گے۔"

"ہم آج پشاور جا رہے ہیں۔ ساڑھے تین فلائٹ سے" شگو نے بات بدلی۔

"وہاں ____"

"وہاں کیا ____؟"

"بھئی وہاں تو کوئی کلینک نہیں نا"

"تو ____"

"وہاں تو آغا جان گھر پہ"

"تم جو کہنا چاہ رہے ہو۔ میں سمجھ رہی ہوں۔ لیکن فکر نہ کرو۔ میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔"

"کیا سوچا ہے"

"انہیں رات کو سکون کی نیند سونا چاہیئے۔ میں انہیں سٹرونگ

ی نیند کی گولی کھلا دیا کروں گی۔ سمجھے" وہ معنی خیز اور ہوشیار طریق سے مسکرائی۔

طاہر بھی ہولے سے مسکرایا۔

"صرف تین چار روز کی بات ہے طاہر ____ پھر امریکہ میں وہ ہوسپٹل یں ایڈمٹ ہو نگے۔ جہاں خطرے کی کوئی بات نہیں ہو گی" وہ پھر ی طرح مسکرائی۔

"یہ تین چار دن ہی تو"

"کہا نا بالکل بیفکر رہو"

"بڑی ہوشیار ہو گئی ہو"

"بالکل"

"کل تک تو یوں رو دھو رہی تھیں کہ"

"کل کی کل تک رکھو۔ آئندہ کا سوچو۔ ہاں تو تمہارا کیا پروگرام ہے"

"کیا"

"باہر جانے کا"

"خط تو ربیعہ کا بھی آج آیا ہے ____ ویزا دو چار دن میں مل جائے گا مجھے ____"

"چلو اچھی بات ہے۔ ہم ادھر پرواز کریں گے تم اُدھر۔"

"خدا کرے ہم دوبارہ بخیریت مل پائیں"

"طاہر ضرور مل پائیں گے۔ ڈھیروں دولت ہو گی ہمارے پاس۔ بنگلہ

گاڑی بنک بنیس ملبوسات زیورات کیا کچھ نہیں ہو گا۔ لوگ کہتے ہیں، خواب پورے نہیں ہوتے۔ یہ کم ہمت اور بزدل لوگوں کی من گھڑت باتیں ہیں۔ انسان عزم کرے تو تعبیریں مل جاتی ہیں۔ سہانی دلفریب اور خوشگوار ہیں نا "

طاہر نے اثبات میں سر ہلایا۔ خوابوں کی تعبیریں اب اسے بھی ملتی نظر آنے لگی تھیں۔ کچھ شگو کی وجہ سے اور کچھ اپنی قسمت بھی کھلنے والی تھی۔ باہر جانے کی دیر تھی پھر پیسہ ہی پیسہ۔

دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ عہد و پیمان ایک بار پھر کیے گئے۔

شگو نے ہنس کر کہا۔ " وعدے سے پھر تو نہ جاؤ گے "

" کس وعدے سے "

" اک نوعمر بیوہ سے شادی کرنے کے وعدے سے " وہ تمسخرانہ انداز میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

طاہر نے پیار سے اسے دیکھا۔ بس نہیں چلا کہ باہوں میں سمیٹ کر سینے سے لگا لے۔

کھانا شگو نے نہیں یہیں سب کے ساتھ کھایا۔ اماں نے مرغ مسلم نان کباب اور مٹھائی بھی کھانے کے ساتھ رکھی۔

" اماں یہ خاطر دلاور کی کرو۔ عزت ہو گی ہماری۔ جا کر بتائے گا سب کو۔ ہماری خیر ہے "

" اسے سب کچھ بھجوا دیا ہے "

ٹھیک ہے "

کھانے کے بعد شگو نے دوسرا لباس تبدیل کیا۔ بال سنوارے اور ے اپ کیا اور کپڑوں کی مناسبت سے ڈائمنڈ کا سیٹ پہنا۔ پرفیوم میں ہا سی گئی۔ شائستہ اور اماں خوش ہو گئیں۔ طاہر نے بھی اسے بڑے وق سے دیکھا۔ تھوڑی دیر سب باتیں کرتے رہے۔ آج شگو ہوائی از میں سفر کرنے والی تھی۔ یہیں باتیں ہوتی رہیں پھر اٹھتے ہوئے لی۔ " اب میں چلوں۔ آپ سب ہمارے ہاں ٹھیک دو بجے ئیں، وہیں سے ایئر پورٹ ہمیں چھوڑنے جائیں۔ میں ابھی جا کر گاڑی ہوا دیتی ہوں۔ ہاں طاہر تم ضرور آنا "

اس نے سر ہلا دیا۔

شگو سب سے مل کر گاڑی میں آ بیٹھی۔

دلاور نے اس کی چیزیں پچھلی سیٹ پر رکھیں اور سینے پر ہاتھ رکھ ر جھکاتے ہوئے اماں کو سلام کیا۔

طاہر سے ہاتھ ملایا اور شائستہ کو بھی خدا حافظ کہا۔

کچی موٹی موٹی اونچی دیواروں والی حویلی کا بیرونی گیٹ لوہے کا تھا بہت چوڑا اور بڑا اونچا۔ حویلی کے چاروں کونوں میں مورچے بنے ہو۔ باہر سے یہ ایک چھوٹا سا قلعہ لگتی تھی۔

پشاور سے گڑھی تک تو پکی سرمئی سڑک تھی، لیکن وہاں سے حویلی تک کچا راستہ تھا۔ گاڑی کو بڑی احتیاط سے اس راستے پر چلایا گیا۔ لیکن پھر بھی کافی دھچکے اور جھٹکے لگے تھے۔ احتیاطاً آغا جان کو پچھلی سیٹ پر تکیوں کے سہارے لٹا دیا گیا تھا۔ شگو ان کے پاؤں کے قریب بیٹھی تھی۔

جب بھی گاڑی کو جھٹکا لگتا۔ وہ آغا جان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھٹکے کی طاقت سے انہیں محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی۔ آغا جان ممنونانہ انداز میں اسے تکتے تھے

حویلی سے کافی فاصلے پر ہی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ آغا جان

ے گاڑی رکوائی۔ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ شگو سے بھی چادر میں اوجود لپیٹ لینے کو کہا۔

شگو نے ان کے کہنے کی تکمیل کی۔ چادر میں اپنے آپ کو اس رح لپیٹ لیا کہ اس کا جسم یا چہرہ کچھ بھی لوگوں کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔

"چلو اب ——"

دونوں ٹھیک طرح سے بیٹھ گئے تو ڈرائیور حشمت گل سے آغا جان نے کہا۔

اب لوگوں کا ہجوم قریب آگیا تھا۔ لوگ آغا جان اور آغا بی بی کا خیر مقدم کرنے یہاں آئے تھے۔ خوشی کا اظہار کر رہے تھے کچھ نوجوان ولڈی ڈال رہے تھے ڈھول بھی پیٹ رہے تھے پھول برسا رہے تھے اور ہوائی فائر کر رہے تھے۔

گاڑی آہستہ آہستہ ان لوگوں کے بیچ میں سے گزری۔ آغا جان مسکرا مسکرا کر ان استقبال کرنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ کسی سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

کسی کی احوال پرسی کو ایک آدھ جملہ کہہ رہے تھے۔ لوگ بھی خان کی صحت کے بارے دعائیں کرتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"خان اب آپ بالکل ٹھیک ہیں نا"

گاڑی رینگتی ہوئی حویلی کے بڑے اور آہنی گیٹ میں داخل ہوئی تو آغا جان نے مسکرا کر شگو کو دیکھا اور ہولے سے بولے۔ "مبارک ہو۔

شیگی۔ تم اپنے گھر میں آگئی ہو"

شگو بڑا لطف لے رہی تھی۔

لوگوں نے جس طرح پذیرائی کی تھی، اک انوکھے سے تفاخر کا احساس اس کے اندر جاگا تھا۔

اپنے بڑے پن کا احساس ہوا تھا۔

وہ اس تجربے سے خوشی اور مسرت محسوس کر رہی تھی۔

"جی ——— شکریہ ———"

آغا جان کی بات کا جواب دیتے ہوئے اس نے چادر سر سے ذرا کھسکائی۔

اب وہ سب حویلی کے بے انتہا بڑے بڑے صحن میں تھے اور رشتہ دار عورتیں گاڑی کو گھیرے میں لئے کھڑی تھیں۔ آغا جان کی دلہن کا استقبال انہوں نے اپنے روائتی طریق سے کرنا تھا یہاں بھی خوشی کے اظہار میں نوجوان عورتیں اور بچیاں خٹک ڈانس کر رہی تھیں۔

پھول برسا رہی تھیں ———

خیر مقدمی کلمات پشتو میں کہہ رہی تھیں ———

شگو یہ زبان تو نہ جانتی تھی نہ ہی الفاظ اس کی سمجھ میں آرہے تھے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا جذبوں کی اپنی زبان بھی تو ہوتی ہے جو مشترک ہوتی ہے۔

دنیا کے ایک سرے پہ رہنے والا۔ دوسرے سرے پہ رہنے
ل کی باتیں اسی زبان میں سمجھ لیتا ہے۔

خوب خوشی کی گئی ———

لاہور سے باقی لوگ بھی پہنچ گئے تھے۔ وہ بھی اس خوشی میں
حصہ لے رہے تھے۔

شگو کو بڑے احترام سے گاڑی سے اتارا گیا۔

بکرے کا صدقہ دیا گیا ———

روپے نچھاور کئے گئے ———

پھولوں کا راستہ بنایا گیا تھا ———

شگو ان پر چلتی ہوئی کمرے تک پہنچی۔ یہاں بھی صدقہ خیرات
خ دلی سے کیا گیا۔

آغا جان کے بھی صدقات دیئے گئے، گاؤں کے بہت سے
یب لوگ حویلی کے باہر جمع تھے انہیں آغا جان اور شگو پر سے
ے وار وار کر دیئے گئے حویلی کے ملازمین جو بیسیوں تھے۔ آج
ل ہو گئے۔

رات حویلی میں چراغاں ہوا ———

حجرے میں گانے بجانے کی محفل جمی۔ سالم بکروں کی سجی کی
ت اڑی ———

شگو دل ہی دل میں حیران بھی تھی کہ آغا جان کی اس عمر کی شادی

پر کسی کو اعتراض نہیں ہوا تھا۔

چھوٹے بڑے سب یوں خوشیاں منا رہے تھے جیسے حویلی کی تقدیر جاگ اٹھی ہو۔

شگو کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔

کافی دیر وہ عورتوں میں گھری بیٹھی رہی۔

یہاں بھی سب نے اسے سلامی دی، کسی نے روپے کسی نے زیور ——— رشتوں ناطوں کے حوالے سے بھی شگو کو سب سے متعارف کروایا گیا۔

رات تک یہ ہنگامہ رہا۔

"آغا جان کو اب آرام کرنا چاہیئے" ہروشے نے کہا۔

"ہاں ——— انہیں بلا بھیجو۔ ورنہ حجرے میں تو جو لوگ ہیں وہ انہیں اٹھنے نہیں دیں۔ ساری رات گاتے بجاتے رہیں گے وہ"

"چلم قہوہ ساری رات ملتا رہے تو ان لوگوں کی محفل ساری رات جمی رہے گی"

"وہ تو ٹھیک ہے لگے رہیں۔ خوشی کا موقعہ ہے سب کے لئے لیکن آغا جان کو آرام کرنا چاہیئے"

"ہاں ——" شگو نے بھی اس کی تائید کی۔ "سفر نے بھی تھکا دیا ہوگا"

"تھکاوٹ تو اپنوں کو دیکھ کر اتر جاتی ہے" شرمینے بولی "اپنوں کا

پیار محبت عزت سب تھکان دور کر دیتے ہیں۔ لیکن آغا جان کے لئے آرام ضروری ہے۔ کاش وہ بیمار نہ ہوتے"

"بیماری بھی ایسی ہے کہ ———"

شگو کے سامنے ایسی باتیں کرنے سے گل پری نے ہروشے کو آنکھوں کے اشارے سے منع کیا۔

پھر بولی "جاؤ نا کسی کو بھیجو حجرے میں آغا جان کو بلا لائیں"

ہروشے اٹھ کر چلی گئی۔

شرمینے بولی۔ "آغا جان کا کمرہ ———"

"ٹھیک ٹھاک ہے ———"

شرمینے شگو سے بولی۔ "صبح اُٹھ کر آپ کو ساری حویلی دکھائیں گے۔ بہت بڑی ہے۔ باہر کچی دیواریں ہیں۔ یہ مدتوں سے ایسی ہی ہیں لیکن اندر سے ساری حویلی پختہ ہے اور آغا جان بڑا ہی نفیس ذوق رکھتے ہیں۔ اس حویلی کی سجاوٹ میں ان کے اس ذوق کا بڑا حصہ ہے"

شگو ہولے سے مسکرائی

"آپ بھی تھک گئی ہوں گی آغا بی" گل پری بولی "آیئے میں آپ کو آپ کے کمرے میں لے چلوں"

شگو اٹھی۔

شرمینے بھی ساتھ اٹھی۔

دو ایک رشتہ دار عورتیں بھی اسے اس کے ساتھ کمرے تک
چھوڑنے آئیں۔ گھر کی خاص خاص نوکرانیاں بھی پیچھے پیچھے آئیں۔

شگو نے کمرے میں قدم رکھا۔

تو

گل پری نے پھر اس پر سے پیسے وار کر ان نوکرانیوں کو دیئے، یہ
کمرہ آغا جان کی خوابگاہ تھی۔

وہ سبز قالین موٹے موٹے پردے۔

نرم و گداز صوفے

کرسٹل کے فانوس اور نوابی طرز کی بڑی سی مسہری جس پر ریشمی
بستر لگا تھا۔

دیواروں پر خوبصورت فریموں میں کچھ اوریجنل پینٹنگز تھیں، کونوں
میں سائیڈ ٹیبلوں پر بڑے بڑے منقش گلدان اور مرمریں مجسمے
تھے۔ اور ایک طرف بڑے سے شوکیس میں سونے چاندی کے
ظروف اور دوسری قیمتی اشیأ رکھی تھیں۔

شگو نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔

ایسی خوابگاہ اس نے پہلے کہاں دیکھی تھی وہ کمرے کے وسط
میں کھڑی ہر چیز کو نگاہ شوق سے تک رہی تھی۔

کمرے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا کمرہ اور تھا اس کو بطور ڈریسنگ
روم استعمال کیا جاتا تھا۔

بڑی بڑی الماریاں تھیں۔

ایک دیوار پوری کی پوری شیشے کی تھی جس کے آگے سٹول۔
پڑے تھے۔ اور شیلفوں اور دروازوں کے اوپر کوسمیٹکس پڑے تھے
یہاں بھی فرش موٹے قالین سے ڈھکا تھا اور کھڑکیوں پر بھاری
بھاری پردے تھے۔

ساتھ ہی باتھ روم تھا۔

جو جدید چیزوں سے آراستہ تھا۔

نہانے کا حوض نما ٹب۔ سنگ بیسن آئینے ہر چیز موجود تھی۔
گاؤں میں اتنا خوبصورت اور جدید ترین چیزوں سے آراستہ گھر بھی ہو
سکتا ہے۔ شگو کے تو کبھی تصور میں بھی یہ بات نہ آئی تھی۔

ابٹی نے شگو کا سامان لاکر ڈریسنگ روم میں رکھدیا۔ ثمرین
نے پشتو میں نوکرانی سے کہا۔

"ابٹی آغا بی بی کے کپڑے بکس سے نکال کر اس الماری میں
رکھ دو۔ جوتیاں اس ریک میں لگا دو۔ اور پرس اس خانے میں"

"بہت اچھا" وہ بولی۔

"تین چار دن آغا بی بی نے یہاں رہنا ہے ان کا ہر کام تم نے کرنا
ہے۔ ان کے کپڑے استری کر کے الماری میں لٹکا دینا"

وہ اسے ہدایات دیتی رہی۔

پھر شگو کا نائٹ ڈریس نکالا۔

اور کمرے میں آکر بولی ۔

"آغابی بی آپ کپڑے بدل لیں ۔ تھک گئی ہوں گی ۔ نہانا چاہیں تو گرم پانی ہے ، نہالیں تھکاوٹ دور ہو جائے گی ۔"

"جی بہت اچھا " شگو نے ڈریسنگ روم کی طرف آتے ہوئے کہا ۔

"آغابی بی " شیرینہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے بولی ۔

"جی " شگو نے کہا ۔

"دیکھیں آغابی بی ۔ آپ بے شک ہم سے چھوٹی ہیں ، ہماری بیٹیوں کے برابر ہیں ۔ لیکن آپکا رشتہ بہت بڑا ہے ۔ آپ ہماری سب کی ماں ہیں ۔ اس لئے ہمارے ساتھ آپکا انداز گفتگو بھی ایسا ہونا چاہیئے کہ پیار و شفقت کے باوجود تحکمانہ انداز ہو ۔ انکساری اور عجز آپ کے مرتبے کو زیب نہیں دے گا ۔ آپ آغاجان کی بیوی ہیں ۔ اب آپ اپنے آپکو اسی بلندی سے دیکھیں "

وہ بڑے خلوص سے گھر کی سب سے بڑی اور معتبر بیگم ہونے کے آداب شگو کو سمجھانے لگی ۔

شگو خاموشی سے سنتی رہی ۔

ان لوگوں کی مرضی رہیت اور رواج کے مطابق اسے عمل کرنا ہی تھی
شگو نے سوچا کیا ہرج ہے چند ماہ کی تو بات ہے ان کی مرضی کے مطابق ہی سب کچھ کرلوں گی ۔

آغاجان آگئے ۔

وہ خاصے تھکے تھکے لگ رہے تھے ۔ شگو کے پاس انکی دوائیوں
ڈبہ تھا ۔

رات انہیں انجکشن بھی دینا تھا اور دوائی بھی ۔

شگو کو ڈریسنگ روم میں چھوڑ کر شیرینہ چلی گئی ۔ اس نے کپڑے
لئے اور باتھ روم میں چلی گئی ۔

گرم گرم پانی سے نہانے میں بڑا مزہ آیا ۔ نہا دھو کر اس نے
ب خوابی کا لباس پہنا ۔

بالوں کو ہیئر ڈرائیر سے سکھایا اور بیڈ روم میں آگئی ۔

آغاجان مسہری کے کنارے پر بیٹھے تھے ۔ شگو کا دل ایک بار
ن سے بیٹھ سا گیا ۔
لیکن
جلد ہی سنبھلی ۔ اس نے رات گہری نیند سونے کے لئے
یں دوائی دینا تھی ۔

آغاجان نے اک گہری نگاہ اس پر ڈالی ۔ خوشی کا ہر توان کے
رے سے چھلکا ۔

بڑے پیار سے بولے ۔ "کیا لگا اپنا گھر "

"صبح دیکھوں گی ۔ ابھی تو لوگوں سے ہی مل پائی ہوں " وہ شرماتے
اتے ہوئے بولی ۔

"کیسے ہیں ہمارے لوگ "

"بہت اچھے پیار کرنے والے"

"میں تم سے کہا تھا نا — میرے لوگ بہت پیار کرتے ہیں مجھے
اور میں بھی ان سے پیار کرتا ہوں۔ سب میرے بچے ہیں"

"جی —"

"اور شگی — تمہیں بھی اب ان سب کو اپنے بچے ہی سمجھنا ہوگا۔ تمہاری
عمر تو بے شک بہت چھوٹی ہے، لیکن تمہارا مقام بہت بڑا ہے"

وہ چند لمحے اسے ان لوگوں کی محبت وفاداری اور جانثاری کا بتاتے
رہے۔

"آغا جان اب آپ کو آرام کرنا چاہیئے۔ تھک گئے ہوں گے آپ"
شگو بولی۔

"میری تھکاوٹ اپنے گھر میں آکر اپنے لوگوں کو دیکھ کر دور ہوگئی
ہے —"

"نہیں — یہ خوشی اپنی جگہ لیکن ریسٹ اپنی جگہ۔ کل رات بھی آپ
کو تکلیف ہوگئی تھی۔ کہیں آج پھر — چلئے کپڑے بدلئے — اور
سو جائیے"

"سو جاؤں —" آغا جان اٹھتے ہوئے شوخ نظروں سے
شگو کو دیکھا۔

شگو گھبرا سی گئی۔

جلدی سے بولی "ہاں —"

آغا جان نیم وا نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بازو پھیلا کر اس
کی طرف بڑھے۔

شگی حواس باختہ سی پیچھے ہٹی۔

"نہیں آغا جان" وہ بولی "آپ جا کر کپڑے بدل لیں۔ آپ کو آرام
کی ضرورت ہے"

"شگی —" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ "میرے پاس
آؤ — آؤ —"

اس نے ہاتھوں سے نفی سے اشارہ کیا۔ "آغا جان۔ ڈاکٹروں
نے منع کیا ہے"

"پیار کرنے سے" وہ بولے۔

شگی کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

"شگی کل میری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ لیکن آج میں بالکل ہی
ٹھیک ہوں۔ یقین مانو مجھے ذرہ بھر تھکاوٹ محسوس نہیں ہو رہی"

شگی کا جسم کانپنے لگا۔

آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لہرانے لگی۔

رنگت پھیکی پڑ گئی۔

اس نے تو سوچا تھا کہ آغا جان کو آتے ہی نیند کی دوائی کھلا
دے گی۔

لیکن

لیکن وہ — وہ —

شیگی ——"

آغا جان نے لپک کر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ ان کے بازوؤں میں بلا کی قوت تھی۔

شیگی تو خوف سے پیلی پڑ گئی۔

جسم بے جان سا ہو گیا۔

ڈر کے مارے اس نے آنکھیں سختی سے بھینچ لیں۔

آغا جان نے سر جھکایا اور اپنے بازو پر پڑے شیگی کے بے جان سے چہرے کو دیکھا۔

پھر ——

ان کا سر اور جھکا اور انہوں نے اپنے لب شیگی کے یخ بستہ ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

شیگی ایک بار بے آب مچھلی کی طرح پھڑکی۔

لیکن،

پھر ——

بالکل ٹھنڈی پڑ گئی ——

آغا جان نے اس کو بازوؤں پر اٹھایا اور اس کے ہونٹ گال بال اپنے تپتے ہونٹوں کے لمس سے داغتے اسے مسہری پر لاکر لٹا دیا۔

شیگی بے بس ہو گئی اس نے چیخنا چاہا —— واویلا کرنا چاہا —— احتجاج کرنا چاہا۔

لیکن ——

کچھ نہ کر سکی ——

بہتّر سالہ بوڑھے مریض کے جسم میں جوانی کی توانائی عود آئی تھی۔ مدتوں عورت کے لمس سے ناآشنا ہو جانے والا مرد بھوکا پیاسا تھا۔

عورت بھرے خوان کی طرح اس کے ہاتھوں میں تھی وہ بڑی وحشیانہ گرسنگی سے اس خوان پر ٹوٹ پڑا۔

اس نے اپنا حق وصول کرنا تھا۔

اپنی بھوک مٹانا تھی۔

اور یہ سب کچھ اخلاقاً قانوناً مذہباً اس کا حق تھا۔

شگو تو جیسے مر ہی گئی ——

چور چور ہو گئی ——

ریزہ ریزہ ہو گئی ——

آج اپنے پلان کی پہلی ناکامی سے دوچار ہوئی تو صدمے نے نڈھال کر دیا۔ اس کا اپنا آپ تو طاہر کی امانت تھا اس امانت کی حفاظت کا اس نے طاہر سے وعدہ بھی کیا تھا۔ اور اس امانت کی حفاظت کو وہ بڑا سہل بھی سمجھتی تھی۔

لیکن ——

لیکن ——

یہ امانت اس بھوکے بھیڑیئے نے جس طرح لوٹی تھی. شگو
کا جی چاہ رہا تھا۔ زور زور سے چیخے۔

اتنا چیخے کہ در و دیوار ہل جائیں ——

لیکن ——

اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی ——

مرجھا گئی تھی شگو ——

بستر پر تو آغا بی بی پڑی تھی۔

آغا بی بی ——

جو ——

آغا جان کی بیوی تھی ——

دوسرے دن بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔
شگو کو بہت قیمتی لباس پہنایا گیا تھا. زیور سے لاد دیا گیا تھا۔
اماں نے سیف کی چابیاں اس کے حوالے کر دی تھیں سیف
جواہرات ہیرے موتی اور نوٹوں سے بھری تھی۔

لیکن ——

کل ——

اور آج کی شگو میں بہت فرق آچکا تھا۔ وہ خوش نہیں تھی۔
بھرپور بکھری بکھری لٹی لٹی سی نظر آرہی تھی. اس کا بدن دکھ
رہا تھا. اس کا دل زخمی تھا۔

اس کی روح مضطرب تھی۔ بہت دیر روتی رہی تھی. اس
کے کانوں میں بار بار طاہر کی آواز اتر رہی تھی۔
"اس کی قیمت کیا چکائی"؟

کس زعم اور اعتماد سے اس نے طاہر کی اس بات کا جواب دیا تھا ——

اسے آغا جان سے کوئی خطرہ محسوس ہوا ہی نہ تھا۔ ایک بہتّر سالہ بوڑھا کینسر کا مریض —— !!

وہ تو سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ کہ یہ سب کچھ ہو جائے گا طاہر کی امانت لٹ جائے گی۔ اور وہ چند دن بھی اس کی حفاظت نہ کر پائے گی۔

آج بھی آغا بی بی کو شہ مینے نے ہی تیار کیا۔ آج دعوت ولیمہ تھی۔ پورے گاؤں کے لوگ مدعو تھے۔ آغا جان کے دوست یار دوسرے گاؤں کے خان خوانین اور ملنے جلنے والے آئے تھے۔ پشاور سے بھی آغا جان، صمد خان، اسد اور سعد خان کے دوستوں اور ان کی بیویوں کی بڑی تعداد آئی تھی۔

آغا جان کی دلہن کو سب باری باری دیکھنے آئے تھے۔ نذرانے پیش کر رہے تھے۔ منہ دکھائی دی جا رہی تھی۔

لیکن ——

آج شگو کو نہ روپے پیسے سے خوشی مل رہی تھی نہ ہی چمکتے دمکتے زیورات سے۔ دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ سارا گاؤں خوشیاں منا رہا تھا۔

ڈھول باجہ بج رہے تھے۔ لوگ لڈیاں ڈال رہے تھے۔ خٹک

ہو رہا تھا۔ ہوائی فائر ہو رہے تھے۔

شگو حیران بھی ہو رہی تھی۔ کیا یہ لوگ واقعی اپنے سردار سے پیار کرتے تھے۔

انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ کہ اک بوڑھے آدمی نے اس عمر میں شادی کر لی ہے۔

سارا دن ہنگامے کی نذر ہو گیا۔

شام گھر کی عورتوں نے شگو کو پوری حویلی گھما پھیرا کر دکھائی بڑے بڑے دالانوں اور جہازی سائز کمروں والی حویلی۔ جو موٹے دبیز اور خوبصورت قالینوں سے ڈھکی تھی۔

قیمتی ساز و سامان سے آراستہ تھی۔ ساز و سامان کے علاوہ ایک کمرہ تو جیسے اسلحہ خانہ تھی۔ اس کی ہر دیوار پر ٹنگی پرانی بندوقیں ٹنگی تھیں۔

طمنچے اور پستولیں ٹنگی تھیں۔

گل پری، شہ مینے، ہرو شے اور دوسری رشتہ دار عورتیں اسے ہر اک رائفل اک اک پستول اور اک اک طمنچے کی کہانی بتا رہی تھیں

سارا اسلحہ آغا جان ہی کا تھا۔

"اس رائفل سے آغا جان نے اپنے تین دشمنوں کو موت کی نیند سلایا تھا۔

"اس سے شکار کیا کرتے تھے"

"یہ خان طغرل خان کے ساتھ لڑائی میں کام آئی تھی"

"اس سے برابر کے گاؤں والوں سے نپٹتے تھے"

"جب عقبی گاؤں والوں کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا تو آغا جان نے یہ طمنچے استعمال کئے تھے"

شگو اندر ہی اندر سہمی جا رہی تھی۔

عورتیں آغا جان کی بہادری دبدبے اور طاقت کی باتیں کر رہی تھیں سخت گیری کے قصے سنا رہی تھیں۔ ان کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔

وہ گاؤں کے سربراہ تھے لوگ ان کی کوئی بات ٹال نہیں سکتے تھے کسی بات سے اختلافات نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا اپنا قانون تھا۔ اپنے اصول تھے۔

گاؤں چونکہ علاقہ غیر میں واقع تھا۔ اس لئے ملکی قانون یہاں لاگو نہیں تھے۔ آغا جان مالک و مختار تھے جسے چاہیں نواز دیں جسے چاہیں غائب کروا دیں۔

جسے چاہیں مروا ڈالیں۔

جسے چاہیں الٹا لٹکا دیں۔

شگو تو باتیں سن سن کر دہلی جا رہی تھی۔ عورتیں اسے مبارکباد دے رہی تھیں۔

آغا بی بی کی مسند پر بیٹھنے کی سعادت اسے حاصل ہوئی تھی۔

ب کے لئے یہ خوشی کی بات تھی۔ ان لوگوں کے روّیے اور طیرے ے شگو جان گئی تھی کہ جو مقام اسے ملا تھا، وہ کتنا اہم اور کتنا ند ہے۔

رات شگو تکان سے چور چور تھی۔ اندر کے دکھ سے نڈھال بھی تھی، وہ آغا جان کے کمرے میں آنے سے پہلے ہی سو جانا چاہتی تھی۔

آغا جان کو نیند کی گولیاں دینے کی بجائے آج خود کھانے کا ارادہ ر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ بغیر گولیاں کھائے اسے نیند نہیں ئے گی۔ ذہنی کوفت اور من کی اذیت سے دوچار رہے گی۔

لیکن ——

ابھی ——

وہ ڈریسنگ روم میں جا کر کپڑے بدلنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی۔

ہ آغا جان آ گئے۔

شیگی نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔

وہ بڑے خوش اور تازہ دم نظر آ رہے تھے۔

"شیگی" وہ اس کے قریب آ گئے۔

اس کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے سرتاپا بڑے اشتیاق سے دیکھا۔

شگو کے اندر پسپائی اور شکست کا احساس جاگنے لگا اس

کے جسم سے سکت غائب ہونے لگی۔

"آغاجان — آپ آرام کریں۔ اپنے آپ کو —" وہ سہمی سہمی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"آرام ہی آرام ہے جانِ من — تم نے تو مجھے نئی زندگی دے دی ہے۔" انہوں نے شگو کو اک ہلکے سے جھٹکے سے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر سینے سے لگالیا۔

شگو نے بیزاری سے منہ بنایا آنکھیں بند کرلیں۔ ان بازوؤں کے حلق سے نکلنے کی کوشش کی۔

لیکن

گرفت آہنی تھی۔

شگو بے بس ہوگئی۔

آغاجان نے اس کے رسیلے ہونٹوں کا رس اپنے ہونٹوں میں پوری شدّت سے اتار لیا۔

آج رات پھر بھوکے پیاسے مرد نے اپنی سیرابی حاصل کی۔

شگو نے بہترا داویلا کیا۔ احتجاج کیا۔ روتی رہی۔

لیکن

مرد اپنا حق وصول کرتا رہا۔

مرد

جسے نہ ضعیفی کا احساس تھا نہ بیماری کا۔

تیسری رات بھی ایسی ہی تھی۔

لیکن

اس رات جب آغاجان نڈھال ہوکر بستر پر پڑ گئے۔ تو تکلیف
شدّت سے بلبلا اٹھے۔

وہی پرانی پیٹ کی تکلیف۔

شگو بالکل نہیں گھبرائی۔

اس کا تو جی چاہ رہا تھا کہ انہیں افاقے کے لئے دوائی دے نہ
بخشن۔ بلکہ اسی طرح تڑپتا چھوڑ دے تاکہ تڑپتے تڑپتے اگلے جہان
نچ جائیں۔

اور

شگو کی خلاصی ہوجائے۔

آغاجان مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے۔ آج تکلیف پہلے سے بھی زیادہ تھی۔

"کچھ کرو شیگی — کچھ کرو — میں بہت اذیت میں ہوں —"

اجان جو بڑے صبر و تحمل سے تکلیف برداشت کرلیا کرتے تھے
ج بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔

شگو پتھرائی سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

"میری دوائیاں کہاں ہیں —" آغاجان نے سمجھا شیگی فرطِ غم سے پتھرا سی گئی ہے۔ "میری جان فکر مند نہ ہو — دوائی دے دو

آفاقہ ہو جائے گا۔"

شگو اٹھی ——

الماری میں رکھا ڈبہ نکالا۔ دو گولیاں انہیں پانی کے ساتھ کھلائیں
آدھے گھنٹے بعد انجکشن دیا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد آغا جان کی طبیعت قدرے سنبھلی۔

اس تکلیف نے انہیں ادھ موا کر دیا تھا۔

شگو نے انہیں سونے کے لئے سٹرونگ سی ڈوز دی۔

"شگی ——" آغا جان نے اسے اپنے پہلو میں لٹا لیا۔

وہ بے جان سی لیٹ گئی۔

"بہت پریشان ہو گئی ہو تم، آج مجھے تکلیف بھی پہلے سے
بہت زیادہ ہوئی ہے۔ اب بھی ہو رہی ہے۔"

"آپ نے جب سے یہاں آئے ہیں آرام بھی تو نہیں کیا۔"
شگو بولی۔

"کیسے کرتا ——"

"یہاں آنا ہی نہیں چاہیئے تھا ——"

"آنا ضروری تھا ——"

"کیوں ——"

"امریکہ جانے سے پہلے کچھ ضروری کام کرنا تھے۔ اپنے لوگوں
سے ملنا تھا۔ اور سب سے بڑی بات کہ تمہیں یہ گھر دکھانا تھا جس

لی تم بلا شرکت غیرے مالک ہو۔ اپنی نئی زندگی کی ابتدا بھی تو یہیں"

شگو نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

آغا جان نے اس ہاتھ پر بے اختیارانہ بوسہ دیا۔

شگو جزبز ہوئی۔

لیکن ——

آغا جان کی باہوں میں سمٹی رہی۔

آغا جان باتیں کرتے رہے۔ درد میں آفاقہ تھا۔ کبھی کبھی کراہتے
ر پیٹ پکڑ لیتے۔

پرسوں امریکہ کے لئے روانگی تھی۔ اس سلسلے میں بھی باتیں ہوئیں
گو نے بہت کم باتوں کے جواب دیئے۔

باتیں کرتے کرتے آغا جان پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ تھوڑی
ر بعد وہ گہری نیند سو گئے۔

شگو جاگتی رہی ——

جاگتی رہی ——

اور ——

سوچتی رہی۔ اس نے اپنے بکھرے وجود کو سمیٹا۔ چور چور
ذہن کو اکٹھا کیا۔ جو ہو چکا تھا ہو چکا تھا۔ اب گریہ و زاری سے کوئی
فائدہ نہیں تھا۔

اس نے اتنا کچھ پا لیا تھا۔ اتنا کچھ کہ اس کی کبھی توقع نہیں کی تھی۔

وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

تصوّر بھی نہیں کیا تھا۔ آغا جان نے بہت ساری زمین بھی اس کے نام کر دی تھی اور بھری سیف کی چابیاں بھی اس کے حوالے کر دی تھیں۔

سیف کی مالیّت کا اندازہ لگانا ناممکن نہیں تو اس کے لئے مشکل ضرور تھا۔

یہ سب کچھ اس کا تھا۔ اور ابھی ابھی آغا جان نے اس حویلی کا بھی تو بتایا تھا کہ اس کی وہ بلاشرکت غیرے مالک تھی۔

وہ بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

آغا جان کیطرف دیکھا۔

وہ بے خبر سو رہے تھے۔

کل اور پرسوں کی طرح آج اسے غصّہ نہیں آیا۔

بیزاری محسوس نہیں ہوئی۔

وہ انہیں تکتی رہی۔

انہوں نے اس پر کتنا بھرپور اعتماد کیا تھا۔ کس فراخدلی سے دولت لٹائی تھی۔

اس کے بدلے میں ــــ ہاں ــــ اس کے بدلے میں اگر انہوں نے اپنا حق وصول کیا تھا ــــ تو ــــ

شگو نے اپنا سر جھٹک کر ذہن سے یہ آزادانہ خیال نکالنا چاہا۔

وہ بستر سے اٹھی۔

بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی چابیاں اٹھائیں اور ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔

جہاں سیف پڑی تھی۔

اس نے سیف کھولی۔

اور ــــ

اس میں رکھی ایک ایک چیز نکال کر دیکھنے لگی۔

یہ سب کچھ اس کا تھا ــــ

اس کا ــــ

وہ بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔

"طاہر ــــ طاہر ــــ" وہ طاہر کو آوازیں دے رہی تھی۔

دیکھو طاہر ــــ یہ سب کچھ میرا ہے ــــ میرا اور تمہارا ــــ تین چار مہینے بعد میں یہ سب کچھ لے کر تمہارے پاس آؤں گی۔ اتنی ڈھیروں دولت۔ میں نے تو کبھی خیالوں میں بھی اتنی دولت نہ پائی تھی ــــ طاہر ــــ ہم کس ٹھاٹھ سے باقی زندگی بسر کریں گے ــــ جانتے ہو ــــ ہاں صرف ــــ صرف ایک بات ہے ــــ کہ ــــ تمہاری امانت ــــ لیکن کیا ہوا طاہر ــــ اتنا کچھ پانے کے لئے کچھ نہ کچھ دینا بھی تو تھا ــــ تمہیں صدمہ تو ہوگا ــــ مجھے بھی ہوا ــــ لیکن اس صدمے کو ــــ ہم جھیل لیں گے۔

کیوں طاہر ـــ دیکھو تو ـــ اتنی دولت ـــ قبول کر لوگے نا مجھے ساری دولت میری اور تمہاری ہے ـــ ساری دولت ـــ"

وہ بڑی دیر تک جذباتی سی کیفیت سے دوچار رہی۔

بہت بڑی خوشی اور اتنا ہی بڑا دکھ جب بیک وقت ذہن پر حاوی ہوں تو پتہ نہیں چلتا کہ توازن کیونکر برقرار رکھا جائے، خوشی پر قہقہے لگائے جائیں یا دکھ پر بے اختیار آنسو بہیں۔ شگو پر بھی ایسی ہی کیفیت طاری تھی۔

شگو کو لگ رہا تھا کہ وہ ایسا زخم ہے جس سے قطرہ قطرہ خون ٹپک رہا ہے۔ ابھی اسے امریکہ جانا تھا وہاں چار چھ ماہ لگ سکتے تھے۔ اگر یہ بوند بوند لہو بہتا رہا تو واپسی تک وہ تو ختم ہی ہو جائے گی طاہر کے لئے کچھ بچا نہ پائے گی۔

تو

پھر

پھر

یہ سارا کھیل اس نے کھیلا ہی کیوں تھا؟

دولت پا کر وہ طاہر کو کھو دے، یہ بات تو اس کی سوچ کی برداشت سے بھی باہر تھی۔

طاہر کو اس نے برسوں چاہا تھا وہ اس کا تھا اس کا اپنا۔ اس کے بغیر زندگی کیسے گزار سکتی تھی، وہی تو اس کے سارے

پلانوں اور منصوبوں کا حصّہ تھا۔

یہ ساری دولت اس نے صرف اپنے لئے تو نہ چاہی تھی۔ طاہر کے ساتھ اک آسودہ خوشگوار اور ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی بسر کرنے کے لئے حاصل کی تھی۔

اس نے چاہا تو یہی تھا کہ صحیح و سالم اتنا مال مار کر طاہر تک جا پہنچے گی۔ لیکن راستہ اتنا ہموار اور راہیں اتنی آسان نہ تھیں۔ یہ اس کی غلطی تھی جو اس نے اس پہلو پر پہلے سوچا ہی نہ تھا۔

لیکن

اب ؟

شگو نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ بے رحم سوچوں سے چھٹکارا پانے کے لئے اس نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کا سوچا۔

کل صبح وہ امریکہ کے لئے روانہ ہو رہی تھی۔ سامان تو اس کی نوکرانیوں نے ہر شے کی نگرانی میں پیک کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ اٹھی۔ ساتھ لے جانے والے دونوں سوٹ کیس کھول کر بیٹھ گئی سارے کپڑے پھر سے تہہ کر کے رکھے۔ بیگ میں سے بھی چیزیں نکالیں۔ اور ایک ایک کر کے واپس رکھیں۔ آغا جان کا سوٹ کیس بھی اس نے کھولا۔

ان کے سارے کپڑے بھی پھر سے تہہ کر کے رکھے۔

انسان جہاں بھی جائے۔ جو کچھ بھی کرے اس کا اپنا آپ تو اس

کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس سے تو چھٹکارا نہیں ملتا۔ سوچوں کی دھیڑ بن کام میں مصروف ہونے کے باوجود بھی جاری تھی۔ شگو طاہر سے شرمندہ تھی۔

وہ اس کے پاس جائے گی تو کیا جواب دے گی ؟

کسی کسی وقت تو اسے خسارے کا احساس ہونے لگتا۔ جتنا پایا تھا اس سے کہیں زیادہ کھو دیا تھا۔

احساس زیاں چین نہ لینے دے رہا تھا۔

لیکن

پھر

ایکا ایکی

اس نے اپنے حواس مجتمع کئے۔ بکھرے وجود کو سنبھالا ڈھٹائی سے اپنے آپ سے بولی۔

کیا ہوا کوئی بات نہیں۔ میں نے کچھ بھی اپنی خوشی سے نہیں کیا۔ جبر کے تحت سب کچھ ہوا۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ آخر لوگ بیواؤں اور مطلقہ عورتوں سے بھی تو شادی کرتے ہیں اک طاہر بھی ایسا کر لے گا تو فرق کیا پڑے گا۔

پھر

اس نے یہ بھی سوچا کہ طاہر کو کچھ بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے ـــ ؟

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

لباس تبدیل کیا۔ بال بنائے۔ میک اپ کیا اور ہلکا سا زیور بھی پہنا۔ اس نے سوچوں سے راہ فرار اختیار کرنے کا عزم کر لیا تھا اس نے جینا تھا اور جیا حال میں ہی جاتا ہے۔ ماضی اور مستقبل کے حوالوں سے زندگی کو اجیرن بنانا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

آغا جان بے حد نڈھال ہو گئے تھے۔ رنگت بھی پیلی پڑ گئی تھی تکلیف میں شدت آ رہی تھی۔ اب انجکشن بھی زیادہ اثر نہیں دکھا رہے تھے۔

اگلی صبح

وہ سب تیار تھے۔

خان صمد خان اور اسد خان بھی آغا جان اور شگو کے ہمراہ جا رہے تھے۔ دلاور خان بھی تیار تھا۔

آغا جان بیحد کمزور دکھائی دے رہے تھے۔ ان سے چند قدم چلنا بھی محال تھا۔

گاڑی تک انہیں سہارا دے کر لایا گیا۔ خاندان کے سارے لوگ گاڑی کے گرد جمع تھے۔ آنکھیں پرنم اور چہرے اُداسی تھے۔ بیماری نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ ناامیدی دلوں میں گھر کرنے لگی تھی۔

ہر دشے نے تو صمد خان سے کہا۔ "خواہ مخواہ بھجوا رہے ہیں آغا جان

کو امریکہ۔ ان کی حالت دیکھ کر آپ کو اندازہ نہیں ہو رہا۔"

صمد خان بھی دلگیر سے تھے بولے۔ "خدا کرے وہاں علاج ایسا ہو کہ آغا جان ٹھیک ہو جائیں۔"

رشتہ دار عزیز بھی ایسی ہی باتیں کر رہے تھے۔ کسی کو اُمید نہ تھی کہ آغا جان بچ پائیں گے اس کے چہرے پر تو زردی اس طرح کھنڈی تھی کہ مردنی کا گمان ہونے لگا تھا۔

"بس چار دن پہلے تو آغا جان ہشاش بشاش تھے۔ لاہور سے واپس آئے تو سب پُر اُمید تھے۔ ان کی صحت اچھی تھی۔"

لیکن ——

اب ؟ ——

لوگ انہیں رخصت کرتے وقت چشم پُرنم سے دعائیں دے رہے تھے۔ جواں سالہ آغا بی بی کو دیکھ دیکھ کر متاسف تھے۔ کچھ لوگ تو دبے دبے لفظوں میں شگی کے گھر والوں کو کوس رہے تھے۔

"اتنا ظلم ڈھایا۔ بچی ہی تو ہے ابھی —— اتنے بزرگ اور بیمار آدمی کے ساتھ باندھ دیا اسے۔ لڑکی انجان تھی ماں باپ تو بچے نہیں تھے۔"

عورتوں کو تو شگی کی جوانی پر بے تحاشا رونا آ رہا تھا۔ گاڑی حویلی سے باہر نکلی تو گاؤں کے لوگوں کا جم غفیر جمع تھا۔ وہ بڑی اور پکی سڑک

تک آغاجان کو جلوس کی شکل میں چھوڑنے گئے۔ آغاجان کی ہر دلعزیزی کا احساس ہو رہا تھا۔

گھر کے سارے افراد اور قریبی رشتہ دار انہیں ائیرپورٹ تک چھوڑنے آئے۔

صمد خان ساتھ نہیں جا رہے تھے۔ وہ آغاجان سے لپٹ گئے بڑی مشکل سے آنسوؤں کو روکا۔ کمال ظفر خان اور دوسرے پوتے پوتیاں بھی آگئے تھے۔

ماہ وش اور اس کا میاں بھی پہنچے تھے۔ بہوئیں بھی موجود تھیں سب نے باری باری آغاجان کو سلام کیا۔ شیگی سے ملے۔ آغاجان بھی اپنی حالت سے مایوس نظر آ رہے تھے۔ گو سب کو دلاسے دے رہے تھے۔

لیکن

اپنے اندر مایوسی کے اندھیرے پھیل رہے تھے۔

"آغابی بی۔ آغاجان کا پوری طرح سے خیال رکھنا" گل پری نے روتے ہوئے کہا۔

"آپ تسلی رکھیں" شیگی نے سب سے کہا۔ "میں انکی خدمت ہی کے لئے تو ساتھ جا رہی ہوں"

"خدا تمہیں ہمیشہ شاد و آباد رکھے"
سب نے کہا۔

فلائٹ کا وقت ہو رہا تھا۔

لاؤنج میں بہت لوگ تھے۔ آغاجان اور شیگی نے سب گھر والوں کو خدا حافظ کہا۔

اور اندر چلے گئے ——

جہاز تک جانے کے لئے آغاجان کے وہیل چیئر لائی گئی۔

"میں سہارا لے کر وہاں تک جا سکتا ہوں صمد خان ——"
وہ بولے۔

"نہیں آغاجان تھکان ہو جائے گی۔ ابھی تو آپ نے اتنا لمبا سفر کرنا ہے"

"ہاں آغاجان۔ جہاز کافی دور کھڑا ہے"
شگو نے بھی وہیل چیئر پر بیٹھنے کو کہا۔

آغاجان وہیل چیئر پر بیٹھ گئے۔ صمد خان نے اس کی ہتھی پکڑ لی۔ شگو ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

جہاز کی سیڑھیاں وہ شگو کے بازو کا سہارا لے کر چڑھے۔ شگو نے اک مستعدی نرس کی طرح سنبھالا۔ اور آرام سے ان کی سیٹ پر لا کر بٹھا دیا۔

"شکریہ ——" آغاجان مسکرا کر بولے۔

شگو نے سر ہلاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "یہ میرا فرض ہے"
وہ ان کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"جیتی رہو —" آغا جان نے خلوص سے کہا۔

"آپ بھی جیئیں —"

"لگتا تو نہیں —"

"ایسی باتیں مت کریں —"

"تم پر اُمید ہو —"

"کس بات سے —"

"میرے ٹھیک ہو جانے سے"

"ہاں — میں سو فیصد پر امید ہوں"

"اپنے آپ سے بھی جھوٹ بولتی ہو"

"آغا جان۔ مت کریں ایسی باتیں۔ میں رو دونگی"

آغا جان نے ہاتھ بڑھایا اور اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کر کے اپنے بے پناہ پیار کا اظہار کیا۔

شگی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اسے تو اس بوڑھے بیمار پر کچھ ترس آرہا تھا۔ جو چار چھ ماہ سے پہلے ہی ختم ہو جانے والا تھا۔

جہاز رن وے پر دوڑنے لگا۔

پھر —

آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ پشاور سے پنڈی تک نصف گھنٹے کا سفر تھا۔ نیو یارک کے لئے فلائٹ پنڈی سے لینا تھی۔

ایئر ہوسٹسوں نے ابھی اخبار اور جوس ہی تقسیم کیا تھا کہ اسلام آباد

ایئر پورٹ پر جہاز کے اترنے کی اناؤنسمنٹ ہوئی۔ ایئر ہوسٹسوں نے جلدی جلدی اخبار مسافروں سے لے کر سمیٹے اور خالی جوس کے کاغذی گلاس اکٹھے کئے۔

جہاز لینڈ کر گیا۔

پنڈی چند گھنٹے کا قیام تھا۔ آغا جان کے فسٹ کزن حبیب اللہ خان اور کچھ دوسرے لوگ ایئر پورٹ پر آئے ہوئے تھے چند گھنٹے کا قیام انہیں کی رہائش گاہ پر کرنا تھا۔ یہاں بھی آغا جان کی طرح آغا بی بی کو بھی بڑی عزت دی گئی۔ ادب واحترام ملحوظ خاطر رہا۔ شگو اس عزت واحترام سے تنافر محسوس کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا۔ زخم سے بوند بوند لہو بہنا بند ہو گیا ہے۔ خون کی بھی تو اپنی خاصیت ہے۔

زخم سے بہتا رہے تو بہتا ہی رہے اور جو جم جائے تو زخم کا منہ بھی بند کر دیتا ہے۔ کھرنڈ بن جاتا ہے۔ اس کھرنڈ کو چھیڑا نہ جائے تو پھر خون نہیں ٹپکتا۔ بند ہی رہتا ہے۔ بیشک یہ دوسری بات ہے کہ کھرنڈ زخم کا احساس دلاتا رہتا ہے۔

کھانا کھانے اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد وقت مقررہ پر سب اسلام آباد کے ایئر پورٹ پر پہنچ گئے۔ امریکن ایئر لائن سے پروانہ کرنا تھی۔

یہاں بھی وہیل چیئر ہی استعمال کی گئی۔ شگو آغا جان کے ساتھ

ساتھ چلتی رہی۔

اور اسد خان چیئر کی ہتھی پکڑ رہے ہے۔

نیویارک تک خاصہ لمبا اور تھکا دینے والا سفر تھا۔ آغا جان تو تھے ہی نڈھال اور بیمار۔ خود شگو بھی بے طرح تھک گئی تھی، سارا راستہ وہ آغا جان کی دیکھ بھال بھی کرتی رہی۔

وقت پر دوائیاں اور انجکشن بھی دیئے۔ دونوں بھائی کئی بار اُٹھ کر آغا جان کی خیریت دریافت کرنے آئے تھے۔

دلاور اکانومی کلاس میں تھا اور دونوں بھائی آغا جان اور شیگی فرسٹ کلاس میں تھے۔

شگو نے سیٹ پیچھے کر کے آغا جان کے لیٹنے کے لئے بھی جگہ بنا دی تھی۔ وہ دوائی کے زیر اثر سوتے بھی رہتے تھے۔ ان کا سر اپنی گود میں رکھے شیگی خود جاگتی رہتی تھی۔ دونوں بھائی یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

اور

شیگی کے لئے ان کے دل میں محبت اور عقیدت کے جذبات موجزن تھے۔

نیویارک میں چند عزیز تھے۔

انہیں آمد سے مطلع کیا گیا تھا۔ وہ ایئرپورٹ پر ان کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ انہوں نے سب کا بڑے پیار سے استقبال کیا۔

اگلے دن آغا جان کو ہوسپٹل میں ایڈمٹ کروا دیا گیا۔ انتظامات پہلے سے کئے جا چکے تھے۔ نیویارک والے عزیزوں نے سارا بندوبست پہلے ہی سے کر دیا ہوا تھا۔

طویل سفر نے آغا جان کو کچھ اور بھی نڈھال کر دیا تھا۔ ان کی حالت اچھی نہ تھی۔

شگو کے پلان کی دوسری کڑی بھی کوئی خاص کامیاب نہ ہوئی۔

امریکہ تو وہ آگئی تھی۔ لیکن جو خیال تھا کہ چار چھ ماہ آغا جان کو ہوسپٹل میں ڈال کر خود سیر سپاٹے کرتی پھرے گی۔

امریکہ کی جس سٹیٹ میں بھی جائے گی اس کا کونہ کونہ دیکھے گی بلکہ دوسری سٹیٹیں میں بھی جا کر قابل دید مقامات کی سیر کرے گی۔

خریداری کرے گی۔

نایاب چیزیں لے گی۔

لیکن

ایسا نہیں ہوا۔

آغا جان کی طبیعت بگڑتی چلی گئی۔ شیگی گھر سے ہوسپٹل اور ہوسپٹل سے گھر ہی کے چکر لگا پائی۔ بیوی اور نرس ہونے کے ناطے اس کو زیادہ سے زیادہ وقت ہوسپٹل ہی میں گزارنا پڑا۔

صمد خان اور سعد خان پندرہ دن رہ کر واپس آ گئے۔ اب اسد خان آنے والے تھے۔ وہ آئے تو آغا جان کا آپریشن ہوا۔

لیکن

کینسر کی جڑیں اتنی پھیل چکی تھیں کہ آپریشن کامیاب نہیں ہوا۔ دواؤں اور اچھی دیکھ بھال کے سہارے آغاجان زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ اچھا ہونے کی بجائے دن بدن حالت بگڑ رہی تھی۔ گھر پر ہر دوسرے تیسرے دن اطلاع دی جا رہی تھی۔ تین ماہ اسی طرح گزر گئے۔

اب تو ان پر بے ہوشی بھی طاری رہنے لگی تھی۔ ان دونوں آغاجان کی احوال پرسی کے لئے پھر خان صمد خان آئے ہوئے تھے آغاجان کو دیکھ کر انہیں بیحد دکھ ہوا تھا۔

ڈاکٹروں سے ساری صورت حال معلوم ہوئی تو شگو سے مشورہ کیا۔

"آغاجان کو واپس لے چلیں، ڈاکٹروں نے تو جواب دے دیا ہے وہ اب کچھ نہیں کر سکتے"

"جیسے آپ کی مرضی" شگو روہانسی ہو رہی تھی۔ "آثار تو اچھے نہیں ہیں"

"ہاں میں بھی دیکھ رہا ہوں آغا بی بی۔ اسی لئے چاہتا ہوں واپس ہی لے چلیں۔"

"آغاجان سے پوچھ لیں"

"آپ ہی ان سے بات کر لیں"

شگو نے اسی دن جب آغاجان ہوش میں تھے اور وہ ان کے پاس بیٹھی ان کا ہاتھ سہلا رہی تھی۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد ان سے پوچھا۔

"آغاجان۔ آپ وطن واپس جانا پسند کرو گے"

"ہاں ــ میں اپنوں میں جا کر مرنا چاہتا ہوں شیگی"

"ایسا نہ کہیں آغاجان"

"شیگی"

"جی"

"شیگی مجھے مرنے کا افسوس نہیں لیکن ــ لیکن یہ افسوس ہے کہ تم ــ زندہ مر جاؤ گی"

شیگی نے ان کے ہاتھ پر سر رکھ دیا۔

اور اس کے آنسو آغاجان کا ہاتھ بھگونے لگے کتنا ترس آ رہا تھا اسے ان پر۔

"شیگی" آغاجان نے نحیف آواز میں کہا۔ "مجھے یقین تھا کہ میں صحتیاب ہو جاؤں گا۔ لیکن ــ اب ــ اب مجھے دکھ ہوتا ہے کہ میں نے تم سے شادی کر کے تمہاری زندگی برباد کر دی۔ مجھے معاف کر دینا شیگی ــ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں ــ اتنی جلدی"

شگو ہچکیوں سے رونے لگی۔

خان صمد خان اندر آئے تو وہ آنسو پونچھتے ہوئے کمرے سے

نکل گئی۔

آغاجان نے واپسی کے لئے رضامندی دے دی۔ "مجھے بہت جلد واپس لے چلو بیٹے"

پھر

انہوں نے صمد خان کو شیگی کے متعلق بہت کچھ نصیحتیں کیں۔

"وہ آغابی بی ہیں آغاجان۔ ہماری ماں ہیں اور آپ جانتے ہیں آپ کی ساری اولاد فرمانبردار ہے"

"ہاں میں جانتا ہوں۔ شاید اب میں چین سے مر سکوں"

"آغاجان" وہ باپ سے لپٹ گئے۔

چار چھ ماہ کی بجائے آغاجان کو تین ماہ کے بعد ہی واپس لایا گیا۔ قریباً ختم ہی ہو چکے تھے وہ تو شاید چند سانسیں باقی تھیں جو اپنی سرزمین پر لینا تھیں۔ سارا راستہ ان پر بیہوشی ہی طاری رہی۔ شگو کی امریکہ جانے کی تمنا تو پوری ہو گئی تھی۔

لیکن

یہ ناکام تمنا تھی۔

یہ سارا عرصہ جو اس نے امریکہ میں گزارا تھا۔ اذیت ہی دیتا رہا تھا۔ نیویارک میں جن عزیزوں کے ہاں ٹھہری تھی۔ وہاں سے صرف ہوسپٹل ہی کا راستہ دیکھ پائی تھی۔

وہ لوگ اسے نیویارک میں دو ایک بار گھمانے کے لئے لے گئے تھے۔ لیکن من میں چنتا ہو تو سیر سپاٹے کب مزہ دیتے ہیں۔ ات یہ نہیں تھی کہ وہ آغاجان سے محبت کرنے لگی تھی۔ ہاں انہیں

دیکھ دیکھ کر اسے دکھ ضرور ہوتا تھا۔ ضمیر ملامت بھی کرتا تھا۔ اتنے نیک اور شریف آدمی کو محض دولت کے لئے لبھانا رجھانا قابلِ تحسین تو نہ تھا۔

کبھی

کبھی اسے یوں لگتا جیسے اس نے شادی کے پردے میں آغا جان کی بے پناہ دولت پر ڈاکہ مارا ہے۔ انہیں لوٹنے کے لئے یہ سب کچھ کیا ہے۔

اس ڈاکے اور لوٹ میں اسے اتنا کچھ مل گیا تھا جتنے کی کبھی شاید تمنّا بھی نہ کی تھی۔ لیکن جانے کیا بات تھی۔ یہ سب کچھ پاکر دل کا چین و سکون نہیں رہا تھا۔ ہر وقت ذہن میں الجھن رہتی۔ دم گھٹنے لگتا۔

جی چاہتا اس ماحول سے کہیں دور بھاگ جائے۔ آغا جان کی حالت جوں جوں بگڑ رہی تھی۔ توں توں اسے ڈاکہ زنی کا احساس ہو رہا تھا۔

اور

گھر والے سمجھ رہے تھے کہ آغا جان کے لئے اتنی متفکر ہے۔ سب اسے تسلّیاں دیتے اپنی اپنی فرمانبرداریوں کا احساس دلاتے آغا جان سے بھی سب نے یہی وعدے کئے۔

لیکن

لیکن

شگو بے چین و مضطرب ہی رہی۔

وطن واپس آتے ہی لاہور اس کی اماں کو آغا جان کی حالت سے آگاہ کر دیا گیا۔ شگو نے اماں کو خط لکھ کر بلا بھیجا۔ آغا جان کی حالت کھول کر بیان کی۔

تیسرے ہی دن اماں وسیم شائستہ اور طاہر آن پہنچے۔

ان سب کو دیکھ وہ بے اختیار ہو گئی۔ اور اتنا روئی — اتنا روئی اماں کا اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

وہ اسے تسلّی بھی نہ دے پائیں۔

ہاں طاہر اس کے اس طرح رونے دھونے سے حیران ضرور ہوا — کیا یہ سب کچھ دکھلاوہ تھا۔

وہ ایکٹنگ کر رہی تھی۔

یا

اسے اپنے بوڑھے شوہر کی حالت سے واقعی دکھ ہو رہا تھا۔

طاہر کچھ سمجھ نہیں پایا۔

اس کی اُلجھن اور حیرانگی اور بڑھ گئی۔

شام چند لمحوں کے لئے وہ شگو کے کمرے میں آیا۔ وہ آغا جان کے سرہانے بیٹھی تھی۔

طاہر نے حیرانگی سے اسے دیکھا اور بولا " شگو یہ تم ہو — کیا

حالت بنا رکھی ہے ۔"

"آغا جان بچ نہیں پائیں گے " وہ بولی ۔

طاہر نے اِدھر اُدھر دیکھا ۔

پھر بے ہوش آغا جان پر نظر ڈالتے ہوئے بولا ۔ "یہی تو تم چاہتی تھیں "

" طاہر ــــ پلیز ــــ اس وقت کچھ نہ کہو "

" ارادے بدل گئے "

شگو نے آنسو بھری آنکھوں سے طاہر کو دیکھا ۔

اور بولی " طاہر ــــ اس وقت پتہ نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے ۔ اس وقت کچھ نہ کہو ۔ وقت کے ساتھ میں سنبھل جاؤں گی ۔ تم فکر نہ کرو "

" اپنے آپ کو سنبھالو ۔ اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ۔"

" میں نے کہا نا اس وقت کچھ نہ کہو ۔ میں ـــ میں خود سنبھل جاؤں گی ۔ لیکن اس میں وقت لگے گا ۔ تمہیں انتظار کرنا پڑے گا "

" وہ تو کر ہی رہا ہوں اور کرتا ہی رہوں گا ۔ ویسے بھی میں اگلے ہفتے سعودی عرب جا رہا ہوں ۔ جہاں سے سال بعد ہی واپسی ہو گی تب تک ۔"

" سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۔"

" یقین رکھوں "

" ہاں "

وہ جانے کیوں بے اختیار ہو کر رونے لگی ۔

وہ چند لمحے اسے تکتا رہا ۔

پھر کچھ لوگ آغا جان کو دیکھنے اندر آ گئے ۔ شگو کو روتے دیکھ کر ان کی آنکھیں بھی بھر آئیں ۔ گل پری نے تو اسے سینے سے لگا لیا ۔ اور خود بھی زار و قطار رونے لگی ۔

صبح ـــــ

جب سورج طلوع ہو رہا تھا ۔

سویرا پھوٹ رہا تھا ۔

روشنی اندھیروں کو نگل رہی تھی ۔

آغا جان کی زندگی کا سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا ۔

مرتے وقت ان پر بے ہوشی طاری تھی ۔ لیکن انہوں نے شگو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا ۔

ساری رات پورا خاندان ان کے کمرے میں تھا کوئی رو رہا تھا ۔

شگو بھی ان کے قریب بیٹھی ۔ چپ چاپ پتھرائی سی ۔

اماں بار بار اسے سینے سے لگا رہی تھی ۔

آغا جان آخری ہچکی لے کر جب سب سے ناطہ توڑ لیا تو اک کہرام مچ گیا ۔

بیٹیاں بیٹے پوتیاں پوتے نواسیاں نواسے ہو کیں سب ان

کے بعد خاکی سے لپٹ لپٹ گئے۔ شگو بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

خبر منٹوں میں سارے گاؤں میں پھیل گئی، جس نے سنا حویلی کی طرف دوڑا چلا آیا۔ دوسرے گاؤں سے بھی لوگ آ گئے۔ پشاور پنڈی اور لاہور بھی فون کر دیئے گئے۔

آغا جان جیسی بزرگ اور مقبول شخصیت کا جنازہ بھی آن بان سے اٹھنا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے اور اشکبار آنکھوں سے آغا جان کی محبتوں اور شفقتوں کو یاد کر رہے تھے آغا جان کے سفر آخرت کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ خاندان کے چیدہ چیدہ لوگ ان تیاریوں میں مصروف تھے۔

میت کو نہلا دھلا کر کفنا دیا گیا۔

بے شمار پھول ان پر ڈالے گئے۔

میت کو پہلے زنان خانے کے بڑے ہال میں رکھا گیا یہ ہال عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔

کبھی

کبھی آغا جان کا کوئی بیٹا یا پوتا آکر میت کے سرہانے کھڑا ہو کر آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتا۔

شگو میت کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اس نے سر گھٹنوں پر رکھے بازوؤں کے حلقے میں دے رکھا تھا۔

اچانک ہی ہال میں ہلکا ہلکا شور مچا۔ آہوں آنسوؤں سے بھرپور ہلکا ہلکا شور۔ شگو نے سر اٹھا کر دیکھا۔

خان صمد خان اپنے دونوں بھائیوں اور خاندان کے کچھ بزرگوں کے ساتھ اس طرف آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں سفید لٹھے کی چادر تھی۔

سب شگو کے قریب آکر رک گئے۔

شگو کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ کچھ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ کیا ہو رہا ہے سب لوگ ایکا ایکی پھر رونے لگے۔ کیا میت اٹھانے کو آئے ہیں یہ سب۔

اس کے کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے ہی صمد خان جھکے اور بڑی دلگیر آواز میں بولے۔ "آغا بی بی"

ان کی آواز گھٹ گئی۔ آنسو پونچھتے ہوئے انہوں نے چادر خان نصر اللہ خان کو دے دی۔

نصر اللہ خان جو آغا جان کے عم زاد تھے۔ خاصے معمر تھے۔ انہوں نے چادر لے لی۔

چند لمحے شگو کو دکھ بھری نظروں سے دیکھا اور پھر چادر پھیلاتے ہوئے شگو سے بولے۔

"بڑا صدمہ ہوا ہے آغا بی بی دل ڈوبا جا رہا ہے۔ آپ کی یہ عمر اور ہوگی کی یہ سفید چادر"

انہوں نے چادر شگی پر ڈال دی۔

ہال میں ایک بار پھر کہرام سا مچ گیا۔

گل پری، ہر وشے، شربینے اور ماہ وش کے علاوہ کئی اور عورتیں بھی شگو سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ خان نصر اللہ خان نے شگو کے سر پر ہاتھ رکھا جو کفن نما سفید چادر سے ڈھک گئی تھی۔

"آغابی بی — صبر کیجیئے۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ آغابی بی یہ بے داغ چادر آپ پر ڈالی گئی ہے۔ یہ اس خاندان کی عزت ہے آپ اس عزت کا پاس کریں گی اور اس چادر کو کبھی داغدار نہ ہونے دیں گی۔"

سب اونچی آوازوں میں رو رہے تھے۔ نصر اللہ خان جانے کیا کچھ کہہ رہے تھے۔

شگو تو جیسے حواس باختہ سی تھی۔

کیا ہو رہا ہے؟

کیوں ہو رہا ہے؟

اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔

جنازہ اٹھنے کا وقت آگیا لوگ میت اٹھانے اندر آگئے کہرام ایک بار پھر مچا۔ اور آغا جان کی میت عزت و احترام سے اٹھائی گئی ہزاروں لوگوں نے جنازے میں شرکت کی اور آنسو بہاتے ہوئے

انہیں سپرد خاک کیا۔

آغا جان خاندان کے بزرگ تھے سربراہ تھے سب کو عزیز تھے ان سے جدائی سب کو شاق گزری۔ لیکن سب کو اطمینان بھی تھا۔ کہ آغا جان نے اتنی طویل عمر پائی اور اک خوشحال زندگی بسر کی۔ انہوں نے سوائے اپنی بیوی کی موت کے اور صدمہ نہیں جھیلا — بچوں کی طرف سے وہ شاد تھے۔

یہ باتیں سب کے لیئے باعث تسکین تھیں۔ اس لیئے آنسو جلد ہی تھم گئے

تیسرے دن رسم قل ہوئی۔

اور

اسی شام خان صمد خان کی دستار بندی ہوئی۔ آغا جان کے بعد وہ خاندان اور گاؤں کے سردار مقرر ہوئے۔

شگو اور اس کے گھر والوں نے یہ سب کچھ کب کبھی دیکھا تھا۔ وہ تو بڑے شوق سے یہ ساری رسوم دیکھ رہے تھے شگو کی اماں نہمینہ نے یہ باتیں اپنے بزرگوں سے کبھی سنی ضرور تھیں۔

لیکن

دیکھنے کا موقعہ اب ملا تھا۔

دستار بندی کے بعد صمد خان سب سے پہلے شگو کے پاس آئے۔ اس کے قدموں میں جھک کر بولے۔ ان کے ساتھ

اور لوگ بھی اندر آئے ۔ عورتیں تو پہلے ہی موجود تھیں ۔ شگو سفید چادر میں لپٹی مسند پر بیٹھی تھی ۔

" آغابی بی ۔۔ گاؤں کی سرداری کا منصب مجھے سونپا گیا ہے ۔ میں سب کا شکر گزار ہوں ۔ لیکن یہ ساری ذمہ داری میں آپ کے قدموں میں جھک کر آپ پر ڈال رہا ہوں "

وہ مسند کے قریب آ کر کچھ اور جھک گیا ۔

" آغابی بی ۔۔ یہ ذمہ داری قبول فرمایئے ۔۔۔ " کسی بزرگ نے کہا ۔

" صمد خان کے سر پر دست شفقت رکھیئے " کوئی اور معمر آدمی بولا ۔

صمد خان سر جھکائے رہے ۔

بغل میں بیٹھی پروشے نے ہولے سے کہا " آغابی بی خان کے سر پر ہاتھ رکھ دیں "

شگو نے ہاتھ بڑھا کر صمد خان کے سر پر رکھ دیا ۔

" شکریہ آغابی بی " صمد خان سیدھے ہوتے ہوئے مؤدبانہ بولے " آپ کی شفقتوں کے ہم سب ہمیشہ طالب رہیں گے میں سب کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ آپ کو ہمیشہ ماں سمجھوں گا ۔ میں اور میرے اہل خاندان بلکہ سارے گاؤں کے لوگ آپ کے فرمانبردار رہیں گے ۔ آپ کے کسی حکم کی سرتابی نہیں کریں گے ۔ آپ ہماری ماں

ہیں ۔ ہم آپ سے بھی یہی توقع رکھیں گے کہ ہم سب کو اپنے بچے ہی سمجھیں ۔ ہم ماں کے رتبے اور تقدس کو جانتے ہیں آغابی بی اور اس کے لئے جانیں بھی نچھاور کر سکتے ہیں "

صمد خان نے کچھ دیر بڑی ہی جذباتی تقریر کی ۔

شگو تو سہم سہم گئی ۔

گو دل ہی دل میں یہ ساری باتیں مضحکہ خیز بھی لگ رہی تھیں اپنے ماں باپ کی عمروں کے بچے اس کی دعاؤں کے طالب تھے سر جھکائے باری باری اس کے سامنے آ رہے تھے اور وہ ان کے سروں پر ہاتھ رکھ رہی تھی ۔

یہ سب اسے اپنی فرمانبرداری کا بھرپور یقین دلا رہے تھے ۔ ساری رسم بڑی سنجیدگی اور ماتمی سوگواری سے ہو رہی تھی ۔ یہ رسم طاہر بھی دیکھ رہا تھا ۔ اس کے ذہن میں وسوسے سے رینگنے لگے تھے ۔

وہ پریشان ہونے لگا تھا ۔

"شگو ___ ۔"

"ہوں ___"

"ہم لوگ صبح واپس جا رہے ہیں"

"ہاں میں جانتی ہوں۔ اماں میرے پاس ہی رہیں گی"

"انہیں رہنا ہی چاہیئے ___ ورنہ تم اکیلی ___"

"ہاں میں بہت گھبراہٹ محسوس کرتی ہوں طاہر ___ اماں پاس رہیں گی تو مجھے ڈھارس ملے گی"

"چالیسویں کے بعد تو تم لاہور آ سکو گی"

"نہیں"

"کیوں"

"یہ لوگ عدت سے پہلے مجھے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دیں گے"

"شگو"

"ہاں"

"مجھے تو ڈر لگتا ہے"

شگو چپ رہی۔

پھر وہ بولا۔ "بڑے سخت قسم کے لوگ ہیں یہ۔ کوئی جنجال ہی کھڑا نہ کر دیں۔ میرا تو دل کہتا ہے۔ کہ ___"

"سب ٹھیک ہو جائے گا طاہر ___ لیکن یہ بات ہے کہ ٹھیک ہونے میں کچھ وقت ضرور لگے گا۔ میرا اپنا اندازہ ہے کہ چھ سات ماہ سے پہلے ___ میں کچھ نہیں کر سکوں گی۔"

"اتنی مدت میں بھی چھٹکارا پا کر لاہور آ جاؤ گی تو غنیمت ہے ویسے میں یہ عرصہ گزار لوں گا۔ مجھے باہر جانا ہے ایک سال سے پہلے تو چھٹی بھی نہیں ملے گی۔"

"یہ بھی اچھا ہی ہوا ___ میں سال بھر میں بہت کچھ کر لوں گی"

"کیا کر لو گی"

"بھئی یہ سارا دھن دولت لاہور پہنچانا ہے ___ یہیں تھوڑا ہی رکھوں گی"

"لیکن لے جاؤ گی کیسے"

"جو کچھ مجھے آغا جان نے دیا ہے۔ وہ تو میں بہ آسانی لے جا سکتی ہوں۔ کسی کو حق نہیں کہ میری ملکیت کو چھیڑے"

"ہوں"

"صرف یہی لے جا پاؤں تو اتنا ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آئے گا"

"سچی"

"ہاں۔ آؤ تمہیں سیف دکھاؤں۔ اس کی چابیاں آغا جان نے میرے حوالے کی تھیں"

دونوں اٹھ کر اس کمرے میں آ گئے جس میں سیف تھی۔ شگو نے دوسری الماری میں رکھی چابیاں نکالیں۔

اور

سیف کھول دی۔

طاہر کی آنکھیں پھیل گئیں۔

نوٹوں کی گڈیاں۔ زیورات۔ سونے کی ڈلیاں اور چمکتے دمکتے ہیروں کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔

"شادی پر جو کچھ میرے حق مہر کے طور پر لکھا گیا تھا۔ یہ سب اس کے علاوہ ہے۔ آغا جان نے امریکہ جانے سے پہلے کچھ اراضی بھی میرے نام کی تھی"

طاہر خوش ہو کر بولا۔ "تمہارا منصوبہ تو سو فیصد کیا لاکھ فیصد کامیاب رہا۔ اتنا کچھ ملا ہے"

شگو نے طاہر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی پھیل گئی اک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

"طاہر"

"ہوں"

"یہ سب کچھ تو ملا مجھے۔ لیکن۔"

"لیکن کیا"

"کہوں تو تمہیں دکھ ہو گا"

"کہدو"

وہ چپ رہی۔

طاہر اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "شاید تم نے یہ سب کچھ پا کر۔ کچھ کھویا بھی ہے"

"ہاں طاہر۔" شگو نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔

طاہر چند لمحے گم صم کھڑا رہا۔

شگو روتی رہی۔

اور وہ نڈھال سا اپنے آپ کو ذہنی صدمے سے نجات دلانے کی کوشش کرنے لگا۔

پھر

وہ

ہولے سے بولا۔ "میں جانتا تھا۔ کہ۔ خیر۔"

"طاہر"

"ہاں"

"کیا تم — مجھے قبول کر سکو گے"

طاہر جلدی سے اس کی طرف بڑھا۔

لیکن اسے چھوئے بنا بولا۔

"یہ کیونکر کہہ دیا تم نے۔ اس میں تمہیں شک کیوں ہوا تم میری نہیں، میری ہو اور میری رہو گی۔ شگو تم نے ایسا کیوں سوچا ایسا کیوں کہا۔ تم ہمیشہ سے میری ہو اور —"

"سچ طاہر —"

"ایسا سچ جو جھوٹا نہیں۔ شگو اس جوئے میں میں بھی تمہارے ساتھ شریک تھا۔ میری مرضی بھی شامل تھی۔ سچ کہوں تو دولت حاصل کرنے کے لئے میں نے ہی تمہیں داؤ پر لگایا تھا۔ ایسا نہ ہوتا، تو میں تمہیں اس شادی سے روک سکتا تھا۔ میں نے روکا نہیں، تمہیں شادی کرنے دی۔ تمہارے ساتھ اس سازش میں برابر کا شریک ہوا نا — تو پھر — تم فکرمند کیوں ہو۔ رونی کیوں ہے۔ جوئے میں ہار بھی ہوتی ہے۔ جیت بھی۔ ہار جائیں تو جیت نہیں ہوتی۔ لیکن شگو یہ جوا جو ہم نے کھیلا ہے۔ تو اس میں اگر ہم ہارے ہیں تو ساتھ جیت بھی ہوئی ہے۔ ہم نے وہ سب کچھ پا لیا ہے جو داؤ پر اپنے آپ کو لگاتے وقت پانا چاہا تھا۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اس سے زیادہ بہت زیادہ پا لیا۔ تم۔ ایسا کیوں سوچتی

ہو۔ میں تو اس بات کے لیے پہلے سے ہی ذہنی طور پر تیار تھا۔"

طاہر کی باتوں سے شگو کو تسلی تو ہوئی۔

لیکن —

اس کے آنسو بہتے ہی چلے گئے۔

وہ رو رہی تھی —

اور —

طاہر اسے سمجھا رہا تھا کہ کمرے میں شائستہ آ گئی۔ اسے روتے دیکھ کر بولی۔ "تو رو کر ہلکان ہو جائے گی — اب سنبھال اپنے آپ کو"

پھر اس نے کھلی سیف کو دیکھا تو خوش کن حیرانگی اس کی آنکھوں میں پھیل گئی۔

جلدی سے بولی۔ "یہ سب؟

میرا ہے —" شگو نے آنکھیں پونچھ کر طاہر کو احسانمندی سے دیکھتے ہوئے شائستہ سے کہا۔

"ہائے — واقعی —"

"ہاں —"

"یہ تو لاکھوں کروڑوں کا مال ہوگا"؟

"ابھی حساب نہیں لگایا"

شائستہ نے بیساختہ شگو کو گلے سے لگا لیا اور اس کی پیشانی

چومتے ہوئے بولی۔

"مان گئے تجھے۔ تو جو چاہتی تھی تجھے مل گیا"

شگو چپ رہی۔

شائستہ بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔ بولی۔ "اماں کو دکھایا ہے یہ سب۔ بلاؤں اماں کو"

"نہیں آپا —— اماں یہیں ہیں نا۔ دیکھ لیں گی۔ چلیں اب باہر جا کر بیٹھیں۔ ورنہ سب لوگ شک نہ کرنے لگ جائیں۔ ابھی ہم نے بھرم بنائے رکھنا ہے"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے لیکن شگو سنبھال کر رکھنا یہ سب کچھ۔ سوتیلے پن کا معاملہ ہے۔ ہوشیاری سے رہنا"

شگو پھیکی سی ہنسی ہونٹوں پر لاتے ہوئے بولی۔ "آپ بیفکر رہیں آپا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا"

شگو نے سیف بند کی اور سب دوسرے کمرے میں آ گئے جہاں تعزیت کے لئے لوگ آئے بیٹھے تھے۔

اس رات بھی جب چاند سیب کی قاش کی طرح سرو کے آخری سرے پر ٹنگا تھا، اور اس کی ہلکی ہلکی روشنی چاندنی کا غبار نہ بن پا رہی تھی۔

گھنے پیڑوں میں ہوائیں رینگ رہی تھیں۔ سب سو چکے تھے گاؤں کی حویلیوں اور گلیوں پر بھی نیند اتر آئی تھی۔ کبھی کبھی کتے بھی

بھونکنے لگتے تھے۔ تو رات کا سکوت برہم ہو جاتا تھا۔ شگو اور طاہر مستقبل کے منصوبے بنا رہے تھے۔ شگو کے ذہن سے بڑا بار اتر گیا تھا۔

طاہر نے اس کا یہ ذہنی بار اور دکھ سمیٹ لیا تھا۔ اس کے دل میں طاہر کے لئے پہلے سے بھی کہیں زیادہ محبت اور پیار چھلک اٹھا تھا۔

دونوں قریب قریب بیٹھے تھے۔ کل دونوں نے اک طویل عرصے کے بچھڑ جانا تھا۔ اس طویل عرصے میں انہوں نے کیا کچھ کرنا تھا۔ اسی کے پلان بنا رہے تھے۔

"ہاں تو" طاہر بولا "عدت ختم ہوتے ہی تم لاہور آجاؤ گی"

"ارادہ تو یہی ہے"

"تب تک امی تمہارے پاس ہی رہیں گی نا"

"سوچتی ہوں کہ اس دوران وہ دو ایک چکر لاہور کے لگا ہی لیں" شگو نے کہا۔

"کیوں"

"بھئی ان کے ہاتھ میں کچھ روپیہ اور زیور لاہور بھجوا دوں گی"

"یہ بھی ٹھیک ہے"

"یہ سارا پیسہ زیور اور ہیرے موتی ایکدم سے ہی تو تھوڑے لے جا پاؤں گی"

" ہاں ممکن ہے یہ لوگ ایسا کرنے نہ دیں "

" بالکل۔ بے شک یہ لوگ اپنی فرمانبرداری کا مجھے یقین دلا رہے ہیں —— لیکن روپیہ پیسہ بڑی شے ہے۔ ممکن ہے وہ اس میں بھی حصّہ بٹانا چاہیں "

" ہوں —— "

" ایسی نوبت آنے سے پہلے ہی میں چاہتی ہوں کہ اماں کے ہاتھ جتنا ہو سکے لاہور پہنچا دوں۔ عدت ختم ہونے کے بعد جب لاہور جاؤں تو اتنا تو ہو کہ زمین خرید کر خوبصورت سی کوٹھی تعمیر کروا سکوں " شگو بولی۔

طاہر مسکرانے لگا۔

شگو کے ذہن میں جیسی کوٹھی کا نقشہ تھا۔ وہ طاہر کو بتانے لگی۔ اس نقشے میں اس کے ذہن میں بچپن میں دیکھی کوٹھیوں کے نقش بھی جھلک رہے تھے۔

" دیکھنا کتنی شاندار کوٹھی بنواتی ہوں۔ اور پھر اس کی سجاوٹ۔" وہ تصور میں اس کوٹھی کی آرائش و سجاوٹ دیکھنے لگی۔

" میں باہر سے آرائش کی بہت سی چیزیں لاؤں گا " طاہر بھی تصور کے خاکے میں رنگ بھرنے لگا۔

" ہاں۔ جس چیز کی ضرورت ہوگی۔ میں تمہیں لکھ دوں گی "

" ضرور —— "

" خط تو لکھو گے نا جا کر —— "

" کیوں نہیں —— کہو تو روز ایک خط لکھ دیا کروں گا "

" نہ —— نہ —— نہ —— ایسا نہیں کرنا —— کبھی کبھی یہاں کے پتے پر خط لکھ دینا۔ وہ بھی بالکل سادہ سا۔ تمہیں کہا ہے نا جب تک میں یہاں ہوں۔ بھرم رکھنا ہی ہے۔ ایسا نہ ہو تم کوئی رومانٹک سا خط لکھ دو۔ اور خط مجھ تک پہنچنے سے پہلے کسی اور کے ہاتھ لگ جائے۔"

" تم کافی سمجھدار ہو گئی ہو "

" ناسمجھ کب تھی جناب —— سمجھدار ہی تھی۔ جو اتنا بڑا پلان بنا ڈالا —— اور —— "

" اسے کامیاب بھی بنا دیا۔ تھوڑی سی ناکامی کے ساتھ "

" ناکامی —— "

طاہر نے شگو کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ شگو نے سر جھکا لیا۔ طاہر جلدی سے بولا۔

" بھئی تم خود بھی تو اس دن کہہ رہی تھیں۔ ناکامی اس طرح بھی کہ امریکہ بھی گئیں تو من مانی نہ کر سکیں۔"

" کوئی بات نہیں۔ اکیلے گھومنے پھرنے میں شاید مزہ بھی نہ آتا تم ساتھ ہو گے تو —— "

" میرے ساتھ جانے کا پروگرام ہے امریکہ "

"بالکل ــــ ہم دونوں جائیں گے طاہر ــــ ایک ایک جگہ دیکھیں گے ــــ گھومیں پھریں گے ۔ دل کی ساری خواہشیں پوری کریں گے ــــ"

"ضرور ــــ تب تک میں بھی کچھ نہ کچھ کما لوں گا ۔ خاصی معقول تنخواہ ملے گی مجھے ــــ"

"ہاں ــــ معقول سے بھی زیادہ ہے ۔ بہت اچھی جاب دلائی اشرف بھائی نے ۔ لیکن صرف ایک سال نوکری کرو گے ۔"

"کیوں ــــ"

"پھر میں تمہیں اپنے سے دور ہونے تھوڑا دوں گی ۔ اتنا پیسہ کس لئے ہو گا جناب"

"واقعی ــــ"

دونوں مستقبل کے خوش کن تصور سے مسکرانے لگے ۔

آہستہ آہستہ سب لوگ جانے لگے ۔ شمینے اور اسد توقّل کے بعد چلے گئے تھے ۔ ہروشے اور صمد خان نے بھی واپس جانا تھا ۔ چھٹی ختم ہو رہی تھی ۔ لڑکے لڑکیاں بھی سکولوں کالجوں کی وجہ سے واپس چلے گئے تھے ۔ صمد خان بھی دسویں کے بعد جا رہے تھے ۔ ان کے ساتھ گل پری اور بچّے بھی جا رہے تھے ۔ جانے سے پہلے وہ شگو کے پاس آئے ۔

"ہم لوگ چالیسویں پر پھر آئیں گے ۔" انہوں نے بڑے مؤدبانہ انداز میں کہا ۔ "چالیسویں کے انتظامات میں نے خان بابا اور رحیم گل کے سپرد کر دیئے ہیں وہ ہمارے بزرگوں میں سے ہیں ۔ اپنے رسم و رواج کے مطابق سب کچھ کر لیں گے ۔ آپ سے مشورہ بھی کریں گے ۔ آغا بی بی آپ کی مرضی کے مطابق ہی ہر کام ہو گا ۔ اگر آپ ان کے پروگرام میں کوئی ترمیم یا تبدیلی کرنا چاہیں تو کر لیجئے گا ۔ ویسے

ہماری روایات کا آپ کو علم نہیں ہوگا ـــــ اس لئے ـــــ"

"وہ یا آپ جو کچھ بھی کرنا چاہیں کرلیں۔ میں کیا رائے دے سکوں گی خان صاحب ـــ مجھے تو آپ کے رسم و رواج اور روایات کا علم ہی نہیں۔"

"شکریہ آغا بی بی"

ـــ گل پری نے بھی اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر بولی۔ "آپ کے آرام کا یہاں ہر طرح خیال رکھا جائے گا۔ دلاور خان یہیں رہے گا۔ شاداب گل کو میں اور خان صاحب نے سب کچھ سمجھا دیا ہے یہ اس لئے کہ دونوں حویلی کے محافظ ہیں۔ اور اچھی بات یہ ہے کہ اردو بول سکتے ہیں۔ ورنہ باقی سارے خدمت گار پشتون ہیں۔ آپ ان کی اور وہ آپ کی بات ٹھیک سے شاید سمجھ نہ پائیں اس لئے شاداب گل اور اس کی بیوی کو خاص طور پر آپ کے یہاں رکھا ہے۔ اس کی بیوی نواب جان آپ نے دیکھی ہے نا۔ بہت اچھی عورت ہے۔ آپ کو کمپنی بھی دے گی اور آپ کا سارا ذاتی کام بھی کرے گی ـــــ"

"کسی قسم کی کوئی تکلیف یا پریشانی ہو تو فون کر دیا کیجئے گا۔ میں حاضر خدمت ہونے کی کوشش کیا کروں گا۔"

"جی شکریہ ـــــ"

"گھبرائیے گا بالکل نہیں ـــ یہ سب لوگ اب آپ کے اپنے ہیں"

"جی ـــــ"

"میں آپ کی ذہنی کیفیت سمجھتا ہوں آغا بی بی ـــ لیکن کریں۔ عدت تک تو آپ کو اسی حویلی میں رہنا ہوگا۔"

"جی ـــــ"

"اس کے بعد چاہیں تو پشاور والے گھر میں شفٹ ہو جائیں۔"

گل پری نے صمد خان سے کہا۔ "یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تو انہیں یہیں رہنا ہے ـــ اچھا ہے جوان کی امی یہیں رہ گئی ہیں"

"ہاں ـــ میں نے خود بھی ان سے یہیں رہنے کی درخواست کی تھی ـــ"

"اماں کے ساتھ ان کا وقت اچھا کٹے گا، وہ چلی جائیں تو تنہائی ان کے لئے بڑا عذاب ہوتی"

خان صمد خان نے دلاسے تسلّی دینے کے بعد ایک چرمی ہینڈ بیگ میں سے چابیوں کے تین چار گچھے اور آغا بی بی کو دے دیئے۔

"یہ کیا ـــــ"

"اس ساری حویلی کی چابیاں ہیں۔ آغا بی بی ـــ یہ سب کچھ ہمارے باپ کا ہے۔ اب وہ نہیں رہے تو ان کے بعد آپ ہیں آپ کے ہوتے یہ چابیاں میں اپنے پاس نہیں رکھوں گا یہ امانت آپ کی ہے"

"لیکن میں کیا کروں گی انہیں۔ میرے لئے تو ادھر کے دو کمرے

ہی کافی ہیں۔"

"نہیں آغا بی بی — ساری حویلی آپ کی ہے جن کمروں کو چاہیں استعمال کریں۔ اور یہ چابیاں بھی آپ ہی رکھیں گی۔"

شگو نے بادل نخواستہ چابیاں لے لیں۔

صمد خان بڑی تعظیم سے اسے مزدوری امور کے متعلق سمجھانے لگے۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔

اچھی خاصی ذمہ داری اس کو سونپی جا رہی تھی۔ لیکن اسے اطمینان بھی تھا کہ سب کچھ کرنے کے لئے دلاور اور شاداب گل جیسے فرض آشنا آدمی اس کے پاس رہنا تھے۔

سب چلے گئے ——

شگو بیگانوں میں بالکل اکیلی رہ گئی۔

اور ——

واقعی ——

اماں بھی نہ ہوتیں تو اسے یہاں اک پل گزارنا بھی مشکل ہو جاتا۔

چالیسویں پر بھی سب لوگ اکٹھے ہوئے۔ سعد خان اور ہروشے البتہ یو کے جا چکے تھے۔ تین چار دن بڑی گہما گہمی رہی۔ گاؤں کے لوگ بھی آتے رہے۔ قرآن خوانی ایصال ثواب کے لئے ہوتی رہی۔ مولود شریف ہوئے اور دیگیں پکا کر غرباء و مساکین کو تین دن کھانا کھلایا گیا۔

چالیسویں کی دعوت بھی کسی ضیافت سے کم نہ تھی۔ اتنے بڑے سردار اور صاحب حیثیت آدمی کا چالیسواں اس کی حیثیت اور مرتبے کے مطابق شاندار طریق سے ہی ہونا تھا۔

لاہور سے وسیم اور شائستہ بھی چالیسویں پر آئے۔

اماں کا جی یہاں نہیں لگتا تھا۔ مجبوراً رہ رہی تھیں۔ وسیم اور شائستہ آئے تو انہوں نے واپسی کا پروگرام بنایا۔

"میں چند دنوں کے لئے لاہور ہو آؤں۔" انہوں نے چالیسویں کے تیسرے دن جب سب واپس جا رہے تھے۔ شگو سے کہا۔

"اماں میں اکیلی کیسے رہوں گی" شگو گھبرا کر بولی۔

"شائستہ کو چند دن روک لو۔ میں واپس آئی تو وہ چلی جائے گی۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے"

شائستہ نے کہا۔ "میں بچے وہاں چھوڑ آئی ہوں۔ اپنی نند کے پاس — ان کو —"

"میں انہیں اپنے ہاں لے آؤں گی" اماں جلدی سے بولیں۔ "تم فکر نہ کرو۔ وسیم بھی ادھر میرے ہاں ہی رہ لے گا۔"

"ٹھیک ہے آپا۔ اماں تنگ آ گئی ہیں۔ کچھ دن کے لئے ہو آئیں تب تک آپ میرے پاس رہیں۔"

"وسیم سے پوچھ لو"

"مناؤں گی انہیں۔ ویسے بھی اماں کا ایک چکر اسی بہانے لگتا

آنا ٹھیک ہے"

شائستہ نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ تو وہ بڑے پُراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "ان کے ہاتھ میں کچھ پیسہ اور زیور بھجوادونگی"

پھر اس نے طاہر کے ساتھ بنائے ہوئے پلان کا کچھ حصّہ شائستہ کو بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ واقعی اماں کو دو چار چکر اسی بہانے لاہور کے لگانے چاہئیں۔ عدت سے پہلے تو تم یہاں سے نکل نہیں سکتیں!

"ہاں ——"

شگو نے اماں سے بھی یہ باتیں کہہ رکھی تھیں۔ چنانچہ اس نے ان کے بکس میں کیش اور زیورات رکھ دیئے۔ اماں کو سمجھا دیا کہ ان پیسوں اور زیورات کا کیا کرنا ہے۔

اماں بیچاری سادہ سی ایماندار عورت تھی۔ شگو کے پلان میں شریک ہونے کو قطعاً جی نہیں چاہ رہا تھا۔

لیکن ——

مجبور تھی۔ کیا کرتی ——

شگو کی بات ٹالنے کی اس میں ہمت کہاں تھی۔

اماں چلی گئی ——

شائستہ اور شگو وہیں رہ کر مستقبل کے پلان بنانے لگیں۔ شگو

کی ہر بات سے شائستہ متفق تھی۔

چند دن رہ کر اماں واپس آگئی۔

اور شائستہ لاہور آگئی۔

عدت ختم ہونے تک اماں نے دو چکر لاہور کے لگائے ——
شگو بھی اب گاؤں کے اس ماحول میں رہتے تنگ آگئی تھی۔ گو اس حکمرانی ملی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اس رضا سے ہوتا تھا۔ سب کے فون بھی آتے رہتے تھے۔

لیکن ——

وہ اس ماحول سے چھٹکارا پانے کے لئے بیتاب تھی، ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی تھی۔

"اماں تنگ آگئی ہوں میں —— دن ہیں کہ گزرتے ہی نہیں" وہ اماں سے کہتی۔

"گزر جائیں گے۔ جہاں اتنے گزرے یہ بھی گزر جائیں گے" اماں نے کہا۔

"میں تو لاہور سے اداس ہوگئی ہوں اماں ——"

"وہیں رہنا ہے۔ یہ تجربہ بھی تو خود ہی کیا ہے نا ——"

"کوئی الزام رہا ہے اماں" وہ اٹھلا کر کہتی۔ "کیسے نشانے پہ تیر مارا تھا میں نے اماں!"

اماں گہری سانس لے کر چپ ہو جاتی۔

"اتنی دولت کا کبھی تصور بھی کیا تھا اماں۔ یہ تجربہ نہ کرتی تو کہاں سے پاتی اتنی دولت۔ اب کس ٹھاٹھ سے رہوں گی دیکھنا تو۔ اپنی پیاری پیاری اماں کو ساتھ ہی رکھوں گی۔ بس یہ چند دن کسی نہ کسی طرح گزر جائیں ___"

"حوصلہ رکھ گزر ہی جائیں گے ___"

"قید تنہائی ہے یہ اماں ___"

"ہوں ___"

"ساری کسریں لاہور جا کر نکالوں گی ___"

"عدت کے بعد ہی آزاد ہو گی نا ___"

"اسی لئے تو ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی ہوں"

"اتنی کم حوصلہ نہ ہوا کر۔ نہ ہی بے تابی کا اظہار اس طرح کیا کر۔ جہاں اتنا کچھ سہہ گزری ہے اب یہ وقت بھی سکون اور حوصلے سے گزار لے۔"

خدا خدا کر کے عدت کے دن ختم ہوئے۔ اس دن شگو نے سفید لٹھے کی چادر جو اسے اوڑھنا پڑتی تھی، اتار ڈالی۔ اس نے ہلکے فیروزی رنگ کے کپڑوں کے ساتھ اسی رنگ کا دوپٹہ اوڑھا۔ بال خوبصورتی سے بنائے اور ہلکا سا میک اپ بھی کیا۔

"آج میں آزاد ہو گئی ہوں اماں" اس نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

اماں نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

وہ خوش خوش کمرے سے نکلی۔

برآمدے میں دو تین نوکرانیاں کھڑی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئیں۔ اس کے سراپا پر گہری گہری متوحش نگاہیں ڈالیں اور آپس میں کچھ کھسر پھسر کرنے لگیں۔

شگو نے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا۔

ان میں سے ایک دوڑ کر نواب جان کو بلا لائی۔

نواب جان نے بھی اس کے سراپا پر حیران سی نگاہ ڈالی۔

"کیوں نواب جان ان کی باتیں مجھے سمجھ نہیں آ رہیں۔ یہ حیران کیوں ہو رہی ہیں۔ تم سے کیا کہہ رہی ہیں"

"آغا بی بی ___" نواب جان مؤدبانہ انداز میں بولی۔

"کیا ہے ___؟"

"ذرا اندر تشریف لے چلئے ___"

"کیوں ___"

"آپ سے کچھ کہنا ہے ___"

"یہیں کہو ___ یہ سب تمہاری بات ___"

"آغا بی بی ___" وہ جلدی سے بولی۔ "آپ نے رنگدار لباس تو پہن لیا ہے، لیکن دوپٹہ ___"

"کیا ہوا دوپٹے کو ___؟"

"دوپٹہ رنگدار نہیں اوڑھنا چاہیئے تھا ———"

"کیوں ——— میری عدت تو ختم ہو چکی ———"

"لیکن آپ آغا جان کی بیوہ تو ہیں۔ ساری عمر آپ کو سفید دوپٹہ ہی اوڑھنا پڑے گا آغابی بی ورنہ ———"

"ورنہ کیا ———؟"

وہ خوفزدہ سی ہو کر بولی "آغابی بی ——— آپ نہیں جانتیں ———؟"

شگو کچھ سہم سی گئی۔

نواب جان بولی "خدا کے لئے ابھی جا کر یہ دوپٹہ اتار دیجئے سفید چادر یا سفید دوپٹہ ہی اب آپ کا مقدر ہے۔ آپ آغا جان کی بیوہ ہیں ———"

"تو کیا میں ہمیشہ ان کی بیوہ ہی رہوں گی ———"

نواب جان نے سر جھکا کر کہا "پہلے اندر چلئے دوپٹہ اتار دیجئے۔ ابھی یہ خبر ساری حویلی میں پھیل جائے گی۔ خان صمد خان بھی آج آ رہے ہیں ——— آپ ———"

"ٹھیک ہے وہ آ رہے ہیں، تو میں ان سے خود بات کر لوں گی"

"نہ نہ آغابی بی ———" وہ وحشت زدہ سی نظر آئی۔

شگو اس کی کوئی بات سنے بغیر پلٹ گئی۔ کمرے میں آتے ہی بولی "سنا تم نے اماں ———"

"کیا ———؟"

"ان سب لوگوں کو میرے رنگدار دوپٹہ اوڑھنے پر اعتراض ہے"

"اچھا ———"

"ہاں ———"

اماں چپ ہو گئی ———

شگو ماں کے قریب بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "اماں صمد خان آ رہے ہیں، تم ان سے کھل کر بات کر لو مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی۔ کہیں یہ لوگ اس بات پر بھی کوئی فساد نہ مچا دیں۔ میں یہاں اب ایک دن بھی نہیں رہوں گی"

اماں نے اسے سینے سے لگا کر دلاسہ دیا۔

پھر بولی۔ "وہ آئیں میں ان سے خود بات کر لونگی تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہے ———"

صمد خان پچھلے پہر یہاں پہنچے۔

وہ شگو سے چند امور پر تبادلہ خیال کرنے آئے تھے، عدت ختم ہونے پر وہ چاہتے تھے ——— شگو چند دنوں کے لئے پشاور رہ لے۔

لیکن ———

آتے ہی انہیں اس کے رنگدار دوپٹہ اوڑھنے کی خبر مل گئی وہ کچھ پریشان تو ہوئے ———

پھر خبر دینے والے سے کہا "انہیں ہمارے رسم و رواج کا علم

نہیں ہے نا۔ میں انہیں آج سمجھا دونگا ـــــ"

وہ شگو کے پاس آئے۔ اس نے فیروزی دوپٹہ اتار کر وہی سفید لٹھے کی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ چہرے پر برہمی کے آثار تھے۔ وہ صمد خان سے آج خود بھی تصفیہ کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی ـــــ

صمد خان نے اسے دیکھا ـــــ حال احوال پوچھا۔ پھر بولے، "آغا بی بی۔ آپ کی عدت کی مدت تو ختم ہوگئی ہے اس لئے اب آپ چاہیں تو حویلی سے باہر جا سکتی ہیں۔ پشاور والی کوٹھی میں آپ کے قیام کا بندوبست ـــــ"

"میں لاہور جانا چاہوں گی ـــــ؟"

"کچھ دنوں کے لئے جا سکتی ہیں ـــــ"

"کچھ دنوں کے لئے ـــــ؟"

"تو اور ـــــ"؟

شگو کی بجائے اس کی اماں نے بات کرنا مناسب سمجھا۔ اس نے تمہید کے طور پر بہت کچھ کہنے کے بعد آہستگی سے کہا۔

"خان صاحب ـــــ میری بچی اتنی کم عمری میں بیوہ ہوگئی ـــــ"

"ہاں ہمیں اس بات کا دکھ ہے ـــــ"

"لیکن ابھی اس کی پہاڑ سی زندگی پڑی ہے ـــــ ایسے تو نہیں کٹے گی ـــــ"

خان صاحب کے سارے بدن میں جیسے تشنجی سا کڑاؤ پیدا ہوا۔ آنکھوں میں غصّے کی لہر دوڑ گئی۔ جلدی سے بولے۔

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں ـــــ؟"

"خان صاحب۔ میں اپنی کو واپس اپنے گھر لے جانا چاہتی ہوں۔ اس کی عمر ہی کیا ہے۔ وہ سدا بیوہ تو نہیں رہ سکتی ـــــ"

"کیا ـــــ؟" خان صاحب اس طرح دھاڑے کہ شگو اور اس کی اماں سہم گئیں۔

"آپ کا ارادہ اپنی بیٹی کی دوسری شادی ـــــ"

اماں نے ڈرتے ڈرتے سر اثبات میں ہلایا۔ تو خان صاحب کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا۔ غصّے سے تھر تھر کانپنے لگے۔ آواز کو قابو میں رکھنے کی ناکام کوشش ہوگئی۔ کرخت اور تیز لہجے میں چیخے۔

"یہ آپ نے سوچنے کی جرأت کیسے کی ـــــ"

شگو کا تو جیسے دل ہی بند ہونے کو ہوا۔ ٹھنڈے پسینے میں نہا گئی۔ ہاتھ پاؤں بے سکت ہو گئے۔ چوپٹ آنکھوں سے صمد خان کا چہرہ تکنے لگی۔

اس چہرے اور ہمیشہ کے چہرے میں کتنا فرق تھا۔ وہ ہول گئی۔

اماں نے ہی ذرا ہمت کی بولنے کی۔ آہستگی سے کہا۔ "خان صاحب ـــــ شگو کی عمر ـــــ"

"یہ سب پہلے سوچنا چاہیئے تھا ——" وہ گرجے "میں نے انہیں اس اقدام سے منع بھی اسی لئے کیا تھا کہ آغا جان کی موت متوقع تھی۔ اور ان کی کم عمری — بھی اک حقیقت تھی۔"

"لیکن اب ——" اماں بولی۔

وہ بڑی گرجدار آواز میں بولے "اب انہیں ساری زندگی آغا جان کی بیوہ بن کر گذارنا ہوگی ——"

"نہیں ——" شگو بے اختیارانہ چلاّئی۔ خان صاحب کا پارہ آخری حدود کو چھو گیا۔

حویلی کے نوکر چاکر اور دور پار کے رشتہ دار ادھر تھے۔ سب کمرے کے باہر جمع ہو گئے۔ سب کے دل دہل رہے تھے۔ اور دم سادھے وہ ساری باتیں سن رہے تھے۔

"آغا بی بی ——" صمد خان بڑے دبدبے اور رعب سے بولے۔

"آپ کو یہ بات ذہنی طور پر تسلیم کرنا ہوگی کہ آپ آغا جان کی بیوہ ہیں ہمارے باپ کی بیوہ۔ ہماری ماں۔ ہماری غیرت اور عزت۔ ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کہ اپنی ماں کی دوسری شادی کریں۔ یہ ہماری غیرت اور عزت کو چیلنج ہے۔ لیکن یہ سوچ لیں کہ اس رشتے اور تقدس کو قائم رکھنے کے لئے ہم اپنی جانیں بھی نثار کر سکتے ہیں۔ خون کی ندیاں بہہ سکتی ہیں۔ اس آبرو کے تقدس کے لئے — آپ آغا بی بی ہیں۔ تو ہماری جانیں آپ پر نثار — اور جو آپ اس رشتے کو پامال کرنا

چاہیں گی —— تو پھر —— ہماری تلواریں اور بندوقیں اپنا کام دکھانا جانتی ہیں ——"

وہ مڑے اور دھم دھم قدم رکھتے کمرے سے باہر نکل گئے۔

شگو پر تو نیم غشی سی طاری ہو گئی۔ اور اماں مٹی کا بے جان بت بن کر رہ گئی۔

شگو ہار گئی ——

اسے ہارنا ہی تھی ——

سب کچھ پا کر بھی اسے کچھ نہ ملا۔ دولت کی ہوس نے اسے جن راہوں پر ڈال دیا تھا وہ ان پر بھٹک بھی تو نہیں سکتی ——

اس کی حالت تو فرعون مصر کے وقت کی ان ممیوں کی سی ہے جو سونے چاندی کی دیواروں میں مقید ہیں۔ مدفون خزانوں پر دھری یہ حنوط شدہ نعشیں ایک لحاظ سے شگو سے تو اچھی ہیں۔

کہ ——

اس کی طرح جیتی جاگتی مدفون اور مقید نہیں ہیں

ختم شد